تحریر

علمی مجلس دلی کا سہ ماہی رسالہ

(۳۱)

مرتب:
مالک رام

Rs.

Printed by Z. A. Abbasi at Kohinoor Printing Press,
Lal Kuan DELHI-6
and Published from "ILMI MAJLIS" OFFICE,
1429, Chhatta Nawab Saheb, Farrash Khana, DELHI-6.

تحریر

علمی مجلس دلی کا تماہی رسالہ

مرتب (۳۱) مالک رام

جلد ۹ جنوری / مارچ ۱۹۷۵ء شمارہ ۱

چندہ سالانہ ۱۵ روپیے اس شمارے کی قیمت ۵ روپیے

غیر ممالک سے: ۲/۱/۲ پونڈ (انگریزی) یا ۷ ڈالر امریکی

پرنٹر و پبلشر ظل عباس عباسی نے کوہ نور پریس، دلی میں چھپوا کر دفتر علمی مجلس ۴۲۹ چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ دلی ۶ سے شائع کیا

ملاحظات

تحریر نے اپنی زندگی کے آٹھ سال پورے کر لیے اور اس شمارے نے سالِ نہ
کا آغاز ہو رہا ہے۔ فالحمد للہ۔

پارسال ہم پر بہت سخت گزرا۔ ہوشربا گرانی اور دوسری ناگہانی مشکلا
باوجود ہم نے سال میں دو خاص نمبر پیش کیے اور ساڑھے چھ سو صفحات کا
مواد پیش کیا، جس نے ہماری مشکلات کو المضاعف کر دیا۔

ہم نے صرف اتنا چاہا تھا کہ جن لوگوں کی طرف واجب الادا رقوم ہیں،
ادا کر دیں۔ بیشک، بہت سے دوستوں نے اس پر توجہ کی۔ لیکن ایک
تعداد نے ہنوز معاملے کی سنگینی کا اندازہ نہیں لگایا۔ انھیں اپنے
احساس ہونا چاہیے۔

مالک رام

سید حسن

مکاتیبِ تاج

سید امتیاز علی تاج مرحوم کو دنیا سے رخصت ہوئے آج تقریباً سوا چار سال کا عرصہ ہوا۔ گو ان کا وجود عالمِ فانی میں باقی نہیں ہے، تاریخ ادبِ اُردو کے صفحات میں ان کا نام ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا جاتا رہیگا۔ اُن کی المناک موت کا یوں تو جملہ پرستاران و علاقمندانِ زبان و ادبِ اُردو نے سوگ منایا تھا، لیکن میں نے اس سانحے کو ایک ذاتی غم اور شخصی نقصانِ عظیم کے طور پر محسوس کیا کیونکہ میرے اور مرحوم کے درمیان غائبانہ تعلقات دس سال تک قائم رہے۔ اس مدت کے دوران مرحوم نے مجھے بہت سے خط لکھے، جن میں سے کچھ تو ضائع ہو گئے، اور کچھ میرے پاس محفوظ ہیں۔ ذیل میں اُن ہی کے خطوں کی کاملاً یا اقتباساً نقل پیش کی جا رہی ہے، لیکن اس سے قبل ایک مختصر سی تمہید ضروری ہے۔

تاج مرحوم کے نام سے میں اپنے لڑکپن کے زمانے میں اُس وقت آشنا ہوا جب میں نے بچوں کا ہفتہ وار اخبار "پھول" پڑھنا شروع کیا تھا۔ یہ اخبار لاہور سے شائع ہوتا تھا اور اس کے مالک و مدیر تاج مرحوم کے والد شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی مرحوم تھے۔ کبھی کبھی تاج کا لکھا کوئی مضمون اس اخبار میں چھپ جاتا تھا۔ بعد میں کئی برس تک غالباً ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک تاج کا نام اس اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے سرورق پر چھپتا رہا۔ اس کے بعد پھول کی ایڈیٹری ابوالاثر حفیظ جالندھری کو تفویض ہوئی۔ جب حفیظ جالندھری نے اردو کے قدیم رسالے 'مخزن' کا تیسری مرتبہ اپنی ادارت

میں اجرا کیا، تو اس میں بھی کبھی کبھی تاج کا کوئی مضمون دیکھنے کو مل جاتا، یہ زمانہ غالباً ۱۹۲۵ء
سے ۱۹۳۲ء تک کا تھا۔ ان دنوں میں پٹنہ کالج میں انٹرمیڈیٹ یا بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ ۳۵ء
میں جب میں ایم اے اُردو کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا تو تاج مرحوم کو زیادہ قریب سے سمجھنے کا
موقع میسر ہوا۔ کیونکہ اس زمانے میں اُن کا مشہور ڈراما 'انارکلی' ہمارے نصاب میں داخل تھا،
اس کتاب کو غور سے پڑھنے اور اس کے بارے میں تنقیدی نوٹ تیار کرنے میں تاج کی ادبی اور فنی صلاحیت
کا پورے طور پر اندازہ ہوا۔ ڈراما "انارکلی" اُردو ڈرامہ نگاری میں ایک اہم موڑ کا درجہ رکھتا ہے
اس موڑ کی ابتدا آغا حشر مرحوم کے بعض کامیاب ڈراموں سے ہوئی تھی۔

"انارکلی" کے بعد تاج مرحوم کی کوئی مستقل قابلِ ذکر تالیف دنیائے اردو میں نہیں آئی، یا کم از کم
میں نے نہیں دیکھی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۸ء تک یعنی تئیس چوبیس سال کے طویل عرصے میں اُن کی یاد
کچھ دُھندلا سی گئی تھی کہ یک بیک ۱۹۵۸ء میں مرحوم سے مکاتیب کا سلسلہ شروع ہو گیا جو ۱۹۶۸ء
تک وقفے وقفے سے جاری رہا۔ اس مکاتبت کا آغاز تاج نے ہی کیا۔ ان کو احسن لکھنوی مرحوم کے ایک
بہت ہی قیمتی مضمون بعنوان "نامۂ احسن" کی نقل درکار تھی۔ یہ مضمون رسالہ "بہارستان"، لاہور میں شائع
ہوا تھا اور میں نے اپنے ایک مضمون "محمود میاں رونق" میں اس کا حوالہ دیا تھا، میرا مضمون "نوائے ادب"
بمبئی میں ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ تاج مرحوم نے اسی کو دیکھ کر مجھ سے "نامۂ احسن" کی نقل طلب کی تھی۔
سخت تعجب کی بات ہے کہ "بہارستان" کا کوئی شمارہ خود لاہور میں موجود نہیں ہے۔ تاج مرحوم کا خط پا کر مجھے بڑی
خوشی ہوئی اور میں نے انھیں فوراً جواب دیا کہ آپ سے تو میری پرانی شناسائی ہے، بلکہ آپ میرے لڑکپن کے
ہیرو ہیں۔ میں پھول میں مضامین اور کہانیاں لکھا کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ مضامین لکھنے کے صلے میں مجھے
انعام اور اس کے ساتھ میری طرزِ تحریر اور خوشخطی کی تعریف میں آپ کے خطوط ملا کرتے تھے۔ ان کی مطلوبہ
چیز یعنی "نامۂ احسن" کی نقل بھی بھیج دی۔ اس کے بعد دس سال تک وہ وقتاً فوقتاً مجھے خط لکھتے رہے،
افسوس، کہ بعض خطوط تلف ہو گئے، صرف گیارہ بچ گئے ہیں۔ لیکن یہ باقیماندہ خطوط بھی خاصے اہم
ہیں کیونکہ ان کے مطالعے سے مکتوب نگار کے بعض ذاتی حالات، ادبی مشاغل اور اُن کی سیرت و شخصیت
پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ ان مکاتیب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'انارکلی' کی کامیابی کے بعد اور
ناقدینِ فن کی قدر دانی سے متاثر ہو کر تاج مرحوم کو اُردو کے قدیم ناٹکوں، اور کلاسیکی ڈراموں کو مرتب

کرکے چھپوانے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ خود اُن کے پاس اُردو کے قدیم ڈراموں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف ذرائع سے متعدد دوسرے کلاسیکی ڈرامے جمع کر لیے تھے، لیکن اُن کے ایڈیشن شائع کرنے کی انھیں ہمت اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ طباعت کے کثیر اخراجات کے، خود پبلشر ہونے کے باوجود، متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ اس غرض سے سرکاری امداد حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ وہ اس میں کامیاب ہوئے یا نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ البتہ جب مجلس ترقی ادب، لاہور نے تاج کے تیار کردہ ایڈیشنوں کی طباعت و اشاعت کا بار اپنے ذمے لے لیا، تو انھوں نے زیادہ توجہ اور انہماک سے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

جون ۱۹۶۸ء کے بعد یاد نہیں، کس سبب سے، تاج مرحوم سے مکاتبت کا سلسلہ بند ہو گیا، البتہ اختر شیرانی مرحوم کے فرزند ارجمند جناب مظہر محمود شیرانی کے خطوں کے ذریعے تاج مرحوم کی خیریت اور ادبی مشاغل کا حال معلوم ہوتا رہا۔ مظہر محمود شیرانی صاحب شیخوپورہ (پنجاب) کالج میں فارسی کے لکچرر ہیں۔ ان سے بھی خط و کتابت کا سلسلہ "بہارستان" ہی کی وجہ سے قائم ہوا۔ وہ اپنے دادا یعنی جناب محمود شیرانی مرحوم کے مقالات کی تدوین کر رہے تھے، اور اس کے لیے انھوں نے "بہارستان" سے ایک مقالے کی نقل طلب کی تھی۔ مظہر محمود شیرانی کے خط سے معلوم ہوا کہ بعض ناٹکوں کے ایڈیشن جو تاج نے مرتب کیے تھے، چھپ گئے ہیں؛ اور پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے خبر دی تھی کہ دو مجموعے الہ آباد کی کسی خاتون کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ میں نے انھیں دیکھنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ ۱۹۷۰ء کے آغاز میں مظہر محمود شیرانی سے بھی مکاتبت بند ہو گئی۔ پھر اپریل ۱۹۷۰ء میں یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ کسی نے تاج پر قاتلانہ حملہ کر دیا، جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔

تاج مرحوم ہائی بلڈ پریشر یعنی فشارِ خون کے مریض تھے۔ بعض مرتبہ یہ مرض شدت اختیار کر لیتا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا تھا کہ انھیں اسپتال میں داخل کرنے کی تجویز تھی، لیکن ایک دو روز میں گھٹ گیا اور اسپتال جانے کی نوبت نہیں آئی۔ پھر ۱۹۶۶ء میں فشارِ خون کی زیادتی کی وجہ سے ایک شریان پھٹ گئی، اور اس کے بعد انھیں عرصے تک چلنے پھرنے کی اجازت نہیں ملی۔ خرابیِ صحت کے باوجود انھوں نے ڈراموں کی تصحیح و تدوین کا کام پوری توجہ کے ساتھ جاری رکھا۔ تاج مرحوم نہ صرف یہ کہ خود ایک بلند مرتبہ ادیب اور فنکار تھے، بلکہ اردو کے دوسرے خدمتگزاروں

کے بھی قدر دان اور ان سے مخلصانہ ارتباط رکھتے تھے۔ اُردو کلاسیکی ڈراموں کی تفتیش و تدوین کے کام میں انھوں نے تمام معلوم ذریعوں سے استفادہ کیا تھا، اور ان تمام لوگوں سے رابطہ پیدا کیا تھا، جو اس موضوع سے واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ مجھ سے بھی، جیسا کہ پہلے عرض ہو چکا ہے، مکاتبت کا یہی ایک بہانہ ہوا۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ وہ میرے عہدِ طفلی کے ہیرو ہیں اور میں اخبار "کول" میں مضامین لکھا کرتا تھا، تو انھوں نے بعد میں جو خط مجھے لکھے، ان میں بڑی محبت و شفقت کا اظہار کیا۔ بلکہ بعض خطوں کے القاب اور لب و لہجے سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ مجھے اپنا ہم عمر تصور کرتے تھے، حالانکہ وہ مجھ سے کم از کم آٹھ نو سال بزرگ تر تھے۔ میں نے قدیم اُردو ڈراموں کے بارے میں جو کام کیا ہے، مرحوم اس کے بڑے قدر دان تھے۔ میری قدر افزائی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے جون ۱۹۶۶ء میں جو خط مجھے لکھا تھا، اس میں ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اپنی ایک تالیف کو میرے نام سے معنون کریں گے اور اس غرض سے میری اجازت مانگی تھی۔ ان کا یہ ارادہ عمل میں آیا یا نہیں، اس کی مجھے خبر نہیں۔ اس کے علاوہ اس خط میں ان کے مرتب کردہ مجموعوں کے مقدموں میں میرے مضامین کا حوالہ دینے کا بھی تذکرہ تھا۔ چونکہ کوئی مجموعہ ہنوز میری نظر سے نہیں گزرا، میں نہیں کہہ سکتا کہ واقعتاً ایسا ہوا یا نہیں۔ بہر حال، تاج ایسے نامور ادیب کا میرا قدر دان ہونا ہی، میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔

تاج مرحوم کے جو خط ذیل میں نقل ہوئے ہیں، ان میں ڈاکٹر محمد باقر، معین حزیں، اور ناصر حسین نقوی کے نام بھی آئے ہیں، اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ نام کیوں لیے گئے ہیں۔

یہ ڈاکٹر محمد باقر وہ ہیں، جو اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ اب اس عہدے سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ فارسی ادبیات سے متعلق اپنے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے خاصے مشہور ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے انھوں نے فارسی شعرا کے ایک ضخیم تذکرے "مخزن الغرائب" کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ تاج مرحوم نے "نامۂ احسن" کی نقل کی فرمایش میں جو پہلا خط مجھے لکھا، اس میں یہ بتایا تھا کہ فرمایش کرنے میں تامل اس لیے ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر محمد باقر نے ایک بار اُن سے بیان کیا تھا کہ پٹنے میں انھوں نے مجھ سے کوئی نادر کتاب دیکھنے کو مانگی تھی اور میں نے انکار کر دیا تھا۔ اس الزام کا میں نے جواب دیا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کبھی مجھ سے کوئی کتاب دیکھنے کو نہیں مانگی؛ ان کا بیان کسی غلط فہمی پر مبنی ہے؛ آپ

اُن سے دریافت کریں کہ کب اور کونسی کتاب مانگی تھی۔ تاج نے جب ڈاکٹر باقر صاحب سے تذکرہ کیا تو انھوں نے پہلے بیان سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ سید حسن صاحب سے کبھی میری ملاقات نہیں ہوئی ہے اور نہ میں انھیں پہچانتا ہوں۔ اس کے جواب میں میں نے لکھا کہ ڈاکٹر صاحب نے سہواً یہ بات کہی ہے۔ میری ان کی ملاقات ۱۹۵۶ء میں ایران میں ہوئی ہے۔ جب میں وہاں دانشگاہِ تہران میں فارسی مطالعات کی غرض سے مقیم تھا۔ اس زمانے میں "خواجہ نصیر الدین طوسی کی ہفتصد سالہ یاد بود" کی تقریب منائی جا رہی تھی اور اس میں شرکت کے لیے مختلف ملکوں سے مستشرقین مہمان آئے ہوئے تھے؛ ڈاکٹر صاحب موصوف پاکستان سے تشریف لائے تھے، میرا ان سے تعارف اسی موقع پر ہوا تھا۔ شہنشاہِ ایران نے ایک روز شرکائے کانفرنس کی "کاخِ گلستان" میں عصرانہ کی دعوت کی تھی۔ ہم لوگوں نے "کاخِ گلستان" میں جو شاہی میوزیم ہے، بعض نادر مخطوطاتِ فارسی کی بھی زیارت کی تھی۔ شاہنامۂ فردوسی کے ایک نفیس و بیش بہا مخطوطے کو دیکھنے کے وقت ڈاکٹر صاحب موصوف بھی ساتھ ہو گئے تھے، اتفاقاً فوٹو گرافر نے اس موقع پر ہماری تصویر لے لی تھی، جس کی ایک کاپی میرے پاس موجود ہے۔ یہی اس بات کا ثبوت ہو کہ ڈاکٹر صاحب کی ملاقات مجھ سے ہو چکی ہے۔ تاج مرحوم نے اس کے بعد ان سے کیا کہا اور انھوں نے کیا جواب دیا، اس کی مجھے خبر نہیں۔ مختصر یہ کہ غلط فہمی اور سہو کے باعث دلچسپ باتیں ہو گئیں۔

جناب معین حزیں اُس زمانے میں شاید پنجاب یونیورسٹی میں جناب کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کے متعلق ایک تحقیقی یا تنقیدی مقالہ لکھ رہے تھے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مجھ سے میرے ایک مضمون کی جو کلیم صاحب کے احوالِ زندگی اور سیرت و شخصیت کے بارے میں رسالہ صنم، پٹنہ میں شائع ہوا تھا، نقل طلب کی تھی۔ میں نے ایک شاگرد کے ذریعے مضمونِ مطلوبہ نقل کرا کے انھیں بھیج دیا اور شاگرد کا محنتانہ لاہور کی ایک مطبوعہ فارسی کتاب کی شکل میں مانگا تھا۔ لیکن حزیں صاحب نقل پا لینے کے بعد بالکل خاموش ہو گئے، اور میری یاد دہانی اور تاج مرحوم کی تاکید کے باوجود توجہ نہ کی۔

ثاقب حسین نقوی صاحب سندر ساتی ہیں، ان سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں، ان دنوں وہی کام سے کبھی کبھار لاہور گئے آئے تھے۔ ان ہی کے ذریعے تاج مرحوم نے بعض ڈراموں کی، جو میرے پاس موجود ہیں، نقلیں طلب کی تھیں، یہ نقلیں ڈاک کے ذریعے بھیج دی گئی تھیں۔

تاج مرحوم زمانۂ طالب علمی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں انھوں نے اپنا ایک شعر بھی نقل کیا ہے، جو اسی زمانے میں کہا تھا۔ شعر یہ ہے:

حشر پر ہی وعدۂ دیدار رہنے دیجیے ۔ کچھ نہ کچھ انکار میں اقرار رہنے دیجیے

اس مختصر سی تمہید کے بعد تاج مرحوم کے مکاتیب ملاحظہ فرمائیے۔ ان خطوں میں پانچ ٹائپ میں ہیں، اور باقی چھ تاج مرحوم نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں۔ مجلسِ ترقی ادب کے ڈائرکٹر بن جانے کے بعد اُن کے اکثر خطوط ٹائپ شدہ آتے تھے۔

خط نمبر ۱

۷۔ ریلوے روڈ، لاہور۔ ۲۳ فروری ۵۸ء

محترمی تسلیم۔ گرامی نامہ موصول ہوا۔ دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ نامۂ احسن کی نقل کی رسید اور اپنے دلی شکریے کا خط ارسالِ خدمت کر چکا ہوں۔ اس میں آپ سے دریافت کیا تھا کہ ناقل صاحب کو یہاں کی کن کن کتابوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ خط بذریعۂ رجسٹری روانہ کیا گیا تھا۔ نہ جانے میرے ایسے خط جو رجسٹرڈ نہیں ہوتے یہاں سے غائب ہو جاتے ہیں یا وہاں۔ بہر حال آپ کے گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ ناقل صاحب اورینٹل کالج میگزین لاہور کے وہ سب شمارے حاصل کرنا چاہتے ہیں جن میں تذکرۂ مردم دیدہ قسط وار شائع ہوا ہے۔ میں فی الفور تعمیلِ ارشاد کی کوشش کرتا۔ لیکن اورینٹل کالج میں ان دنوں اُردو کانفرنس ہو رہی ہے، کالج بند ہے۔ کل شام کو افتتاحی اجلاس میں تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں بھی گیا تھا۔ میں ان دنوں ہائی بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا ہوں۔ پچھلے ہفتے تو بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہسپتال میں داخل ہونے کی تجویز تھی۔ لیکن ایک دو روز میں گھٹ گیا۔ معالج کی ہدایت کے مطابق زیادہ وقت بیکاری اور آرام میں گزار رہا ہوں۔ آپ کا اور ناقل صاحب کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اتنا طویل مضمون نقل کر کے مجھے ارسال فرمایا۔ اسے پڑھتے ہی چند اوراق کا مقدمہ میں نے لکھ دیا تھا۔ معالج کام کی اجازت دے، تو باقی ڈراموں کے مقدمے بھی ان شاء اللہ جلد لکھ لوں گا:۔۔۔۔ "آجکل" کا ڈرامہ نمبر زیادہ پسند نہ آیا، میں اس سے معلومات حاصل کرنے کا متوقع تھا۔ آپ کے مضمون 'الف خاں حباب' کے شائع ہونے کا بےچینی سے انتظار کروں گا۔ کاش، کہیں سے حباب کے کچھ ڈرامے حاصل ہو سکتے۔ یہی ایک ایسے ڈرامانگار ہیں جن کا

کوئی ڈراما میرے پاس موجود نہیں، ممکن ہو، تو امداد فرمایئے، بےحد احسانمند ہونگا۔ ڈاکٹر باقر صاحب کی طرف دو تین بار گیا، لیکن اُن سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اب اورینٹل کالج میگزین کے نمبر لینے جاؤنگا، تو غالباً ملاقات ہوسکیگی۔ گزشتہ دنوں وہ لاہور سے غیر حاضر بھی رہے۔ اُمید کہ آپ بخیریت ہونگے۔ مضمون بھیجنے کا شکریہ ایک بار پھر قبول فرمایئے، والسلام

آپ کا امتیاز علی تاج

یکم مئی ۵۸ء — خط نمبر ۲

مکرمی محترمی! تسلیم۔ غالباً دو سال ہوئے 'نوائے ادب' میں رونق پر آپ کا مضمون پڑھنے کے بعد میں نے کالج کے پتے پر آپ کو خط لکھا تھا، لیکن اس کا جواب نہ آیا تھا۔ اب حال ہی میں رائٹرز ایسوسی ایشن کے جناب مسافر لاہور آئے، تو انھوں نے مشورہ دیا کہ آپ کے گھر کے پتے پر لکھوں، ان ہی سے مجھے آپ کے گھر کا پتہ معلوم ہوا۔

میں نے مغربی پاکستان کی مجلس ترقیِ ادب کی فرمائش پر اُردو ڈراموں کی تصحیح و ترتیب اور ان پر مناسب مقدمے لکھنے کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔ اس کام کو خاطر خواہ طور پر انجام دینے کے لیے مجھے بہت سے اُن اردو ڈراموں کی ضرورت ہے، جو کبھی بمبئی سے گجراتی اور فارسی رسم الخط میں شائع ہوئے تھے۔ تو میرے پاس ڈراموں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، لیکن تصحیح کی غرض سے اُن کے اور ایڈیشن بھی فراہم کر رہا ہوں۔ چند نایاب ڈراموں کے فوٹو گراف برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری سے بھی منگائے ہیں۔ جو حضرات اُردو ڈراما میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے دروازے پر امداد کی اُمید میں دستک دے رہا ہوں۔ مسافر صاحب نے بتایا تھا کہ اس سلسلے میں مجھے ڈاکٹر نامی سے امداد کی توقع نہیں رکھنی چاہیے؛ آپ سے امداد ملنے کی اُمید البتہ ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اردو ڈراموں کے متعلق آپ نے کوئی اپنی تجویز نہ بنا رکھی ہو، تو از راہِ نوازش میری امداد فرمایئے۔ میں آپ کا احسانمند ہونگا۔ میرا یہ عرض کر دینا شاید مناسب نہ ہو کہ یہ کام ایسا ہو کہ بغیر سرکاری امداد کے اس کا سرانجام پانا آسان نہیں۔ میں پبلشر بھی ہوں، لیکن بحیثیت پبلشر کے اس کام میں ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ مجھے اس وجہ سے کبھی نہ پڑ سکا کہ بازار میں ان ڈراموں کی مانگ نہ اب ہے، اور نہ آئندہ ہونے کی اُمید ہے۔ اگر مجلس ترقیِ ادب انھیں شائع کرنے پر آمادہ نہ ہوتی، تو میں اب بھی اُن کی طرف توجہ نہ کر سکتا۔ اب میں یہ کام شروع کر چکا ہوں، اور دن رات اس پر محنت کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو میرے، اس کام سے دلچسپی

ہے تو براہِ کرم مطلع فرمائیے، کہ آپ سے امداد کی توقع رکھ سکتا ہوں۔ امید کہ آپ بخیریت ہونگے، والسلام

خاکسار سید امتیاز علی تاج

خط نمبر ۳   ۴۰۔ ایبٹ روڈ، لاہور ۲، ستمبر ۵۵ء

محترمی سید حسن صاحب! تسلیم۔ میرے خط کا جواب اب تک نہیں آیا۔ اندیشہ ہے کہ ملا نہ ہوگا۔ ورنہ ممکن معلوم نہیں ہوتا کہ اپنے پہلے مخلصانہ محبت نامے کے بعد آپ یوں خاموشی اختیار کریں۔ میں اس دوران میں ادھر کی یونیورسٹیوں کے پرچے دیکھنے میں مصروف رہا۔ آج یہ خط بذریعۂ رجسٹری روانہ کر رہا ہوں، از راہِ نوازش مطلع فرمائیے کہ میرا مفصل خط آپ کو ملا یا نہیں۔

مجھے زیادہ انتظار الف خاں حباب کے متعلق معلومات کا ہے۔ احسن کے ڈراموں پر اب تک مقدمہ نہیں لکھ سکا۔ چاہتا تھا کہ مقدمہ لکھنے سے پیشتر کم از کم حباب کا "ماہرو و عز الٰہ" پڑھ لوں۔ حباب ہی کے ڈرامے دیکھ کر احسن کو ڈراما نویسی کا شوق پیدا ہوا تھا۔ اس لیے یقین ہے کہ احسن کے ابتدائی ڈراموں میں حباب کی تدبیر کاری کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ملیگا؛ نہ ہو، جب بھی اطمینان کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہاں باوجود بیحد کوشش کے حباب کا کوئی ڈراما دستیاب نہ ہو سکا۔ ایک صاحب کے پاس "جشن کنور سین عرف سیر پرستان" موجود ہے۔ لیکن وہ صاحب ایک عرصے سے حیدرآباد ہیں اور ابھی کچھ معلوم نہیں کہ کب آئینگے۔ احسن کے حالاتِ زندگی اور تاریخ وفات بھی اب تک معلوم نہ ہو سکی۔ لکھنؤ کے کئی احباب کو خط لکھے، انھوں نے جواب میں امداد کا وعدہ بھی فرمایا، لیکن پھر اس کام کے لیے شاید وقت نہ نکال سکے۔ آج انھیں یاددہانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بس "عز الٰہ و ماہرو" اور احسن کے حالاتِ زندگی مل جائیں، تو مقدمہ لکھ کر احسن سے فراغت پالوں۔ ان کے جو کھیل میں نے منتخب کیے ہیں، ان سب پر جدا جدا دیباچے لکھ چکا ہوں۔ امید ہے کہ آپ از راہِ نوازش "عز الٰہ و ماہرو" کی اور حباب پر اپنے مضمون کی نقل ارسال کر کے شکریے کا موقع بخشینگے۔ ایک بار پھر وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے ذخیرے یا آپ کے مضمون سے جو امداد بھی ملی، اس کتاب میں اس کا اعتراف کرونگا۔ نقل تیار کرانے کے متعلق لکھ چکا ہوں کہ اس پر جتنی رقم صرف ہو، اس کے بدلے میں پاکستان کی جن اردو مطبوعات کی آپ کو ضرورت ہو، بلا تکلف مجھ سے طلب فرمائیے؛ ضرورت نہ ہو تو اطلاع دیں۔۔۔۔ آپ کے ڈراموں کے

۱؎ یہ ڈرامہ حباب رامپوری کی تصنیف ہے۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ جناب پروفیسر مسعود حسن رضوی (لکھنؤ) کے پاس ہے۔

ذخیرے کی فہرست کا بھی منتظر ہوں، میں تین چار سو ڈرامے فراہم کر چکا ہوں، لیکن ان میں کئی ایسے ہیں جنھیں بلا تکلف علیلیوں کی پوٹ کہا جا سکتا ہے۔ آرام کے نورجہاں کی تصویری نقل انڈیا آفس لائبریری سے منگوالی ہے۔ آپ کے پاس کسی اتفاق سے آرام کا گجراتی رسم الخط میں چھپا ہوا "خورشید" تو نہیں؟ آپکے پاس جو ڈرامے ہیں، ان میں سے گجراتی رسم الخط کے ڈراموں کے نام معلوم کرنے کا (ڈرامہ پڑھا نہیں گیا) میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے، تو اب از راہِ نوازش میری امداد فرمائیے۔ دوسرے کاموں سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اب بھی سے آپکے جواب کا انتظار کرونگا۔ امید کہ آپ بخیریت ہونگے۔ خاکسار سید امتیاز علی تاج

خط ۴ ۔ ۴۰ ایبٹ روڈ لاہور ۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۸ء

مکرمی تسلیم۔ گرامی نامہ مورخہ یکم اکتوبر موصول ہوا۔ دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ یہ معلوم ہو کر بہت افسوس ہوا کہ میرا پچھلا خط آپ کو نہ ملا۔ پچھلے خط کی طرح اس خط کو بھی بذریعہ رجسٹری آپ کی خدمت میں روانہ کرونگا۔ افسوس کہ اپنے پچھلے خط کی کوئی نقل میں نے اپنے پاس نہ رکھی تھی۔ لیکن اتنا بخوبی یاد ہے کہ آپ کا محبت نامہ پڑھ کر بیحد خوشی ہوئی تھی۔ "پھول" کے سلسلے میں آپکے اپنے تعلقات معلوم ہو کر وہ پُر لطف زمانہ یاد آگیا تھا، جب میں پھول میں بہت گہری دلچسپی لیا کرتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی عملۂ ادارت میں کام کرتے تھے، تو مضمونوں کی ڈاک میں ہی کھول کر اور سب مضامین پڑھ کر ان کے حوالے کیا کرتا تھا۔ آپکے یاد دلانے سے آپکے مسودے تک نظروں میں پھر گئے۔ لدنق پر آپ کا مضمون "نوائے ادب" میں پڑھا، تو مجھے گمان تک نہ تھا کہ "پھول" کی معرفت میرا آپ کا لڑکپن کا یہ رشتہ نکل آئیگا۔ لہذا ایک طرف تو اس دریافت سے خوشی ہوئی اور دوسری طرف اس بات کی خوشی کہ ڈرامے ایڈٹ کرنے کا جو جنجال اپنے سر لے بیٹھا ہوں، اس میں پرانے تعلقات کی وجہ سے سہولت کی صورتیں پیدا ہو سکینگی۔ جو خط میں نے "نوائے ادب" میں آپ کا مضمون پڑھ کر کالج کے پتے پر لکھا، اور جس کا جواب مجھے نہ مل سکا تھا، میں اس کے بعد دوسرا خط بھی لکھتا لیکن اس زمانے میں ڈاکٹر باقر پروفیسر اورینٹل کالج لاہور نے نہ جانے کیوں، یہ بتایا کہ پٹنے میں انھوں نے آپ سے کوئی نادر کتاب محض دیکھنے کے لیے حاصل کرنے کی بہت کوشش کی، مگر کسی طور کامیاب نہ ہو سکے۔ لہذا خط کتابت کے ذریعے میرا امداد طلب کرنا بے نتیجہ ہوگا۔ ان سے یہ سن کر مجھے دوبارہ خط لکھنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ رائٹرز امپوریم بمبئی کے مسافر صاحب ان گرمیوں میں لاہور آئے، تو انھوں نے ڈاکٹر باقر صاحب کی پیدا کی ہوئی غلط فہمی دور کی اور آپکے گھر کا پتہ مجھے عنایت فرمایا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ آپ کا پہلا جواب آنے کے بعد محض اتفاق سے بہت جلد ایک پارٹی میں ڈاکٹر باقر سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے اُن سے آپ کے جواب کا تذکرہ کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ وہ آپکے واقف تک نہیں۔ سمجھ میں نہیں آ سکا کہ کس کو کیا غلط فہمی اور

کیوں پیدا ہوئی!
آپ کے بچوں کی علالت کا حال معلوم ہو کر دلی افسوس ہوا۔ ٹائیفائیڈ بخار تو اکرومائی سی ٹن کے استعمال سے عموماً بہت جلد اتر جاتا ہے۔ امید ہے بچے اب تک مکمل طور پر شفا پا چکے ہونگے۔

ڈرامے کے سلسلے میں مفصل باتیں اپنے اگلے خط میں لکھونگا۔ اس وقت تو صرف اتنی فرمائش کرتا ہوں کہ ازراہ نوازش "نامۂ احسن" مجھے نقل کرا کے بھیج دیجیے۔ اس مضمون کو یہاں بہت تلاش کروایا، کئی حضرات نے "بہارستان" کے پرچے بہم پہنچانے کا وعدہ کیا لیکن اتفاق سے کسی کے یہاں بھی یہ مضمون نہ مل سکا۔ چونکہ احسن کے تمام ڈرامے ایڈٹ کر چکا ہوں اور اب ان پر صرف مقدمے لکھنے کا کام باقی ہے اس لیے اس مضمون کی شدید ضرورت ہے! اسے پڑھے بغیر مقدمے لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر حباب کے "نیرنگ قاف" کے مقدمے کی نقل بھی آپ ہی ارسال کر دیں تو بیحد احسانمند ہونگا۔ ان دنوں بعض غیر معمولی مصروفیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان سے فراغت پانے کے بعد رضوی[1] صاحب کی خدمت میں ایک مفصل خط لکھنا چاہتا ہوں۔ نقل کا کام بہت صبر آزما ہوتا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کسی طالب علم کو یہ کام اجرت پر کرنے کے لیے فرما دیں تو غالباً بہت جلد مضمون کی تمام اقساط کی نقل کر لینگے۔ . . . . . . امید ہے کہ آپ مع الخیر ہونگے۔ انشاء اللہ چند روز کے بعد جب ذرا فرصت میسر آئیگی تو اپنے ڈراما کے کام کے متعلق آپ کو ایک طویل خط لکھونگا۔ والسلام

نیاز مند سید امتیاز علی تاج

خط ۵ — ۱۴۰ ایبٹ روڈ، لاہور یکم نومبر ۶۰ء

مکرمی - تسلیم۔ گرامی نامے کا دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ سید عزیز الشفیع صاحب میرے پھوپی زاد بھائی ہیں کئی ماہ ہوئے وہ لاہور آئے تھے، تو میں نے ہمایوں کا سالگرہ نمبر اور نیل کالج میگزین کا خاص نمبر انھیں دیا تھا کہ دلی پہنچ کر آپ کی خدمت میں روانہ کر دیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ دونوں نمبر آپ کی خدمت میں پہنچ گئے، اور آپ نے رسید روانہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اب آپ کے گرامی نامے سے معلوم ہوا کہ رسالوں کا پارسل ہفتہ عشرہ قبل آپ کو ملا۔
حباب رامپوری پر آپ کا مضمون[2] میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کی نقل بھجوائیے احسانمند ہونگا۔
رونق کے دو ڈراموں کے متعلق بھی عرض کیا تھا کہ ان کی نقلیں مجھے مل جائیں تو اپنے کام میں مجھے بہت سہولت ہو جاتی۔ "خون عاشق" اور "جلسۂ پرستان" کی نقلوں کی ضرورت ہے۔ میں مجلس ترقی ادب کا ڈائرکٹر بن گیا ہوں۔ آج وہاں کی مطبوعات کی فہرست آپ کی خدمت میں بھجوا دونگا۔ . .
احسن کے ڈرامے ایڈیٹ کیے ہوئے رکھے ہیں۔ ایک "خون ناحق" میں چند مقامات پر کچھ غلطیاں اصلاح طلب

۱۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب
۲۔ میرا یہ مضمون آجکل دہلی میں شائع ہوا تھا۔

بن گئی ہیں۔ کسی اچھے نسخے کی تلاش میں ہوں، مل جائے تو فراغت پاؤں۔ لکھنؤ کے بعض احباب کو لکھا ہے کہ احسن کے حالات زندگی، ان کے عزیزوں سے دریافت کر کے لکھ بھیجیں۔ لیکن وہ ابھی تک اس طرف توجہ نہیں کر سکے۔ میں اس دوران میں آرام[1]، طالب[2]، کریم[3] وغیرہ کے ڈرامے ایڈیٹ کرنے میں مصروف ہوں۔ ڈرامے طبع ہوئے تو ضرور آپ کی خدمت میں روانہ کروں گا۔

آپ کے پاس اردو کے جو ڈرامے گجراتی حروف میں چھپے ہوئے موجود ہیں، ان میں "خورشید" تو نہیں؟ بس مجھے اپنے کام کی تکمیل میں صرف تین ڈراموں کی ضرورت رہ گئی ہے، خورشید، خون ناحق، اور طلسم پریشان، ان کی نقلیں بہم پہنچا دیں، تو بہت نوازش ہوگی۔ آپ کا سید امتیاز علی تاج

خط نمبر ۶

مجلس ترقی ادب لاہور ۲، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ۔ لاہور

مکرمی محترمی! تسلیم بحسب الارشاد مطلوبہ کتابیں آپ کی خدمت میں روانہ کر دی گئی تھیں۔ ان کی رسید نہیں آئی، مگر امید ہے کتابیں آپ کو مل چکی ہونگی!

حباب پر آپ کام شروع کر سکے یا نہیں؟ میں نے اپنے پچھلے کسی خط میں حباب کی چند غزلوں کا ذکر کیا تھا؛ وہ آپ نے طلب فرمائی تھیں۔ آج بذریعہ رجسٹری آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔ از راہ نوازش ان کی رسید ارسال فرمایئے۔ امید کہ آپ بخیریت ہونگے۔ والسلام

خاکسار سید امتیاز علی تاج (ناظم مجلس ترقی ادب، لاہور)

خط نمبر ۷ مجلس ترقی ادب لاہور۔ مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۶۲ء

مکرمی، محترمی، تسلیم۔ عجائبات پریستان کے مسودے کی رسید بھیجنے کے بعد آنجناب کا گرامی نامہ آیا تھا، اور معلوم ہو سکے گا کہ حباب کے ڈراموں پر کام کرنے کے لیے آپ وقت نکال سکے یا نہیں اور مسعود رضوی صاحب سے غزالہ دماہرو کی نقل آپ کو مل گئی یا ابھی اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ آپ کی اس طویل خاموشی سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس طرف توجہ نہیں فرما رہے ہیں۔ صورت حال سے مطلع فرمایئے کہ یکسوئی ہو۔ خدا کرے آپ تندرست ہوں۔ والسلام خاکسار سید امتیاز علی تاج

(ناظم مجلس ترقی ادب، لاہور)

خط نمبر ۸ مجلس ترقی ادب، ۲ کلب روڈ۔ لاہور ۲۹، اکتوبر ۱۹۶۲ء

محترمی سید حسن صاحب، تسلیم۔ ایک عرصے سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ میرا ڈراما کا کام جاری

[1] خان صاحب نسروانجی مہربان جی آرام [2] منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی [3] منشی کریم الدین

ہے۔ آرام، رونق اور ظریف[5] کے ڈرامے پیرس میں ہیں۔ آرام اور رونق کے تین تین ڈراموں کی دو جلدیں ہیں اور ظریف کے تین ڈراموں کی ایک جلد مفقود ہے جن میں سے اب احباب اور کریم الدین مراد رہ گئے ہیں۔ حباب کا "جشنِ کیخسرو بیین" مجھے مل چکا ہے اور اسے ترتیب دے چکا ہوں۔ "تائیدِ یزدانی" بھی ملا ہے، لیکن اس کی غزلوں کے مقطعوں میں حباب کے شاگرد غلام علی دیوانہ کا تخلص ہے۔ کیا یہ ڈراما آپ کے پاس موجود ہے کہ اس کے متعلق بعض دریافت طلب باتیں آپ کو لکھ بھیجوں؟

میں چاہتا تھا کہ حباب کے ڈرامے مرتب کرنے کی زحمت آپ کو دوں۔ غالباً اس کی درخواست بھی آپ سے کر چکا ہوں۔ لیکن جو ڈرامے اب تک مرتب کیے، اُن کے متن کی درستی اور حاشیے لکھنے اور مسودے پریس میں بھیجنے کے بعد ایسی ایسی مشکلیں پیش آئیں کہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ ان ہی مشکلات کے باعث یہ ڈرامے اب تک چھپ کر تیار نہیں ہو سکے ہیں۔ دفتر میں موجود ہوتے ہوئے یہ معاملہ اتنا طول کھینچ گیا، تو آپ کے پٹنے میں ہونے سے تو خط و کتابت میں نہ معلوم اور کتنا زیادہ صرف ہو جائے۔ ان حالات میں حباب کے دو ڈراموں کی نقلیں اگر آپ مجھے مہیا کر دیں، تو آپ کا بے حد مشکور ہوں گا۔ "جشنِ پرستان" کے دیباچے میں میں نے اس کی نقل آپ کے دستیاب ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ بعض ڈراموں کے دیباچوں میں آپ کا حوالہ دے کر آپ کے مضامین سے استفادہ بھی کیا ہے۔ ایک مجموعہ آپ کے نام معنون کرنے کی اجازت بھی چاہتا ہوں۔

امید کہ آپ بخیر ہوں گے، اور آپ کا ملازم پبلشر قابو میں ہوگا۔ والسلام

خاکسار سید امتیاز علی تاج (ناظم مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور)

خط نمبر ۹ — مجلسِ ترقیِ ادب، ۲ کلب روڈ۔ لاہور — ۱۹ جولائی ۶۷ء

مکرمی سید حسن صاحب۔ تسلیم۔ نہ معلوم آپ کو یقین آئے یا نہ آئے کہ دفتر آتا ہوں، تو اندر داخل ہوتے وقت یہ امید ہر روز ہوتی ہے کہ جو ڈاک میز پر رکھی ہوگی، اس میں آپ کا گرامی نامہ شاید آج آ گیا ہو۔ ہر روز مایوس ہوتا ہوں۔ لیکن باوجود مسلسل مایوسی کے ناامید نہیں ہوتا۔ حباب کے دو کھیلوں اور عبدالکریم مراد بریلوی کے "خداداد" کا کام اٹھا رکھا ہے۔ ادھر صحت جواب دیتی جا رہی ہے۔ پچھلے دنوں ایک شریان پھٹ گئی تھی جس کے باعث عرصے تک لیٹا رہنا پڑا۔ جو کام پھیلا رکھا ہے، چاہتا ہوں کسی طرح ختم ہو جائے۔ یہ جانتا ہوں کہ گجراتی رسم الخط کو اردو میں منتقل کرنے کا کام آپ خود ہی کر سکتے ہیں، اور آپ کچھ کم مصروف نہ ہوں گے۔ لیکن ناممکن نہ ہو تو کوئی وعدہ تو ہو۔ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں ایک شعر کہا تھا، یاد آ رہا ہے:

حشر پر ہی وعدۂ دیدار رہنے دیجیے — کچھ نہ کچھ انکار میں اقرار رہنے دیجیے۔

٥۔ حسینی میاں ظریف۔ ان کے بارے میں میرا ایک مضمون رسالہ آجکل میں چھپ چکا ہے۔

اُمید کہ آپ بخیریت ہونگے۔ والسّلام

خاکسار۔ سیّد امتیاز علی تاج

خط نمبر ۱۰ — مجلس ترقی ادب لاہور — ۱۷ مارچ ۱۹۶۷ء

جناب محترم۔ السلام علیکم۔

گرامی نامہ مورخہ ۲۔ مارچ ۱۹۶۷ء عین انتظار میں موصول ہوا۔ اس خط میں آپ کی علالت کا حال پڑھ کر دلی افسوس ہوا، اللہ کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔ آمین!

"ڈراموں کی نقول" کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ ازراہ کرم اس "ڈرامے" کی نقل پہلے تیار کرا لیجئے جو پہلے شائع ہوا ہو۔ اور نقل تیار ہو جانے کے بعد مجھے بھیج دیجیے کہ یہاں بھی کام جاری رہ سکے۔ مجھے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ آپ نے "بہاریہ" ڈراما اور اسٹیج کے موضوع پر مضامین لکھے ہیں۔ میں شکر گزار ہونگا اگر آپ ان کا مسودہ ارسال فرمائیں۔ اس کا مطالعہ دو نقطۂ نظر سے کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اگر یہ مجموعہ "مجلس" کی اسکیم میں آ سکے تو اس کی اشاعت کے لیے بورڈ سے منظوری حاصل کر دوں۔ دوسرے آپ کی اجازت اور حوالے سے اپنے کام میں اس سے استفادہ کروں۔ اُمید ہو کہ آپ مسودہ ارسال فرما کر شکر گزار ہونے کا موقع بخشیں گے۔

مجھے اب تک چلنے پھرنے کی اجازت نہیں۔ بستر پر بیٹھ کر دفتر کا کام کر لیتا ہوں۔ معالج کا خیال تھا کہ اندر کوئی شریان پھٹ گئی ہے! لیٹے رہنے سے نیچر خود بخود اس کی مرمت کر دیگی۔ اب پرسوں ای سی جی بنیگا اور معلوم ہوگا کہ چلنے پھرنے کی اجازت ملتی ہے یا نہیں۔ امید ہے آپ بخیریت ہونگے۔ والسلام

خاکسار سید امتیاز علی تاج (ناظم مجلس ترقی ادب، لاہور)

خط نمبر ۱۱ — مجلس ترقی ادب لاہور ۲۹ جون ۱۹۶۷ء

محب گرامی قدر سیّد صاحب: سلام و تسلیمات

نوازش نامہ مل گیا تھا، یاد آوری کا شکریہ۔ آپ نے "مجلس" کی کتابیں پسند فرمائیں، مجھے اپنی محنت کی اس سے بڑی داد اور کیا مل سکتی ہے! اردو کے ڈراموں کے بعض دیباچوں میں میں نے آپکا حوالہ دیا ہے اور آپ کی تحریروں سے استفادے کا اعتراف کیا ہے۔ چار جلدیں مکمل ہو چکی ہیں، چھپائی اور جلد سازی کے معمولی کام کی تکمیل کے بعد دفتر میں آ جائینگی۔ سب سے پہلے انھیں آپ کی خدمت میں بھیجونگا۔

حزیں[1] صاحب کو کئی مرتبہ شرمسار کیا جا چکا ہے۔ وہ آپ کو براہ راست خط لکھنے کا وعدہ فرماتے ہیں۔ سوائے اظہار ندامت کے ان کے پاس اور کوئی الفاظ نہیں۔ "صحیفے" کا مطلوبہ شمارہ بھیجا جا رہا ہے۔ مدیر صاحب کو آپ کا پتا دے کر آپ کے نام اعزازی پرچہ جاری کرا دوں گا۔ نائب[2] نقوی صاحب تا حال لاہور نہیں پہنچے ہیں۔ مجھے خود بڑی بیتابی سے ان کا انتظار ہے۔

سید صاحب! ایک زحمت دے رہا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ پہلے ہی آپ کی دوستانہ عنایات سے گراں بار ہوں، لیکن کیا کیا جائے! ڈرامے کا ذوق اور انہماک بار بار دوستوں سے رجوع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

الف خاں حباب کا کھیل "سیر پرستان" میرے پاس موجود ہے۔ وہ اس قدر غلط چھپا ہوا ہے کہ تصحیح قیاسی بھی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ آخر مرتب کے اختیارات کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ اس کا مقابلتہً بہتر ایڈیشن حاصل کرنے کے لیے نقوی صاحب کو خط لکھ رہا ہوں۔ لیکن آپ کے مضمون میں اس کے ایک کھیل "تنبیہ الغرور" کا حوالہ نظر سے گزر چکا ہے، جو آپ کے پاس ہو۔ اگر آپ مجھے اس کھیل کی نقل بھی مرحمت فرما دیں تو حباب کی یہ جلد بڑی عمدگی سے مرتب ہو جاتی ہے۔ اس نوازش کا پیشگی شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ عبدالکریم مراد کے ان دو کھیلوں میں سے کسی ایک کی تلاش بھی شدت سے جاری ہے۔ (۱) غنچۂ عشق عرف گل بکاؤلی (اس میں کچھ اوراق کم ہیں) یا (۲) خداداد"۔ ان کے علاوہ پارکھ کے کھیل "سلیمانی شمشیر" کو تلاش کر رہا ہوں۔ جسے بالی والا انگلستان لے گئے تھے۔ یہ سب چیزیں مہیا ہو جائیں تو متقدمین کے متعلق کام میری مرضی کے مطابق ختم ہو جاتا ہے۔ متاخرین کے ڈراموں کی فراہمی اور تصحیح و ترتیب، میرے خیال میں مقابلتہً آسان ہو گی۔ ان سب چیزوں کے بارے میں خوشخبری کا منتظر ہوں۔ خدا کرے، مزاج گرامی بخیریت ہو۔ والسلام

خاکسار

سید امتیاز علی تاج

(ناظم مجلس ترقی ادب، لاہور)

(آگے دیکھیے ص ۶۰)

۱۔ معین حزیں صاحب　　۲۔ جناب نائب حسین نقوی

ضیاء الدین احمد ڈیسائی

ہندستان کے عہدِ اسلامی کے سکّے

(سلطنتِ دہلی)

بنی نوعِ انسان کی تاریخ میں سکّوں کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ معاشرے میں، لین دین کا رواج قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے لیکن ابتدا میں جب کوئی شخص یا اس کا کنبہ اور خاندان اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے کسی اور کا دست نگر نہیں تھا، اسے لین دین کے طور طریقوں سے سابقہ پڑنے کا کوئی سوال ہی درپیش نہیں تھا۔ مگر ابنائے آدم کی روز افزوں ترقی نے ان کو مختلف وجوہات مثلاً نسل، رنگ، ملک وغیرہ کی بنا پر کنبوں، قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کر دیا۔ طبعی اور فطری مناسبتوں نے لوگوں کو مختلف پیشوں، متنوع صنعتوں اور اشغال سے مخصوص کر لیا۔ روزمرہ کے رہن سہن میں بھی تبدیلی آئی۔ طور طریقے بدل گئے اور اس طرح انسان کے حوائجِ ضروری میں اضافہ ہوتا چلا گیا، تو نتیجتاً کسی شخص یا اس کے خاندان کو پہلی سی یکسوئی اور دوسروں سے بے نیازی قائم نہ رہ سکی۔ اب وہ اپنی تمام ضروریات میں خود کفیل نہیں رہ سکتا تھا، جیسا کہ ابتدا میں تھا۔ گویا انسانوں کا کسی نہ کسی چیز کے لیے ایک دوسرے کا محتاج ہونا ضروری ہو گیا۔

معاشرے کی تشکیل کے ساتھ ہی ایسے تقاضے پیدا ہوئے، جن کے پورا کرنے کے لیے انسان کو ضروری قدم اٹھانا پڑا۔ اس طرح لین دین کا معاملہ وجود میں آیا، جو

ایک عرصہ دراز تک اشیا کے مبادلے کی صورت میں ہوتا رہا؛ یعنی جس کے پاس جو چیز غیر ضروری یا فاضل تھی، اس نے اسے دوسرے سے اپنی ضرورت کی چیز سے بدل لیا لیکن اس طریقے کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اس سے لین دین میں وسعت نہیں پیدا ہو سکتی تھی جو معاشرے کے پھیلاؤ یا انسانی کارگذاریوں کی افزائش یا قوموں کے جغرافیائی حدود سے آزاد ہوتے جانے سے پیدا شدہ تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس لیے تہذیب و تمدن نے جوں جوں انسانی زندگی کو مختلف سمتوں میں وسعت دی، ویسے ہی لین دین میں سہولت اور آسانی پیدا کرنے کے لیے ان کو مختلف طریقے وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی، جس سے بڑے معاملے آسانی سے بروقت طے ہو سکیں۔ "مبادلہ" کی اشیاء کی مقدار زیادہ ہونے کی صورت میں لین دین کا معاملہ ہو نہیں سکتا۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لیے لوگ آپس میں کسی ایسی شے یا اشیا پر متفق ہو گئے، جو نقل و حرکت، حجم، قیمت، افادیت، دیرپائی وغیرہ کے لحاظ سے اس کام کے لیے زیادہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہوں، اور اُن کے ذریعہ سے لین دین کے طے ہونے میں آسانی ہو۔ مثال کے طور پر قدیم ہندستان میں ویدک زمانے میں گائے کو "مبادلہ" کا واحد ذریعہ قرار دیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک چیز کو دوسری پر درجہ بدرجہ ترجیح دی جاتی رہی اور اس طرح بالآخر قیمت کی بنیاد اکائی کی تعیین عمل میں آئی، اور آخر کار ہر دھات یا جنس کے چھوٹے ٹکڑوں کو ایک گونہ عرفی حیثیت دی گئی، تاکہ وہ اس مقصد کی تکمیل میں کامیاب ہوں، جس کے لیے ان کا انتخاب ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر دھات کے ٹکڑے مسکوک و مضروب ہو کر سکوں کے عرفی نام سے مشہور ہوئے۔

سکوں کی اختراع اور ان کے رواج سے ہر قسم کے لین دین، خاص کر تجارتی معاملات میں بہت آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ چونکہ اس ذریعے کی اہمیت کے پیش نظر اس کے غلط استعمال کا امکان تھا، اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا تھا کہ ان کا اجراء قوم یا ملک کے سردار یا شاہ کی تحویل میں رہے۔ یہی خاص وجہ تھی کہ مسلمان حکمرانوں کے نزدیک سکے مزید امتیاز کے حامل قرار پائے اور خطبہ کے ساتھ ان کو بھی شاہانہ سطوت اور

ہندستانی عہدِ اسلامی کے سکے

ادارت سلطنت کا مابہ الامتیاز بنایا گیا، بالفاظِ دیگر یہ وہ منصب رفیع تصور کیا گیا۔ جس میں کوئی بادشاہ یا حکمران کسی اور کو حتیٰ کہ اپنے بیٹے یا بھائی کو بھی کسی قیمت پر شریک کرنا پسند نہیں کرتا تھا، بظاہر تو یہ ادعائے انا و لا غیری کی مثال ہے، لیکن اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ سلطنت کے کاروبار میں جس کا سارا دار و مدار آمدنی یعنی چلن پر ہو، اس میں معمولی سی رخصت یا ڈھیل بھی سارے نظام کی ابتری کا باعث بن سکتی ہے۔

مسلمانوں کی ہندستان میں آمد یا یوں کہیے کہ ان کے سیاسی نفوذ اور ان کی یہاں حکومت کی تشکیل کے بعد مقامی سکوں میں بہت نمایاں تبدیلی ہوئی، جو ان کے مذہبی یا سیاسی عقائد کی مرہونِ منت تھی۔ ان کے آنے سے قبل مقامی سکوں میں مذہبی یا شخصی تصاویر کا التزام تھا۔ لیکن عقائد کی پابندی کی وجہ سے یہ بات اسلامی بادشاہوں کے سکوں میں ممکن نہیں تھی۔ اس لیے تصویر کی جگہ تحریر، خاص کر کلمہ یا اسی قسم کی مذہبی عبارت نے لے لی۔ پھر جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، چلن یا زرِ مبادل کے علاوہ سکوں میں جو سیاسی پہلو مضمر تھا، اس کے پیشِ نظر بھی سکوں کے اجرا کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ تخت نشینی کے بعد پہلا شاہی حکم یا قدم نئے بادشاہ کے نام خطبہ جاری کرانے اور سکہ صادر کرنے کا تھا اسی طرح کسی ملک کی فتح بھی سکوں کے اجراء کی تقریب بن جاتی تھی۔ غرض بادشاہی اقتدار اور مطلق العنانی کی شہادت مہیا کرنے والے ان سکوں پر دوسرے اسلامی ممالک کے سکوں کی مانند مذہبی کلمات کے علاوہ بادشاہ کا نام بھی کندہ شدہ عبارت کا لازمی جز و تھا۔ نام کے ساتھ عموماً اس کا شاہی لقب اور کنیت، اعزازی القاب کے ساتھ یا ان کے بغیر بھی شاملِ عبارت ہوتا تھا۔ دوسرے تقریباً لازمی اجزا دار الضرب اور سکہ جاری کرنے کے سال (ہجری) کی نشاندہی کرتے تھے۔ مذہبی عبارات کلمۂ شریفہ (عموماً کلمۂ توحید)، کبھی اس کے ساتھ خلفائے راشدین کے اسمائے مبارک اور ان کی صفات مخصوصہ ظاہر کرنے والی عبارت (مثلاً صدق ابی بکرؓ و عدل عمرؓ و آزرم عثمانؓ و علم علیؓ) یا صرف اسمائے یا صفات ابی بکرؓ

صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان عفانؓ، علی مرتضیٰ، یا کبھی کبھی قرآن شریف کی آیتیں کوئی حدیث وغیرہ پر مشتمل ہوتی تھیں۔ تصویر کی جگہ اس عبارت والے رُخ کو باصطلاح سکہ شناساں "آب ورس" یعنی سامنے کا رخ اور دوسری طرف کو "ری ورس" یا کہتے ہیں۔ اس پشت پر بقیہ عبارات مرتسم ہوا کرتی تھیں۔ مذہبی عبارت کی عدم میں بادشاہ کے نام، کنیت، لقب وغیرہ والی عبارت سکے کے سامنے رُخ پر ہوا تھی۔

پیشتر اس کے کہ نفسِ مضمون یعنی ہندستان کے سلاطین ترک و افاغنہ کے سکوں کا مختصر کیا جائے، نامناسب نہ ہوگا۔ اگر یہاں سکہ شناسی کی ایک اور اصطلاح یعنی "سکے کی کی وضاحت پیش کر دی جائے۔ اس اصطلاح کا اُردو ترجمہ اس مضمون میں لفظ "قسم" استعمال کیا گیا ہے۔ "قسم" سے مراد یہ ہے کہ کسی بادشاہ کے سکے جنس یا دھات شکل (مدوّر یا مربع)، عبارت کی ترتیب، سالِ ضرب اور اس کے اظہار کا طریقہ (لفظوں میں یا ہندسوں میں، عربی الفاظ یا فارسی میں وغیرہ) دار الضرب یا ٹکسال کا نام، انداز تحریر یا خطاطی، ٹکسال کی مخصوص علامات اور نشانات کی شکل وغیرہ کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بالکل مشابہ ہوں، تو کہا جائیگا کہ یہ ایک "قسم" کے ہیں۔ اگر ان میں سے مذکورۂ فوق خصوصیات میں سے ایک یا زائد جزو مختلف ملتا ہو تو وہ سکہ دوسری "قسم" کا کہلائیگا۔ ہاں، اگر یہ فرق معمولی یا ایک ہی جزو تک محدود ہے، تو اسے پہلی قسم کی ذیل یعنی ملتی جلتی قسم کہتے ہیں۔ بالعموم سکوں کی اس نوعیت کی تعیین میں بالترتیب دھات، عبارت اور دار الضرب سالِ ضرب اور اس کا طریقۂ اظہار، ٹکسال کے نام کی عدم موجودگی میں نشانات پر مشتمل علامات یا عبارات کی ترتیب اور خطاطی ملحوظ ہوتی ہے۔ ٹکسال کی مخصوص علامات کے یہ معنی ہیں کہ بالعموم سکوں پر اقلیدسی یا اس کی مشابہ شکلوں کے نشانات پائے جاتے ہیں، جنھیں سکہ شناس تزئینات یا ٹکسال کی علامات کے اصطلاحی الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ ان علامات کی علتِ غائی کے بارے میں وثوق کے ساتھ

کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ سکّوں کی تزئین کے لیے وضع ہوئی تھیں، لیکن دوسروں کا خیال ہے کہ یہ علامات چونکہ صرف چند ٹکسالوں ہی سے مخصوص ہیں، اس لیے وہ جعلی طور پر سکّہ زدگی کی روک تھام کے لیے ایجاد کی گئی تھیں، اور ان علامات کا پتہ کسی کو سوائے دارالضرب کے اعلیٰ افسروں کے کسی کو نہیں ہوتا تھا۔ لیکن قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں تو یہ علامت غالباً تزئین ہی کے لیے ہوگی، لیکن بعد میں ٹکسالوں کے ساتھ ان کے اختصاص کی مذکورہ بالا یا کسی اور وجہ سے یہ صورت بھی پیدا ہو گئی ہوگی۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے آخری چند تاجداروں کے زمانہ میں جو خود مختار و نیم خود مختار حکومتیں ملک کے طول و ارض میں وجود میں آ گئی تھیں، اُن کے ان سکّوں کی تعیین جن پر دارالضرب کا نام مرتسم نہیں ہوتا تھا، اور وہ سلاطینِ مغلیہ کے نام سے مسکوک ہوتے تھے۔ بڑی حد تک ان علامات ہی کے ذریعے سے ممکن ہو سکی ہے۔

اس تمہید کے آخر میں ایک اور بات کی طرف بھی توجّہ دلا دوں۔ تاریخی اعتبار سے سکّوں کی اپنی اہمیّت تو تھی ہی، لیکن عہدِ وسطیٰ میں تالیف شدہ تاریخی کتب کی موجودگی میں اس عہد کے سکّوں کی وہ قدر و قیمت نہیں ہو سکتی، جو چند قدیم کے سکّوں کی ہے۔ یہی حال کتبوں کا بھی ہے۔ لیکن عہدِ وسطیٰ کے کتبوں کے مقابلے میں بھی سکّوں کی عبارت وغیرہ جگہ اور موضوع کے لحاظ سے محدود اور مختصر ہونے کے باوجود تاریخی حالات پر زیادہ روشنی ڈال سکتے ہیں تاہم ان کی قدامت اور دیگر وجوہ کی بنا پر ان کی اہمیّت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ سکّوں کی اہمیّت کے فرقِ مراتب کا مدار سب سے پہلے تو ان کی جنس پر ہے، جو ان کی مالی قیمت پر دال ہو دوسرے، ان کی یا ان کی مختلف قسموں میں ایک قسم یا ملتی جلتی قسم کے سکّوں کی فراوانی یا کمیابی یا ندرت یا نایابی پر ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی بادشاہ کا کسی جنس میں آج تک کوئی سکّہ نہ ملا ہو، اور اب ملے، تو یہ نہایت ہی اہم تصوّر

کیا جائیگا یا اگر اس جنس میں اس کا سکہ موجود ہے، لیکن دریافت شدہ سکہ قسم کے لحاظ سے مختلف ہے یا کچھ نئی معلومات کا حامل ہے تو اس کی بھی اس لحاظ سے اہمیت ہوگی۔ اسی طرح کسی نئی ٹکسال کا سکہ ملے، یا کسی معلوم شدہ دار الضرب کے صادر شدہ سکوں میں کسی نئے سال کا سکہ مل جائے، تو اگرچہ یہ دوسری باتوں میں پہلے دستیاب شدہ یا معلوم سکوں کے مشابہ ہو، تاہم اس کی اہمیت ہوگی۔

اس تمہید کے بعد ذیل میں ہندستان کے قبل از عہد مغل کے سکوں کا ایک مختصر جائزہ لیا جاتا ہے جو امید ہے کہ اردو زبان کے قارئین کے لیے مفید ہوگا۔

یوں تو برصغیر سرزمین مسلمانوں کی آمد اور قیام بخصوص سواحلی علاقوں میں قرن اول ہجری (مطابق ساتویں صدی عیسوی) میں آباد ہونا مختلف قرائن اور شواہد سے ثابت ہوتا ہے، لیکن بخلاف تعمیرات یا کتبہ جات کے (گو یہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہے، لیکن ان کا وجود تھا یا ہو سکتا تھا)، اس دور میں اسلامی سکوں کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ سکہ اور حکومت لازم و ملزوم ہیں۔ سرزمین سندھ پر اسلامی سکے سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی کی فتح سندھ (۷۱۲ء) کے بعد رائج ہوئے۔ لیکن سندھ کے حکام کے جاری کردہ ان سکوں کو جو آج تک نواح سندھ اور راجستھان کے بعض مقامات میں دستیاب ہوتے رہتے ہیں، ہندستان کے اسلامی سکوں کے سلسلے کی کڑی شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ چاندی کے یہ چھوٹے اور وزن میں ہلکے سکے سندھ کے کسی مستقل اسلامی حکمران سے منسوب نہیں، بلکہ خلفائے بنی امیہ کے نام سے جاری کیے گئے تھے۔ اس لیے عرب حکام کے جاری کردہ یہ سکے ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

ہندستان میں اسلامی سکوں کی تاریخ کی ابتدا سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ حملے ۱۰۰۱ء سے ۱۰۲۱ء تک کے درمیان ہندستان کے دور و نزدیک مقامات یا علاقوں پر ہوئے، غزنویوں کی مستقل حکومت ہندستان کے شمالی مغربی علاقے ہی تک محدود رہی جس میں موجودہ پنجاب اور ہریانہ

ریاستوں کا کچھ حصہ شامل تھا۔ اس لیے ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو سلطان محمود کے سکے بھی سندھ کے عرب حکام کے مروجہ سکوں کی طرح اس موضوع سے خارج ہیں۔ لیکن محمود کے سکوں میں کچھ سکے ایسے ہیں جنھیں اس سلسلے کی کڑی ماننے بغیر چارہ نہیں کیونکہ یہ سکے بصراحت ممالکِ ہند کے مقبوضہ علاقوں یا مفتوحہ شہروں میں یا ان کے استعمال کے لیے ڈھالے گئے یا جاری کیے گئے تھے۔ مثلاً محمود نے ۳۹۰ھ مطابق ۱۰۰۰ء میں، طلائی سکوں کی ایک قسم جاری کی، جس کے سامنے کے رُخ پر کلمۂ توحید اور عباسی خلیفہ القادر باللہ امیرالمومنین کا نام ہے، اور پشت پر جو عبارت ہے، اس میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ دینار سالِ مذکور میں ملک ہند کے خلاف جہاد کے دوران مفتوح شدہ شہروں کے لیے جاری ہوا۔ اسی طرح محمود ہی کے کچھ نقرئی سکے (دراہیم) دستیاب ہوئے ہیں، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے سکہ شناسوں کے نزدیک بے انتہا اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ سکے ۴۱۸ - ۴۱۹ھ (۱۰۲۸ء) میں جاری کیے گئے تھے۔ ان کے سامنے رخ پر بسملہ، کلمۂ توحید، محمود کے القاب یمین الدولہ و یمین الملتہ اور یہ عبارت کہ یہ درہم ۴۱۸ھ (یا ۴۱۹ھ) میں محمود پور میں مضروب ہوا، بخطِ کوفی مرتسم ہے۔ اور پشت پر اس تمام عبارت کا سنسکرت ترجمہ بخطِ ناگری مرتسم ہے۔ یعنی درمیان میں سلطان کا نام (نرپتی محمود)، کلمہ کا آزاد ترجمہ (اَویکتمیکم محمدٌ اوتارُ) اور اردگرد حاشیہ میں (ایَم ٹنکم هَتَ مَحْمُودپور سَمْوَت ۴۱۸ یا، اَیَم ٹنکم مَحْمُودپور گھٹیت تاجیکیر سموتنہ ۴۱۸ یا ۴۱۹) یعنی یہ ٹنکہ محمود پور مقام میں (تاجک سنہ) ۴۱۸ یا ۴۱۹ میں ضرب کیا گیا۔

خاندانِ غزنوی کے آخری تاجداروں کی سلاطینِ غور کے ہاتھوں شکست پر وہ اپنی سلطنت اور پایۂ تخت کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور انھوں نے اپنے مغربی علاقوں میں پناہ لی۔ اس کے بعد وہ چند سے لاہور سے اس محدود علاقے پر حکومت کرتے رہے۔ انھوں نے جو سکے یہاں سے جاری کیے، وہ چھوٹے اور تانبے میں چاندی کی

آمیزش والی دھات کے جیسے جسے انگریزی میں "بلّون" کہتے ہیں بنے ہوئے ہیں۔ ان سکّوں کے سامنے کے رُخ پر مقامی ہندو بادشاہوں کے سکّوں کی تقلید میں اسپ سوار اور پشت پر اہلِ ہنود کے دیوتا شیو کے نندی بیل کی تصویر مرتسم ہے۔ ان پر بادشاہ کا نام اور لقب وغیرہ بخطِ کوفی مسکوک ہے۔ نندی یا بیل کی تصویر کے ساتھ مقامی ہندو راجہ سامنت دیو کا نام بھی دیوناگری رسم الخط میں مرتسم ہے۔ لاہور سے جن سلاطینِ غزنہ کے سکّے جاری کیے گئے، وہ فرخزاد (۱۰۵۲ - ۱۰۵۹ء)، ابراہیم (۱۰۵۹ - ۱۰۹۹ء)، بہرام شاہ (۱۱۱۸ - ۱۱۵۲ء) اور خسرو ملک (۱۱۶۰ - ۱۱۸۷ء) ہیں؛ موخر الذکر اس خاندان کا آخری فرمانروا ہے جس کی حکومت کا خاتمہ بادشاہ غور غیاث الدین بن سام کے بھائی اور جرنیل معز الدین محمد بن سام کے ہاتھوں ہوا۔

لیکن در اصل شاہانِ ہند کے سکّوں کی تاریخ کی ابتدا اس فیصلہ کن جنگ کے بعد شروع ہوتی ہے، جو ۱۱۹۳ء میں پرتھوی راج چوہان اور محمد بن سام کے درمیان میدان نرائن میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں غوریوں کی فتح کے بعد کچھ سال تک تو ملک سلاطینِ غور کے ماتحت رہا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ۱۲۰۶ء میں محمد بن سام کی وفات کے بعد اس کے گورنر قطب الدین ایبک نے ہندستان میں اسلامی سلطنت کی داغ بیل ڈالی، جس کا پایۂ تخت دہلی تھا۔ یہ سلطنت رفتہ رفتہ ملک کے بیشتر حصّے پر محیط ہو گئی اور مختلف خاندانوں میں منتقل ہوتی ہوئی بالآخر گزشتہ صدی کے وسط میں ختم ہوئی۔

ان مسلمان بادشاہوں کے ابتدائی دور کے سکّے کم و بیش مقامی ہندو راجاؤں کے سکّوں کی نقل تھے۔ نہ صرف ان میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں کی گئی، بلکہ بیل، اسپ سوار اور ہندوؤں کی دیوی لکشمی کی تصویروں کو بھی جوں کا توں بحال رکھا گیا۔ حتی کہ بادشاہوں کے نام اور خطاب بھی کچھ عرصے تک ناگری رسم الخط میں مرتسم ہوتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان سکّوں کی ہیئتِ مجموعی میں نمایاں تبدیلی رونما ہو گئی۔ تعداد

ترک ہو گئیں اور ان کے بجائے سکوں کے دونوں طرف کلمہ وغیرہ مذہبی عبارت بادشاہوں کے نام اور القاب، سنۂ ضرب اور کہیں کہیں دار الضرب کا نام وغیرہ مرتسم ہونے لگے۔ بالکل ابتدا میں عربی عبارت خطِ کوفی میں اور بعد میں خطِ نسخ میں لکھی جانے لگی، خطِ نستعلیق کا رواج اکبر کے عہد سے شروع ہوا۔

سلاطینِ دہلی کے سکے بحیثیت مجموعی تین بڑی شقوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں:
(۱) طلا اور نقرہ کے ہم وزن سکے جو تنکہ (ٹنکہ) کہلاتے تھے (طلائی تنکے کے لیے دینار اور نقرئی کے لیے درہم بھی مستعمل تھا)۔ ان کا وزن ۹۶ رتی (= ۱۷۲ء۸ گرین) کے تولہ کا تھا۔ (۲) مرکب دھات (بلون) کے سکے، جو قیمت میں کم تھے اور مقامی "دہلی وال" سکوں کے مرادف تھے۔ یہ "گانی" بھی کہلاتے تھے اور دو گانی، چار گانی چھ گانی، آٹھ گانی، سولہ گانی اور ۲۴ گانی کے سکے ہوا کرتے تھے۔ (۳) ۴۸ (یا ۵۰ یا ۶۰) جتیل قیمت میں ایک تنکۂ سیم (= روپیا) کے برابر ہوا کرتا تھا۔
(۴) سیم اور زر کی قیمتوں کا تناسب کم و بیش دس اور ایک (۱ : ۱۰) اور تانبے اور چاندی کا تناسب عہد غلاماں میں (۱ : ۸۰) تھا۔ اس تناسب میں وقتاً فوقتاً سیاسی اور اقتصادی حالات یا سیم و زر کی افراط یا کمیابی اور ایسے ہی دیگر وجوہ کی بنا پر فرق ہوتا رہا۔

الغرض سلاطینِ ہند کے سکے چار دھاتوں یعنی سونا، چاندی، تانبہ اور مرکب دھات (بلون) میں مسکوک ہوئے۔ شیر شاہ سوری (۹۴۵ - ۹۵۲ھ / ۱۵۳۸ - ۱۵۴۵ء) نے سکوں کے لیے مرکب دھات کے استعمال کو ختم کر دیا اور اس کے بعد آخر تک اس دھات میں سکہ بنانا بند ہو گیا۔ ان سکوں پر کہیں ان کی قیمت درج کرنے کا التزام نہیں کیا گیا؛ بلکہ اکثریت ان سکوں کی ہے، جن پر قیمت کی کسی قسم کی صراحت نہیں ملتی ہے۔ اگر کچھ صراحت ہے تو اس حد تک کہ ان کو یا تو سکہ یا دینار یا درہم یا تنکہ جیسے سکوں کی نوعیت، نہ کہ قیمت جتانے والے ناموں سے یاد کیا گیا ہے؛ وہ بھی ضرب هٰذه السکة بحضرة دہلی فی سنة فلان یا ضرب هٰذا الدینار فی شهور سنة فلان

وغیرہ جیسی عبارتوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ بالعموم ان سکّوں کے وزن اور سائز کے قرائن سے ان کی قیمت معلوم کی جاتی تھی ۔ ان حالات میں البتہ عوام کالانعام اور سادہ لوح لوگوں کو مشکل پیش آتی ہوگی (لیکن یہ دشواری تو آج کے اس مہذب دور میں بھی پوری صراحت کے باوجود ان پڑھ اور دیہاتی لوگوں کو پیش آتی ہے) مثلاً "عدلی" اور "الدینار الخلیفتی" بھی ملتے ہیں، جو نوعیت کے مظہر ہیں، قیمت کے نہیں، گو ان سکّوں کی قیمت عام طور پر اس زمانے کے لوگوں کو معلوم ہوگی، البتہ اسی سلطان کے علامتی (TOKEN) یا جبری (FORCED) سکّوں پر ان کی قیمت کے اندراج کا التزام ضروری تھا (جیسا کہ آج کل ہلکی دھات کے سکّوں یا کاغذی نوٹوں (زرِ کاغذ) پر قیمت کی صراحت کی جاتی ہے) چنانچہ اس قسم کے دریافت شدہ سکّوں میں تنکہ رائج، نصفی، درہم شرعی، پنجاہ گانی، ہشت گانی، دوگانی وغیرہ نام ملتے ہیں ۔ ابتدا میں (ماقبل مغل عہد) سکّوں پر دارالضرب کی صراحت یا تزئینات یا ٹکسال کی علامات کا بھی پابندی سے التزام نہیں تھا ۔ لیکن رفتہ رفتہ ان چیزوں کا اہتمام ہوتا گیا ۔ بہرحال سلاطینِ سُور کے ہاں مکمل طور پر اس کا التزام تھا، جو بعد میں مغل بادشاہوں کے سکّوں میں بھی جاری رہا ۔

محمد بن سام (۵۸۹ ۔ ۶۰۲ھ / ۱۱۹۳ ۔ ۱۲۰۶ء)

سلطان معز الدین ابوالمظفر محمد بن سام اور اس کے فوری جانشینوں محمود بن محمد (۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء) اور تاج الدین ابوالفتح یلدوز (تقریباً ۱۲۰۶ء) کے عہدِ حکومت میں عام چلن ۳۲ رتی (۲ء۵۷ گرین) وزن کے ملّون کے بنے ہوئے چھوٹے سکّوں کا تھا، یہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا "دِلی وال" کہلاتے تھے، ان کی تین بڑی قسمیں ہیں (۱) وہ جو بادشاہِ وقت کے نام کے ساتھ بیل اور گھوڑ سوار کی تصویروں کے حامل ہیں، ان سکّوں میں بادشاہ کا نام بخطِ ناگری مرتسم ہے ۔ (۲) ان میں بیل اور سوار کی تصویر کے ساتھ بادشاہ کا نام اور القاب عربی رسم الخط میں تحریر ہے ۔ (۳) ان کے سامنے

رخ پر بادشاہ کا نام اور پشت پر القاب وغیرہ صرف عربی خط میں دیے گئے ہیں۔
محمود محمد بن سام کے طلائی سکوں کی ایک قسم میں سامنے کے رُخ پر لکشمی کی تصویر اور دائے
رُخ پر سلطان اور اس کے والد کا نام "سری محمد بن سام" ناگری حروف میں لکھا
ہے، اس قسم کے دریافت شدہ سکے ۳۲ رتی سے کچھ زیادہ یعنی ۶۶ گرین یا اس سے ذرا
کم وزن کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قیمت میں ایک تہائی دینار یا اشرفی کے
برابر ہونگے۔ ان سکوں کا وزن، ہیئت، ساخت وغیرہ اس بات کی مظہر ہیں کہ یہ
قنوج اور مہوبہ کی ہندو حکومتوں میں رائج سکوں کی نقل تھے۔ دوسرے طلائی سکوں پر اس کا پورا نام
بخطِ عربی درج ہیں، اور پشت پر گرز یا نیزہ لیے ہوئے حملہ آوری کی حالت میں
ترک سوار کی تصویر اور اس کے نیچے سکے کے ضرب کا سال عربی لفظوں میں، اور بادشاہ
کا نام ناگری رسم الخط میں مرتسم ہیں۔ اس سکے میں سنہ کے ساتھ مہینا اور دن ۔
(الستہ عشرہ رمضان سنہ احدی وستمائۃ) درج ہے، جو غیر معہود ہے۔
اس سلطان کا ہندستان میں کوئی ضرب شدہ نقرئی سکہ آج تک دستیاب نہیں ہوا
ہے۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ چاندی کی قلت کی بنا پر اس نے یہ سکے شاید جاری
نہ کیے ہوں۔ یا یہ بھی امکان ہے کہ چاندی کے سکے کم تعداد میں جاری ہوئے ہوں اور
آج تک کسی گوشۂ گمنامی میں یا صدیوں کی جمع شدہ خاک کے کسی ڈھیر کے نیچے دفن
پڑے ہوں۔ بلون دھات کے سکوں میں زیادہ تعداد ایسی ہے، جن میں سامنے رخ پر
بیل اور خطِ ناگری میں اس کا اور اس کے والد کا نام ہے، اور پشت پر اسپ سوار
کے ساتھ لفظ امیر کی سنسکرت شکل "سری ہمیر" بخطِ ناگری مرتسم ہے، گنتی کے چند سکے
ایسے ملے ہیں، جن میں سامنے اور پشت پر دو تصویروں کے بجائے رُخ یا پشت پر
دو میں سے ایک (بیل یا سوار کی) تصویر بنائی گئی اور دوسری طرف عربی رسم الخط
میں سلطان کا نام اور لقب وغیرہ کی عبارت درج ہے۔ بلون دھات کے سکوں میں
ایک قابلِ ذکر سکہ وہ ہے، جس میں سامنے رُخ پر بائیں طرف منہ کیے بیٹھے ہوئے
بیل کی تصویر اور سلطان اور اس کے والد کا نام اور پشت پر چوہان اسپ سوار اور

پرتھوی راج چوہان کا نام پایا جاتا ہے، یہ عبارتیں ناگری رسم الخط میں ہیں۔ یہ سکہ پرتھوی راج چوہان کی جنگ ترائین میں شکست کے بعد اس کی سلطان کی اطاعت قبول کرنے کا مظہر ہے۔

سلطان محمد بن سام نے تانبے کے سکے بھی جاری کیے تھے، جو وزن میں ہلکے اور سائز میں چھوٹے ہیں، ان کا وزن تقریباً ۳۵ سے لے کر ۵۰ گرین تک ہے۔ ان کی ایک قسم میں سلطان کے لقب کا ایک حصہ (معز الدنیا) سامنے رخ پر ہے اور بقیہ حصہ (والدین) پشت پر، دوسری قسم کے سکوں پر، جسے سکہ شناسوں کی اصطلاح میں "عدلی" سکے کہا جاتا ہے، "عدل معز" عبارت ہے، اس طرح کہ سامنے رخ پر لفظ عدل اور پشت پر لقب کا حصہ "معز" درج ہے۔ کچھ سکوں پر لفظ "عدلی" بھی ملتا ہے۔ اور ان کی پشت پر کھڑے ہوئے بیل کے اوپر سلطان کے نام اور اس کے والد کے نام کا کچھ حصہ ناگری خط میں ملتا ہے، ایسے کچھ سکوں پر بجائے "عدلی" کے لفظ "معزی" مرتسم ہے۔

ا۔ سلاطینِ غلامان (۶۰۲۔۶۸۹ھ/۱۲۰۶۔۱۲۹۰ء)

سلاطین غلامان میں سلطان قطب الدین ایبک (۶۰۲۔۶۰۷ھ/۱۲۰۶۔۱۲۱۰ء) طلائی اور نقرئی سکے آج تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے جاری کردہ پیتل یا تانبے کے سکے بھی کم ہی حاصل ہوئے ہیں۔ یہ سلطان محمد بن سام کے ان سکوں کے مماثل ہیں، جن کے سامنے رخ پر کھڑے بیل کی تصویر ہے، اگرچہ تصویر کے ساتھ کوئی عبارت نہیں ہے اور پشت پر مختلف اقلیدسی شکلوں کے اندر اس کے نام کی مناسبت سے لفظ قطبی مرتسم ہے۔

سلطان شمس الدنیا والدین ابو المظفر التتمش (۶۰۷۔۶۳۳ھ/۱۲۱۰۔۱۲۳۵ء) کا عہد فن تعمیر کی طرح سلاطین دہلی کے سکوں کی تاریخ میں بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، التتمش نے خاص طور پر چاندی کے تنکہ اور دیگر دھاتوں کے سکوں کے

وزن اور قیمت کی تعیین کی اس عہد سے باقاعدہ طور پر ٹکسال کا نام سکوں پر درج کرنے کا رواج شروع ہوا، جو آگے چل کر سکوں کی عبارت کا جزو لازمی بن گیا۔

التتمش کے ہر قسم کی دھات کے سکے دستیاب ہوئے ہیں، لیکن ان میں طلائی سکوں کی تعداد کم ہے۔ یہ وزن میں ہلکے یعنی عام طور پر ۶ء۷ یا ۱۷ گرین کے ہیں اور سلطان محمد بن سام کے اسپ سوار والے طلائی سکے سے ملتی جلتی قسم کے ہیں۔ ان کی عبارت میں التتمش کے نام اور دوسرے القاب کے ساتھ اس کا لقب "قطبی" بھی درج ہے۔ نیز اعزازی لقب "برہان امیر المومنین" اور کلمۂ توحید کا استعمال سرزمین ہند کے سکوں میں پہلی مرتبہ نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس التتمش کے نقرئی سکے کافی تعداد میں اور مختلف قسموں کے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں نصف تنکے بھی شامل ہیں، جن کا وزن ۴ء۸۲ گرین ہے۔ اس کے عہد کی ابتدا میں جاری شدہ سکے اس کے طلائی سکوں کے مشابہ ہیں۔ ان میں ایک کی عبارت میں التتمش کے اوپر ناگری حرف "سا" یا "سو" مرتسم ہے۔ بعد کے سکوں میں سوار کی شبیہ کو ترک کر کے کلمۂ توحید کے ساتھ عباسی خلفا یعنی الناصر لدین اللہ یا الظاہر بامر اللہ یا المستنصر باللہ کا نام اور پشت پر سلطان کا نام، لقب وغیرہ والی عبارت درج ہے، جس میں "یمین خلیفۃ اللہ بالحجۃ والبرہان" کے اعزازی لقب کا اضافہ ہے۔ المستنصر والے سکے میں ایک اور قسم ہے، جس میں سامنے رُخ پر کلمۂ توحید، خلیفہ کا نام اور دارالضرب کے نام کے علاوہ اردگرد میں قرآن شریف کی اس مشہور آیت (سورۃ صف ۶۱: آیت نمبر ۹) کا ٹکڑا (ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ) مرتسم ہے، جو محمد بن سام کے غزنہ میں مضروب سکوں پر بھی ہے۔ سکوں کی ایک اور قسم میں سامنے کے رُخ پر صرف کلمہ ہے اور پشت پر درمیان میں فی عہد الامام المستنصر اور حاشیے میں عربی الفاظ میں سنہ و ضرب درج ہے۔ خلفائے بنی عباس کے نام سے مزین یہ سکے ۶۲۶ھ میں التتمش کے معاصر عباسی خلیفہ کی جانب سے خلعت کے ساتھ پروانۂ اجازت عطا ہونے کے بعد جاری ہوئے اور عہد مابعد میں بھی یہ رسم جاری

التمش کے نقرئی سکّوں میں ایک تنکہ اور نصف تنکہ کے سکّوں کی ایک قسم ہے، جو اپنی عبارت کی نوعیت کے لحاظ سے بےنظیر ہے، اس عبارت میں ان سکّوں کو "فی بلادھنہ لہ" من خراج فتوح وکفر (؟) کےزا مروغیرہ کے ساتھ شامل عبارت ہے۔
سلطنتِ دہلی کے ابتدائی دور کے سکّوں میں التمش کے ان نقرئی تنکوں کا خاص مقام ہے، کیوں کہ یہ معیاری وزن یعنی ۹۶ رتی (۸ء۱۷۲ گرین) کے وزن کے ہیں۔
التمش کے قائم کردہ وزن کا یہ معیار سلاطینِ دہلی کے سکّوں میں کم وبیش یا معمولی فرق اور تغیر کے ساتھ شیر شاہ سوری کے زمانے تک جاری رہا۔ شکل وصورت، عبارت تحریر غرض ہیئت مجموعی کے اعتبار سے بھی سکّوں کی یہ قسمیں التمش کے جانشینوں کے زمانے میں کچھ معمولی تبدیلی کے ساتھ غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ - ۱۲۸۶ء) کے عہد تک کے سکّوں کے لیے نمونوں کا کام دیتی رہیں۔ یہاں ایک امر کی طرف توجہ مبذول کی جاتی ہے کہ التمش کے نقرئی سکّوں میں ناگری رسمِ خط کا استعمال بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔
مرکّب دھات بلّون میں اس ملک میں پہلے سے رائج "دہلی وال" سکّوں کی قسم کا تقریباً ۵۵ گرین یا اس سے کچھ کم وزن کا ایک نیا سکّہ جاری کیا گیا، جس کو کتبِ تواریخ میں "جیتل" کی جنسی ترکیب میں اور نقرہ کے تناسب میں چاندی کی مقدار کم یعنی ۳۶ گرین تھی۔ جب کہ اسی وزن کے "دہلی وال" میں یہ مقدار سات سے آٹھ گرین یعنی دوگنی یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ جیتل میں ایک طرف تو بائیں طرف منہ کر کے بیٹھے ہوئے بیل کی تصویر اور اس کے اردگرد ناگری خط میں سلطان کا لقب یا نام اور دوسری طرف چوہان راجاؤں کے سکّوں والی سوار کی تصویر اور اس کے گرد لفظ امیر کی سنسکرت شکل "سری ہمیر" مرتسم ہے۔ انھیں تصویروں کے حامل کچھ سکّوں پر صرف عبّاسی خلیفہ المستنصر باللہ کا نام یا لقب خطِ ناگری میں ملتا ہے۔ اسی قسم کے کچھ سکّے تاریخی اعتبار سے کافی اہم ہیں۔ جو التمش کے مطیع بزور نئے ہندو راجا چاہڈ دیو نے جاری

کیسے تھے۔ اس میں سامنے رُخ پر تصاویر مذکور کے ساتھ ناگری رسم الخط میں سلطان کا لقب اساوری کے ساتھ اور پشت پر دیو کا نام بھی ناگری خط ہی میں مرتسم ہے۔ ایسے ہی کچھ سکّوں میں پشت والی عبارت میں چاہڑ دیو کے نام کی جگہ لفظ "امری ہمیر" نے لے لی۔

التتمش کے مرکب دھات جیتلوں کی دوسری ممتاز قسم ان سکّوں کی ہے، جن پر بیشتر عبارت عربی رسم الخط میں ہے اور تصویر بھی دونوں طرف کی بجائے ایک ہی طرف ہے۔ ان سکّوں کے سامنے رُخ پر سلطان کا نام کچھ اعزازی القاب (مثلاً السلطان الاعظم السلطان) یا شاہی لقب اور کنیت (شمس الدنیا والدین ابو المظفر) اور پشت پر بچوہان سوار کے اردگرد ناگری میں "سری ہمیر" درج ہے۔ کچھ سکّوں پر ناگری عبارت اکثر سے مفقود ہے۔ اس قسم کے بعض سکّوں پر (ان کی تعداد بہت کم ہے) دارالضرب "دہلی" کا نام بھی ملتا ہے جو تاریخی اعتبار سے اس لیے اہم ہے کہ اس جنس کے سکّوں پر بالعموم ٹکسال کا نام نہیں پایا جاتا۔ اسی مرکب دھات کے کچھ اہم سکّے وہ ہیں، جن میں تصاویر متروک ہیں، لیکن ایک طرف عبارت مع لفظوں میں سنہ ہجری کے بخطِ عربی ملتی ہے، اور دوسری طرف سلطان کے نام وغیرہ کے ساتھ ہندسوں میں رقمی سمت، ہندسوں میں بخطِ ناگری مرتسم ہے۔ ان میں سے بھی بعض سکّوں پر ٹکسال دہلی کا نام ملتا ہے۔ ان قسموں کے علاوہ ایک قسم خالص عربی عبارت والے سکّوں کی ہے۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، ان سکّوں میں چاندی کی مقدار صرف ۲۰ و ۳۲ گرین ہوا کرتی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ۴۸ جیتل کا ایک تنکۂ نقرئی شمار ہوتا تھا نیز سطورِ بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جیتل کو "گانی" کے رکنی نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کتبِ تواریخ میں دوگانی، چہارگانی، ہشتش گانی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

التتمش کے تانبے کے سکّوں پر زیادہ تر عبارت عربی خط میں مرقوم ہے۔ زیادہ سے زیادہ

تقریباً ۴۰ رتی (۶۶ء۵ گرین) کے اور کم سے کم تقریباً ۶ رتی (۵ء۱۰ گرین) کے ہیں۔ ان میں ایک قسم ان سکوں کی ہے جن پر اگرچہ بادشاہ کا نام نہیں ملتا، لیکن ساخت، ہیئت اور دیگر قرائن کی بنا پر انھیں التتمش کے عہد کے سکوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس قسم کے سکّے عہدِ تغلق تک (۱۳۲۵-۱۴۱۴ء) تک ملتے ہیں۔ ان کے سامنے رُخ پر نقطہ دار دائرے کی شکل میں السلطان المعظم کا اعزازی لقب اور پشت پر نیسی سی زمین میں ٹکسال کا نام مرتسم ہے، اسی طرح عدلی سکّے بھی مختلف اوزان کے دستیاب ہوئے ہیں۔

ان سکوں پر بیل یا سواری کی تصاویر یا ناگری عبارتیں مفقود ہیں۔ البتّہ بطور استثناء کوئی کوئی سکّہ ملتا ہے جس کی پشت پر نزدوانے سکوں کے اسپ سوار کی شبیہ یا سلطان کا لقب ناگری حروف میں پایا جاتا ہے۔

التتمش کے جانشینوں میں یکے بعد دیگرے سلطان رکن الدنیا والدین ۱۲۳۶-۱۲۴۰ء فیروز شاہ (۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء)، سلطان جلالۃ الدنیا والدین رضیہ (۶۳۴-۶۳۷ھ، سلطان معز الدنیا والدین ابوالمظفر بہرام شاہ (۶۳۷-۶۳۹ھ/۱۲۴۰-۱۲۴۲ء) سلطان علاء الدنیا والدین ابوالمظفر مسعود شاہ (۶۳۹-۶۴۴ھ/۱۲۴۲-۱۲۴۶ء) سلطان ناصر الدنیا والدین ابوالمظفر محمود شاہ (۶۴۴-۶۶۴ھ/۱۲۴۶-۱۲۶۶ء) تخت نشین ہوئے۔ ان میں سلطان رضیہ اور مؤخر الذکر دو بادشاہوں کو چھوڑ کر اور کسی کا بھی طلائی سکّہ آج تک دستیاب نہیں ہوا یا کم از کم دستیاب ہونے کی اطلاع نہیں ملی۔ ان کے چاندی کے سکوں کی تعداد بھی کم ہے۔ یہ سکّے التتمش کے سکوں کی طرز و ہیئت کے ہیں۔ ایک اور اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ رکن الدین فیروز شاہ کے زمانے سے سکوں کی عبارت سے کلمہ حذف کر دیا گیا۔ کم از کم آج تک کلمۂ توحید کی عبارت والا اس کا اور اس کے جانشینوں کا کوئی سکّہ ہمارے علم میں نہیں آیا۔

ان بادشاہوں کے تلوں کے جیتل کی مندرجۂ ذیل ممتاز قسمیں رائج تھیں، جو التتمش کے سکوں کے نمونے پر ڈھالی گئیں، ایک وہ جن کے سامنے رُخ پر ناگری تحریر کے ساتھ

بیل یا سوار کی تصویر ہے۔ دوسری قسم میں بیل کی تصویر کی عدم موجودگی کے علاوہ عبارت کلمی عربی میں ہے، تیسری میں سامنے رخ پر زرہ پوش اسپ سوار کی شبیہ اور پشت پر عربی میں سلطان کا نام اور لقب وغیرہ مرتسم ہیں۔ ان سلاطین کا مس یعنی تانبے میں بھی کوئی سکہ دستیاب نہیں ہوا۔

سلطان رضیہ کے جاری کردہ سکوں میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اس کا ایک طلائی سکہ کچھ سال ہوئے دریافت ہوا تھا، جو منفرد ہونے کے سبب نہایت قیمتی ہے۔ اس کے جو نقرئی سکے ملے ہیں، ان میں ایک قسم ان سکوں کی ہے، جن میں صرف اس کے والد التتمش کا نام ہے۔ لیکن سال ضرب صراحتاً اس کے عہد کا ہے، اور ساتھ ہی اس کا لقب "نصرۃ امیر المومنین" بھی مرتسم ہے۔ دوسری قسم میں ملکہ کا نام اور ٹکسال (دہلی) کا نام مسکوک ہے۔ اور تیسری میں اس کا نام اور القاب ہے اور اس کے بنگال میں واقع لکھنوتی (موجودہ گوڑ۔ ضلع مالدہ) میں مسکوک ہونے کا ذکر ہے۔ یہ سب قسمیں عباسی خلیفہ المستنصر باللہ کے نام سے جاری کی گئی تھیں۔ یہ امر ایک بات قابل لحاظ ہے کہ لکھنوتی میں مضروب سکوں میں سلطان کا لقب جلالۃ الدنیا والدین ہے اور دہلی کے سکوں میں رضیۃ الدنیا والدین ہے[a]

رضیہ کے بلبن کے سکے بھی مروجہ قسم اور طرز کے ہیں یعنی سامنے رخ پر عربی خط میں سلطان کے نام اور لقب پر مشتمل عبارت اور پشت پر چوہان اسپ سوار۔ ان میں سے بعض پر اسپ کے اوپر گرد "سری ہمیر" والا لقب درج ہے۔

---

[a] سلطان رضیہ کا کوئی ایسا کتبہ نہیں ملا جس سے اس کے لقب کے مسئلے کی قطعی تحقیق ہو سکے، اس کا آج تک صرف ایک ہی کتبہ (اور وہ بھی چند سال ہوئے) ملا ہے۔ لیکن یہ نا تمام ہے اور اس کی عبارت میں لقب والا حصہ غائب ہے۔ دیکھیے "تحریر" صفحات ، لیکن دہلی کے نزدیک پالم میں دریافت شدہ غیاث الدین بلبن کے ایک سنسکرت کتبے میں اس کا لقب جلال الدین ملتا ہے جس سے سلطان رضیہ کے لقب کا جلالۃ الدنیا ہونا ثابت ہوتا ہے

(دیکھیے ایپیگرافیا انڈو مسلمیکا ۱۹۱۳-۱۹۱۴ء صفحات ۳۲، ۴۰ اور ۴۳)

سلطان رضیہ کے دستیاب شدہ تانبے کے سکوں کی تعداد بھی کم ہے، ان میں سامنے رخ پر بیل یا سوار کی شبیہہ ہے اور پشت پر رضیہ نام بخطِ عربی مسکوک ہے۔ ان میں بعض کے سامنے رخ پر بیل کی تصویر کے اوپر "سری سامنت دیو" کا نام مرتسم ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ سکہ مذکورہ ہندو راجہ نے سلطانِ دہلی کی اطاعت گزاری میں مسکوک کرا کے رائج کیا تھا۔

معز الدین بہرام شاہ بن التتمش کے نقرئی سکے بہت کم تعداد میں ملے ہیں، اور ان میں بھی کوئی نئی بات نہیں۔ دریافت شدہ سکے التتمش کے (اور رضیہ کے بھی) ان سکوں کی طرز کے ہیں، جن کی عبارت عباسی خلیفہ المستنصر کے عہد میں ان کا مسکوک ہونا ظاہر کرتی ہے۔ چاندی کے برعکس مرکب دھات بلّون کے سکوں یعنی جیتل کی کئی قسمیں دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن نوعیت کے اعتبار سے ان کی بھی کئی قسمیں دستیاب ہوئی ہیں، یہ بیل اور سوار کی تصاویر اور ناگری خط میں عبارت، یا عربی عبارت اور صرف اسپ کی شبیہہ والی قسم کے ہیں۔ ان میں بھی کسی کسی پر ٹکسال کا نام (دہلی) ملتا ہے۔ بہرام شاہ کا تانبے کا کوئی سکہ آج تک دریافت نہیں ہوا۔

بہرام شاہ کے بعد اس کے بھتیجے یعنی رکن الدین فیروز کے بیٹے سلطان علاء الدنیا والدین ابو المظفر مسعود شاہ (۶۳۹ - ۶۴۴ھ / ۱۲۴۲ - ۱۲۴۶ء) تخت نشین ہوا۔ اس کے سکے بھی اس کے پیشروؤں کے سکوں کی طرز کے ہیں، اور کسی خاص تنوع یا خصوصیت سے عاری ہیں۔ البتہ اس کا ایک طلائی سکہ ایسا ملا ہے، جو واحد بفرد ہونے کی وجہ سے بیش قیمت ہے اگرچہ ساخت ہیئت، عبارت، وغیرہ کے اعتبار سے اس کے نقرئی سکوں ہی کے مشابہ ہے۔ اس کا وزن ۱۶۶ء۴ گرین ہے، یعنی ایک تولہ سے کچھ کم یہ بھی اس کے نقرئی سکوں کی طرح جن کا وزن ۱۶۳ سے ۱۶۹ گرین ہے، عباسی خلیفہ المستنصر کے عہد میں مضروب ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس طرح مسعود شاہ کے بلّون کے سکوں کی ہیئت مجموعی التتمش کے جیتل سے مشابہ ہے۔ لیکن جنس کی ترکیب میں چاندی کا جو تناسب التتمش کے عہد میں مقرر ہوا تھا، وہ ملحوظ نہیں رہا۔ بالفاظِ دیگر ان میں ۴ء۳ گرین کی بجائے صرف ۲۱ء۲ گرین چاندی پائی گئی ہے۔ اس صورت میں سکوں کی ظاہری اور چلنی قیمت تو بیشک برقرار رہی، لیکن اس کی جنسی یا اصلی قیمت ضرور کم ہوگئی۔ سکوں کی خرابی کی جانب گویا یہ پہلا قدم تھا۔

مسعود شاہ کے جیتل سے کم قیمت کے یعنی تانبے کے کسی سکے کے دریافت ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔

سلطان ناصر الدنیا والدین ابو المظفر محمود بن التتمش نے طویل مدت یعنی ۶۴۴ - ۶۶۴ھ / ۱۲۴۶ء
۱۲۶۶ء) تک حکمرانی کی۔ لیکن اس کے بہت کم طلائی سکّے ملے ہیں۔ یہ بھی اس کے نقرئی سکوں
کے مماثل ہیں یعنی ہیئت، عبارت اور اس کی تنظیم، وزن وغیرہ کے اعتبار سے بالکل ان سے ملتے
ہیں۔ اس کے نقرئی سکوں میں نصف تنکہ (نصف روپیہ) کا جز وی سکہ بھی رائج ہوا تھا۔ اس
سے پہلے کا کوئی اس قیمت کا سکہ ہمارے علم میں نہیں آیا۔ اس کے طلائی اور نقرئی سکوں کی عبارت
وہی المستنصر کے عہد والی ہے جو اس کے پیشرو اور بھتیجے سعود شاہ کے سکوں پر ملتی ہے۔ کچھ سکوں میں
المستعصم باللہ کے عہد کا حوالہ بھی ہے۔

ناصر الدنیا کے طلائی سکوں میں ایک پر دار الضرب (دہلی) کا نام ملتا ہے، جب کہ نقرئی سکے دہلی
کے علاوہ بداؤن اور لکھنوتی میں مضروب ہوئے تھے۔

اس بادشاہ کے بلّون کے سکوں میں بھی کوئی امتیازی خوبی نہیں۔ لیکن چاندی کی طرح اس دھات
میں بھی نصف جز یعنی نصف جیتل کے سکے دریافت ہوئے ہیں، گو ان کی تعداد کم ہے۔ ایک
جیتل کے سکوں میں چاندی کی مقدار تین سے لے کر ۳ گرین ہے یعنی جیتل کی جنسی قیمت از سر نو
اس کی اصلی قیمت کے جو التتمش کے زمانے میں قرار پائی تھی، تقریباً برابر ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس
سے اس سکے کے چلن میں لوگوں کا اعتبار بڑھا ہوگا۔

اس کے تانبے کے سکے بھی کم ملتے ہیں۔ دستیاب شدہ سکوں میں بیل یا اسپ سوار کی شبیہ یا
ناگری حروف کی عبارت والا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے، ان سکوں میں کچھ پر سلطان کا امتیازی
لقب سامنے رخ پر اور پشت پر شاہی لقب مرتسم ہے، اور کچھ عدلی قسم کے سکے ہیں جن کے سامنے
کے رخ پر اس کے شاہی لقب کی مناسبت سے عدلِ ناصری اور پشت پر ٹکسال کا نام (حضرت
دہلی) مسکوک ہے۔ یہ سکے وزن میں ۳ر۱۲ اور ۱۱ر۷ اور ۲ر۶۴ گرین کے ہیں۔

ناصر الدین محمود کے ساتھ ہی خانوادۂ التتمش (خاندان غلامان) کا خاتمہ ہو گیا اس کے بعد وزیر اعظم
اور خسر الغ خان بلبن، غیاث الدنیا والدین ابو المظفر کے شاہی القاب اختیار کر کے تخت نشین
ہوا۔ بلبن کے عہد (۶۶۴ - ۶۸۶ھ / ۱۲۶۶ - ۱۲۸۷ء) کے طلائی اور نقرئی سکے ساخت، ہیئت
وزن وغیرہ میں مروّجہ معیار اور طرز کے ہیں۔ فنّی اعتبار سے کچھ بہتر ہیں۔ ان کی شکل، لکھاوٹ،

خصوصاً حروف کی اٹھان اور ابھار بہت حد تک دلکش ہے، مثلاً اس کے طلائی سکوں کی عبارت گول دائرے اور حاشیے میں اور نقرئی سکوں کی چوکور زمین اور حاشیے میں مسکوک ہے۔ سکوں کی عبارت تقریباً اسی انداز پر ہے جو علاء الدین مسعود، ناصر الدین محمود وغیرہم کے سکوں کی ہے۔ ان سکوں پر المستعصم باللہ کا نام ہے۔

عہد بلبن کے چلن کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ دستیاب شدہ سکوں سے کچھ اور ٹکسالوں کا پتا چلتا ہے، مثلاً دہلی اور لکھنوتی وغیرہ کے علاوہ خطۂ الور، خطۂ سلطان پور، فخر آباد وغیرہ نیز اس عہد سے مرکب دھات بلون کے سکوں سے سوار وغیرہ کی شبیہ کو ہمیشہ کے لیے سلاطین دہلی کے سکوں سے حذف کر دیا گیا اور اس کی جگہ بادشاہ کے شاہی لقب (بخط ناگری) نے لے لی۔ اس کا آج تک، اسپ سوار والی قسم کا صرف ایک ہی نمونہ دستیاب ہوا ہے۔

نقرہ یا چاندی میں اس کے جزوی سکے بھی ملتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ ان جزوی سکوں کی تعداد خاندان خلجی کے آخری فرمانروا قطب الدین مبارک شاہ (۷۱۶ - ۷۲۰ھ/۱۳۱۶ - ۱۳۲۰ء) کے عہد تک محسوس ہوتی ہے۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ ہے کہ کم قیمت والے بلون کے جیتل کی افراط کی وجہ سے چاندی جیسی گراں بلکہ کمیاب جنس کے سکوں کو رائج کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی؛ اور صرف وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ہی یہ جزوی سکے مسکوک کیے گئے ہوں گے۔ بلبن کے عہد میں بلون کے ایک انوکھی قسم کے سکے کا رواج ہوا۔ یہ زمانۂ مابعد میں بھی ایک عرصے تک جاری رہا، یہ دو لسانی طرز کا ہے۔ ان سکوں میں چاندی کی مقدار تقریباً پانچ گرین پائی گئی ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید یہ سکے دو جیتل یعنی دوگانی کا کام دیتے ہوں اور ایسے ۴۸ سکے ایک تنکہ کے برابر شمار کیے جاتے ہوں گے۔

اسی طرح بلبن نے کم و بیش ۵ء۲، گرین وزن کا تانبے کا سکہ بھی دوبارہ رائج کیا، جو اول التتمش کے عہد میں جاری ہوا تھا، ساتھ ساتھ اسی دھات کے دس سے لے کر ۳۶ گرین وزن تک کے چھوٹے عدلی سکے بھی کافی تعداد میں مسکوک ہوئے تھے، جو دستیاب ہوئے ہیں۔ مگر ان عدلی سکوں کا دوسرے نسبی سکوں سے قیمت کے اعتبار سے براہ راست متعلق ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں غالباً یہ چھوٹے سکے ان سکوں کے جزو یا حصہ نہیں تھے۔

خاندانِ غلامان کے آخری دو فرمانروا بلبن کے پوتے سلطان معز الدنیا والدین ابو المظفر کیقباد (۶۸۶ - ۶۸۹ھ / ۱۲۸۷ - ۱۲۹۰ء) اور موخر الذکر کے بیٹے شمس الدنیا والدین ابو المظفر کیومرث (۶۸۹ھ / ۱۲۹۰ء) کے سکوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ معز الدین کے طلائی اور نقرئی سکے حسب معمول المستعصم کے نام کے حامل ہیں۔ البتہ چاندی کے جزوی سکوں یعنی نصف تنکہ والے سکوں میں صرف سلطان کا نام درج ہے۔ ان جزوی سکوں میں ۱۲ء۹۱، ۵ء۶۷ اور ۵۶ گرین یعنی ایک ماشہ اور چار ماشے وزن کے نمونے ملے ہیں جو اس حساب سے ایک تنکے کے تہائی، چھٹے اور بارھویں حصے شمار ہوتے ہوں گے۔ ان جزوی سکوں پر ظاہر ہو کہ عبارت مختصر ہے۔

مرکب دھات میں کیقباد کے بہت ہی کم سکے ملے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ماقبل بادشاہوں کے جیتل کافی تعداد میں بازار میں موجود ہونے کی وجہ سے نئے سکوں کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ یہ سکے بلبن کے عہد کے دو لاتینی طرز کے ہیں۔ لیکن ان میں اپنی سکہ چاندی آٹھ گرین ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سکے تین جیتل قیمت کے ہوں گے۔ اس کے تانبے کے سکے بھی اپنے دادا کے سکوں کی طرز کے ہیں۔

شمس الدین کیومرث کے زمانے کے صرف نصف درہم نقرئی اور ایک تانبے کا سکہ ہے۔ سونے یا مرکب دھات (دلّیوال) کا کوئی نمونہ آج تک نہیں ملا۔ چاندی کے سکے معیاری وزن اور مروجہ طرز اور ہیئت کے ہیں یعنی بلبن اور کیقباد کے سکوں کے مشابہ ہیں۔ تانبے کا سکہ بھی کیقباد کے تانبے کے سکے کی ایک قسم کا ہے جس میں سامنے رخ پر سلطان کا اعزازی لقب اور پشت پر اس کا شاہی لقب درج ہے۔

سلاطین خلجی (۶۸۹ - ۷۲۰ھ / ۱۲۹۰ - ۱۳۲۰ء)

سلطنت خلجی کے بانی سلطان جلال الدنیا والدین ابو المظفر فیروز شاہ خلجی ۶۸۹ - ۶۹۵ھ / ۱۲۹۰ - ۱۲۹۶ء) کے طلائی اور نقرئی سکے اپنی دیدہ زیب اور موزوں ہیئت و ساخت کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔ اس کے طلائی سکے کم تعداد میں ملے ہیں اور نقرئی کچھ زیادہ۔ باقی چیزوں میں یہ اس کے پیشروؤں کے انھیں دھاتوں کے سکوں کے مشابہ ہیں یعنی یہ بھی

خلیفہ المستعصم باللہ کے نام سے بمقام دہلی مسکوک ہوئے۔ چاندی میں تنکہ کے بارھویں حصے کی قیمت کے دو عدد موجودی سکے دستیاب ہوئے ہیں، جن کا وزن ۳۱ گرین ہے، یہ چھوٹے سکے بھی اس کے پیشروؤں کے اسی طرز کے سکوں کے مشابہ ہیں۔

مرکب دھات بتون کے سکے بھی بلبن کے مروجہ ذولسانین سکوں کی طرز کے ہیں اور تین وزنوں ۵۷ء۲۲، ۵ء۴۸، ۵ء۴۳ گرین، میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں چاندی مقررہ معیار سے کم یعنی ۶ء۳ گرین کے بجائے صرف ۳-۲ گرین ہے۔ سلطان جلال الدین کے تانبے کے سکوں میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ان میں کچھ ۹۵ اور ۶۶ گرین کے ہیں۔ کچھ ۳۳ اور ۳۴ اور ۳۵ کے قریب اور کچھ ۲۲ء۵ گرین وزن کے، ذولسانین قسم کے علاوہ سلطان کے اعزازی اور شاہی لقب والے اور عدلی، ان تینوں قسم کے سکے بھی ملتے ہیں۔

سلطان جلال الدین کو نہر گنگا کے کنارے کڑہ کے مقام پر اس کے بھتیجے علاء الدین خلجی نے قتل کرا دیا تھا۔ علاء الدین کے پایۂ تخت پہنچنے سے پہلے جلال الدین کے بیٹے ابراہیم نے سلطان رکن الدنیا والدین ابوالمظفر ابراہیم شاہ کا نام اور القاب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ لیکن وہ ۶۹۵ھ / ۱۲۹۶ء میں صرف چند دن ہی حکمرانی کر سکا۔ اسی لیے اس کے دریافت شدہ سکوں کی تعداد بہت ہی کم ہے، جو فطری بات ہے۔ تاہم اس کے چاروں قسم کے سکے ملتے ہیں۔ کچھ سال پہلے تک اس کا کوئی طلائی سکہ دریافت نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب ایک نمونہ دستیاب ہوا ہے، جو ۶۹۵ ہجری میں دہلی میں مسکوک ہوا تھا۔ یہ سب سکے خود جلال الدین فیروز شاہ یا اس کے پیشروؤں کے سکوں سے اس حیثیت سے مختلف ہیں کہ طلائی اور نقرئی سکوں میں سامنے کے رخ پر خلیفہ کے نام اور عہد کے بجائے خود سلطان کا نام اور لقب وغیرہ شامل عبارت ہیں اور پشت پر بجائے بادشاہ کے اس کے والد کا نام اور لقب تحریر ہو اور بتون کے سکوں میں بلبن کے سکوں کی دو زبانی عبارت کے بجائے سامنے رخ پر اعزازی اور شاہی القاب اور پشت پر اس کا (...) کے والد کا نام مرتسم ہے۔ وزن میں یہ سکے ۵۱ یا ۵۲ یا ۵۳ گرین کے ہیں۔ ابراہیم کے تانبے کے سکے اس کے والد سلطان جلال الدین کے اسی دھات کے سکوں کے مماثل ہیں۔

سلاطین دہلی میں سلطان علاء الدنیا والدین ابو المظفر محمد شاہ کے طلائی اور نقرئی سکّے عام طور پر اچھی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ گو بحیثیت مجموعی یہ پیشرو سلاطین کے سکّوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، بلکہ وزن، ساخت، ہیئت وغیرہ میں تقریباً ان سے مشابہ ہیں۔ جنوبی ہند میں پہلی بار جس سلطان دہلی کے سکّے مضروب ہو کر رائج ہوئے، وہ سلطان علاء الدین ہی ہے۔ اس نے دیوگیر کے مقام پر جسے اس نے اپنے چچا کے ایام حکومت میں فتح کیا تھا اور جس کا عہد محمد شاہ بن تغلق شاہ دولت آباد نام رکھا گیا، اور اسے دہلی کی جگہ پایۂ تخت بنایا گیا تھا، کچھ سکّے مسکوک کرائے۔

ایک اور بات میں بھی اولیت کا سہرا سلطان علاء الدین کے سر ہے۔ عہدِ سلاطینِ دہلی کے سکّوں کے سلسلے میں پہلی بار چوکور یا مربع شکل کے سکّے اسی زمانے میں ڈھالے گئے۔ سکّوں کی یہ شکل بعد میں علاء الدین کے بیٹے سلطان قطب الدین مبارک شاہ اور مغل بادشاہوں میں اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں کافی مقبول ہوئی۔ سلطان علاء الدین نے سکّوں کی عبارت میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں۔ رکن الدین ابراہیم کی طرح اس کے سکّوں سے بھی خلفاء کے نام محذوف کر دیے گئے مگر اس نے خود اپنے لیے یمین الخلافۃ اور ناصر امیر المومنین جیسے القاب استعمال کیے۔ اس نے ایک نیا لقب سکندر الثانی بھی اختیار کیا (جو اس کے کتبوں میں بھی ملتا ہے)۔ ان چند پہلوؤں کو چھوڑ کر اس کے طلائی اور نقرئی سکّوں میں اور کوئی امتیازی بات نہیں ہے۔ یہ سکّے جن ٹکسالوں میں ضرب کیے گئے، وہ دہلی، دار السلام (راجستھان کے ضلع سوائی مادھو پور میں واقع مشہور قلعہ رنتھمبور) اور دیوگیر یا قلعۂ دیوگیر ہیں۔

علاء الدین نے بلّون دھات کے دو قسم کے سکّے جاری کیے تھے، جو وزن میں تو یکساں ہیں، لیکن ایک میں چاندی کی مقدار دوسرے سے زیادہ ہونے سے قیمت میں فرق تھا۔ دستیاب شدہ سکّوں کے کس نکالنے پر معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے بعض میں یہ مقدار تقریباً ۲٫۱۳ گرین یا ۸٫۱ گرین اور بعض میں ۲٫۴۵ یا ۲٫۵۹ گرین ہے۔ عبارت، ہیئت وغیرہ کے اعتبار سے یہ سکّے ذولسانین اور عربی میں نام اور لقب کی عبارت والی دونوں قسموں کے ہیں۔ ان میں عربی عبارت والے سکّوں کی قیمت دو زبان والے سکّوں سے زیادہ ہے۔ قرین قیاس

ہے کہ یہ سکّے بالترتیب تنکہ کے بارھویں اور چوبیسویں حصّے کے برابر شمار کیے جاتے تھے ۔
علاء الدین کے ذولسانین سکوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں ہجری سال ضرب (۷۰۳ ھ اور ۷۱۳ ھ اور ۷۱۴ ھ کو چھوڑ کر اس کے زمانۂ حکومت کے ہر سال میں اس قسم کے ضرب شدہ سکّے دستیاب ہوئے ہیں) ہندی کے ہندسوں میں دیے گئے ہیں جو اس کے علاوہ کسی اور بادشاہ کے سکوں میں نہیں پائی جاتی۔
سلطان علاء الدین کے تانبے کے سکّے اس کے حریف اور پیشرو رکن الدین ابراہیم کے اسی دھات کے سکوں کے مماثل ہیں، سوائے اس کے کہ وزن میں قدرے مختلف ہیں۔
سلطان علاء الدین کے ان سکوں کا یہ حال ان کے دستیاب شدہ نمونوں پر مبنی ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے ایک جھرنش پراکرت زبان میں وکرم سمبت ۱۳۷۵ھ (۱۳۱۸ء) میں تالیف شدہ ایک کتاب کا خطی نسخہ دریافت ہوا ہے جو علاء الدین خلجی اور اس کے دو جانشینوں کے عہد میں دہلی کی شاہی ٹکسال کے افسر علیٰ ٹھکر و پھیرو کا تصنیف کردہ ہے۔ اس کتاب کا نام دَرَیَہ پرکیھا[1] ہے۔ اس کتاب میں مصنّف نے ان سکوں سے بحث کی ہے جو شاہی ٹکسال میں پگھلا کر دوبارہ مسکوک کرانے کی غرض سے لائے جاتے تھے۔ اس لیے اس میں ان سکوں کے وزن مختلف دھاتوں کی مقدار اور ان کی مروجہ قیمتوں سے بحث کی گئی ہے۔ بلکہ یہ معلومات ایک فہرست کی صورت میں مرتب کی گئی ہیں۔ غرض اس کتاب سے ان سلاطین کے سکوں کے بارے میں کافی نئی معلومات ملتی ہیں، بلکہ سلاطین ہند کے سکّے کے نظام پر بھی اس سے کافی روشنی پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب آج تک طبع نہیں ہوئی۔ لیکن ان کے مندرجات کے خلاصے پر مشتمل ایک مبسوط مقالہ جرنل آف دی نیومسمیٹک سوسائٹی آف انڈیا کی جلد ۱۹ (حصّہ اول) میں ۱۲ صفحات میں شائع ہوا ہے۔ یہاں ان مندرجات کی تفصیل میں جانے کی نہ ضرورت ہے نہ اس کی گنجائش۔ لیکن علاء الدین اور قطب الدین کے سکوں کے بارے میں اس میں جو معلومات

---

[1] یہ سنسکرت لفظ دَرَوی پرکیشا کا مخفف ہے اور معنی اس کے "نقد کی جانچ" ہے۔

ملتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ علاء الدین نے سونے کے ۵ اور ۱۰ اور ۵۰ اور ۱۰۰ تولہ وزن کے سکے مسکوک کرائے تھے (ان میں سے کسی وزن کا آج تک ایک نمونہ بھی دستیاب نہیں ہوا ہے۔ جو سکے ملے ہیں، وہ معمول کے مطابق مقررہ ایک تولہ وزن کے ہیں) اسی طرح ان کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ نے طلا اور نقرہ میں ۵ اور ۱۰ اور ۲۰ اور ۳۰ اور ۴۰ اور ۵۰ اور ۶۰ اور ۷۰ اور ۸۰، ۹۰ اور ۱۰۰ اور ۱۵۰ اور ۲۰۰ تولہ وزن کے سکے مضروب کرائے تھے۔ ان میں سے بھی کوئی سکہ آج تک نہیں ملا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سکے روزانہ چلن اور لین دین کے لیے نہیں تھے۔ لیکن مخصوص تقاریب یا نذر و ہدایا یا اسی طرح کے خاص مقاصد و اغراض کے لیے بنائے ہونگے۔ قطب الدین کے دوسرے سکوں کے بارے میں ٹھکرا پھیرو کی دی ہوئی معلومات کا خلاصہ سطور آئندہ میں پیش کیا جائیگا۔

علاء الدین کا جانشین سلطان شہاب الدنیا والدین ابوالمظفر عمر شاہ ابن علاء الدین (۷۱۵ھ/۱۳۱۶ء) کچھ ماہ کے لیے مسند خلافت پر متمکن رہا اس کے چاندی کے کچھ سکے تو ملے ہیں لیکن طلائی صرف ایک سکہ آج تک دستیاب ہوا ہے؛ اور تانبے کا ایک بھی سکہ ملنے کی اطلاع نہیں ہے۔ بلّون مرکب دھات کے سکے بھی گنتی کے چند پائے گئے ہیں۔ یہ سب سکے علاء الدین کے سکوں کے مماثل ہیں۔ مرکب دھات میں شہاب الدین کا دو لسانی قسم کا بھی کوئی نمونہ نہیں پایا گیا۔

شہاب الدین عمر کے بعد تخت نشین ہونے والے اس کے بھائی اور وزیر سلطان قطب الدنیا والدین ابوالمظفر مبارک شاہ (۷۱۶-۷۲۰ھ/۱۳۱۶-۱۳۲۰ء) کا عہد سلاطین دہلی کے ادوار حکومت میں سکوں کی تاریخ میں عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ سکے ڈیزائن کی نفاست اور خوش اسلوبی، بہتر ساخت، تنوع عبارت، اچھے ابھرے ہوئے حروف، اچھی خطاطی وغیرہ کے خوبصورت نمونے ہیں۔ سکوں کے لیے باقاعدہ طور پر گول یا مدور شکل کی جگہ چوکور یا مربع شکل کا رواج ہوا۔ اس تنوع سے سکوں کی خوبصورتی اور جاذبیت نظری میں اضافہ ہوا۔

قطب الدین کے طلائی سکوں میں ایک نمونہ ایک تہائی تولہ وزن یعنی ۵۵ گرین کا دستیاب

ہوا ہے، جس سے اس جنس کے سکّوں کے حصّوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح چاندی میں ۶ء۴۲ اور ۲۶ گرین وزن کے دستیاب شدہ سکّے اس کے مشعر ہیں کہ یہ نصف تنکہ اور تنکہ کے ششم حصّے کے طور پر رائج تھے۔ ان دونوں دھاتوں میں ایک تولے کے مقررہ وزن کے سکّے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔

قطب الدین کے مرکّب دھات کے سکّوں کی عبارت اور وزن دونوں لحاظ سے کئی قسمیں ہیں، جن میں سے ایک ۵ء ۸۲ گرین وزن کی ہے، ان میں ۲۹ سے ۳۰ گرین چاندی کی آمیزش ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سکّہ ۱۲ جیتل یا ربع تنکہ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ دوسری قسم معیاری وزن یعنی ۳۲ رتّی کے لگ بھگ والے وزن کے سکّوں کی ہے جو ابتدا میں حسبِ معمول گول شکل میں ڈھالے گئے، لیکن کچھ دن بعد چوکور شکل میں مسکوک ہونے لگے۔ مگر گول شکل بھی ترک نہیں کر دی گئی کیونکہ اس شکل کے سکّوں کی ایک قسم سلطان کے آخر عہد تک جاری رہا۔ ان میں کم سے کم وزن کا جو سکّہ دستیاب ہوا ہے، اس کا وزن ۳۰ء ۳۱ گرین ہے۔ ان سکّوں کے اوزان کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ مرکب دھات بلّون کے سکّے ۳، ۴ یا ۶ جیتل کی قیمت کے لیے مستعمل تھے، بالفاظِ دیگر یہ تنکہ (= روپیا) کے سولھویں، بارھویں اور آٹھویں حصّے کے طور پر رائج تھے۔

اس طرح قطب الدین مبارک شاہ کے تانبے کے سکّوں میں بھی نسبتاً زیادہ تنوع ہے، عبارت میں بھی اور وزن میں بھی ۷۰ گرین والے معیاری اور مقررہ سکّوں کے ساتھ ساتھ ان سے کم وزن یعنی ۷ء ۵۴، ۳۳، اور ۱۲ گرین کے سکّے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ سکّے بھی زیادہ تر چوکور شکل ہی میں ڈھالے گئے ہیں؛ ان میں عدلی بھی شامل ہیں۔

دستیاب شدہ سکّوں سے مستنبط جو مفصل معلومات ٹھکر‌ّا پھیرو کی متذکرۂ بالا تصنیف میں درج ہیں، وہ دلچسپی سے خالی نہیں اور ان کا مختصر بیان یہاں بے محل نہیں ہوگا۔ بقول مصنّف ٹھکّرا پھیرو مرکب دھات بلّون کے سکّے بالعموم "گانی" یا اس کے (حاصلِ ضرب) کہلاتے تھے یعنی دوگانی، چوگانی، اٹھ گانی، بارہ گانی، چوبیس گانی اور اڑتالیس گانی۔ ان سے اوپر چاندی کا تنکہ تھا، جو قیمت میں ساٹھ گانی کے برابر تھا۔ عہدِ حاضر کے سکّہ

شناس دستیاب شدہ سکوں کی چاندی کی مقدار کی بنا پر اڑتالیس گانی کے برابر ایک ٹنکے کی قیمت تصور کرتے ہیں) پھر چھ گانی تنک تو ان گانیوں کے سکے وزن میں یکساں تھے، یعنی ان کا وزن ۴ ماشہ (۵۶ر۷ گرین) تھا (اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کی قیمت ان میں موجود چاندی کی مقدار کی بنا پر متعین ہوتی تھی) گانی سکوں کے اجزاے مرکب میں ۵ فیصد چاندی اور ۹۵ فیصد تانبہ ہوتا تھا؛ دوگانی میں ۵ر۹ فیصد چاندی، چوگانی میں ۱۶ر۴ فیصد؛ اس طرح بھاری قیمت کے سکوں میں اسی تناسب سے چاندی کی مقدار بڑھتی جاتی تھی۔ زیادہ قیمت والے سکے وزن میں یکساں نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان کی قیمت کے مطابق ان کا وزن ہوتا تھا، جو اٹھ گانی کے وزن کو اکائی شمار کر کے متعین ہوتا تھا۔ ان میں چاندی کا جزو حسب تناسب ہوتا تھا۔ چھوٹے یعنی چھ گانی اور اس سے کم قیمت کے سکوں کی شناخت میں ان کے وزن یکساں ہونے کی وجہ سے دشواری پیش آتی ہوگی کیونکہ ان میں کسی پر سکے کی قیمت درج نہیں ہوتی تھی۔

قطب الدین کے تانبے کے سکے بقول پھیرو قیمت میں گانی سے کم تھے۔ رائج تانبے کے سکے اس طرح تھے: دِسیوا (گانی کا بیسواں حصہ)، سوا دِسیوا (گانی کا سولھواں حصہ)، ادھوا (گانی کا آٹھواں حصہ)، اور پنکایا پانچ دِسیوا (گانی کا چوتھا حصہ) جو وزن میں بالترتیب ایک، سوا، ڈھائی اور پانچ ماشے یعنی ۱۴ر۲، ۱۷ر۹، ۳۵ر۸ اور ۷۱ر۶ گرین وزن کے تھے۔ ٹھکر پھیرو کے بتائے ہوئے ان سکوں میں سے ۱۷ر۹ گرین وزن کو چھوڑ کر باقی سب سکے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس دستیاب شدہ سکوں میں کچھ سکے ۴۷ر۵ گرین کے ہیں، جو ٹھکر پھیرو کی فہرست کی تفاصیل کے پیش نظر گانی کے چھٹے حصے والے سکے ہونا چاہییں بہرحال اس موضوع پر مزید تحقیق و تلاش کی گنجائش ہے۔

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا، قطب الدین مبارک شاہ کے سکے اپنی عبارت کے لحاظ سے بھی ماقبل بادشاہوں کے سکوں سے متمیز ہوتے ہیں۔ رکن الدین ابراہیم اور علاء الدین کے عہد میں خلیفہ کا نام سکوں کی عبارت سے خارج ہو چکا تھا۔ لیکن خلیفہ کی نیابت پر مشعر ناصر امیر المومنین یا برہان امیر المومنین جیسے القاب شامل عبارت تھے، یعنی یہ بادشاہ

اپنے آپ کو خلیفہ نہیں کہتے تھے بلکہ خلیفہ کے نائب کہلوانے پر اکتفا کرتے تھے۔ علاء الدین نے بھی کم از کم سکوں میں اپنے لیے خلیفہ کا لقب اختیار نہیں کیا، لیکن قطب الدین مبارک نے تخت نشینی کے چند مہینے بعد ہی اپنے آپ کو خلیفۂ وقت کے مقام کا حامل ظاہر کر دیا۔ چنانچہ اپنے سکوں کی عبارت میں وہ باستثنائے ان سکوں کے جو ۷۱۶ھ یعنی اس کے جلوس کے سالِ اول کے ابتدائی مہینوں میں جاری کیے گئے تھے، وہ الامام الاعظم خلیفۃ رب العالمین، خلیفۃ اللہ، الواثق باللہ، امیر المومنین وغیرہ القاب کے ساتھ لکھا جانے لگا۔ اس کے سکوں کی عبارت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں دار الضرب والے شہروں کے نام کے ساتھ اعزازی لقب بھی استعمال کیے گئے ہیں مثلاً حضرت دار الخلافت دہلی، قلعہ قطب آباد (دیوگیر) وغیرہ۔

سلطان قطب الدین کے زمانے میں ۷۱۸ھ میں ضرب شدہ کچھ مرکب دھات بلون کے ایسے سکّے دستیاب ہوئے ہیں جن پر بادشاہ کا نام شمس الدنیا والدین ابوالمظفر محمود شاہ مرتسم ہے۔ یہ بادشاہ کون تھا اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ یہ سکّے سب سے پہلے مسٹر آر۔ بی۔ وہائٹ ہیڈ نے شائع کیے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ سلطان علاء الدین کے چچیرے بھائی اسد الدین نے قطب الدین کے سفرِ دکن کے دوران یا پایۂ تخت سے غیر حاضری یا عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر بغاوت کی تھی، اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا، اور یہ سکّے مسکوک کرائے تھے۔ لیکن ہمارے زمانے کے غالباً سب سے بڑے سکّہ شناس اور مورخ پروفیسر شاپور جی ہرمزجی ہوڈی والا نے مختلف شواہد کی بنا پر یہ ثابت کیا کہ یہ سکّے دکن میں باغی امیر حاکم دیوگیر ملک یک لکھی نے مسکوک کرائے تھے۔ ملک شمس الدین محمود کے یہ سکّے دو قسم کے ہیں اور علاء الدین خلجی کے بلون کے عربی عبارت اور ذو لسانین والی قسموں کے مشابہ ہیں۔

قطب الدین مبارک کو اس کے حسن نامی ایک مقرب نے قتل کر کے زمامِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی اور خطبے اور سکّے میں سلطان ناصر الدنیا والدین ابوالمظفر خسرو شاہ کا نام کنیت اور لقب اختیار کیا۔ اس کے چاروں دھاتوں کے سکّے دستیاب ہوئے ہیں، گو

ان کی تعداد بہت کم ہے اور ان میں بحیثیت مجموعی کوئی امتیازی بات بھی نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان میں سلطان نے اپنے آپ کو خلیفہ نہیں بلکہ خلیفہ کا ولی بنایا ہے، یعنی طلائی، نقرئی اور مرکب دھات تینوں کے سکوں پر اس کے نام کے ساتھ الواثق بنصر اللہ ولی امیر المومنین یا صرف ولی امیر المومنین لکھا ہے۔ اس کا طلائی سکہ دہلی کے ٹکسال میں اور نقرئی کا سکہ دکن میں دیوگیر کی دار الضرب میں مسکوک ہوا تھا۔ تانبے کے ایک سکے پر حضرت دہلی کے دار الضرب کا نام بھی ملتا ہے۔

سلاطین خاندان تغلق (۷۲۰ - ۸۱۵ھ / ۱۳۲۰ - ۱۴۱۴ء)

ناصر الدین خسرو شاہ کی محسن کشی اور غصب سلطنت سے برافروختہ ہو کر امرائے ملک غازی تغلق کی سرکردگی میں دہلی پر حملہ کر دیا اور اسے میدان جنگ میں شکست دے کر اولاً اسیر بنا لیا اور پھر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ غرض صرف چار ماہ کی قلیل حکومت کے بعد اس کی جگہ امرا اور حکام کے اتفاق رائے سے ملک غازی سلطان غیاث الدنیا والدین ابو المظفر تغلق شاہ کا نام، کنیت اور لقب اختیار کر کے مسند حکومت پر جلوہ افروز ہوا۔

تغلق شاہ کے طلائی اور نقرئی سکے زیادہ کمیاب نہیں ہیں۔ عبارت کے لحاظ سے یہ دونوں ایک ہی قسم کے ہیں۔ عبارت میں تغلق شاہ نے بھی اپنے کو خلیفہ کا نائب ظاہر کر کے ناصر امیر المومنین کا لقب شامل کیا۔ یہ سکے دہلی اور دیوگیر میں ڈھالے گئے تھے، سونے میں ایک نئی قسم ان نہایت ہی نادر سکوں کی ہے، جو فتح تلنگانہ کے بعد وہاں مسکوک ہوئے تھے۔ جیسا کہ ان کی عبارت میں اس کا صراحۃً ذکر ہے۔ ان پر ٹکسال کے نام کی تخصیص نہیں لیکن ان پر "یہ سکہ ملک تلنگ میں ۷۲۵ھ میں مضروب ہوا" یہ عبارت مرتسم ہے۔ نیز ان سکوں پر ناصر امیر المومنین کے علاوہ سلطان کے نام اور لقب کے ساتھ المتوکل علی اللہ کا جملہ بھی ملتا ہے۔ نقرہ میں ایک مزید قسم ان سکوں کی ہے، جو بنگال کے سلطان نے تغلق شاہ کے نام سے اپنی ماتحتی کے ثبوت میں جاری کیے تھے۔ سلطان تغلق شاہ کے یہ طلائی اور نقرئی سکے نقد دوال کہتے ہیں۔

مرکّب دھات بلّون کے سکّے بلبن اور علاء الدین خلجی کے سکّوں کی طرز کے اور انہی کی طرح دو قسم کے ہیں۔ ابتدا میں دونوں قسمیں رائج تھیں، لیکن جلوس کے سال اوّل کے بعد ذو لسانین عبارت والے سکّے متروک کر دیے گئے اور عربی عبارت والے سکّے آخر تک جاری و ساری رہے۔ ۳ ماشے یا ۳۲ رتی (۵۰ء۵ سے ۵۶ء۵ گرین) کے ان سکّوں میں چاندی کی مقدار ۱۵ گرین کے قریب ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چار جیتل یا تنکہ کے بارھویں یا پندرھویں حصّے کے طور پر رائج تھے۔

غیاث الدین تغلق شاہ کے سکّوں میں السلطان الاعظم کے اعزازی لقب کی جگہ السلطان الغازی کا لقب استعمال ہوا ہے۔ جو معلوم ہوتا ہے، اس کے نام اور ناصر الدین خسرو شاہ کے ساتھ جنگ میں فتح پانے کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ ہندستان کے سلاطین میں کم از کم تغلق شاہ کے سکّوں پر پہلی بار 'الغازی' کا لقب مستعمل ہوا جو تانبے کے سکّوں کی ایک قسم کو چھوڑ کر برابر اس کے سکّوں کی عبارت میں استعمال ہوا۔

تغلق شاہ کے تانبے کے سکّوں میں مقرّرہ یا معیاری ۱۴۰ رتی وزن کے سکّے بہت کم تعداد میں ملے ہیں، البتہ اس سے ذرا ہلکے، یعنی ۱۳ سے لے کر ۵۷ء۵ گرین کے وزنوں کے سکّے کافی تعداد میں ملے ہیں، جن میں سامنے کے رُخ پر "تغلق" اور پشت پر "شاہ" مرتسم ہو۔ یہ سکّے بہت عام ہیں۔

تغلق شاہ کے بیٹے اور جانشین سلطان محمد بن تغلق شاہ (۷۲۵ھ - ۷۵۲ھ / ۱۳۲۵ء - ۱۳۵۱ء) نے سکّوں کی تاریخ میں ایک نئے شاندار باب کا اضافہ کیا۔ سب سے بڑی بات جو ہماری توجّہ اپنی طرف فوراً مبذول کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس عالی دماغ بادشاہ نے خود اپنے جاری کردہ سکّوں کے لیے کوئی شاہی لقب یا کنیت کم از کم سکّوں کی عبارت کے لیے اختیار نہیں کی (کتبوں میں بھی کنیت تو ہے، لیکن شاہی لقب کا استعمال نہیں ہوا) حتیٰ کہ اس کے سکّوں کی عبارت میں السلطان الاعظم یا السلطان المعظم اعزازی اور عرفی القاب بھی غائب ہیں۔ ان کی جگہ سلطان کو ہمیشہ العبد الراجی رحمۃ اللہ، المجاہد فی سبیل اللہ، الواثق بنصر اللہ، وغیرہ کہا گیا ہے۔ بلکہ اکثر جگہ اس کے نام کے ساتھ شاہ کا لفظ بھی

نہیں ملتا۔

سلطان محمد شاہ کے مختلف النوع سکے کئی اعتبار سے بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور سکہ شناسوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ کیا افراط کے لحاظ سے اور کیا قسموں کی بھاری تعداد (پچاس سے زائد) کے لحاظ سے، کیا تنوعِ عبارات کے اعتبار سے اور کیا ساخت اور بناوٹ کے پہلو سے یا ڈیزائن اور خطاطی کے لحاظ سے۔ غرض کسی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے، سلطان محمد بن تغلق شاہ کے سکوں کو سلاطینِ دہلی کے سکوں پر فوقیت حاصل ہے۔ ڈیزائن اور ساخت میں یہ سکے اپنے پیشروؤں کے سکوں سے بہتر ہیں، بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، عبارت میں بڑا تنوع ہے، قسموں کی افراط بلکہ ان میں نئے اختراع اور ایجادات، تجربے ہیں، جن میں بعض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کئی نئی ٹکسالیں وجود میں آئیں (مثلاً ستگاؤں واقع بنگال، دھار واقع مدھیہ پردیش، تلنگانہ، سلطانپور، ترہت واقع شمالی بہار وغیرہ) اور سب سے اہم بلکہ ہنگامہ خیز اور عہد آفرین بات علامتی سکوں (Token currency) کا اجرا ہے، جو بدقسمتی سے دیرپا ثابت نہ ہوا۔ غرض ان تمام حقائق کی بنا پر سلطان محمد شاہ کو صاحبِ سکہ بادشاہوں کا سرتاج کہا جاتا ہے۔

اس بادشاہ کے ابتدائی سکوں میں وزن وغیرہ کے معیار کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ یعنی ابتدا میں طلائی سکے ایک تولہ یا تقریباً ۵۔۱۷۲ گرین وزن کے تھے مگر جلد ہی ان کا وزن بڑھا کر ۲۰۰ گرین کر دیا گیا، جب کہ چاندی کے سکوں کا وزن معمول سے ذرا کم کر کے ۱۴۴ گرین بنا دیا۔ چاندی کے اس نئے وزن کا ایک طلائی سکہ جاری ہوا، جو خیال کیا جاتا ہے کہ جنوبی ہند یعنی دکن کے مفتوحہ علاقوں کے لیے مسکوک ہوا ہوگا۔ لیکن وزن میں یہ تغیرات دیرپا ثابت نہیں ہوئے اور سال بھر کے بعد ہی دوبارہ معیاری اور مقررہ وزن کے طلائی اور نقرئی سکے جاری کیے گئے۔ سلطان محمد شاہ نے مرکب دھات (بلّون) کا ۷۔۱۴۱ گرین وزن کا سکہ بھی جاری کیا تھا۔

لیکن اپنی تخت نشینی کے پانچ سال کے اندر ہی سلطان نے چلنی نظام میں ایک ایسا قدم اٹھایا

ہندستانی عہد اسلامی کے سکے

جس کی قرونِ وسطیٰ کی دنیا تو درکنار ماضی قریب سے کچھ زمانہ پہلے تک بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس سے مراد زرِ علامتی یا علامتی سکّے یعنی ان سکّوں کا چلن ہے جو محض علامت کے طور پر جاری کیے گئے تھے اور اپنی اصلی قیمت سے زیادہ قیمت پر چلتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ مثلاً علامتی سکّے ہوتے تو تھے۔ پیتل یا تانبے کے۔ لیکن قیمت ان کی تنکۂ سیم یا تنکۂ زر کی قرار دی گئی تھی۔ چونکہ یہ حکومت کی طرف سے جاری کیے گئے تھے اور ان کے چلن کو لازمی بنا دیا گیا تھا، اس لیے ان کے لیے جبری سکّوں" (Forced money) کی اصطلاح بھی مستعمل ہے۔ دھات سے قطع نظر علامتی سکّوں کی ظاہری شکل و صورت، ساخت، ہیئت، عبارت، خطاطی وغیرہ بعینہٖ طلائی اور نقرئی سکّوں کی مانند تھی۔ اس لیے ان کے چلن میں یوں کوئی دشواری پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ لیکن چونکہ ان کی اصلی قیمت بہت کم تھی اور زرِ مستند سے بدل دیے جانے کی حکومت کی طرف سے ضمانت تھی، اس لیے لوگوں نے نقلی سکّے وضع کرنا شروع کیے اور اس سے مال و متاع خریدنے لگے۔ معاصر مؤرخ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ ہر ایک ہندو کا گھر ٹکسال بن گیا اور سارے ملک میں لاکھوں اور کروڑوں سکّے ضرب ہوئے، جن سے خراج بھی ادا کیا جاتا اور اسپ و اسلحہ اور قسم قسم کے نفائس بھی خریدے جاتے، ہر زرگر اور بیتار کے گھر میں ایسے سکّے ڈھلنے لگے۔ غرض جس آسانی سے یہ سکّے بنائے جا سکتے تھے، اور ان کی روک تھام کی کوئی معقول صورت یا مؤثر طریقہ یا مناسب اقدام نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے ملک میں کم از کم چلن کے بارے میں بڑی افراتفری مچ گئی۔ خزانہ تانبے کے علامتی سکّوں سے معمور ہو گیا اور ان کے عوض زرِ مستند ادا کرتے کرتے خالی ہو گیا۔ بالآخر دو سال کے اندر اندر یعنی ۷۳۱ھ میں سلطان زرِ علامتی کو ترک کر دینے پر مجبور ہو گئے اور خزانے نے ان علامتی سکّوں کی قیمت جن میں جعلی نمونے بھی بے شمار تھے، زر اور تنکۂ زر سے ادا کی۔

سلطان محمد شاہ کے سکّے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے والد مرحوم کے نام سے بھی باقاعدہ سکّے جاری کیے۔ وزن، عبارت وغیرہ کے اعتبار سے یہ معمول کے مطابق ہیں۔ صرف ایک سکہ [illegible] جس کا وزن ۱۷۵ گرین یا وزن [illegible] تقریباً [illegible]

ہے۔ نیز اس نے دوبارہ سکّوں کی عبارت میں کلمہ شامل کیا اور خلفائے راشدین کے اسمائے مبارک بھی شامل کیے۔ کچھ سکّوں میں کلمۂ توحید کے بجائے کلمۂ شہادت بھی استعمال کیا گیا۔ نیز اس نے دوبارہ اپنے سکّوں کو خلیفۂ وقت کے نام سے مزیّن کرنے کی رسم کا احیا کیا۔ چنانچہ اس کے سکّے المستکفی باللہ ابو ربیع سلیمان اور الحاکم بامراللہ ابوالعباس سے مزیّن ہیں؛ ان میں سے کچھ سکّوں کو دنیا خلیفتی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ سلطان کے اپنے نام سے جاری شدہ سکوں میں تاریخ وغیرہ کے علاوہ اس کا نام وغیرہ ہے، جو اعزازی القاب سے معرّا ہے۔ محمد تغلق کے سکّوں میں وہ سکّے بھی شامل ہیں، جو سلاطین بنگال نے اس کے نام پر مسکوک کرائے اور جاری کیے تھے۔ مؤخرالذکر سکّے صرف چاندی اور سونے میں ڈھلے ہوئے ملے ہیں، جب کہ باقی سکّے بلونِ مرکّب دھات میں بھی موجود ہیں۔

عبارت کا جو تنوّع اس بادشاہ کے سکّوں میں نظر آتا ہے، وہ بلاخوف تردید سلاطین دہلی میں سے کسی اور کے ہاں موجود نہیں ہے؛ اگر کہیں ہے بھی، تو وہ صرف ایک یا دو دینی کلمات تک محدود ہے۔ لیکن محمد شاہ بن تغلق شاہ کے سکّوں میں تو کیا عبدیّت ظاہر کرنے والے کلمات اور خداوندِ کریم کی نصرت و تائید میں وثوق کے مظہر کلمات، کیا قرآن شریف کی آیتیں اور کیا احادیث کے ٹکڑے، غرض قسم قسم کی جو عبارتیں سکّوں پر درج ہوئی ہیں، وہ ناظرین کے ملاحظے کے لیے درج کی جاتی ہیں: المجاہد فی سبیل اللہ، محی سُنن خاتم النبیین، ظل اللہ، العبد الراجی رحمۃ اللہ الکریم، العبد الواثق بنصر اللہ، الواثق بتائید الرحمٰن، حسبی ربّی، الملک والعظمۃ للہ، اللہ الکافی، واللہ غنی وانتم الفقراء وغیرہ، اس کے دستیاب شدہ سکّے پر دامت سلطنتہ کا دعائیہ کلمہ مرتسم ہے۔ نیز اس کے ایک آدھ درجن سکّوں پر سالِ ضرب عربی لفظوں میں جیسا کہ معمول تھا، نہیں، بلکہ فارسی لفظوں میں ملتا ہے۔

جب اس کے زرِ مستند یعنی اصلی اور معیاری سکّوں کی تحریروں کا یہ حال ہے، تو اس کے زرِ علامتی کی عبارتوں کے تنوّع اور اُن کی معنی خیزی کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے۔ ان

سکّوں پر، ضروری تھا کہ ایسی عبارات مرتسم ہوں، جس سے لوگوں کو علامتی سکّے کی پہچان میں مدد ملنے کے علاوہ ان کو رائج الوقت ماننے کی ترغیب ہو۔ اسی مطمح نظر سے ایسے علامتی سکّوں پر ان سکوں کی علامتی قیمت یا قیمت مقصودہ کی نشان دہی کرنا بھی از حد ضروری تھا، بخلاف معیاری سکّوں کے کہ ان میں دھات اور وزن سے قیمت کی تشخیص ہوتی تھی۔ چنانچہ علامتی سکّوں کے جو نام رکھے گئے تھے، وہ دستیاب شدہ نمونوں میں تنکہ رائج، تنکہ پنجاہ گانی، نصفی، ربعی، درہم شرعی[۷] تنکۂ دوگانی، عدل ہشت گانی ہیں۔ ان سکّوں پر سلطان کا نام بھی ہے، یا اس کے عہد کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ قرآن شریف کی آیتیں یا احادیث جو حاکم وقت کی اطاعت و فرمانبرداری کے احکام پر مشتمل ہیں، دی گئی ہیں — دستیاب نمونوں میں "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" یا "من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمٰن" یا "لولا السلطان لاکل الناس بعضھم بعضا" وغیرہ پائی گئی ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان سکّوں پر قرآن شریف کی آیت یا احادیث کے ساتھ کہیں کہیں فارسی عبارتیں بھی مرتسم ہیں؛ یہ غالباً عوام و خواص کی ہدایت اور رہنمائی کی غرض سے کیا گیا۔ ان عبارتوں میں "مہر شدہ تنکہ در روزگار بندۂ امیدوار محمد تغلق" یا "سکہ زد جائز در عہد بندۂ امیدوار محمد تغلق" یا "در تخت گاہ دہلی سال بر ہفصد سی" یا "در تخت گاہ دولت آباد" وغیرہ شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ قطعی شواہد یا قراین کی عدم موجودگی میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دستیاب نمونوں میں کونسے اصلی اور کونسے نقلی یا جعلی علامتی سکّے ہیں۔ حقیقت جو بھی ہو، اس سے نفسِ مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سلطان محمد شاہ کے سکّوں کے بارے میں موجودہ معلومات کی روشنی میں ایک اور چیز سامنے آتی ہے وہ یہ کہ نقرئی سکّے اس کے طلائی سکّوں کے مقابلے میں کم دستیاب ہوئے ہیں۔ ممکن ہے، یہ چاندی کی قلت کے باعث ہو۔ ابتدائی دور میں نقرئی تنکے معیاری وزن کے تھے مگر جلد ہی کچھ ہلکے سکّے رائج کیے گئے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے،

تخت نشینی کے دو سال کے اندر ہی نقرئی اور دھاتی سکوں کی جگہ بلّون کے سکے رائج ہو
گئے تھے۔ لیکن بنگال میں چاندی کے سکے جاری رہے۔ بالفاظِ دیگر زیادہ قیمت کے
لیے مرکب دھات کے سکوں کا رواج اس عہد میں شروع ہوا (جس کی انتہائی صورت
آج زرِ کاغذ کا علامتی چلن ہے) ان مرکب دھات کے ابتدائی سکوں کا وزن تین ماشے
یعنی ۵۷٫۶ گرین تھا اور ان کی پشت پر مختلف عبارتیں درج تھیں۔ لیکن ۷۲۷ھ
سے ان کا وزن بڑھا کر ۸۰ رتی یعنی قریب قریب ۱۴۰ گرین کر دیا گیا اور طلائی دینار
اور نقرئی تنکوں کی مخصوص عبارتیں ان پر مرتسم ہونے لگیں۔ گمانِ غالب یہ ہے
کہ یہ سکے نقرئی سکوں کی قیمت کے مساوی قرار دیے گئے تھے یعنی یہ سرکاری تنکہ بیا
تھا، مرکب دھات میں جزوی سکے بھی حاصل ہوئے ہیں، جو تنکہ کے حصوں کا کام دیتے
ہونگے۔

محمد شاہ بن تغلق شاہ کے تانبے کے سکے بہت کم دستیاب ہوئے ہیں۔ موجودہ نمونوں
میں ایک خاص قسم کا سکہ ہے جو ۴۰ رتی یا ۷۲ گرین وزن کا ہے اور نادر ہے۔ تانبے
میں وزن معمول بعد میں ۳۲ رتی (۵۷٫۶ گرین) قرار پایا تھا۔

محمد بن تغلق شاہ کے بعد اس کا چچیرا بھائی سلطان ابو المظفر فیروز شاہ تغلق (۷۵۲-
۷۹۰ھ/۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) تخت نشین ہوا۔ اس کا بھی شاہی لقب سکوں کی عبارت
میں مفقود ہے، بلکہ سکوں میں اسے فیروز شاہ "سلطانی" سے یاد کیا گیا ہے، جو اس کے
مروجہ مفہوم کے پیش نظر معمول کے خلاف بھی نظر آتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر سلاطین دہلی
یا صوبائی حکومت کے بادشاہوں سے خاص طور پر وابستہ امیر اپنے نام کے ساتھ
لفظ سلطان کا اضافہ کرتے تھے۔

فیروز شاہ کے طلائی اور نقرئی سکوں میں اس کے نام کے ساتھ خلفاء وقت الحاکم
بامر اللہ ابو العباس، المعتضد باللہ ابو الفتح اور المتوکل علی اللہ ابو عبد اللہ کے
نام مرتسم ہیں۔ یہ سکے ۷۵۹ھ کے بعد جاری کیے گئے تھے یا کم از کم اس سے پہلے کا کوئی
نمونہ ہم تک نہیں پہنچا۔ ان دونوں قیمتی دھاتوں میں اس کے سکے معیاری وزن کے

ہیں۔ گو تعداد میں کم دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس مرکّب دھات اور تانبے
کے سکّے برابر تعداد میں حاصل ہوتے ہیں۔ مرکّب دھات کے سکّوں کا وزن عام طور
پر ۸۰ گرین ہے۔ اس سے کم وزن یعنی ۵۶ گرین وزن والے سکّے بھی اس نے
جاری کیے تھے، لیکن ان میں چاندی کی مقدار نسبتاً کم ہے۔ ان میں سے اکثر سکّے
دہلی ٹکسال میں ڈھالے گئے تھے۔ لیکن کچھ سندھ میں بھی مسکوک ہوئے۔ دیگر
ٹکسالوں کے سکّے بہت کم ملتے ہیں۔ فیروز شاہ کے تانبے کے کچھ سکّے تقریباً ۴۲ گرین
وزن کے ہیں۔ مگر یہ نہایت ہی نادر ہیں اگرچہ ڈیزائن، عبارت وغیرہ کی مختلف نوعیت
کی بنا پر یہ کئی قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں،
فیروز شاہ نے سونے اور مرکّب دھات کے کچھ ایسے سکّے بھی جاری کیے تھے، جن پر اس کے
ساتھ اس کے لڑکوں کے نام بھی پائے جاتے ہیں۔ ان سکّوں پر پہلے شاہزادہ فتح خاں
کا نام اور وفات کے بعد شاہزادہ ظفر خان کا نام شامل عبارت ہے؛ کچھ پر شاہزادہ
محمد شاہ کا نام بھی مرتسم ہے۔
فیروز شاہ کے جانشینوں میں سلطان غیاث الدنیا والدین تغلق شاہ بن فیروز شاہ
(۷۹۰ - ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۸ - ۱۳۸۹ء) سلطان فیروز شاہ ظفر ابن فیروز شاہ (۷۹۱ھ/
۱۳۸۹ء) سلطان ابوبکر شاہ بن ظفر شاہ (۷۹۱ - ۷۹۳ھ/ ۱۳۸۹ - ۱۳۹۰ء) سلطان
ابوالمجاہد محمد شاہ بن فیروز شاہ (۷۹۲ - ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۰ - ۱۳۹۳ء) سلطان سکندر شاہ
بن محمد شاہ (۷۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء) سلطان ابوالمظفر محمود شاہ بن محمد شاہ (۷۹۵ - ۸۱۵ھ/
۱۳۹۴ - ۱۴۱۲ء) اور سلطان نصرت شاہ سلطانی (۷۹۷ - ۸۰۲ھ/ ۱۳۹۵ - ۱۳۹۹ء)
کے سکّے پائے جاتے ہیں۔ ان میں صرف محمد شاہ اور اس کے بیٹے محمود شاہ کے چاروں
دھاتوں میں سکّے جاری ہوئے؛ اور تغلق شاہ، فیروز شاہ اور ابوبکر شاہ کے سونے،
مرکّب دھات اور تانبے میں؛ سکندر شاہ کے مرکّب دھات اور تانبے میں اور نصرت شاہ
کے سونے اور تانبے میں۔ ان سب بادشاہوں کے سکّے کم و بیش فیروز شاہ کے سکّوں کے
طرز کے ہیں، البتہ محمد شاہ نے مرکّب دھات میں ایک سکّے وزن یعنی ایک تولہ (۱۷۲٫۶

گرین) کا سکّہ جاری کیا تھا۔ ان میں سے اکثر سکّوں پر خلیفۂ وقت کے نام والی عبارت ملتی ہے اگر بعد میں خلیفہ کا نام محذوف ہوگیا اور صرف اس کے القاب "الامام امیرالمومنین خلدت خلافتہ" جیسی عبارت پر اکتفا کیا گیا۔ ان میں بادشاہ کو نائب امیرالمومنین کا لقب دیا گیا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان سکّوں میں کسی کی عبارت میں باستثنائے تغلق شاہ ان بادشاہوں کے شاہی القاب اور باستثنائے محمد شاہ اور محمود شاہ ان کی کنیت کا اظہار نہیں ہوا ہے۔ نیز ان سکّوں پر ٹکسال کے نام کا بھی التزام نہیں ہے، مگر کچھ پر ان کے دہلی میں مضروب ہونے کی صراحت کی گئی ہو۔

سلاطین سیّد خاندان (۸۱۷ - ۸۵۵ھ/۱۴۱۴ - ۱۴۵۱ء)

سیّد خاندان کے بانی خضر خاں (۸۱۷ - ۸۲۴ھ / ۱۴۱۴ - ۱۴۲۱ء) نے اپنے نام سے کوئی مستقل سکّہ جاری نہیں کیا۔ اس کے جانشین مبارک شاہ ۸۲۴ - ۸۳۷ھ/۱۴۲۱ - ۱۴۳۴ء نے بھی اپنی حکومت کے پہلے آٹھ سال تک کوئی سکّہ اپنے نام سے مضروب نہیں کیا، کم از کم آج تک ان کے اس زمانے کے سکّے دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے دورِ حکومت میں بھی فیروز شاہ تغلق کے نام کے تانبے کے سکّوں کا چلن رہا، کیونکہ ان کے ایسے سکّے ملے ہیں، جن پر نام تو فیروز شاہ کا ہے، لیکن سال خضر خاں اور مبارک شاہ کے عہد کے۔

مبارک شاہ کے اپنے سکّے ۸۳۲ھ کے بعد ضرب ہونا شروع ہوئے۔ اور اگرچہ اس کے طلائی، نقرئی اور تانبے سب طرح کے سکّے دستیاب ہوئے ہیں، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کا طلائی سکّہ معیاری وزن سے ذرا کم ہے، لیکن چاندی کے سکّے معیار کے مطابق ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ چاندی کے مقابلے میں سونا کمیاب اور گراں تھا۔ اس کے دریافت شدہ تانبے کے سکّے مختلف وزنوں کے ہیں۔ ۸۰ رتی اور ۴۰ رتی کے بجائے یہ ۹۶ رتی، ۴۸ رتی اور ۲۴ رتی وزن کے ہیں۔ مرکب دھات کا مبارک شاہ کا کوئی سکّہ آج تک نہیں ملا ہے۔

مبارک شاہ کا چاندی کا سکّہ اپنی ندرت کی وجہ سے نہایت اہم ہے۔ لیکن اس کی عبارت کے لحاظ سے کچھ بہت کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اس کے سامنے رُخ پر سلطان کا نام "السلطان الغازی المتوکل علی الرحمٰن" القاب کے ساتھ اور پشت پر گول زمین میں قرآن شریف کی سورۃ الفتح کی پہلی آیت "انا فتحنا لک فتح مبین (کذا)" اور حاشیے میں ٹکسال کا نام (دہلی) اور مضروب ہونے کا سنہ درج ہے۔ اس عبارت میں "الغازی" کا لقب اور قرآن شریف کی آیت کا شمول قابلِ توجہ ہے۔ اس کے برعکس اس کے چاندی کے سکّوں میں کوئی ندرت نہیں؛ وہ محمد شاہ بن فیروز شاہ تغلق کے اس جنس کے سکّوں کے مماثل ہیں یعنی سامنے طرف بلا تصریح نام خلیفہ یا جس عہد میں سکّہ مضروب ہونے کی طرف اشارہ کرنے والی عبارت ہوتی ہے پشت پر اس کے اپنے سونے کے سکّے کی اس سے نام وغیرہ پر مشتمل عبارت مرتسم ہے۔ تانبے کے سکّے بھی آخری فرمانرواؤں کے تانبے کے سکّوں کی طرز پر ہیں یعنی بعض پر اس کا اور ٹکسال کا نام اور بعض پر نائب امیر المومنین کے لقب کا اضافہ ہے۔ مبارک شاہ کا کوئی شاہی لقب یا کنیت اس کے سکّوں پر درج نہیں ہے۔

مبارک [illegible] کے جانشین سلطان ابو المجاہد محمد شاہ بن فرید (۸۳۷ - ۸۴۹ھ/۱۴۳۴ - ۱۴۴۵ء) کے چاروں دھاتوں میں سکّے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں اس کے طلائی سکّے ایک تولے کے معیاری وزن سے زرا بھاری ہیں اور یہی حال کسی حد تک دوسرے سکّوں کا بھی ہے۔ سکّہ شناسوں نے اس کی یوں توجیہ کی ہے کہ اس کے زمانے میں خود تولے کے وزن میں اضافہ عمل میں آنے سے ایسا ہوا ہوگا۔ مرکّب دھات بلّون کے سکّوں کے وزن میں تخفیف کی گئی، چنانچہ ۹۶ رتی کے بجائے ۸۰ اور ۳۲ رتی کے سکّے مسکوک کرائے گئے تانبے کے سکّوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ محمد شاہ کے بعض سکّوں میں اس کی کنیت ابو المجاہد ملتی ہے، لیکن شاہی لقب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

عبارت وغیرہ کے لحاظ سے محمد شاہ اور اس کے بیٹے اور خاندان سیّد کے آخری تاجدار سلطان علاء الدین عالم شاہ (۸۴۹ - ۸۵۵ھ/۱۴۴۵ - ۱۴۵۱ء) کے سکّے مبارک شاہ

کے سکّوں کی طرح کے ہیں۔ علاؤالدین عالم شاہ کا سونے کا کوئی سکّہ آج تک دستیاب نہیں ہوا۔

سلاطینِ خاندان لودی (۸۵۵ - ۹۳۲ھ / ۱۴۵۱ - ۱۵۲۶ء)

بانی خاندان لودی بہلول شاہ (۸۵۵ - ۸۹۴ھ / ۱۴۵۱ / ۱۴۸۹ء) کے سونے اور چاندی کے سکّے جاری ہونا آج تک محتاجِ ثبوت ہے۔ مرکّب دھات بلّون میں ۸۰ رتی (۱۴۴ گرین) کا خاص سکّہ ہے، جو کتبِ تواریخ میں بہلول کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں چاندی کی مقدار ۴۲ء۳ ۲۴ گرین ہے۔ ایک اور قسم ۳۲ رتی یعنی ۶ء۷۵ گرین وزن والے سکّوں کی ہے۔ تانبے میں اس کے مختلف اوزان کے سکّے پائے جاتے ہیں، جن میں سب سے بڑا ۱۴۴ گرین کا ہے۔ عبارت اور ساخت اور ہیئت وغیرہ کے لحاظ سے بہلول لودی کے یہ سکّے اپنے پیشرووں کے سکّوں کے مشابہ ہیں۔

یہی حال اس کے جانشینوں کے سکّوں کا ہے۔ سکندر لودی (۸۹۴ - ۹۲۳ھ / ۱۴۸۹ - ۱۵۱۷ء) کے تو صرف بلّون ہی کے سکّے ملے ہیں۔ ابراہیم شاہ (۹۲۳ - ۹۳۲ھ / ۱۵۱۷ - ۱۵۲۶ء) کے بلّون کے علاوہ چند گنتی کے تانبے کے سکّے بھی ملے ہیں، جو ایک نئے وزن یعنی ۱۱۵ گرین کے اور نئی شکل کے یعنی چوکور ہیں۔ ان کی عبارت بھی ماضی قریب کے تانبے کے سکّوں سے مختلف ہے یعنی سامنے کے رُخ پر بادشاہ اور اس کے والد کا نام اور پشت پر "السلطان بن السلطان" کا اعزازی لقب۔ ان سکّوں کے وزن اور چوکور شکل سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ پایۂ تخت دلی میں نہیں، مگر صوبۂ مالوہ میں مضروب ہوئے ہونگے۔

لودی خاندان کے آخری فرمانروا محمود شاہ بن سکندر شاہ (۹۳۵ھ / ۱۵۲۸ء) نے صوبۂ بہار میں پناہ لے کر کچھ دن وہاں سلطنت کی تھی۔ اس کا صرف ایک بلّون مرکّب دھات کا سکّہ ملا ہے، جو ۹۳۵ھ میں مسکوک ہوا ہے؛ بہلول لودی وغیرہ کے مرکّب دھات کے سکّوں کی قسم کا ہے۔

سلاطینِ خاندانِ سور (۹۴۵ - ۹۶۲ھ / ۱۵۳۸ - ۱۵۵۴ء)

۹۳۲ھ (مطابق ۱۵۲۶ء) میں بابر کے ہاتھوں لودیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا، مگر اس کا اور اس کے بیٹے نصیر الدین محمد ہمایوں کا زمانۂ سلطنت بہت مختصر رہا۔ ہمایوں کو فرید بن حسن سُور نے شکست دے کر ملک بدر ہونے پر مجبور کیا اور اس طرح خاندانِ سُور برسرِ اقتدار آیا۔ فرید (۹۴۵ - ۹۵۲ھ / ۱۵۳۸ - ۱۵۴۵ء) نے شیر شاہ کا خطاب اور فرید الدنیا والدین لقب اور ابو المظفر کنیت اختیار کی۔ بابر اور ہمایوں کے سکے ہندستان کی نسبت ایشیائی میانہ کے مغل سکوں سے زیادہ مماثل ہیں۔ غرض بابر اور ہمایوں کے تیرہ سالہ مختصر دور نے سلاطینِ دہلی کے سکوں کے تسلسل کو منقطع نہیں کیا۔ فنِ تعمیر کی طرح خاندانِ سُور کے سکے بھی گویا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

شیر شاہ سور جس طرح اپنے فلاحِ عامّہ کے کاموں کے لیے تاریخ ہند میں بلند مقام کا مالک ہے، اسی طرح فنِ تعمیر اور سکوں کے بارے میں بھی اسے خاص مقام حاصل ہے۔ اس نے نہ صرف سکوں میں معیار کی پائیداری قائم کی، بلکہ ان کی ساخت اور مناسبت کو بھی ملحوظ رکھا۔ اس نے وزن اور دھات کے بارے میں آخری چند فرمانرواؤں کے سکوں کی افراتفری اور خرابیوں اور نقائص کو دور کیا۔ اس ضمن میں اس کے عہد میں جو دور رس تبدیلیاں اور اصلاحات عمل میں آئی تھیں، ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) مرکب دھات بلّون کو جس میں آمیزش کی مقدار کی وجہ سے خرابی کے لیے زیادہ گنجائش نکل آتی تھی، اس نے یکسر ترک کر دیا۔ اس عہد کے بعد اس دھات میں سکّہ ڈھلنا بالکل متروک ہو گیا۔ اب سکے خالص چاندی یا خالص تانبے کے بننے لگے۔

(۲) اس اقدام سے پیدا ہونے والی صورتِ حالات پر قابو پانے کے لیے اب تانبے کے سکّے کا کثرت سے استعمال شروع ہوا، اور ساتھ ہی تانبے کے جزوی یعنی کم قیمت کے سکّے بھی جاری ہوئے۔ مثلاً تانبے میں آدھے بچے تھے، پانچویں، آٹھویں، دسویں، سولھویں، بیسویں، وغیرہ حصّے تک کے سکّے مضروب کیے گئے۔ ان میں سے کچھ دستیاب

ہوئے ہیں، اور کچھ کمیاب ہیں۔

(۳) تانبے کا ایک نئے وزن ۳۲۰ گرین کا سکہ جاری ہوا، جو بعد میں اکبر بادشاہ کے زمانہ میں دام کے نام سے موسوم اور معروف ہوا؛ اس کے جزوی سکّے بھی وسیع پیمانے پر مضروب ہوئے تھے۔

(۴) نقرئی ٹنکہ جسے اس نے روپیا کے نام سے موسوم کیا، قیمتوں کا معیار (اسٹینڈرڈ) قرار پایا۔ اس کے نصف، چوتھے اور سولھویں حصّے بھی مسکوک کرائے گئے، جن میں سے کچھ اب نایاب یا بہت کم یاب ہیں۔

(۵) شیر شاہ نے ٹکسالوں کی توسیع کی۔ سلطنت کے اہم مراکز میں ٹکسالیں قایم کیں۔ اس کے کچھ سکّوں پر (جن کو ان پر مرتسم "ٹکسال کے نام" جہاں پناہ" کی وجہ سے جہاں پناہ کہا جاتا ہے) اس سے سکّہ شناسوں کے نزدیک وہ ٹکسال مراد ہے، جو شاہی پڑاؤ یا لشکر سے ملحق یا متعلق تھی اور سفر میں اس میں سکّے مضروب کیے جاتے تھے۔ ایسی ٹکسال کو اکبر کے سکّوں پر "اردوے ظفر قرین" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اگر سکّہ شناسوں کا یہ خیال صحیح ہے، تو پھر "اُردو" ٹکسال سے سکّے جاری کرنے کا سہرا بھی شیر شاہ ہی کے سر ہے۔

(۶) وزن کے اعتبار سے شیر شاہ نے روپیا کے سکّے کا معیاری وزن (یعنی ۹۶ رتی کا) تولہ برقرار رکھا اور تانبے میں ۳۰۰ سے لے کر ۳۲۰ گرین وزن تک کے مختلف وزن کے سکّے جاری کیے۔ قیمت میں ایک روپیا چالیس تانبے کے سکّوں کے برابر شمار کیا جاتا تھا۔ شیر شاہ کے طلائی سکّے اس کے نقرئی سکّوں کے مقابلے میں بہت ہی محدود تعداد میں پائے جاتے ہیں، اور ان دستیاب شدہ نمونوں میں بھی سب کے اصلی ہونے میں سکّہ شناسوں کو تامّل ہے، بلکہ انھیں یقین ہے کہ ان کی اکثریت جعلی ہے اور اصلی سکّے صرف گنتی کے ہیں۔ اپنی ساخت، ہیئت عبارت وغیرہ کے اعتبار سے یہ طلائی سکّے اس کے نقرئی سکّوں کے مشابہ ہیں۔ شیر شاہ کے چاندی کے سکّے وافر تعداد میں دستیاب ہوتے ہیں، گو ان میں اسی کثرت سے تنوع یا قسمیں نہیں ہیں۔ شیر شاہ نے ان سکّوں کے سامنے رخ پر

کی عبارت میں کلمۂ توحید اور خلفائے راشدین کے اسماء کا التزام کیا اور پشت پر اس کا اپنا نام اعزازی اور شاہی القاب اور دعائیہ کلمہ۔ السلطان العادل فرید الدنیا والدین ابوالمظفر شیر شاہ۔ سلطان خلد اللہ ملکہ۔ دارالضرب کا نام اور ہندسوں میں سال ضرب شامل عبارت ہے۔ پشت پر اس کا نام "سری شیر شاہی" دیوناگری خط میں بھی مرقوم ہے۔ کچھ سکّوں میں خلفائے راشدین کے نام کے ساتھ ان کے مخصوص القاب یا نام بالترتیب الصدیق، الفاروق، العفّان (حضرت عثمان کے والد) اور المرتضیٰ کا بھی اضافہ ہے۔ ان سکّوں میں کلمہ وغیرہ سامنے کے رُخ اور پشت پر بادشاہ کا نام گول سکّوں پر چوکور زمین میں مرتسم ہے اور حواشی میں عبارتوں کے باقی اجزا بالترتیب درج ہیں، چند سکّوں میں زمین گول مدوّر ہے۔

حال آں کہ شیر شاہ کے چاندی کے سکّے اتنی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں، ان کی بہت کم قسمیں دیکھنے میں آئی ہیں، یعنی ڈیزائن، ساخت اور ہیئت، عبارت، خطاطی، عبارت کی تنظیم وغیرہ کے لحاظ سے ان میں زیادہ تنوّع نہیں ہے۔ البتّہ ان سکّوں پر دارالضرب کے نام کا التزام ہے۔ اس کے برعکس جن سکّوں پر ٹکسال کا نام درج نہیں ہے، ان میں عبارت کی تنظیم میں کافی تنوع ملتا ہے۔

جن ٹکسالوں میں شیر شاہ کے سکّے مضروب ہوئے، ان کے نام یہ ہیں: اجین، آگرہ، پنڈوہ، چنار، نبھور، شنگاؤں شریف آباد، شیر گڑھ قلعہ، شیر گڑھ (قنوج) شیر گڑھ عرف حضرت دہلی، شیر گڑھ عرف شق بھکر، فتح آباد، کالپی، گوالیر اور رہتاس ان کے علاوہ دو تین اور ٹکسالوں کے نام والے سکّے بھی دستیاب ہوئے ہیں، لیکن یہ ٹھیک سے پڑھے نہیں جاتے۔ ان ٹکسالوں کے نام قیاساً کھیانور، رسول پور عرف حضرت پٹنہ اور قلعہ تاندہ جیسے پڑھے جاتے ہیں، مگر ان کی قرأت یقینی نہیں ہے۔ ایک اور ٹکسال کا نام ان سکّوں پر جہاں پناہ ملتا ہے، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ بعض حضرات اس سے قلعہ جہاں پناہ یعنی دہلی (پرانا قلعہ) مراد لیتے ہیں۔ لیکن "قلعۂ شیر گڑھ عرف حضرت دہلی" کے صریحی نام سے موسوم ٹکسال کے وہاں

موجود ہونے کی صورت میں ان کا یہ خیال قرینِ صحت معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے زیادہ قرینِ قیاس وہی بات ہے کہ جہانپناہ سے وہ ٹکسال مراد ہے، جو شاہی لشکر کے ساتھ چلتی تھی۔

شیر شاہ کے تانبے کے سکوں میں سامنے رُخ پر کلمہ اور خلفائے راشدین کے ناموں والی عبارت کے بجائے ایک نئی عبارت "فی عہد الامیر الحامی لدین الدیان" کا التزام کیا گیا اور پشت پر اس کا نام اور کنیت، ملک کے دوام کی دعا کے جملے کے ساتھ مرتسم ہے۔ چھوٹے سکوں میں مختلف عبارتیں ہیں۔ بعض میں خلیفۃ الزماں شیر شاہ السلطان کو رُخ اور پشت پر تقسیم کرکے مرتسم کیا گیا ہے۔ ان میں سے اکثر پر سالِ ضرب اور ٹکسالوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ اس دھات کے سکے آگرہ، الور، اودھ، بیانہ، چنار، حصار، سنبھل، شیر گڑھ (قنوج)، شیر گڑھ، قلعہ شیر گڑھ (دہلی)، کالپی، گوالیر، لکھنؤ، ملوٹ اور نارنول کی ٹکسالوں میں مسکوک ہوئے۔ ایک سکے پر ٹکسال کا نام "آبو" مرتسم ہونا بتایا جاتا ہے، لیکن اس کی قرأت کی صحت میں تامل ہے۔ چونکہ اس کا عکس نظر سے نہیں گزرا، اس لیے سردست اس کے بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی۔ اس مقام سے مراد ظاہراً راجستھان اور گجرات کی سرحد پر واقع مشہور پہاڑی مقام آبو ہے۔ ان کے علاوہ ایسے بیشمار سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں، جن پر کسی ٹکسال کا نام درج نہیں ہے۔

شیر شاہ کے سکوں کے مشاہدہ سے ایک اور بات قابلِ توجہ سامنے آتی ہے، یعنی ان کی عبارتوں میں املا کی اغلاط کی موجودگی۔ عام طور پر کتبوں کی طرح سکوں میں بھی صحتِ املا کا خاص اہتمام بلکہ التزام کیا جاتا تھا؛ اور سلاطینِ دہلی کے سکوں میں ناگری عبارتوں سے قطع نظر املا کی غلطی کی مثال شاید ہی ملے؛ اور یہی حال تقریباً ہندستان کے سارے اسلامی سکوں کا ہے۔ لیکن شیر شاہ کے سکوں میں یہ نقص پایا جاتا ہے جو تعجب خیز ہے، مثلاً عربی عبارتوں میں کہیں "سلطانہ" کی جگہ "سلطان"، (حضرت) "عثمان" کی جگہ "عسمان"، "الحامی" کی جگہ "الحاکمی"؛ الامیر کی جگہ، المیرو یا المیرۃ" منقوش

ملتا ہے۔

شیر شاہ کے جانشینوں کے سکّے بھی کم و بیش اسی طرز پر ہیں۔ اس کے بیٹے اسلام شاہ (۹۵۲ - ۹۶۲ھ/۱۵۴۵ - ۱۵۵۴ء) کے زمانے کی صرف دو تین نئی ٹکسالوں کے چاندی کے سکّے دستیاب ہوئے ہیں، دو بیانہ، ''الیسن'' اور نارنول ہیں۔ اس کے برعکس شیر شاہ کے زمانے کی تانبے کے سکّوں کی ٹکسالوں میں سے اجین، بندوہ، ''ستنبھور'' فتح آباد اور رلوٹ میں سے کسی کا اسلام شاہ کا سکّہ آج تک دستیاب نہیں ہوا۔۔۔

اسلام شاہ کے علاوہ سور خاندان کے جو فرمانروا ہوئے، یا جنھوں نے سکّے جاری کیے وہ محمد عادل شاہ یا عدلی (۹۶۰ - ۹۶۴/۱۵۵۲ - ۱۵۵۶ء) ابراہیم (۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء) اور سکندر شاہ سور (۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء) ہیں ان میں سے مؤخر الذکر دو بادشاہوں کے حاصل شدہ سکّوں کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے اور ان میں سے کسی کا طلائی سکّہ بھی آج تک نہیں ملا۔ اس سے قطعِ نظر ان سکّوں کی ساخت، ہیئت وغیرہ کے لحاظ سے بھی ان میں کوئی امتیازی بات نہیں ہے۔

استدراک

(بقیہ ص ۱۶ سے)

(مضمون '' مکاتیب تاج '')

تاج مرحوم نے (ڈراموں کی) جلد ہشتم میں جو حجاب کے ڈراموں کا مجموعہ ہے، یہ مجموعہ میرے نام معنون کرتے ہوئے یہ عبارت تحریر کی ہے:

دلی احسانمندی کے ساتھ پٹنہ کالج کے معلّم اُردو اور اخبار ''پھول'' کے پرانے مضمون نگار کے نام جنھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور پریشانیوں کے باوجود، ڈراموں کے اس انتخاب میں میری درخواست پر ثابت کردیا کہ ''پھول'' بھائیوں کا رشتہ کیسا مضبوط اور مخلصانہ ہے۔

سید حسن

مشفق خواجہ

گلشن مشتاق

شعرائے فارسی کا ایک نودریافت تذکرہ

برِّصغیر پاک و ہند کی ادبی تاریخ میں تیرھویں صدی ہجری کا نصفِ اوّل اس اعتبار سے اہمیّت رکھتا ہے کہ اس مدّت میں فنِ تذکرہ نگاری میں بعض نئے رجحانات نظر آتے ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے جامعیّت کو مدِّنظر بنایا اور اپنے تذکروں (مثلاً صحفِ ابراہیم از علی ابراہیم خلیل، مخزن الغرائب از شیخ احمد علی سندیلوی) میں زیادہ سے زیادہ شعرا کے تراجم جمع کیے ۔۔ دوسروں نے انتخابِ کلام کی جامعیّت کو ترجیح دی اور نظم کے ساتھ نثر کے نمونے بھی پیش کیے (جیسے خلاصۃ الافکار از ابوطالب خان اصفہانی)۔ بعض نے شعرا کے کلام کی نوعیّت کے اعتبار سے تذکرے مرتّب کیے، مثلاً تذکرۂ نوبہار از محمد رفیع الدّین، ان شعرا کا تذکرہ ہے جن کا کلام عارفانہ ہے، اور نشترِ عشق از عاشق عظیم آبادی میں صرف عاشقانہ کلام جمع کیا گیا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے صرف معاصر شعرا کے حالات و کلام کی جمع آوری تک اپنے کام کو محدود رکھا۔ جیسے سفینۂ ہندی از بھگوان داس ہندی یا طبقاتِ سخن، طبقہ دوم از مبتلا میرٹھی۔ اسی طرح بعض ایسے تذکرے بھی ملتے ہیں جن میں شہروں کے اعتبار سے شعرا کے حالات لکھے گئے ہیں۔ (جیسے ریاض الوفاق از مست بنارسی اور گلدستۂ کرناٹک از غلام علی موسوی رضا فائق)

تذکرہ نگاروں کے ان رجحانات کی وجہ سے اگر ایک طرف شعرا سے ذاتی واقفیت کی بنا پر

ان کے حالات جامعیت کے ساتھ سامنے آگئے، تو دوسری طرف کلام کے براہِ راست مطالعے کے نتیجے میں خاصا ادبی سرمایہ محفوظ ہو گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ برصغیر میں تذکرہ نگاری کے مذکورہ زرّیں عہد کے بیشتر تذکرے تاحال شائع نہیں ہوئے، اور وہ دنیا کے مختلف کتابخانوں میں مخطوطات کی صورت میں محفوظ ہیں۔ بعض تذکرے ایسے بھی ہیں جن کے نام سے ہم واقف ہیں، لیکن اب وہ ناپید ہیں اور بعض یقیناً ایسے بھی ہوں گے جن کا ذکر آج تک کہیں نہیں آیا۔ "گلشنِ مشتاق" ایک ایسا ہی تذکرہ ہے، جسے پہلی مرتبہ متعارف کرایا جا رہا ہے۔ یہ تذکرہ حافظ علی مشتاق کی تالیف ہے اور خود مصنف کا مکتوبہ نسخہ راقم کے پیشِ نظر ہے۔ یہ اس تذکرے کا واحد نسخہ ہے جو دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے۔[1]

مشتاق نے اس تذکرے میں اپنا احوال نہایت مختصر لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

محمد حافظ علی بن الحکیم محمد حسن رضا بن القاضی غلام مصطفیٰ الصدّیقی الحنفی النغلشوی ثم الہندی الملیح آبادی۔

خاندانِ مشتاق کے افراد کے پاس جو خاندانی یادداشتیں اور شجرۂ نسب ہے، ان کے مطابق خاندان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہے۔ اس خاندان کے تین افراد (بدیع الدین آہن دوش، حاجی عبدالفتاح اور حاجی احمد) نوشور سے سیری نگر (بعد ازاں ملگرام) آئے، جہاں انھوں نے راجہ سیری سنگھ کو قتل کر کے اس علاقے پر

---

[1] یہ تذکرہ اور مشتاق کی دوسری تصانیف کے قلمی نسخے اور دیگر دستاویزات ڈاکٹر قاضی فضل عظیم کے کتابخانے (کراچی) میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف قاضی احمد رضا کے پرپوتے ہیں، جو حافظ علی مشتاق کے حقیقی بھائی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی قاضی محمد شمیم صاحب کی عنایت سے میں نے مذکورہ کتابخانے کے نوادر سے استفادہ کیا ہے۔ اس مقالے میں جہاں کہیں بھی خاندانِ مشتاق کی دستاویزوں کا ذکر آیا ہے، وہ اسی کتابخانے میں موجود ہیں۔

قبضہ کر لیا[2]۔ بلگرام میں ان کا اوپر کوٹ نامی بستی میں قیام تھا۔ یہاں سے حاجی بدیع الزّماں آہن دوش موضع کوری آئے اور تمام باشندوں کو تہ تیغ کر کے اس علاقے پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے اس کا نام ملیح آباد رکھا۔ مشتاق کا خاندان پانچویں صدی عیسوی کے آغاز سے ملیح آباد میں آباد ہے۔

خاندانِ مشتاق میں جو شاہی اور خاندانی دستاویزیں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ منصبِ قضا اس خاندان میں موروثی ہے۔ مشتاق کے جدّ امجد قاضی محمد زماں تھے۔ ان کے بیٹے قاضی محمد عوض ہوئے اور پھر ان کے بیٹے قاضی غلام مصطفیٰ جو حاجی بدیع الزّماں آہن دوش کی چھبیسویں (۲۶) پشت میں تھے۔ مشتاق انھیں غلام مصطفیٰ کے پوتے تھے۔

مشتاق کے والد کا نام حکیم حسن رضا تھا۔ ان کی پیدائش ۲۲ جمادی الاول، ۱۱۸۸ھ (یکم اگست ۱۷۷۴ء) کی ہے اور وفات ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸-۱۸۳۷ء) میں ہوئی۔ (یادداشت بقلمِ مشتاق) مولوی محمد علی عرش ملیح آبادی نے واقعاتِ ملیح آباد[3] میں قاضی حکیم حسن رضا کے بارے میں یہ اطلاعات فراہم کی ہیں[4]:

جب آپ کے والد کا انتقال ہوا تو عہدۂ قضا آپ پر حسبِ فرمان...[5]

۲۔ منشی محمد محمود احمد عثمانی بلگرامی کے بقول بلگرام کے متعدد خاندان فتحِ بلگرام کو اپنے اجداد کا کارنامہ بتاتے ہیں اور تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ ۴۰۹ ہجری مطابق ۱۰۱۸ء عہدِ سلطان محمود غزنوی میں بلگرام کی فتح واقع ہوئی۔ (تنقیح الکلام فی تاریخ خطۂ پاک بلگرام: ۴۰)

۳۔ محمد علی عرش ملیح آبادی، "واقعاتِ ملیح آباد" قلمی بخطِ مصنف، مخزونہ نیشنل میوزیم آف پاکستان، ذخیرۂ انجمن ترقیِ اردو، کراچی۔

۴۔ واقعاتِ ملیح آباد: ۵۸-۵۹

۵۔ یہ جگہ اصل مخطوطے میں خالی ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، قاضی حافظ علی کی پیدائش (۱۲۲۰ھ) کے بعد حکیم حسن رضا عہدۂ قضا پر فائز ہوئے تھے۔ یہ تقرر اکبر شاہ ثانی (۱۲۵۳-۱۲۲۱ھ) کے فرمان پر ہوا ہوگا۔

بادشاہِ دہلی منتقل ہوا۔ لیکن آپ نے گوشۂ عافیت میں رہنا پسند کیا۔
اور عبادتِ الٰہی کو مقدّم سمجھ کر اپنے بڑے بیٹے قاضی حافظ علی کو اس خدمت
کے لیے منتخب کیا۔ چونکہ اس وقت قاضی حافظ علی صغیر سن تھے، اس
وجہ سے تھوڑے زمانے تک خود ہی اس خدمتِ جلیلہ کو انجام دیتے
رہے ۔۔۔۔ قاضی حسن رضا مرحوم علوم معقول و منقول میں کافی دستگاہ
رکھتے تھے۔ اور قابلِ عظمت و وقعت تھے۔ آپ کے مکاتیب دو قرطیس
بطور یادگار اس وقت تک خاندان میں محفوظ ہیں، جن کے دیکھنے سے
ایک بڑی عقل والا شخص بھی حیران ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ آپ حکیم بھی
تھے لیکن اس فن سے کبھی آپ نے کام نہیں لیا۔ خطِ نسخ و نستعلیق میں
خوش نویس تھے۔ تین قرآن شریف آپ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے
دیکھنے میں آئے، جن کے دیکھنے سے یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ یہ خطِ ولایتی
نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو تصوّف سے زاید شوق تھا، اور بہت بڑے
صوفی مشرب تھے ۔۔۔۔ نہایت متقی پرہیزگار تھے۔

قاضی حافظ علی مشتاق ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء - ۱۸۰۶ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی
تاریخِ پیدایش کا قطعہ لکھا تھا، جو ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ قطعہ یہ ہے:

تاریخِ تولّدم بر آمد	از مصرعِ شیخِ کیش خوانم
اعداد "دی" اندر آن فزوده	"من سعدی آخر الزّمانم"
۱۶	(۱۶ + ۱۲۰۴ = ۱۲۲۰ھ)

پیدایش کے چند سال بعد مشتاق کی تعلیم شروع ہوئی۔ متداولہ درسیہ کتب ختم
کرنے کے بعد، اپنے والد سے فقہ و حدیث کا درس لینا شروع کیا اور کچھ عرصے میں اس
سے بھی فراغت پائی۔ قرآن شریف حفظ کیا۔ فنِ تجوید میں بھی مہارت حاصل کی۔

۲۔ قاضی محمد [illegible] صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے فنِ طب بطورِ پیشہ بھی اختیار کیا تھا اور
نواب صاحب باندا کے پاس معالجِ خاص کی حیثیت سے ملازم تھے۔

اور علم و فضل میں ایسا کمال حاصل کیا کہ اپنے والد کے ہم پلّہ سمجھے جانے لگے۔ کم عمری ہی میں مشتاق کے والد نے عہدۂ قضا ان پر منتقل کر دیا تھا لیکن جب تک بالغ نہیں ہو گئے، اس عہدے کے فرائض ان کے والد ہی انجام دیتے رہے۔ بالغ ہونے کے بعد مشتاق نے ان ذمّے داریوں کو خود سنبھال لیا۔ مشتاق کو مولوی سیّد احمد شہید بریلوی سے بیعت تھی۔
۹ جمادی الاوّل ۱۲۷۶ھ (دسمبر ۱۸۵۹ء) کو وفات پائی۔

مشتاق کو مذہب کے ساتھ ساتھ ادبیات سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ اُردو اور فارسی، دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ حافظ اور مشتاق دو تخلّص تھے، اگرچہ حافظ کم اور مشتاق زیادہ استعمال کرتے تھے۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ شاعری میں کس کے شاگرد تھے۔

مشتاق کی جو تصانیف موجود ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ دیوانِ اردو:

مشتاق نے اپنا دیوان اُردو ۱۲۵۷ھ میں مرتّب کیا تھا۔ دیوان کا جو نسخہ محفوظ ہے، وہ خود مشتاق کے قلم سے ہے۔ سائز ۷؍۸ x ۵؍۶" ہے اور اس میں ۱۹۶ صفحات ہیں۔ اس کے آخر میں ص ۱۹۳ پر ترتیبِ دیوان کی تاریخیں ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے:

شکرِ خدا چوں نہ کنم زان کہ دست ۔۔۔ داد بہ ترتیبِ غزل با فراغ
فکر چو کردم پئے تاریخِ آں ۔۔۔ بلبلِ دل گفت: گلِ چار باغ
(۱۲۵۷)

یہ نسخہ عمدہ حالت میں ہے۔ حمد اور نعت کے اشعار کے بعد غزلیات ہیں۔ آخر میں چند قطعات، رُباعیات اور فردیات ہیں۔ اس نسخے کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں مصنّف نے جا بجا ترمیم و اصلاح کی ہے۔ کوئی صفحہ ایسا نہیں، جس پر مصنّف نے دو ایک مصرعوں میں جا بجا ترمیم نہ کی ہو۔ متعدّد صفحات پر حواشی میں بھی اشعار اضافہ کیے گئے ہیں۔
مشتاق کی شاعری کا عام رنگ وہی ہے، جو ناسخ اور ان کے تلامذہ کا ہے۔ روایتی مضامین کو روایتی زبان میں پیش کیا ہے۔ ذیل کے اشعار سے ان کے رنگِ کلام کا اندازہ

۷۔ واقعاتِ ملیح آباد: ۵۹

کیا جا سکتا ہے:

ہے بادۂ الفت سے بھرا جام ہمارا | گر یار ہو ساقی تو بنے کام ہمارا
ہم گوشۂ عزلت میں جو بیٹھیں، تو عزّت | مشہور ہو عنقا کی طرح نام ہمارا
کچھ قدر جوانی کی نہ کی ہم نے، عزیزو! | کیا مفت گیا، ہائے وہ ہنگام ہمارا

۲- دیوانِ فارسی:

فارسی دیوان بھی اُردو دیوان کے ساتھ ہی مجلّد ہے اور یہ ۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی حمد و نعت کے بعد غزلیات ہیں۔ ہر غزل کا عنوان سرخ روشنائی سے ہے جو بحر کے نام اور وزن کی صراحت پر مشتمل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشتاق کو عروض سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ دیوانِ فارسی میں بھی جا بجا اصلاحیں ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

بخلوتخانۂ دل ظرف را ہے کردہ ام پیدا
دراں اقلیم ویراں بادشاہے کردہ ام پیدا

جلوہ بطرفِ بام دہ، تازہ بتازۂ نو بنو | خجلتِ مہِ تمام دہ، تازہ بتازہ نو بنو
ہاں بکرشمہ دلبرا! نرگسِ سُرمہ سائے را | رخصتِ قتلِ عام دہ، تازہ بتازہ نو بنو

روئے تو، صفِ صفِ دا برو، گرہ گرہ | موئے تو، حلقہ حلقہ و گیسو، گرہ گرہ
از لعبِ پیچ پیچِ تو، سنبل بہ پیچ و تاب | در طرۂ تو، نافۂ آہو، گرہ گرہ

شدم در عشقِ تو رسوا، دگر از من چہ می خواہی
غریبم، بیکسم، تنہا دگر از من چہ می خواہی
ز ہجرت، اے ستم گارہ! منِ مسکینِ بیچارہ
دمے دارم بصد پارہ، دگر از من چہ می خواہی

گلشن مشتاق

چو رہ نہ بوصل یار آدم بجگر و تا لہ اندادم
لی خستہ بیاد م، دگر از من چہ می خواہی
شدم نا آشنا لے تو اکشم رنج از برائے تو
نہادم سر بپائے تو، دگر از من چہ می خواہی

مشتاق، ۱۲۵۰ء کے بعد بائیس برس تک زندہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اس طویل عرصے میں بھی انھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا۔ یہ کلام کہیں یکجا مرتب نہیں ہے۔ خاندانِ مشتاق میں جو کاغذات ہیں، ان میں متعدد پرچوں پر ان کا اُردو اور فارسی کلام انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا محفوظ ہے۔ یہی ۱۲۵۰ھ کے بعد کا کلام ہوگا، جسے مشتاق کو مرتب کرنے کا موقع نہیں ملا۔

۴۔ چمنستانِ افکار

یہ شعرائے فارسی کا انتخاب ہے جو ۲۵ء۱۱ × ۷″ سائز کے ۲۳۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کا ترقیمہ یہ ہے: تم الکتاب بعون اللہ الوہاب فی یوم السبت فی الحادی والعشرین من ذی الحجہ ۱۲۷۲ ہجری، کاتب الحروف محمد حافظ علی عفا اللہ عنہ۔

اس مخطوطے میں بھی حواشی پر جابجا اضافے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے ۱۲۷۲ھ کے بعد اس پر نظرِ ثانی کی ہے۔ اس کتاب کی نثری تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق نے اس کی تالیف کا کام ۱۲۷۱ھ میں شروع کیا تھا۔ اس تمہید کے بعض ضروری حصے یہاں درج کیے جاتے ہیں:

> ناطقۂ بشری را چہ یارائے تقریر کہ با دائی حمدِ جنابِ احدی پردازد، نے خشک خامہ را چہ دستِ تحریر کہ نقشِ نعتِ احمدی طرازد۔ پس من شکستہ پائے را درین رہ دو عرصۂ دشوار گزار قدم نگذاشتن اولیٰ تر،
> بقولِ قائلی:
>
> زلافِ حمد و نعت اولیٰ است ناچار ک ادب گفتن
> بسجود سے میتوان کردن، درود سے میتوان گفتن

..... اما بعد می گوید کمترین خلائق آفاق محمد حافظ علی مشتاق .....
اکثر اوقات بخاطر فاتر این ہیچ میرز میگذشت کہ ہر قدر غزلیات منتخبی
شعرائے پارسی گوی چہ اہل زبان و چہ غرابیان در ہنگام شباب و
زمان قوت انتخاب بر کاغذ پارہ ہا مرقوم نمودہ ام، و بزنگ لولوی منثور
منتشر افتادہ است، در یک جا فراہم ساختہ کتابے ترتیب دہم، تا
شائقان را بمطالعۂ آن سرور قلب افزا بد و نظارگیان جمال شاہد سخن را
جلوۂ زنگار زنگ نماید۔ لیکن نقش بندی این عزیمت از رہ گزر قلت
فرصت و کثرت عواید و موانع و ہجوم افکار تا چند سال بر صفحۂ اوراق
مادہ نمایان و آشکار نگشت۔ اکنون کہ در عالم پیرانہ سری آثار برزخیہ
بین الموت و الحیات پیش نظر دیدم، ترسیدم ازان کہ مبادا حصول
این امنیت دلی بوجوہ مرقومہ تا دم مفارقت روح از قالب عنصری
صورت نہ بندد، و حسرت این معنی در حال مشتاق بماند۔ ناچار
در سنۂ یک ہزار و دو صد و ہفتاد و یک ہجری بہر کیف کہ توانست
شد، این سفینہ را مرتب نمودہ بہ "چمنستان افکار" موسوم ساختم و
طرح تاریخ ترتیب آن در ین قطعہ انداختم:

ز دست و خامۂ حافظ علی بعون خدائے   رقم شد ز غزل ہا کتاب پاکیزہ
سروش گفت بہ مشتاق سال ترتیبش   "گل چین کردۂ انتخاب پاکیزہ"

(۱۲۷۱)

ختم داشت از ناظران این مجموعۂ غزلیات دلکش آنست کہ در حق مؤلف
مسکین دست بدعائے حسن خاتمہ دراز فرمایند۔۔۔ (ورق ۱، ب و ۲۔ الف)

اس مجموعے میں مشتاق نے اساتذۂ جدید و قدیم ایران و ہند کی ہم طرح غزلوں کو
ردیف وار مرتب کیا ہے۔ اور ہر زمین کی غزلیات کے آخر میں اپنی بھی ایک غزل درج
کی ہے۔ جن شعرا کی غزلیات اس مجموعے میں ملتی ہیں، اُن کے نام یہ ہیں:

جامی، فغانی، فارغ، فائض، ہلالی، خواجہ ہجری، سیفی،
مجذوب تبریزی، واقف، شاہ حسین صوفی، عرفی، نظیری،
صائب، فرخ، امانی، قزلباش خان امید، شائق، شمس الدین
فقیر، غضنفر بلگرامی، امیر خسرو، سخنور بلگرامی، شوکت بخارائی،
خواجہ حسین ثنائی، ہیلی ہروی، محتشم کاشی، مشتاق اصفہانی،
مخفی، جلال اسیر، مرزا بیدل، طالب علی عیش، صائب بلگرامی،
املی، محمود، آہی، افسری، شاہی، طوسی، نرگسی، ناصر علی،
مرزا فاخر مکین، حسن دہلوی، سلمان ساوجی، قدسی، کلیم،
سلیم، وحشی، عنایت، زائر، غالب، مجذوب، امیر،
خواجہ میر درد، حافظ، حزیں، متین، مرزا قتیل، توفیق کنیرلی
آصفی، عادی، فانی، طاہری، ظہوری، مظفر، حیدری تبریزی
محمد باقر آگاہ، جلال، طالب آملی، عنایت، شیخ غلام مینا،
ساحر، نظام خاں معجز، شنائی، لسانی، نوا، سید ابوسعید
والہ، شیخ سعدی، حکیم شفائی، مرزا ناطق، مرزا مظہر،
قاسم، نعمت خان عالی، محمد مستقیم لائق، آزاد، فیضی، مخفی،
احمد، خاقانی، موجد مولانی، مرزا ذکریٰ لکھنوی، فدائی، سالک
عالم، محوی، مرزا احمد خرم، محمد صادق مدہوش، محمد باقر شہید
خوش دل، شرف الدین بوعلی قلندر، ملامعین، وحید،
نواب محبت خان محبت۔

ان میں بعض شعرا کی متعدد غزلیں اس انتخاب میں ہیں۔ یہ انتخاب حقیقتاً محنت
سے کیا گیا ہے اور مشتاق نے جملہ شعرا کے دواوین سے براہِ راست ان کا کلام لیا ہے۔
خاندانِ مشتاق میں مشتاق کے ذاتی کتابخانے کی جو فہرست ہے، اس میں مذکورہ بالا
شعرا میں سے بیشتر کے دواوین کے نام موجود ہیں۔ یہ انتخاب اس اعتبار سے بھی اہمیت

رکھتا ہے کہ اس میں بعض ایسے شعرا کے کلام محفوظ ہو گیا ہے جو اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ اس انتخاب کی نوعیت کا اندازہ ایک مثال سے کیا جا سکتا ہے "ستانہ را" "پروانہ را" کی زمین میں ۲۶ شعرا کی غزلیں درج کی گئی ہیں۔ ان غزلوں کے مطلعے یہاں درج کیے جاتے ہیں، تاکہ مشتاق کی محنت کا اندازہ کیا جا سکے:

امیر خسرو: باز دل گم گشتہ در کوئیش من دیوانہ را
از کجا گردم نگاہ آن شکلِ قلاشانہ را

حسن دہلوی: باز مستِ عشقِ خود کرد می من دیوانہ را
ز آتش غم سوختم، ہم رخت را، ہم خانہ را

جامی: رخنہ کردی دل بقصدِ جان من دیوانہ را
دُزد آرے بہر کالا می شگافد خانہ را

سلمان ساوجی: محتسب گوید کہ بشکن ساغر و پیمانہ را
غالباً دیوانہ می داند من دیوانہ را

قدسی: کو سرانجامی کہ شب روشن کند کاشانہ را
آورم شمع، بدست آورم دلِ پروانہ را

کلیم: دوش گم کردم ز بیہوشی رہ کاشانہ را
یافتم باز از نوائے جغد آن ویرانہ را

عرفی: گریہ بر جوشانم و شویم دل دیوانہ را
تا کنم آرایش از بہر صنم بتخانہ را

نظیری: از پے آشوب ما در زلف دارد شانہ را
شورش زنجیر در شور آورد دیوانہ را

میلی: چشم مستِ نازنین شد من دیوانہ را
کز نگاہِ آشنا زد راہ صد بیگانہ را

گلشنِ مشتاق

سلیم:
اختر از عشق کے باشد دلِ دیوانہ را
شعلہ از مشتی بود مہتاب این ویرانہ را

وحشی:
خانہ پُر بود از متاعِ صبر این دیوانہ را
سوخت عقلِ خانہ سوز اوّل متاعِ خانہ را

صائب:
از سر و سامان چہ می پرسی منِ دیوانہ را
ہوش می برداشت از جا سقفِ این میخانہ را

عنایت:
از صفا برکس نمی بندم درِ کاشانہ را
کردہ ام تعمیر چون آئینہ مہمانخانہ را

زاہد:
دادہ ام دست از ادب تا پیرِ صہبا خانہ را
کردۂ طوقِ گلوے خود خطِ پیمانہ را

ہلالی:
گر نمک ریزد بہ خُم، گر بشکند پیمانہ را
محتسب تا چند در شور آورد میخانہ را

غالب:
لیکہ دارد عشق در ماتم منِ دیوانہ را
قطرہ ہائے اشک می دانم بجز من دانہ را

ہجری:
باز کن از خواب تا ناز آن نرگسِ مستانہ را
تا ازین دیوانہ تر سازی منِ دیوانہ را

مجذوب:
ساقیا! تا می توانی پُر بدہ پیمانہ را
تا ازین دیوانہ تر سازی منِ دیوانہ را

اُمید:
دل ز غم خالی شود چون پُر کنم پیمانہ را
کے دہم از دست، ساقی! عشرتِ میخانہ را

شوکت:
صبحِ پیری بر دمید از کف بنہ پیمانہ را
مرہمِ کافور شد موے تو زخمِ شانہ را

بیدل:	ساختم قانع دل از عافیت بیگانہ را ترک بیدی فرش کردم خانۂ دیوانہ را
واقف:	سرکشی چون در گلستان غارت ترکانہ را چشمِ مخمورِ تو از نرگس گشد پیمانہ را
خواجہ میر درد:	می کند ہر کس نصیحت ہا منِ دیوانہ را این نمی آید کہ فہماند کسی جانانہ را
تمکین:	عشق یغما می کند صبرِ دلِ دیوانہ را رہزنِ غارت نماید رہبرِ ویرانہ را
عیشی:	عارضش خورشید سازد روزنِ کاشانہ را کاکلش خواب پریشاں می نماید شانہ را
مشتاق:	آن پری پیکر کہ برد از کفت دل دیوانہ را کردہ مجنون عشق او چون من بسے فرزانہ را

مذہبی تصانیف:

محمد علی عرشی ملیح آبادی کا بیان ہے کہ مشتاق نے تصوف، فقہ اور حدیث کے مسائل پر بھی چند رسالے لکھے تھے۔ ان میں سے اب صرف ایک رسالہ "تبصرۃ المسلمین" محفوظ ہے۔ یہ فارسی میں ہے اور اس میں نماز اور روزے کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس رسالے کا جو مخطوطہ محفوظ ہے، وہ مصنف کا اصل مسودہ ہے۔ یہ ناقص الآخر ہے اور ۲۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی جا بجا ترمیمیں اور اضافے کیے گئے ہیں۔

گلشنِ مشتاق:

یہی وہ تذکرۂ شعرائے فارسی ہے جو اس مقالے کا موضوع ہے۔ اس کے مخطوطے کا سائز $\frac{1}{2}$۹" × $\frac{1}{2}$۶" ہے؛ اوراق ۹۹ ہیں؛ ورق ۱ (الف و ب) اور ورق ۲ (الف) سادہ ہیں۔ متن ورق ۲ (ب) سے شروع ہوتا ہے اور ۹۹ (الف) پر ختم ہوتا ہے۔ ۹۹ (ب) سادہ ہے۔ آغاز کی عبارت یہ ہے:

۲۸۔ واقعات ملیح آباد: ۵۹

گلشن مشتاق

الحمد للّٰہ علی نوالہ والصلوٰۃ علی من بلغ العلی بکمالہ وعلی آلہ ومن سلک
علی طریقہ وخصالہ ۔ امّا بعد می گوید بندۂ ہیچ مدان غرقہ دریای عصیان
مسکین خاکسار امیدوار مغفرت آمرزگار دردمند دلی، محمد حافظ علی
المتخلص بمشتاق صانہ اللّٰہ عن حوادث الآفاق کہ اکثر اوقات بخاطر فاتر
فقیر می گذشت کہ کتابی مشتمل بر ذکر احوال شعرای متقدمین و متاخرین
تالیف باید کرد، لیکن عدیم الفرصتی خار راہ گام فرسائی و ر وادی این
تمنا بود ۔ درین ولا کہ باتفاق حسنہ تذکرۂ "نشتر عشق" مولفہ حسین
قلی خان عظیم آبادی از نظر احقر گذشت ۔ بمشاہدۂ طرز شگفتہ اش
بس مسرور و شگفتہ خاطر شدم ۔ الحق نشتر عشق است کہ دم مطالعہ
نشتر و درد رگ جان دیوانہ مزاجان می زند ۔ چون آن را بملاحظہ بعضی
از دوستان صمیمی در آوردم، ایشان تکلیف بر اتمام آنم دادند کہ اگر تو نیز
بہمین طرز تذکرۂ جدید فراہم نمائی، از تو یادگاری در بر مانند باشد،
یقین کہ بحکم لکل جدید لذۃ، قاری و سامع را لذتی بخشد ۔ بندہ
حسب فرمایش ایشان کمر ہمت چست بمیان بر زدہ در عرصۂ قلیل ۔ از آغاز
سنۂ یک ہزار و دو صد پنجاہ و یک ہجری کتابی مختصر بطریق انتخاب از
تذکرۂ مذکور محتوی برخی از احوال اساتذۂ سلف و خلف اہل فارس
و شعرای ہند مشحون بمقالات مطبوعہ آنہا کہ عاشقانہ و صاف بود،



بقید تحریر در آوردہ بہ "گلشن مشتاق" موسوم کردم و بجای او
بمناسبت نام گلدستہ قرار دادم ۔ طرفہ این کہ سال تاریخ ترتیب
این روضۂ دلکشا نیز از ہمین اسم فقط بزیادت "یای" نسبتی بر می آید
چنان کہ این رباعی بران ناطق است :

رباعی در گفتن تاریخ بعالم طاقی

اے آن کہ بنظم شہرہ آفاقی
تاریخ فراہمی این تذکرہ ام
مشتاق بگفت: "گلشن مشتاقی"
(۱۲۵۱)

باید دانست کہ ہر چند راقم را از شنیدن نام و کلام ہنود نفرتِ تمام است، لیکن چون مقالاتِ بعضی از شعرای این فرقہ بامزہ دیدم و مطبوعِ طبعِ موزونم افتاد، قطعِ نظر از کافر کیشیِ آنان کردہ، ذکرِ نام و ایرادِ کلام آنہا درین نسخہ چندان قبحی ندانستم۔ چشمِ رافت از تماشائیانِ این گلزارِ ہمیشہ بہار آنکہ اگر جائے سہوی و خطائی در یابند، با صلاح کوشند۔ و اگر از مطالعۂ این دفترِ بہر تفریحِ طبع و خوشی وقت دست دہد، دست بدعا بر آورند، تا باشد کہ بیمنِ عالی ہمتی عاقبتِ این بیچارہ بخیر گردد۔ (ورق ۲ (ب) و ۳ (الف))

خاتمہ یہ ہے:

"للّٰہ الحمد والمنۃ کہ این تذکرہ بدستیاریِ خامۂ خام این مستہام باتمام رسید، و سمتِ اختتام پذیرفت۔ الٰہی، این گلشنِ بہار را از صدمۂ برگ ریزِ تلف و ضیاع نگاہ داری و از تند باد نظرِ نکتہ چینان بدنگاہ در حفظ و پناہ۔ لکاتبہ:

یارب، این گلشن ہمیشہ بہار ... کہ بود رُو کشِ ارمِ گلزار
تو نگہدارش از گزندِ خزان ... چشمِ بد نیز دور باد از ان

اگرچہ اسامیِ شعرای متفق التخلص و لقدیدیع متجانس التخلص را در یک جا بضبطِ تسطیر در آوردہ، لیکن بلحاظِ کثرتِ فراواں و ناتہ و رعایتِ تقدیم و تاخیر آن ملحوظ و منظور نماندہ۔ احیاناً اگر کلامِ کسی بنامِ دیگری بر آید، یا در اسامیِ شعرا و احوالِ ایشان جائے غلطی وارد شدہ باشد، مؤلفِ مسکین را مورد طعن نسازند، زیرا کہ این سہو منسوب بکسانی است کہ در سفاین خود دیا رقم نمودہ اند۔ و انی کتبت ما فی الکتاب واللّٰہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔ کاتب مؤلفہ المدعو بہ محمد حافظ علی عفا اللّٰہ عنہ" (ورق ۹۸ (ب) و ۹۹ (الف))

تے سے واضح ہے کہ مخطوطے کی کتابت خود مؤلف کے قلم سے ہے۔ خط نستعلیق، اوسط درجے کا ہے۔ کہیں کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے، تو حاشیے پر اضافہ کر دیا ہے۔ غلط ہوا ہے، تو اسے قلمزد کرکے اسی جگہ صحیح لفظ لکھا ہے۔ لیکن ترمیم و تصحیح کا عمل نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ مصنف نے اپنے کلام کے انتخاب میں خاصا اضافہ کیا ہے ورق ۸ (الف و ب) کے حواشی پر چالیس (۴۰) اشعار اضافہ کیے ہیں۔ بعض اشعار قلمزد بھی کیے ہیں اور کہیں کہیں اصلاح بھی دی ہے۔ شعرا کے تراجم الفبائی ترتیب سے ہیں، اور تذکرے کے نام کی مناسبت سے، جیسا کہ مذکورۂ بالا تمہید سے واضح ہے، ہر باب کو گلدستہ لکھا ہے۔ گلدستہ الف، گلدستہ با وغیرہ۔

تذکرے کی تمہید سے واضح ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۵۱ھ کے شروع میں لکھا گیا تھا۔ لیکن یہ سال اختتام ہے، مشتاق نے اس کام کا آغاز اس سے پہلے کیا تھا۔ تاریخ آغاز کے تعین میں شیخ غلام مینا ساحر کاکوروی کے ترجمے سے مدد ملتی ہے۔ اس میں مشتاق نے لکھا ہے:

> باستماع صیت اوصاف و کمالاتش از مدتی مشتاق لقاے او بودم و بارہا با خاطر می گذشت کہ بادی ملاقاتے باید کرد۔ لیکن افسوس کہ چون مشیت ایزدی نبود، دولت این آرزو نصیب این حسرت نصیب نشد یعنی در اثناے تالیف این مجموعہ ناگہان بگوشم خورد کہ بتاریخ...[9] شہر.... سنہ یک ہزار و دو صد و پنجاہ ہجری مینای حیاتش بسنگ حمات شکستہ گردید۔ (ورق ۴۲ (ب) و ۴۳ (الف)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ھ میں تذکرے کی تالیف کا کام جاری تھا۔ مشتاق نے تذکرے کی تمہید میں یہ بھی بتلایا ہے کہ اس کی تکمیل "عرصۂ قلیل" میں ہوئی۔ اس سے البتہ

۹۔ اصل میں تاریخ اور مہینے کے لیے جگہ سادی رکھی گئی ہے۔ ساحر کا انتقال مذکورہ سنہ کی ۲۳ ویں ذیقعدہ کو ہوا تھا۔

(مشاہیر کاکوروی: ۳۱۴)

گلشنِ مشتاق

یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ تذکرے کا آغاز ۱۲۵۰ھ کے شروع یا ۱۲۴۹ھ کے آخر میں ہوا ہوگا۔

بقول مؤلف یہ "اساتذۂ سلف و خلف اہلِ فارس و شعرائی ہند" کا تذکرہ ہے۔ شعرا کے تراجم کی مجموعی تعداد ۹۴۳ ہے۔ ان میں سے بیشتر شعراوہ ہیں جو کبھی برِصغیر پاک و ہند میں نہیں آئے۔ ہندی نژاد اور باہر سے آنے والے شعرا جن کا ذکر اس تذکرے میں ہے، مجموعی تعداد کے ایک تہائی سے کچھ زیادہ ہیں۔ "نشترِ عشق" جو گلشنِ مشتاق' کا بنیادی ماخذ ہے، اس میں شعرا کی تعداد ۱۴۸۰ ہے۔ گویا "گلشنِ مشتاق" میں "نشترِ عشق" سے ۵۸۳ تراجم کم ہیں۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ مشتاق نے انتخابِ اشعار کو معیار بنایا ہے، نہ کہ تعدادِ شعرا کو۔ عاشقی نے اپنے تذکرے میں "عاشقانہ اشعار" جمع کرنے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس کا نام "نشترِ عشق" رکھا تھا۔ مشتاق نے بھی عاشقی کی تقلید کی اور "اشعارِ عاشقانہ وصاف" کو معیار بنا کر یہ تذکرہ مرتب کیا تھا۔ مشتاق نے اپنے تذکرے کو "کتابِ مختصر" بھی لکھا ہے۔ یہ اختصار، شعرا کی تعداد میں کمی ہی کی وجہ سے ہو۔

مشتاق نے اپنے معیارِ انتخاب کی سختی سے پابندی کی ہے۔ اور کسی شاعر کا کوئی ایسا شعر درج نہیں کیا، جس میں عشق و عاشقی کی کیفیات بیان نہ کی گئی ہوں۔ صرف ایک جگہ سرمد کے انتخاب میں اس اصول سے انحراف ملتا ہے۔ مشتاق کو سرمد کے کلام میں کوئی ایسا شعر نظر نہ آیا، جو تذکرے کے "موافق" ہوتا۔ لہٰذا مجبوراً دو ایسے شعر درج کرنے پڑے، جو مضمون کے اعتبار سے تذکرے میں مشمولہ اشعار سے مختلف تھے۔ سرمد جیسے شاعر کو تذکرے میں شامل کرنا چونکہ ضروری تھا، اس لیے مشتاق کو اپنے قائم کردہ اصول کو توڑنا پڑا۔ مشتاق نے اپنی مجبوری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

۱۰۔ علی رضا نقوی: "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" (تہران ۱۹۶۴ء)، ۵۲۰
۱۱۔ "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" (محولہ بالا)، ۵۱۸

گلشنِ مشتاق

"چون موافق انتخاب تذکرہ رباعیات بدست نیامد، ازین جہت این دو بیت اکتفا رفت"۔ (۴۳ ب)

مشتاق نے متعدد ایسے معروف شعرا کو اپنے تذکرے میں جگہ نہیں دی، جن کے نام "گلشنِ مشتاق" سے پہلے کے بیشتر تذکروں میں نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ مشتاق کو اگر کسی شاعر کا ایسا شعر نہیں ملا، جو اُس کے قائم کردہ معیار کے مطابق ہو، تو اس شاعر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی غیر معروف یا معمولی شاعر کا کوئی اچھا شعر مل گیا، تو اس شاعر کو تذکرے میں جگہ دے دی ہے۔ احمد عبرت (شاگردِ بیدل) نوابوں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی یہ معاشرتی حیثیت بھی مشتاق کے نزدیک ایسی تھی کہ تذکرے میں ان کا احوال شامل کرنا مناسب تھا۔ لکھتے ہیں:

اگرچہ ذکرش در جنب اکابر شعرا خیلے نازیبا، لیکن بقولِ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ:

سگ اصحاب کہف روزے چند
پیِ نیکان گرفت: مردم شد

ایرادِ نام و کلامِ او درین مجموعۂ سخن داشتم" (ورق ۴۷ - الف)

مشتاق نے تمہید میں لکھا ہے کہ اس نے "نشترِ عشق" سے اپنا تذکرہ تیار کیا ہے۔ اس بنا پر "نشترِ عشق" کو "گلشنِ عشاق" کا بنیادی ماخذ سمجھنا چاہیے۔ لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ تذکرے کی تالیف کے دوران مشتاق کے پیشِ نظر صرف "نشترِ عشق" ہی رہا ہے۔ "گلشنِ مشتاق" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشتاق نے صرف "نشترِ عشق" ہی پر انحصار نہیں کیا، بلکہ متعدد دوسرے تذکروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض سے یقیناً بالواسطہ استفادہ کیا گیا ہوگا، اور یہ واسطہ "نشترِ عشق" ہی ہے؛ لیکن بیشتر تذکروں سے مشتاق نے براہِ راست استفادہ کیا ہے۔ اس سلسلے کی تفصیلات پیش کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم دیکھیں کہ "نشترِ عشق" سے جو استفادہ کیا گیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔

نشترِ عشق راقم کے پیشِ نظر نہیں ہے، جب تک دونوں تذکروں کا باہمی موازنہ نہ کیا جائے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مشتاق نے کس حد تک "نشترِ عشق" سے استفادہ کیا ہے۔ البتہ جن شعرا کے تراجم میں "نشترِ عشق" کا حوالہ موجود ہے، ان پر ایک نظر ڈالنے سے استفادے کی نوعیت کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ زیب النسا مخفی (۲۷۔ الف) کے دیوان بہ تخلص کی بحث میں "نشتر" کا ایک اقتباس ملتا ہے۔ مخفی کے ترجمے میں "مخزن الغرائب" کا بھی ایک اقتباس ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ترجمۂ مخفی میں "نشتر" سے جزوی استفادہ کیا گیا ہے۔

۲۔ ترجمۂ مولانا روم (۲۸۔ ب) میں نشتر کا ایک اقتباس ہے اور اس کے ساتھ ہی "مخزن الغرائب"، "ریاض الشعرا" اور "سروِ آزاد" کے حوالے بھی ہیں۔ یہاں بھی "نشتر" سے استفادہ جزوی طور پر کیا گیا ہے۔

۳۔ نظامی گنجوی (۱۰ ب) کے ترجمے میں صرف سالِ وفات کے سلسلے میں "نشتر" کا حوالہ ہے۔ اس ترجمے میں جامی اور صاحبِ "صبحِ صادق" کے بیانات بھی دیے گئے ہیں۔ یہاں بھی استفادے کی محض جزوی نوعیت ہے۔

۴۔ وجیہ الدین عشقی (۶۰۔ ب) کا نام اور ولدیت لکھنے کے بعد لکھا ہے:
"صاحبِ نشترِ عشق" می نویسد کہ در بدوِ حالِ ایشان را باستادی خود گزیدم و تا شش ماہ چند کتبِ فارسی تحصیل نمودم و استفادۂ صحبت بردا شتم۔" یہاں بھی "نشتر" سے استفادہ جزوی ہے۔

اسی طرح اندرمن، سعدی، فردوسی، ہرگوپال رامی (تفتہ)، مست دہلوی اور محمد حسن دراستہ کے تراجم میں "نشترِ عشق" کا حوالہ آیا ہے، اور ان حوالوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق نے اس تذکرے سے جزوی استفادہ کیا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ اگرچہ "نشتر" یقیناً "گلشن" کا اہم ماخذ ہے، لیکن بہ تمام و کمال اس کا چربہ یا خلاصہ ہے۔ مؤلف نے "نشتر" کی طرح اور تذکروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

"نشتر" کے علاوہ مشتاق نے جن دوسرے تذکروں سے استفادہ کیا ہے اور ان کا حوالہ دیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تذکرۃ الشعرا از دولت شاہ (۸۹۲ھ):

انوری (۱ب)، رشید وطواط (۲۳ ب)، سعدی (۳۸۔ الف)، فرخی (۶۲۔الف) اور لطف اللہ نیشاپوری (۷۷۔ ب) کے تراجم میں تذکرۂ دولت شاہ کا حوالہ ملتا ہے۔ ان تراجم میں اس تذکرہ سے جزوی استفادہ کیا گیا ہے۔

۲۔ مجالس النفائس از علی شیر نوائی (۸۹۶ھ):

نرگسی ابہری (۲۰۹۔ ب) کے مذہب کے سلسلے میں اس تذکرے کا حوالہ ملتا ہے۔

۳۔ تحفۂ سامی از ابوالنصر سام مرزا (۹۵۷ھ):

اس تذکرے کا حوالہ رازی شیرازی (۳۳۔ ب) اور عنایت اللہ عنایت دہلوی (۱۴۳ ب) کے تراجم میں ملتا ہے۔ دونوں جگہ انتخابِ کلام اس تذکرے کے حوالے سے دیا گیا ہو۔

۴۔ ہفت اقلیم از امین احمد رازی (۱۰۰۲۔ ۹۹۶ھ):

نسیم استرآبادی (۱۹۱۔ ب) کا ترجمہ اس کے حوالے سے لکھا ہے۔

۵۔ کعبۂ عرفان از تقی اوحدی (۱۰۳۶ھ):

مخفی رشتی (۱۹۷۔ ب) کا ترجمہ اس کے حوالے سے لکھا ہے۔

۶۔ مرآت الخیال از شیر خان لودی (۱۱۰۲ھ):

انوری (۳۔ ب) کے سالِ وفات کے سلسلے میں حوالہ دیا ہے۔

۷۔ ریاض الشعرا از علی قلی خان والہ داغستانی (۱۱۶۱ھ):

رازی شیرازی (۳۳۔ ب) اور جامی (۸۷ ب) کے تراجم میں اس تذکرے سے جزوی استفادہ کیا گیا ہے۔ خود والہ کے ترجمے میں مشتاق نے "ریاض الشعرا" کا ذکر والہ کی تصنیف کے طور پر کیا ہے لیکن یہاں اس تذکرہ سے استفادے کا قرینہ موجود نہیں ہے۔

۸۔ مجمع النفائس از خان آرزو (۱۱۶۳۔ ۶۴ھ):

ایزد بخش رسا (۱۴۳۔ ب) کے مذہب کے سلسلے میں حوالہ دیا ہے۔

۹۔ تذکرۃ المعاصرین از شیخ محمد علی حزین (۱۱۶۵ھ):

شوکت بخارائی (۴۸۔ ب) کے سالِ وفات کے سلسلے میں اس تذکرے کا حوالہ ملتا ہے نیز ابراہیم ضابط (۵۳۔ الف) کا ترجمہ اسی حوالے سے لکھا ہے۔

۱۰۔ سروِ آزاد از میر غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۶۶ھ):

گلشن میں تین شعرا کے تراجم میں اس تذکرے کا حوالہ موجود ہے۔ انوری (۳۔ ب)، مولانا روم (۸۷۔ ب) اور فرحی (۶۶۔ الف) پہلے دو حوالے شعرا کے سالِ وفات کے سلسلے میں ہیں؛ تیسرا حوالہ فرحی کے وطن کے بارے میں ہے۔

۱۱۔ مخزن الغرائب از شیخ احمد علی خان ہاشمی سندیلوی (۱۲۱۸ھ)

نشترِ عشق کے بعد شتاق نے جس تذکرے سے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے، وہ "مخزن الغرائب" ہے۔ میر محمد اشرف حسرت سندیلوی (۲۴۔ الف)؛ خطیب (۲۸۔ الف)؛ امیر علی شیر نوائی (۳۱۔ ب)، میرزا صادق شیرازی (۵۰۔ الف)؛ حکیم محمد کاظم صاحب (۵۲۔ الف) امام فخر الدین رازی فخری (۶۵۔ ب)، اور یوسفی (۹۸۔ ب) کے تراجم میں یہ تمام و کمال "مخزن الغرائب" سے استفادہ کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ان تراجم میں خود مشتاق نے "مخزن" کا حوالہ دیا ہے۔ ان کے علاوہ بعض شعرا کے سلسلے میں "مخزن" سے جزوی استفادہ کیا گیا ہے۔ رودکی (۲۳۔ ب)؛ زیب النسا مخفی (۳۷۔ الف)، مولانا روم (۸۷۔ الف)، محمد حسن وارستہ (۹۶۔ الف) کے تراجم میں کہیں کسی کے سالِ وفات کے سلسلے میں "مخزن" کی سند پیش کی گئی ہے اور کہیں تعدادِ اشعار کے سلسلے میں[۱۲]

مشتاق نے مذکورۂ بالا تذکروں کے علاوہ بعض دوسری کتابوں کو بھی بطور مآخذ کے

۱۲۔ ان تذکروں کے علاوہ دو اور تذکروں کا ذکر بھی "گلشنِ شتاق" میں ملتا ہے "تذکرۂ حسینی" از حسین دوست سنبھلی (۲۸۔ ب) اور "مردم دیدہ" از حاکم لاہوری (۳۲۔ ب) لیکن یہ ذکر حسین دوست سنبھلی اور حاکم کی تالیفات کے ضمن میں آیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تذکرے بھی شتاق کی نظر سے گزرے ہونگے۔

بال کیا ہے۔ اور ان کا حوالہ دیا ہے۔ جن کتابوں کے حوالے ملتے ہیں ان کے نام
ہے:

بہارستان جامی" (تراجم حافظ، نظامی گنجوی، خاقانی، امیر خسرو)، "مرأت جہان نما" مصنفہ شیخ محمد بقا (ترجمۂ انوری)، "مرأت الصفا" مصنفہ میر محمد علی (ترجمہ شوکت بخارائی) مجمع الصنائع" مصنفہ نظام الدین احمد (ترجمہ ملا حسین آشوب)، اخبار الاخیار" از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ترجمۂ امیر خسرو)، "صبح صادق" از مرزا محمد صادق صادقی (ترجمہ نظامی گنجوی)، "منتخب التواریخ" از ملا عبدالقادر بدایونی (تراجم سعدی و قادری)[13]، فرہنگ رشیدی" و فرہنگ جہانگیری (ترجمۂ حسن دہلوی)، نفحات الانس (ترجمہ حضرت نجم الدین کبرٰی نجم)

مشتاق نے ماخذ تذکروں سے محض حالات نقل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ کئی مقامات پر از خود غور و فکر سے بھی کام لیا ہے۔ ایسے مقامات سے مشتاق کے تحقیقی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ابوالفرج رونی کے بارے میں لکھا ہے[14]:

وفاتش در سنہ چہار صد و ہشتاد و نوشتہ اند، مگر از یک قصیدۂ او معلوم می شود کہ تا سنہ پانصد و نود بقید حیات بودہ۔ ظاہراً غلطی تذکرہ نویسان است کہ وفاتش در سنہ صدری می نویسند۔

اسی طرح شیخ سعدی کے حالات میں لکھا ہے:

صاحب نشترِ عشق" می نویسد کہ در تذکرۂ دولت شاہ و منتخب التواریخ مرقوم است کہ شیخ را نسبت ارادت بشیخ محی الدین عبدالقادر گیلانی

13۔ ترجمہ سعدی میں بحوالہ "نشتر عشق" اور ترجمہ قادری (تخلص ملا عبدالقادر) میں بطور تصنیف قادری ذکر آیا ہے۔ براہ راست استفادے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔

14۔ "گلشن مشتاق (بدایر)" تبصرہ مخطوطہ، (تذکرہ)، ورق ۴ الف

قدس سره بود و نیز از عبارت گلستان مفهوم می شود که شیخ صحبت شیخ عبدالقادر جیلانی دریافته بود. چنانچه جایی در حکایت کتاب مذکور در باب دوم می فرماید که شیخ عبدالقادر گیلانی رحمة الله علیه را دیدم که روی بر در کعبه نهاده می گفت که یا غفور، یا رحیم، تو دانی که از ظلوم و جهول چه آید. حال آن که اکثر مؤرخان عمر شیخ را یک صد دو سال نوشته اند و تولد مبارکش در سنهٔ پانصد و هشتاد و نه دانسته و انتقال او را در سنهٔ شش صد و نود و یک گفته. چنانچه اعداد آن از این مصرع بر می آید. مصرع:

ز خاصان بود، زان تاریخ شد خاص

و رحلت شیخ عبدالقادر باتفاق اهل سیر در سنهٔ پانصد و شصت و یک اتفاق افتاده که سال تاریخش از این مصرع بزیادت یک سال خبر می دهد. مصرع. وصالش دان ز معشوق الهی

پس این حساب گویا بعد بیست و هفت سال انتقال شیخ عبدالقادر تولد شیخ سعدی رو داده.

و بعضی مؤرخان که عمر آن ملک الشعرا یک صد و بیست سال نوشته اند پس از آن هم بیست سال را تفاوت بر می آید. این اختلاف خالی از دو وجه نیست. یا مؤرخان را در تحقیق سنهٔ ولادت شیخ سهوی واقع شده، یا عبدالقادر نامی کدام بزرگی دیگر، سوای غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی که شیخ او را بر در کعبه دیده بود، باشد. انتهیٰ کلامه.

راقم حروف گوید که این هر دو وجه که مؤلف "نشتر عشق" نوشته، ناموجه است، زیرا که نه مؤرخان را سهو در سنهٔ ولادت شیخ رو داده و نه عبدالقادر نام دیگری سوای غوث اعظم بود که شیخ ذکر وی نموده. بلکه در عبارت مذکورهٔ "کتاب گلستان" بسبب تحریف کاتبان ناکج فهم

غلطی واقع شده۔ و آن اینست کہ پارۂ از شروعِ عبارتِ حکایتِ اخریٰ درمفتتحِ حکایتِ اول نوشتہ اند۔ و ہم چنین پارۂ از کہنا زعبارتِ حکایتِ اول در اول حکایتِ اخریٰ نموده باشند۔ در چند نسخہ صحیحہ کہ از آنہا منقول بود از ان منقول عنہ کہ بخطِ مصنّف یعنی حضرت شیخ سعدی مکتوب بود، عبارتِ حکایتِ اولی چنین بہ نظرِ احقر رسیده کہ، درویشی را دیدم سر بر آستانِ کعبہ می نالید و می گفت: یا غفور، یا رحیم، تو دانی کہ از ظلوم و جہول چہ آید۔ الخ . . . و عبارتِ ثانی اینست: عبدالقادر گیلانی را دیدند رحمۃ اللہ علیہ، در حرم کعبہ رُوی بر حصا نہاده بود و ہمی گفت: اے خداوند، بخشای الخ . . . پس در این جا اندکی غور باید کرد کہ شیخ صیغۂ جمع ماضی غائب ایراد فرموده، نہ صیغۂ واحد متکلم و این دلیل قویست بر این کہ شیخ صحبتِ غوثِ اعظم درنیافتہ۔ چنان چہ در بعض شروحِ "گلستان" مسطور است کہ زمانِ عبدالقادر جیلانی قبلِ زمانۂ سعدی بوده است، لہٰذا شیخ گفتند کہ دیدند یعنی مردم پیشین دیدند پس صاف معلوم شد کہ آنچہ در تذکره ہا مذکور است کہ شیخ از مریدانِ غوثِ اعظم است و باتفاقِ ہمراہیِ وی بزیارتِ بیت اللہ مشرف شده محض غلط است۔" (۳۸ (الف و ب) و ۳۹ - (الف))

صاحبِ "نشترِ عشق" نے زیب النسا کے دیوان کا ذکر کیا ہے جس میں تخلص مخفی آیا ہے۔ اس ضمن میں مشتاق لکھتے ہیں:

بخاطرِ مؤلف این مجموعہ میرسد کہ مخفی تخلص شاعری: رختۂ رشت بود شاید این دیوان کہ بنظرِ صاحب "نشترِ عشق" رسیده، دیوانِ مخفی رشتی بوده باشد۔ و مردم بخیالِ این معنی کہ چون نسوان را بسبب کمالِ تستر و حجاب ماندن لفظ مخفی و مثلِ آن تخلصِ خود قرار دادن بسیار مناسب و زیبا ست گمان برده اند کہ تخلصِ بیگم مخفی است (۳۷ ب)

صائب کے کلیات کے بارے میں مشتاق نے لکھا ہے:

گویند کہ کلیاتش بہ یک صد و بست ہزار بیت می رسد۔ لیکن اتفاقاً کلیات
نسخۂ دیوانش کہ نہایت ضخیم و حجیم بود، روزی بنظر حقیر رسید، چون ابیاتش
را شمار نمودہ شد، قریب بہ پنجاہ و نہ ہزار بیت برآمد۔ (۱۵۱۔ الف)

اور صائب کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

بعضی جہلا می گویند کہ مرزا صائب شعر عاشقانہ ندارد، تمثیل بند است۔
این چہ حرف است بخیال خام است، زیرا کہ اگر کسی خواہد کہ شعر عاشقانہ
از دیوانش انتخاب کند، برابر دو سہ دیوان برمی آید و طرز تمثیل کہ
طریقۂ دشوار است، قسمی کہ او ورزیدہ، نقد ور دیگری نیست۔

(۱۵۱۔ الف)

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مشتاق نے اپنے پیشرو تذکرہ نگاروں کی ہر بات کو آنکھ بند کر کے تسلیم نہیں کیا۔ جہاں کہیں کوئی غلطی نظر آئی ہے، اس کی نشان دہی کر دی ہے۔

مؤلف نے زیادہ تر توجہ انتخاب اشعار پر دی ہے۔ شعرا کے حالات کے سلسلے میں مجموعی طور پر کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔ بیشتر شعرا کے حالات ایک ایک دو دو سطروں میں آ گئے ہیں۔ اپنے عہد یا قریب العہد شعرا خصوصاً اپنے صوبے کے شعرا کے حالات مؤلف اگر چاہتا تو تفصیل سے لکھ سکتا تھا۔ لیکن اس نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ یہ کمی ان تراجم میں زیادہ محسوس ہوتی ہے، جن کے نام صرف اسی تذکرے میں ملتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مصنف نے خود اپنے بارے میں بھی انتہائی اختصار سے کام لیا ہے، اور صرف ڈیڑھ سطر پر اکتفا کی ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس روش سے انحراف بھی ملتا ہے۔ مثلاً حکیم الوری۔ ابوالفرج رونی، میر قمر الدین۔ آصف جاہ نظام الملک سراج الدین علی خان آرزو، مولانا جامی، حسن دہلوی، حافظ شیرازی، میر علی حزیں، امیر خسرو، خواجہ میر درد، ایزد بخش رسا، زیب النسا مخفی، ساحر کاکوڑی

ی نراین شفیق، فردوسی، فیضی، مرزا قتیل، مولانا نامی، قمر الدین منّت،
، مظہر جانِ جاناں کے تراجم میں خاصی تفصیل ملتی ہے۔ اگر اسی نہج پر تمام
جم لکھے جاتے، تو تذکرہ اہمیت و افادیت کے اعتبار سے شعرائے فارسی کے تذکروں
متاز مقام حاصل کر لیتا۔

تذکرے کی ایک خصوصیت جو اسے تمام تذکروں سے ممتاز کرتی ہے کہ مؤلف
حتّی الامکان شعرا کے سنینِ وفات درج کرنے کی کوشش کی ہے۔ پورے تذکرے
۱۶۱ شعرا کے سنینِ وفات ملتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں کی عام روش کو دیکھتے ہوئے
تعداد بہت معقول نظر آتی ہے۔

شتاق نے تذکرہ نگاروں کے عام رواج کے مطابق شعرا کے کلام یا ان کے رنگِ سخن
متعلق تفصیل سے کچھ نہیں لکھا۔ "سلاست"، "روانی"، "پختگی"، "نازک خیالی"،
"عذوبت" جیسے الفاظ کے استعمال سے شعرا کے اسلوبِ سخن کو واضح کرنے کی کوشش
ہے یا پھر شعرا کے تخلص کی رعایت سے اُن کے لیے توصیفی کلمات استعمال کیے ہیں۔
سلطان ابراہیم امینی کو "امینِ گنجینۂ سخن" یا سراج الدین علی خاں آرزو کو
سراج وہاجِ محفلِ سخن دانی و چشم و چراغِ آرزومندانِ مجلسِ غزل خوانی" لکھا ہے۔
عرا کے انتخابِ کلام سے پہلے عموماً اس قسم کے جملے لکھے ہیں، جن میں شاعر کے تخلص
رعایت ملتی ہے۔ مثلاً،

"از نالۂ دردناکِ اُوست" (آہی)
"از جوششِ آدایِ اُوست" (آدایِ سمرقندی)
"از نتائجِ طبعِ الفت سرشتِ اُوست" (الفتی)
"از ایجادِ خاطرِ آن موجدِ طرزِ تازہ گفتاری است" (مرزا علی نقی ایجاد)
"از نتائجِ طبعِ آن عاقبت بخیر است" (امیر خان انجام)
"از روشنیِ طبعِ انور اوست" (قاضی محمد صادق اختر)
"از آن آزاد وضع است" (آزاد بلگرامی)

"این بیت بر کمالش برہانی است قاطع (آقا محمد صالح بُرہان)
"او بنیادِ سخن را طرح می افگند" (کمال الدین بنائی)
"این بیت از آن ساکن دارِ بقا درین فانی سرا یادگار است" (محمد بقا) وغیرہ
مؤلف نے عموماً شعرا کے کلام کا انتخاب ماخذ تذکروں سے کیا ہے۔ لیکن بعض شعرا کے دواوین بھی اس کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ مثلاً امیر خسرو، خواجہ میر درد، میر اولاد محمد ذکا، شیخ سعدی، صائب اور میرزا مظہر جانِ جاناں کے دواوین سے براہِ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مؤلف نے یا تو ان شعرا کے دواوین دیکھنے کا اظہار کیا ہے یا انتخابِ کلام کی طوالت سے تصریح ہوتا ہے کہ ان شعرا کے دواوین مؤلف کے پیشِ نظر تھے۔
اس تذکرے کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسے شعرا کے تراجم بھی ملتے ہیں جو اردو کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے جن شعرا کے تراجم اس تذکرے میں ہیں، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

"شاہ ولی اللہ اشتیاق (۹۔ ب)، امیر خان انجام (۹۔ ب)، قاضی محمد صادق اختر (۱۰۔ الف)، سراج الدین علی خان آرزو۔ (۱۰ الف) شرف الدین علی پیام۔ (۱۲ ب)، شاہ ضیاء الدین پروانہ (۱۴۔ ب) خواجہ محمد علی تمنا عظیم آبادی (۱۵۔ ب) خواجہ عبداللہ تائید (۱۹ الف) حشمت دہلوی (۲۳ ب)، خواجہ میر درد (۲۹ الف)، محمد فقیہ دردمند (۳۰ ب)، لالہ سرب سکھ دیوانہ (۳۱ ب)، ہرگوپال راحی (دو تخلص) (۳۵ ب)، مرزا محمد رفیع سودا (۴۴ الف)، سراج اورنگ آبادی (۴۰ ب)، لچھمی نرائن شفیق (۴۹ الف)، شیخ وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی (۶۰ ب) حسین قلی خان عاشقی عظیم آبادی (۶۱ الف)، عارف الدین خان عاجز (۶۳ ب) میر عبدالولی عزلت (۶۳ ب)، اشرف علی خان فغان (۶۸ ب) میر شمس الدین فقیر (۶۹ الف) نواب محبت علی خان محبت

گلشنِ مشتاق

(۸۴ الف) مروان علی خان مبتلا (۸۴ الف) میرزا مظہر جانِ جاناں
(۸۵ الف) شعرائے اُردو کی فارسی شاعری کے سلسلے میں یہ تذکرہ اہم
ماٰخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

تذکرے میں مؤلف کی تاریخ گوئی کے بعض نمونے بھی ملتے ہیں۔ تذکرے کی تاریخ تصنیف کا قطعہ اوپر درج ہو چکا ہے۔ ایک رباعی شیخ غلام مینا ساحرؔ کاکوروی کے سالِ وفات کی بھی ملتی ہے جو یہ ہے:

تا گہ خبرِ وفاتِ ساحر چو شنید — مشتاق شکستہ دل بسی رنج کشید
تاریخ وفاتش بعد اندوہ و الم — گفتا کہ دلا غلام بینا کو چید (۴۳ الف)

دو قطعات شیخ سعدی کی تاریخ وفات کے بھی ہیں۔ (۳۹ الف)

گلشن میں چند شاعرات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

"بی بی زائی (۳۶ ب)، زیب النساء مخفی (۳۷ الف)، بی بی ضعیفی سمرقندی (۵۳ الف)، گل رُخ بیگم (۶۷ الف)، گلبدن بیگم (۶۷ الف)، لالہ خاتون کرمانی (۷۷ ب)، نہانی (۹۳ ب)۔

شاعرات کے کلام و حالات پر مشتاق نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ "نشترِ عشق" اور "مخزن الغرائب" میں جن شاعرات کا ذکر ہے، انھیں میں سے بعض کا حال مشتاق نے بھی اپنے تذکرے میں لکھ دیا ہے۔

تذکرے کی تمہید میں مؤلف نے ہندو شعرا سے اپنی سخت ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مندرجۂ ذیل گیارہ ہندو شعرا کے تراجم تذکرے میں ملتے ہیں:

" لالہ اوجاگر چند الفت (۱۱۔ الف)، اندرمن (۱۱۔ الف)، لالہ سیوا رام حیا اکبرآبادی (۲۴۔ ب) امر سنگھ خوشدل (۲۸۔ الف)، لالہ صاحب رام خاموش دہلوی (۲۸۔ ب)، جواہر لال دبیر (۳۱۔ الف)، لالہ سرب سکھ دیوانہ (۳۱۔ ب)، لالہ داتا رام رفیق دہلوی (۳۵۔ ب)، لالہ ہرگوپال رامی (۳۵۔ ب)، لچھمی نرائن شفیق (۴۹۔ الف)، گیان رائے ہنر (۷۹۔ ب)۔

اگرچہ انھوں نے دیباچے میں ہندو شاعروں کے بارے میں کچھ عمومی مخالفانہ رائے دی تھی۔ لیکن ان کے حالات میں کوئی ناملائم لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ بعض شعراء تو انتخاب بھی خاصا طویل کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً رام ہرگوپال تماشی (تفتہ) کے ۲۶ شامل تذکرہ ہیں، لچھمن نرائن شفیق کے ۲۱، اور اندرمن کے ۳۰۔
ان خصوصیات کی بنا پر خیال ہوا کہ یہ تذکرہ اشاعت کے قابل ہے۔ چنانچہ راقم الحروف نے اسے مرتب کر لیا ہے۔ اور توقع ہے کہ یہ عنقریب منظرِ عام پر آجائے۔

رول (۸) فارم (۴)

۱۔ سنِ تحریر: تماہی: مارچ، جون، ستمبر، دسمبر

۲۔ (۱) اڈیٹر: مالک رام؛ (۲) قومیت: ہندستانی (۳) پتا: سی ۳۹۶، ڈیفنس کالونی، نئی دلی ۲۴

۳۔ (۱) پرنٹر و پبلشر: ظلِ عباس عباسی (۲) قومیت: ہندستانی (۳) پتا: ۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی ۶

۴۔ نام و پتا مالک: علمی مجلس، ۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی۔

میں ظلِ عباس عباسی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

(دستخط)
ظلِ عباس عباسی

مالک رام

وفیات

ثاقب عظیم آبادی، سیّد حسن رضا

پٹنے کے علمی و ادبی حلقوں کی معروف شخصیت تھے۔ ان کے والد منشی سیّد علی حسن عظیم آبادی وہاں کے ماہر اور مشہور خوشنویس تھے اور شہر میں 'بڑے منشی صاحب' کے لقب سے معروف تھے۔ ثاقب کی ولادت ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔
ابتدائی تعلیم نجی طور پر گھر کے بزرگوں سے پائی۔ ۱۹۲۶ء میں مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے "عالم" کی سند لی اور ۱۹۲۷ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے " فاضل" کی۔ پھر ۱۹۳۰ء میں انگریزی کے دسویں درجے کا امتحان بھی پاس کر لیا، حالانکہ وہ اس زمانے میں کاری اسکول، پٹنہ میں عربی اور فارسی کے معلّم تھے۔ مختلف اسکولوں میں کام کرنے کے بعد بالآخر ۱۹۶۵ء میں پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔
اس صدی کے اوائل میں پٹنہ سٹی، جہاں ان کی سکونت تھی، علم وادب اور شعر و سخن کا مرکز تھا۔ شاد عظیم آبادی (ف جنوری ۱۹۲۷ء)، عبدالحمید پریشان (ف) تمنا عمادی (ف نومبر ۱۹۷۲ء) اور کئی دوسرے حضرات اسی نواح کے رہنے والے تھے۔ غرض پوری فضا شعر و نغمہ سے معمور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ثاقب بھی بچپن سے شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ آغاز میں انھوں نے میر باقر عظیم آبادی کے شاگرد رشید وحید الٰہ آبادی (ف) سے مشورہ کیا۔

افسوس کہ ان کا کوئی شعری مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ بہت کلام مختلف رسالوں میں منتشر پڑا ہے۔ البتہ دو نثری کتابیں "عظیم آباد کی گزشتہ ادبی محفلیں" اور "یادگارِ عشق، سوانحِ شاہ رکن الدین عشق : ملوی کرم عظیم آبادی) چھپ چکی ہیں۔

ان کے گیارہ اولادیں ہوئیں لیکن بدقسمتی سے نو بچے ان کی زندگی ہی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان پے در پے حادثات نے ان کا دماغی توازن مختل کر دیا۔ بہت دن کے بعد یہ توازن بحال ہوا تھا کہ اپنے چل چلاؤ کا زمانہ آگیا۔

۱۹ جنوری ۱۹۷۱ء کو رحلت کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جوان سندیلوی، منی لال

۱۸۹۰ء میں سندیلہ ضلع ہردوئی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاب رام شاہ تجارت پیشہ تھے۔ منی لال نے بمشکل آٹھویں درجے تک تعلیم پائی تھی کہ اس کے بعد اپنے والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ جب والد نے نقل مکان کرکے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی، تو یہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس کے بعد نجی طور پر اردو اور فارسی میں کچھ مہارت پیدا کرلی تھی۔

انھوں نے ۱۹۰۵ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ پہلے چند روز حکیم عبدالقدیر مہر سندیلوی سے مشورہ کرتے رہے، بعد کو انور حسین آرزو لکھنوی (ف اپریل ۱۹۵۱ء) کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ جب آرزو ۱۹۲۸ء میں بعض فلمسازوں کی دعوت پر مستقلاً کلکتے میں مقیم ہو گئے، تو جوان نے بھی وہیں کی سکونت اختیار کرلی۔ تاکہ استاد سے پورے طور پر استفادہ کر سکیں۔ کلکتے میں بھی انھوں نے تجارت ہی کو اپنی بسر اوقات کا ذریعہ بنایا۔ وہ ۱۹۶۰ء میں کلکتے سے واپس لکھنؤ آئے۔

آرزو کی زبان و بیان اور عروض کی ماہرانہ واقفیت زبان زدِ خاص و عام ہے۔ ان علوم میں جوان بھی اپنے استاد کے شاگردِ رشید تھے۔ چنانچہ بعد کو بہت شاگردوں نے

ان سے بھی فیضان حاصل کیا۔

بروز جمعہ ۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء کو شام کے چھ بجے اپنے مکان محلہ حسن گنج، لکھنؤ میں انتقال کیا۔

ان کی شادی شاہجہانپور میں شریمتی برج رانی سے ہوئی تھی۔ ایک بیٹا شری انند بہاری لال گپتا جسمانی یادگار چھوڑا ہے؛ یہ یوپی حکومت کے محکمۂ مالیات میں ملازم ہیں۔

کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں: کلیاتِ جوان حصۂ اول عرف حسین چراغاں (۱۹۶۳ء) کلیاتِ جوان حصۂ دوم عرف شوخ غنچہ (۱۹۶۴ء) کلیاتِ جوان حصۂ سوم عرف چراغِ قاف (۱۹۶۶ء) سوزِ دل (دس نظمیں)؛ رباعیاتِ جوان؛ خوش رنگ پھول (غالب اور آرزو کے اشعار کی تضمین)، فریاد و جوابِ فریاد (بطرزِ شکوہ و جوابِ شکوہ از اقبال) مع غزلیات؛ رام بن باس۔

انھوں نے چار مرثیے بھی کہے تھے: شہادتِ امام حسین علیہ السّلام؛ در مدحِ حضرت عون ومحمد؛ در مدحِ حضرت عباس علمدار؛ در مدح حضرت علی اصغر۔ یہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔

تفصیل زحافات اور آئینۂ بحور اپنے شاگردوں کے لیے نثر میں لکھی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک مختصر چیز "حضرت آرزو کی اصلاحیں (شاگردوں کے کلام پر)" ہے۔ دو ایک چیز بچوں کے لیے بھی ہندی اور اردو میں شائع کی تھیں۔

کلام پختہ اور بے عیب ہے۔ ان کی وفات سے ایک خوش خلق، منکسر مزاج اور وضعدار شخص اٹھ گیا۔

قیس کوٹوی، نور محمد

کوٹہ (راجستھان) کے ایک غریب گھرانے میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔

گھر کے حالات بہت ناتسلی بخش تھے۔ ان کے والد نے جب دیکھا کہ کوٹہ میں ان کی بہتری کا امکان نہیں، تو وہ ہجرت کر کے موضع "لوٹر ادیت" چلے گئے، جو کوٹہ سے ۴۴ میل

کی دوری پر نسبتاً خوشحال جگہ ہے ، والدہ اپنے چاروں بچوں کے ساتھ کوئٹہ ہی میں مقیم رہی ۔ لیکن بدقسمتی گھات میں تھی ۔ کوئٹہ میں ہیضہ وبائی صورت میں پھوٹ پڑا ۔ اس میں قیس کی والدہ اور دو بھائی رحلت کر گئے ۔ اس وقت قیس بمشکل دس برس کے ہوں گے ۔

اس حادثے کی خبر بوڑادیت پہنچی ، تو ان کے والد کوئٹہ آئے اور بقیۃ السیف خاندان کو اپنے ساتھ لے گئے ۔ یہاں قیس کو ایک مقامی سرکاری سندی اسکول میں داخل کیا گیا ، جہاں انھوں نے ہندی میں کچھ شدبد حاصل کر لی ۔ اس کے بعد وہ ہندی میں دوہے ، چوپائیاں وغیرہ لکھنے لگے ۔ اس زمانے میں وہ نور تخلص کرتے تھے ۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے طور پر اردو پڑھنے کا کچھ انتظام کر لیا ۔ اسی دوران میں شادی بھی ہو گئی ۔

وہ ۳۰ برس کے تھے کہ بوڑادیت سے اپنے مسقط الرأس کوئٹہ واپس چلے آئے ۔ لیکن اصلی مسئلہ روزگار کا تھا ، یہ نہ بوڑادیت میں ملا ، نہ کوئٹہ میں ۔

۱۹۳۴ء میں افضل حسین ثابت لکھنوی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے ۔ ثابت اہلِ زبان اور صاحبِ فن استاد تھے ۔ انھوں نے تخلص نور بدل کر قیس کر دیا ۔ قیس کو ان سے مشورہ کرنے سے بہت فائدہ ہوا ۔ ان کی تعلیم ناقص تھی ؛ اور شاعری علم و فن کے بغیر ناممکن ہے ۔ ثابت نے قیس کی یہ کمی پوری کرنے میں جو محنت کی ، اس سے انکار ممکن نہیں ۔ ۱۹۴۱ء میں ثابت کا انتقال ہو گیا تو ۱۹۴۳ء میں قیس نے سیماب اکبرآبادی کا دامن تھاما اور ان کی وفات (جنوری ۱۹۵۱ء) تک انھیں سے وابستہ رہے ۔ ان اساتذہ کی تربیت پھل لائی ۔ ۲۸ ، ۲۹ اپریل ۱۹۶۵ء کو مقامی اربابِ اردو نے کوئٹہ میں شاندار پیمانے پر جشنِ قیس منایا ، اردو کے مشہور و معروف شاعر پنڈت آنند نرائن ملّا نے اس تقریب کی صدارت کی ۔ اس موقع پر گیارہ سو روپے کی تھیلی قیس کی خدمت میں پیش کی گئی تھی ۔

بے روزگاری بدستور قائم رہی ۔ اس پر راجستھان ساہتیہ اکاڈیمی نے ان کا وظیفہ

مقرر کر دیا۔ یہ بھی صرف دو تین برس ملا۔
آخری ایام میں کوٹہ سے ۴۰۔۵۰ میل دور ایک مقام سکیت میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں بروز سہ شنبہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۴ء (یکم محرم ۱۳۹۴ھ) کو پیام مرگ آپہنچا۔ ان کے استاد بھائی مفتون کوٹوی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:

ہوا ہے دل کو بہت ہجرِ قیس کا صدمہ — مجھے جو یہ خبرِ مرگ پُر ملال ملی
"شہیدِ عشقِ خدا" "مخزنِ تواضع" بھی — وفاتِ قیس سے تاریخِ انتقال ملی

(۱۳۹۴) (۱۹۷۴)

خانگی زندگی بھی کچھ اطمینان بخش نہ تھی، بلکہ ایک مرتبہ انھوں نے "نہایت تلخ" کہا تھا۔ اولاد میں تین بیٹے (محمد اسحاق، فہیم احمد فہمی، ریاض احمد ریاض) اور ایک بیٹی اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔
افسوس کہ آج تک کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔
قیس خالصاً غزل کے شاعر تھے اگرچہ انھوں نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان میں وہ کیف نہیں، جو ان کی غزل کا حصہ ہے۔

عزیز جھالاواڑی، محمد عزیز الرحمٰن قریشی

ان کا خاندان ریاست جھالاواڑ کے باعزت ملازموں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے دادا منشی علی بہادر مہتمم کوٹھی و کارخانہ جات تھے۔ ان کے بعد عزیز کے والد منشی حبیب اللطیف بھی کارخانہ جات کے مہتمم رہے۔ عزیز یہیں جھالاواڑ میں بسنت پنچمی کے دن جمعرات ۱۹ فروری ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔
خاندان میں تمام سہولتیں میسر تھیں، لہذا تعلیم مناسب طریقے پر گھر ہی پر ہوئی۔ اور اسی کی تکمیل کے بعد یہ بھی ریاست کی ملازمت میں لے لیے گئے۔ ترقی کرتے کرتے بالآخر وہ مہتمم کے درجے تک پہنچے، جو انگریزی علاقے کے ڈکشنری کے مساوی رہا ہوگا۔ عزیز نے جھالاواڑ کے چار حکمرانوں کا عہد حکومت دیکھا: (۱) راج رانا ظالم سنگھ

ان کے زمانے میں ان کا شباب تھا۔ (۲) مہاراجا بھوانی سنگھ؛ (۳) مہاراجا راجندر سنگھ۔ ان دونوں حکمرانوں کے زمانے میں عزیز مقرب خاص رہے (۴) راج رانا ہریش سنگھ آخری رئیس تھے۔ جب راجستھان کی ریاستیں جمہوریۂ ہند میں ضم ہوگئیں، تو ابتدائی زمانے میں رانا ہریش چندر راجستھان میں وزیر بھی رہے تھے۔

مہاراجا بھوانی سنگھ خود صاحب علم اور قدردان علم و ادب تھے۔ ان کے زمانے میں اس نوع کی تمام سرگرمیوں کا اہتمام عزیز کے ذمے ہوتا تھا۔ عزیز کے کلام میں جو متعدد نظمیں سالگرہ کی یادگار، ہولی، جشن غسل صحت وغیرہ کے عنوانوں سے ملتی ہیں، وہ انھوں نے اسی عہد میں کہی تھیں۔

مہاراجا بھوانی سنگھ نے بھوانی ناٹیہ شالا، ایک ادارہ قائم کیا تھا، جہاں ڈرامے اور ناٹک اور اسی طرح کی دوسری تفریحی اور کلچرل تقاریب منعقد ہوتی تھیں۔ اس ادارے کے مہتمم بھی عزیز ہی تھے۔ ان تقریبوں میں داخلہ بہت محدود ہوتا تھا۔ ان کے جانشین مہاراجا راجندر سنگھ کے تو وہ مصاحب خاص اور ہروقت کے ندیم حاضر باش تھے۔ عزیز جب جھلاوڑ آتے تھے، تو ان دونوں حکمرانوں کے زمانے کے قصے بیان کرتے اور ان کی علم پروری اور ادب نوازی کے واقعات سنایا کرتے تھے وہ ان دونوں کے ہمیشہ مداح رہے۔

عزیز کے مکتبی زمانے کے ایک استاد قاضی قطب الدین تھے۔ وہ کبھی کبھی نعت کہتے تھے۔ انھیں کی دیکھا دیکھی عزیز کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ وہ شعر کہنے لگے۔ لیکن قاضی صاحب موصوف سے کبھی اس کا ذکر نہیں آیا۔ سب سے پہلے انھوں نے حکیم عبدالقیوم شوق سے اصلاح لی اور انھیں کے کہنے پر مشاعرے میں اپنا کلام سنایا۔ یہ سلسلہ کافی دن تک رہا۔ بعد کو عزیز درباری شاعر جناب افتخار الشعرا مولوی عبدالوحید نیرنگ کاکوروی کے شاگرد ہوگئے۔ یہ تلمذ انھوں نے مہاراجا بھوانی سنگھ کے ایما پر اختیار کیا تھا۔ نیرنگ خود منشی عبدالمجید سحر (ابن غلام ساحر علوی) کے بیٹے اور مشہور نعت گو مولوی محمد محسن کاکوروی (ف اپریل ۱۹۰۵ء) کے شاگرد تھے؛ نیرنگ

۲۷ستمبر ۱۸۸۵ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے تھے۔ راجستھان میں اُردو کے فروغ میں ان کی خدمات بہت قابلِ قدر ہیں۔ وہ بہت ذہین اور طبّاع آدمی تھے۔ تلامذہ کی کثیر تعداد نے ان سے کسبِ فن کیا۔

عزیز قدیم وضع کے بہت پختہ سخنگو تھے۔ ان کا کوئی مجموعہ حینِ حیات شائع نہیں ہوا۔ دو دیوان غیر مطبوعہ موجود ہیں۔ ایک میں غزلیات ہیں؛ اور دوسرے میں رباعیات، قطعات، نظمیں وغیرہ۔

عزیز بہت وضعدار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ مثلاً گھر سے کبھی شیروانی کے بغیر باہر نہیں نکلے۔ پان کی ڈبیہ اور بٹوہ ہمیشہ ساتھ رہتا۔ آخر تک پرانی وضع کا قلمدان استعمال کیا اور نیزے کے قلم سے لکھتے رہے۔ مہمان نواز اور سیر چشم آدمی تھے۔ لیکن بہت محتاط زندگی بسر کی؛ ہمیشہ اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھتے۔ باغبانی کا شوق تھا۔ جھالاواڑ سے باہر سات آٹھ میل دور سکیت کے مقام پر ان کا باغیچہ آج بھی موجود ہے۔ اپنے شہر کے مکان میں بھی ایک پھلواری لگا رکھی تھی۔

ان کا بدھ ۶ فروری ۱۹۷۴ء (۱۲ محرم ۱۳۹۴ھ) کو انتقال ہوا۔ ۹۰ برس کی عمر پائی۔ بیوی سے والہانہ محبت تھی۔ ان کا پانچ چھ سال قبل انتقال ہو گیا، تو وہ بجھ سے گئے؛ اس کے بعد عزیز نے متعدد نظموں میں ان سے اپنی شیفتگی اور جدائی پر رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ دو لڑکے (ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن اور محبوب الرحمٰن) اور دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں۔ سب ماشاء اللہ اپنے گھر بار والے، بلکہ بیٹوں، پوتوں والے اور خوش و خرّم ہیں۔

مفتون کوٹوی نے تاریخِ وفات کہی:

کر گئی نذیر و زبر بزمِ خیال	اطلاعِ ارتحالِ پُر ملال
وہ عزیز خوشنوا رخصت ہوئے	تھے جو بزمِ دوستاں میں خوش مقال
جنّت الفردوس ان کو ہو نصیب	مغفرت فرمائے ربِ ذوالجلال
ہے یہ مفتوںؔ ان کی تاریخِ وفات	"قربِ سبحاں پا گیا" رنگیں خیال"

(۱۳۹۴ = ۹۷۱ + ۴۲۳)

مہجور شمسی، سید عبدالقیوم

ضلع روہتاس (بہار) کے تاریخی شہر سہسرام کے رہنے والے تھے، جسے شیر شاہ سوری کا مسقط الراس ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہیں ۵ اپریل ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد محمد ادریس (ف ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء) ریلوے پولیس میں داروغہ تھے۔

ابتدائی تعلیم مدرسۂ خانقاہ کبیریہ، سہسرام میں ہوئی، ثانوی مدرسۂ حنیفیہ، آرہ میں اور اعلیٰ کی تکمیل مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں کی۔ یہ مدرسۂ شمس الہدیٰ کا تعلق ہی تھا، جس کے باعث بعد کو شعر گوئی کے زمانے میں انھوں نے اپنے تخلص مہجور کے ساتھ شمسی کا اضافہ کیا، بلکہ بعض غزلوں میں تو انھوں نے "شمسی" بطور تخلص بھی استعمال کیا ہے۔

آخر میں پٹنہ یونیورسٹی سے صرف اردو کے مضمون میں امتحان دے کر بی اے کی سند حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد مدرسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک ضلع اسکول، گیا میں فارسی اور اردو پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد اوائل ۱۹۴۸ء میں پلاموں ضلع اسکول، ڈالٹن گنج میں تبادلہ ہو گیا۔ بقیہ ملازمت کا سارا زمانہ یہیں گزارا اور یہیں سے اوائل ۱۹۷۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد مشکل سے مہینہ بھر گزرا ہوگا کہ جمعہ ۸ فروری ۱۹۷۴ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ فشارِ دم کا عارضہ پرانا تھا، لیکن موت حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہوئی۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اسی دن پلاموں نٹے راج کیندران کے اعزاز میں ایک شبِ غزل منانے والا تھا کہ بعد نماز جمعہ تین بجے سہ پہر کو اچانک قلب کا دورہ پڑا اور آناً فاناً جاں بحق ہو گئے، جشنِ غزل، مجلسِ عزا میں تبدیل ہو ہو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ڈالٹن گنج کے قبرستان میں آخری آرامگاہ نصیب ہوئی۔ ان کے شاگرد مجیب نشتر نے تاریخ کہی:۔

حضرت ہجو رخصت ہو گئے — مردِ کامل، صاحبِ فن، نغز گو
لوحِ دل پہ کیوں نہ پھر ہر شخص کے — "شاعرِ شیریں سخن" کا نام ہو
(۱۹۷۴)

بہت کم عمری میں شعر و سخن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کلام پر مختلف اوقات میں سیماب اکبرآبادی (ف جنوری ۱۹۵۱ء) ساغر نظامی اور آرزو لکھنوی (ف اپریل ۱۹۵۱ء) سے مشورہ کرتے رہے۔ اگرچہ دوسری اصناف میں بھی کلام موجود ہے، لیکن دراصل غزل کے شاعر تھے، اور وہ بھی روایتی رنگ کے۔ خوش گلو ہونے کے باعث مشاعروں میں مقبول تھے۔

دو مجموعے: پردۂ ساز (ڈالٹن گنج ۱۹۶۶ء) اور نوائے راز (گیا ۱۹۷۳ء) ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔

اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی سہسرام میں ہوئی۔ ان سے دو بچے ہوئے: ایک لڑکا (محمد مخدوم) اور بیٹی نزہت جہاں۔ دونوں بچے فوت ہو گئے اور بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ دوسری بیوی سے دو بیٹیاں زندہ ہیں۔ یہ زیرِ تعلیم ہیں۔

محمود احمد عباسی، امروہوی

ان کے خاندان کا سلسلہ بواسطۂ خلیفۂ عباسیہ (بغداد) امین الرشید (خلف ہارون الرشید) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب تک پہنچتا ہے۔ خلیفہ امین الرشید (۸۰۹ - ۸۱۲ء) حضرت عباس سے نویں پشت میں تھے۔ جب ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو تاراج کیا اور آخری خلیفۂ بنی عباس مستعصم باللہ کو تہِ تیغ کر دیا، تو اس خاندان کے اکثر اشخاص جان اور ناموس بچانے کی خاطر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ انھیں خلیفہ امین سے دسویں پشت میں مخدوم زادہ محمد یوسف مکی تھے۔ وہ ہندستان چلے آئے۔ یہ سلطان غیاث الدین بلبن کا عہدِ حکومت تھا۔ سلطان نے اُن کی خاندانی عظمت اور علمی حیثیت کے پیشِ نظر

انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور شایانِ شان منصب اور عہدہ عطا کیا۔ یہ خاندان ایک صدی تک آرام و آسائش سے دلّی میں مقیم رہا تھا کہ اتنے میں قہرِ خداوندی امیر تیمور کی شکل میں نازل ہوا۔ اب مخدوم زادہ محمد یوسف سے چوتھی پشت میں مولانا شمس الدین یہاں سے جلاوطن ہو کر پنجاب چلے گئے اور زندگی کے بقیہ ایام انھوں نے وہیں بسر کیے۔ ان کے پوتے مولانا رکن الدین عباسی (ابنِ مولانا نظام الدین) سلطان سکندر لودی کے عہد میں پنجاب سے نقلِ مکان کر کے امروہہ آئے۔ عباسیانِ امروہہ انھیں مولانا رکن الدین کے اخلاف ہیں۔

مولانا رکن الدین کی نویں پشت میں مولانا سید احمد علی شاہ عباسی پچھلی صدی کے صاحبِ صورت و سیرت بزرگ تھے۔ شروع سے خاندانی جاہ و ثروت سے کنارہ کش اور یادِ اللہ میں مشغول رہے۔ اگرچہ باقاعدہ حضرت حافظ موسیٰ چشتی قادری مانکپوری سے بیعت تھے، لیکن دوسرے سلاسلِ طریقت مثلاً صابریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں بھی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔ تمام وقت مطالعۂ کتبِ دینیہ میں صرف ہوتا یا عبادتِ الٰہی میں۔ پیر کے دن ۲۹ شوال ۱۲۹۷ھ (۴ اکتوبر ۱۸۸۰ء) کو ۸۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ امروہہ میں شاہ علاؤل کی درگاہ میں، بلکہ انھیں کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سید احمد علی شاہ کے اکلوتے فرزند سید علی محمد عباسی ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دینی علوم اور درسِ نظامیہ کی تکمیل مختلف اساتذہ سے کی۔ پھر حکومتِ انگریزی میں ملازم ہو گئے۔ اسی اثنا میں وکالت کا امتحان پاس کر کے اسے بطورِ پیشہ اختیار کر لیا۔ انھوں نے پہلے مختلف مقامات پر کام کیا، لیکن بالآخر امروہہ میں مقیم ہو گئے تھے اور ان کا شہر کے اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ یہیں ۱۸۹۷ء میں رحلت کی اور اپنے والد کے پہلو میں جوارِ حضرت شاہ علاؤل میں دفن ہوئے۔

سید علی محمد عباسی نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہوئے۔ سب کے نام گنانا طوالت سے خالی نہیں۔ البتہ دو قابلِ ذکر ہیں۔

سب سے بڑے حکیم فریدا حمد عبّاسی اپنے عہد کے مشہور طبیب، جو مدتوں طبیہ کالج
دہلی کے پرنسپل رہے ہے۔ دوسرے محمد داؤد عباسی جو کسی زمانے میں علی گڑھ میں
طالبعلم تھے اور جن کا حالی کے بعض اشعار کی تضمین کے سلسلے میں بہت لوگوں نے
ذکر کیا ہے۔ انھیں سید علی محمد عبّاسی کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے۔ وہ ۲۰ رمضان ۱۲۸۰ھ
۲۹ فروری ۱۸۶۴ء) کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا بعارضۂ تپ دق ۲۷ جون
۱۹۰۰ کو فتح آباد (ضلع آگرہ) میں انتقال ہوا؛ وہیں احاطۂ عیدگاہ میں دفن ہوئے۔
(حجاز جادید و ۳ میں دونوں تاریخیں غلط ہیں) ان کی مثنوی لحنِ داؤدی" محمود احمد عباسی
صاحب نے شائع کی تھی۔
سید علی محمد عبّاسی کی دوسری بیوی شیخ غلام محمد صدیقی کی صاحبزادی (صغرا بانو)
تھیں۔ ان بیگم سے ایک بیٹی اور چار بیٹے پیدا ہوئے۔ محمود احمد عبّاسی بیٹوں میں
سب سے بڑے تھے؛ یہ گویا ان محمد داؤد عبّاسی مذکور الصدر کے علاتی بھائی تھے۔
وہ منگل کے دن ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۰۲ھ (۳۱ مارچ ۱۸۸۵ء) بوقت صبح امروہہ
پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے وہ اپنے نانا شیخ غلام محمد صدیقی کے زیر اثر آگئے۔ جو ان
کے والد ہی کے ساتھ مقیم تھے۔ وہ انھیں اولیا اللہ کے واقعات سناتے؛ اگر کسی
درویش کی ملاقات یا بزرگ کی زیارت کو جاتے تو انھیں ساتھ لے جاتے۔ اسی سے
انھیں تاریخ اور سیرت اولیا اور تصوّف سے شوق پیدا ہوا۔ جس سے گویا بعد کے زمانے
کے مطالعے کا رُخ متعین ہو گیا۔
تعلیم کا زمانہ آیا تو امروہہ ہائی اسکول میں داخلہ ملا یہیں زیر تعلیم تھے کہ ۱۸۹۷ء میں والد کا
انتقال ہو گیا اب یہ اپنے دوسرے علاتی بھائی ڈاکٹر محمد احسن عبّاسی کے پاس آگئے
اور رائے بریلی رہے، جہاں وہ میڈیکل افسر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ ... دسویں
درجے تک تعلیم یہیں پائی۔ اس کے بعد لکھنؤ کالج میں بھیج دیے گئے۔ وہاں
کالج اقامتگاہ سے باہر ایک ذاتی مکان میں رہتے تھے۔ اور یہی ان کے تعلیم ...
بے توجہی کا باعث ثابت ہوا۔ نواب وقار الملک، مولوی مشتاق حسین ...

ابنائے وطن کے عدم تعاون، بلکہ عملی مخالفت کے باعث کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے سیاسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (ف جنوری ۱۹۳۰ء) نے دلی سے اپنا مشہور روزنامہ ہمدرد جاری کیا۔ انھوں نے عباسی صاحب کو اس کے شعبۂ ادارت میں کام کرنے کی دعوت دی، جو انھوں نے قبول کرلی۔ اس سلسلے میں کوئی سال بھر دلی میں قیام رہا۔

امروہے کے قیام کے زمانے میں انھوں نے "تاریخ امروہہ" (جلد اول) اور پھر "تذکرۃ الکرام" (دوسری جلد) اور "تحقیق انساب" تین کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، تحقیق و تدقیق اور روایت و درایت کی تمام شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے، حق پژوہی اور حق گوئی میں کسی کی رو رعایت ان کے سدِّراہ نہیں ہوئی۔ "تاریخ امروہہ" میں اور پھر "تحقیق انساب" میں کئی خاندانوں کا کچا چٹھا تھا۔ اس سے قدرتاً بہت لوگوں کو رنج ہوا اور انھوں نے سخت مخالفت کی۔ عباسی صاحب نے تکلیف برداشت کی، نقصان اٹھایا، لیکن جو بات صحیح سمجھی، اس کے اعلان سے باز نہیں آئے۔ اس پر مقدمہ بازی ہوئی اور بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ وہ ہر طرح کامیاب رہے۔

انھوں نے ملکی سیاست میں بھی عملی حصہ لیا۔ ممکن ہے کوئی اور اثر بھی ہوا ہو، لیکن وہ غالباً مولانا محمد علی کی صحبت میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ وہ امروہہ کانگریس کمیٹی کے صدر چنے گئے تھے۔ اور کچھ مدت وہاں کی میونسپل کمیٹی کے صدر اور آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء کے انتخاب کے سلسلے میں جب جواہر لال نہرو دورے پر امروہے گئے ہیں، تو وہاں جلسے کا انتظام، اور نظم و ضبط کا اہتمام عباسی صاحب ہی نے کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک کی فضا مکدر ہو گئی اور امروہے کا قیام غیر محفوظ ہونے لگا، تو وہ عارضی طور پر پاکستان چلے گئے تھے۔ لیکن ان کا ارادہ وہاں مستقل قیام کا نہیں تھا۔ چنانچہ بعد کو جب دونوں حکومتوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ اب مہاجرین کو

اپنی مستقل حیثیت کا تعین کرنا پڑے گا ؛ اور فلاں تاریخ کے بعد پاسپورٹ اور ویزا کے قواعد نافذ ہو جائینگے، تو وہ ہندستان واپس چلے آئے یہاں ان کی خاصی بڑی جاداد وغیرہ تھی ۔ کچھ کتابیں چھپ چکی تھیں ۔ اس لیے معقول آمدنی تھی اور بسر اوقات کے لیے کوئی تشویش نہیں تھی ۔

ان کا نکاح ملا امان اللہ کے خاندان میں، ابراہیم علی صدیقی کی صاحبزادی (ڈیکیلر بیگم) سے ہوا تھا ۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادی (دُر جبیں فاطمہ) ہوئیں، جو جناب سبط رسول فاروقی کے حبالۂ عقد میں آئیں ۔ پاکستان بننے پر بیٹی اور داماد وہاں چلے گئے تھے ۔ جب عباسی صاحب تقاضائے عمر سے بیمار رہنے لگے، تو انھوں نے اصرار کیا کہ آپ بھی پاکستان چلے آئیے، تاکہ ہم آپ کی دیکھ بھال کر سکیں ۔ یوں بھی اب امروہے میں ان کا کون تھا! لہٰذا بیٹی کے بلانے پر وہ ۱۹۵۱ء میں ہجرت کر کے مستقلاً کراچی چلے گئے ۔ جانے سے پہلے انھوں نے یہاں کی بیشتر جاداد فروخت کر دی تھی ؛ بقیہ کے عوض میں شاید وہاں کچھ باغات وغیرہ مل گئے تھے ۔ غرض انھیں وہاں بھی مالی پہلو سے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا ۔

کراچی کے زمانۂ قیام میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں ۔ وہاں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے "حقیقت قوم کمبوہ" چھپی، جو امروہے ہی میں مکمل ہو چکی تھی، اور جس کا مسودہ وہ ساتھ لیتے گئے تھے ۔ لیکن جس کتاب نے سب سے زیادہ ہنگامہ بپا کیا، وہ "خلافت معاویہ و یزید" ہے یہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تھی ۔ اس میں انھوں نے امیر معاویہ اور پھر ان کے جانشین یزید کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی تھی ۔ قدرتی بات تھی، شیعی حضرات نے سخت احتجاج کیا ۔ حکومت نے عافیت اسی میں دیکھی کہ کتاب کی اشاعت ممنوع قرار دے دی جائے لیکن وہ عباسی صاحب کو خاموش نہ کر سکی ؛ انھوں نے دو سال بعد اپنے نظریے کی تائید میں دوسری کتاب تحقیق مزید، شائع کی (۱۹۶۰ء) مخالفانہ جلسے وغیرہ اب کے بھی

ہوئے ، لیکن چونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا ، اس کی تردید محال تھی ، اس لیے
مخالفین نے خموشی اختیار کرلی اور یہ کتاب ضبط نہیں ہوئی ۔
انھوں نے شعراے امروہہ کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا تھا ۔ دراصل یہ ان کی
تاریخ امروہہ ہی کا ایک حصّہ تھا ۔ وہ یہ کام مکمل کرچکے تھے اور اس کا مسودہ بھی
وہ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے ۔ لیکن یہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی ۔ اگر ان کے
پسماندگان ان کے مسودات کی چھان بین کرکے اسے الگ کرلیں ، اور شائع کردیں
تو یہ ادب کی مستقل خدمت ہوگی ۔
۱۴ مارچ ۱۹۷۴ء کو کراچی میں انتقال ہوا ۔

محشر مرزاپوری ، مرزا فرزند علی

یکم جنوری ۱۸۹۸ء کو مرزاپور میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد حکیم علی صاحب تھے ۔ محشر صاحب نے
بعمر سولہ سال ۱۹۱۴ء میں مقامی لندن مشن ہائی اسکول سے دسویں درجے کی سند اول
ڈویژن میں حاصل کی ۔ چونکہ خاندان کی ذمہ داریاں مزید تعلیم کے راستے میں حارج تھیں ،
اس لیے انھوں نے بسراوقات کے لیے ملازمت میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا ، اور ۱۹۱۸ء
میں اسی سلسلے میں الہٰ آباد پہنچے ۔ اول دو ایک ماہ کچہری میں کام کیا اور اس کے بعد خفیہ
پولیس کے محکمے میں بھرتی ہوگئے ۔ شروع میں کرایے کے مکان میں قیام رہا ۔ بعد کو
جب حالات سازگار ہوگئے ، تو ۱۹۲۸ء میں محلہ یحییٰ پور میں اپنا مختصر مکان خرید لیا ۔
ملازمت اور اس کے بعد بھی اپنی وفات تک وہ اسی مکان میں مقیم رہے ۔
۱۹۲۰ء میں انھوں نے الہٰ آباد کے جناب راحت حسین کی صاحبزادی سے نکاح کرلیا ، ان
کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے : پانچ لڑکے (محمد علی مصطفیٰ ، غضنفر علی غضنفر ، اظہر علی ،
حیدر علی ، صفدر علی) اور تین لڑکیاں (قیصر جہاں ، انیس جہاں ، فردوس جہاں) ۔
بڑی بیٹی قیصر جہاں کا ان کی زندگی میں انتقال ہوگیا تھا ۔ باقی سب بچے بفضلہ تعالیٰ
زندہ سلامت موجود ہیں ۔

۱۹۴۵ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ بدقسمتی سے کوئی سال بھر بعد ۱۹۴۶ء میں وہ بصارت سے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اپنی وفات تک اسی حال میں رہے
انھوں نے ۱۹۲۶ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ آغاز سخنگوئی میں کلام پر پروفیسر سید ضامن علی ضامن صدر شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی کے برادر خورد سید حامد علی حامد مرحوم سے مشورہ رہا پھر انھوں نے سید حسن مرتضیٰ شفق عماد پوری تلمیذ امیر مینائی سے رجوع کیا۔ شفق نے چند غزلیں دیکھنے کے بعد فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ پھر کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ افسوس کلام کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔
۲۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو دن میں فالج کا حملہ ہوا اور ہفتہ بھر بعد بروز جمعہ یکم نومبر ۱۹۷۴ء کو دن کے دس بجے داعیٔ حق کو لبیک کہا۔ خاندان کے علاوہ شاگردوں کی کثیر تعداد ان کے سوگواروں میں ہے۔

تاج ٹونکی، نواب محمد اسماعیل علی خان بہادر (والیٔ ٹونک)

انگریزی زمانے کے راجپوتانے میں ۲۲ ریاستیں تھیں اور ٹونک ان میں واحد مسلم ریاست تھی۔ اسے امیر الدولہ نواب محمد امیر خان (ف ۱۸۳۴ء) نے انگریزوں سے طویل کشمکش کے بعد ایک عہدنامے کی رو سے نومبر ۱۸۱۷ء میں قائم کیا تھا۔ علم و ادب کی سرپرستی اور اسلامی شعائر کی حفاظت اور پابندی ہمیشہ اس ریاست کا خاص شعار اور طرۂ امتیاز رہی۔ حضرت سید احمد بریلوی کی مہم کی ناکامی کے بعد ان کے بقیۃ السیف قافلے کے بیشتر مجاہدین کو یہیں پناہ ملی تھی۔ ٹونک کے دوسرے حکمران نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خان (ف ۱۸۶۴ء) کا نام غالب کی سوانح حیات میں بہت نمایاں ہے۔
نواب محمد اسماعیل خان اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے۔ وہ ۱۳ جنوری ۱۹۱۷ء کو ٹونک میں پیدا ہوئے۔ وہ چوتھے فرمانروا نواب محمد ابراہیم خان صولت جنگ کے بیٹے تھے اور بظاہر ان کے والیٔ ریاست ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا، لیکن مقدر کو کون ٹال سکتا ہے! نواب محمد ابراہیم علی خان کے انتقال (جون ۱۹۳۰ء) کے بعد

ان کے سب سے بڑے بیٹے نواب سعادت علی خان اُن کے جانشین ہوئے۔ وہ بھی تقریباً سترہ برس کی جہانبانی کے بعد جب ۲۳ مئی ۱۹۴۷ء کو رنگر اسے عالم جاودانی ہوئے تو چونکہ ان کے کوئی فرزند نرینہ نہیں تھا، ان کے چھوٹے بھائی اُن کے جانشین ہوئے پھر ان کے انتقال پر ۱۹۴۷ء میں ان کے چھوٹے بھائی فاروق علی خان گدّی پر بیٹھے لیکن اس پر مشکل سے چھ مہینے گزرے ہونگے کہ ان کا اچانک دتی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بھی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ ان کے برادرِ خورد محمد اسماعیل خان (جو باقی بھائیوں میں سب سے بڑے تھے) ان کے جانشین قرار پائے۔ یہ ۸ جنوری ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے۔ جب تک حکومت ہند کی طرف سے اس کی باقاعدہ توثیق نہیں ہوگئی، تاریخ ادب اُردو کے مصنف جناب رام بابو سکسینہ (ف ۱۹۵۷ء) جو یوپی میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے) ریاست کے منتظم قرار پائے، اور حکومت ہند کی طرف سے اجازت موصول ہوگئی، تو وہی وزیر اعلیٰ بنا دیے گئے۔

لیکن ملک آزاد ہو چکا تھا اور حکومت ہند چاہتی تھی کہ ساری ریاستیں اپنے آپ کو ملک کے نظم و نسق میں ضم کر دیں۔ چنانچہ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے نواب محمد اسماعیل علی خان بہادر نے بھی ٹونک کو اپریل ۱۹۴۹ء میں راجستھان سے ملا دیا۔ اس کے باوجود ٹونک کی رعایا کی محبت اور احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح یہاں کے لوگوں کا ملجا و ماوا بنے رہے۔ جمعرات ۲۱ نومبر ۱۹۷۴ء کو بعارضہ کینسر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ تجہیز و تکفین اگلے دن صبح گیارہ بجے ہوئی۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں ہندو مسلمانوں کا مجمع تھا۔ ہر طرف سے جنازے پر گلباری ہو رہی تھی اور کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جو اشکبار نہ ہو۔ موتی باغ (شاہی قبرستان) کے قطعۂ خاص میں اپنے دادا نواب وزیر الدولہ کے سرہانے سپرد خاک ہوئے۔

ان کے بھی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اہل خاندان اور ٹونک کے عوام نے ان کے چھوٹے بھائی نواب معصوم علی خان کو ان کا جانشین قرار دے لیا ہے۔

نو محمد اسماعیل علی خان نے ہوش سنبھالا، تو اپنے اردگرد علم و فضل اور شعر و سخن کی فضا

دیکھی ان کے والد نواب محمد ابراہیم علی خان خود بھی شاعر تھے، خلیل تخلّص تھا۔ وہ مضطر اور پھر بسمل سے مشورۂ سخن کرتے رہے تھے۔

نواب محمد اسماعیل علی خان کی تعلیم کا معقول گھر انتظام ہوا اور انھوں نے مختلف علوم متعدد اساتذہ سے حاصل کیے۔ بعد کو انگریزی تعلیم کے لیے میو کالج، اجمیر بھیجے گئے اور وہاں ایک انگریز ماہر تعلیم تالبوٹ کی نگرانی میں چند برس رہے۔

ٹونک اس زمانے میں شعر و ادب کا شہر تھا۔ یہاں نواب محمد ابراہیم علی خان خلیل کی سرپرستی کے باعث شاعری کا دور دورہ تھا۔ اساتذۂ وقت نواب سلیمان خان بہادر اسد لکھنوی، سید محمد حسین بسمل خیرآبادی، سید محمد افتخار حسین خان مضطر خیرآبادی، سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی اور ان کے تلامذہ نے ٹونک کو حریف دہلی اور لکھنؤ بنا دیا تھا۔ شاہی خاندان کے بیشتر افراد اور شہر کے لوگ شعر سے دلچسپی لیتے تھے اور آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ایسی فضا میں اگر نوجوان محمد اسماعیل خان بھی شعرگوئی کی طرف مائل ہو گئے، تو اس میں تعجب کا کیا مقام ہے! چنانچہ انھوں نے تاج تخلّص اختیار کیا اور اردو میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

انھوں نے مشورۂ سخن مولانا سید عبدالغفار خان سے کیا جو عربی، فارسی کے عالم اور اردو کے صاحب فن کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انھوں نے خود اپنے کلام پر مفتی مہدی حسن اور مولانا معین اجمیری سے اصلاح لی تھی۔ ۱۹۴۷ء تک اجمیر ہی میں رہے۔ آزادی ملک کے بعد جب وہاں کی سکونت مخدوش ہو گئی، تو ٹونک چلے آئے۔ شروع میں بہت دن تک نواب صاحب کے کتابخانے کے مہتمم بھی رہے۔ نواب صاحب مرحوم ان کے بڑے قدردان تھے۔

تاج مرحوم اگرچہ غزل سے بھی شغف رکھتے تھے، لیکن اخلاص حضرت رسالتمآب کی ذات ستودہ صفات سے جو محبت اور ارادت تھی، اس کا اظہار اکثر نعت کی شکل میں ہوتا رہتا تھا۔ اپنے پدر بزرگوار حضرت خلیل کے اتباع میں ربیع الاول میں سات دن تک محفل میلاد کا قیام ان کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اس کے اخراجات کے لیے ہزار دو ہزار

اپنی جیب خاص سے صرف کرتے تھے۔ روز ازبلا امتیاز مذہب وملت شیرینی تقسیم ہوتی تھی اور آپ کے محل مندر باغ میں چراغاں ہوتا تھا۔ ٹونک کی محفلوں کے بارے میں مولانا منظور الحسن برکاتی کا لکھا ہوا کتابچہ "ٹونک کے جشن میلاد النبی" خاصے کی چیز ہے۔ مولانا برکاتی ہی کا مرتب کردہ تاج مرحوم کے نعتیہ کلام کا انتخاب بھی "تاجدار مدینہ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے شروع میں انھوں نے وقیع اور جامع مقدمے کا اضافہ کیا ہے۔ اس پر نواب صاحب مرحوم نے انھیں خطاب اور خلعت اور انعام سے نوازا تھا۔

ان کی وفات سے ایک صاحب علم اور قدر دان شعر و ادب شخص ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔

ثمر چھپروی، عبدالحفیظ صدیقی

ان کے خاندان میں جہاں ایک طرف عربی علوم اور اسلامیت کی روایت تھی، وہیں دوسری طرف شاعری اور وکالت کا پیشہ بھی تھا۔ ان کے والد مولوی عبدالماجد چھپرہ کے کامیاب وکیل تھے اور اردو فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ نصرت تخلص تھا۔ انھیں تاریخگوئی میں خاصا ملکہ حاصل تھا۔ تاریخی نام سے اپنا مجموعۂ کلام "بیان الغرائب" کے نام سے مرتب کیا تھا، جو غیر مطبوعہ رہ گیا۔ اُن کے والد (یعنی ثمر کے دادا) مولوی بخشش علی عربی اور فارسی کے عالم، دینیات کے فاضل اور فارسی کے شاعر تھے۔ انھیں بھی تاریخ گوئی میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کا غیر مطبوعہ دیوان بھی خاندان میں موجود ہے۔

ایسے ماحول میں ثمر (عبدالحفیظ) کی یکم فروری ۱۹۱۳ء کو چھپرہ (محلہ دھیالزاں) میں پیدائش ہوئی۔ وہ آٹھ بھائی بہن تھے۔ دو بھائی ان سے بڑے تھے، پانچ چھوٹے؛ بہن بھی چھوٹی تھیں۔ یہ سات آٹھ برس کے تھے کہ ۱۹۲۰ء میں ان کے دادا مرحوم نے ان کے بڑے بھائی عبدالحکیم کے ساتھ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھیج دیا۔ یہاں وہ دو برس تک رہے۔ لیکن سیاسی ہنگاموں بالخصوص خلافت تحریک

کے باعث یکسوئی نصیب نہ ہوسکی۔ آخر ان کے والد کے مشورے سے انھیں انگریزی
تعلیم دلانے کا فیصلہ ہوا اور یہ پٹنہ واپس آگئے۔ یہاں محمدیہ اسکول میں داخلہ لیا۔
اس سے فارغ ہوکر پٹنہ کالج میں پہنچے۔ درجہ بدرجہ ترقی کرکے بالآخر ۱۹۴۳ء میں
پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ اس کے بعد وکالت کا امتحان (ایل ایل بی)
بھی پاس کر لیا۔
تعلیم کی تکمیل کے بعد کسب معاش کا مرحلہ آیا، تو اپنی سادگی پسند طبیعت کے اقتضا
سے شروع میں معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور پرسا ہائی اسکول۔ سارن (بہار) میں ملازم ہوگئے۔
لیکن نجی حالات کی مجبوری سے یہاں زیادہ دن تک نہیں رہ سکے اور والد کے توسط سے
پٹنہ ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے نوکر ہوگئے۔ آدمی محنتی تھے اور اخلاص و ایمانداری
سے کام کرنے والے، محکمے میں ترقی ہوتی گئی۔ پہلے ناظم دارالترجمہ مقرر ہوئے اور آخیر میں
ادتھ کمشنر۔ اسی عہدے سے ۱۹۷۱ء میں سبکدوش ہوکر پھلواری شریف میں مستقل سکونت
اختیار کرلی تھی۔
صحت بظاہر حال ہمیشہ اچھی رہی۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں دل کا دورہ پڑا۔ علاج کے لیے اسپتال
چلے گئے۔ مہینا بھر بعد ۲۶ نومبر ۱۹۷۴ء کو معالجوں نے کہا کہ آپ ٹھیک ہوگئے ہیں،
چاہیں، تو مکان پر واپس جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اسی شام پھلواری پہنچے۔ دوست احباب
رشتہ دار سب خوش و خرم تھے۔ ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرتے رہے۔ اچانک دس بجے
شب میں طبیعت بگڑ گئی اور اللہ اللہ کرتے جان بحق ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔
درگاہ مخدوم منہاج الدین راستی میں سپرد خاک ہوئے۔
ابتدائی ماحول اور تعلیم کے زیر اثر شروع سے ورع و اتقا کی طرف مائل تھے۔ ہمیشہ
پابند صوم و صلوٰۃ اور عامل اوراد و وظائف رہے۔ ان کی نیکی کا ادنیٰ سا ثبوت یہ ہے
کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا ہے، تو سب نے باتفاق رائے نماز جنازہ پڑھانے کے لیے
انھیں امام بنا دیا۔
ان کی شادی کوئلور (آرہ) میں داروغہ عبدالجلیل کی صاحبزادی (نسیمہ خاتون) سے

ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے چار بچے ہوئے: ایک لڑکا (جاوید اقبال) اور تین لڑکیاں ان شاء اللہ سب موجود ہیں۔

جس زمانے میں لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے، وہاں دارالعلوم میں ایک "بزم سخن" تھی، جس کے اہتمام میں مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ ان کی آٹھ نو برس کی عمر تھی، یہ بھی ان مشاعروں میں جانے اور وہاں اپنے سے بڑے طلبہ سے شعر لے کر اپنے نام سے پڑھ دیتے۔ یہی تفنن ان کی شعرگوئی سے شوق کی بنیاد بن گیا۔ چھپرہ اسکول کی طالبعلمی کے زمانے میں خود کچھ تک بندی کرنے لگے اور اصلاح کے لیے اسے اپنے دارالعلوم لکھنؤ کے رفیق سید ابراہیم ندوی نجم (سابق سپرنٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز، پٹنہ) کے پاس بھیجنے لگے۔ اس کا اعتراف ایک شعر میں بھی کیا ہے:

شاعری آتی نہ تھی دراصل مجھ کو اے ثمر
صحبتِ نجمِ سخنور نے سخنداں کر دیا

چندے بعد نجم نے انھیں اپنے استاد حضرت تمنا عمادی مجیبی (ف نومبر ۱۹۷۲ء) کے سپرد کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی جلد ہی منقطع ہو گیا اور ۱۹۳۳ء میں یہ سیماب اکبر آبادی (ف جنوری ۱۹۵۱ء) کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے؛ آخر تک انھیں کے دامن سے وابستہ رہے۔

انھیں نثر سے بھی دلچسپی تھی۔ کسی زمانے میں مشہور فرانسیسی ناول نویس اور مصنف ہیوگو کے ناول کا ترجمہ "بدنصیب" کے عنوان سے کیا تھا۔ ابتدا میں کچھ نظمیں انگریزی میں بھی لکھی تھیں، جو انگریزی ماہنامے "ٹریزر چیسٹ" میں شائع ہوئی تھیں۔ افسوس کہ ان کا کوئی اردو مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ کلام بہت پختہ اور بے عیب ہے۔ فلسفیانہ طبیعت پائی تھی، اسی کی جھلک ان کے کلام میں بھی ہے۔

انور کامٹوی، حافظ یار محمد انصاری

۱۸۵۷ء کی افتاد کے بعد انگریزی سیاست کی سخت گیری کے باعث شمالی ہند کے معاشرے میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ یہاں کی گھریلو صنعتیں روبزوال ہونے لگیں۔ اس زمانے

یں بھی دستکار اور پیشہ ور خاندان تلاشِ معاش میں ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ انھیں میں یو پی کے دیہات کے پارچہ باف بھی تھے، جو عرفِ عام میں انصاری کہلاتے ہیں۔ اسی برادری کا ایک خاندان نواری (ضلع فیض آباد) سے ۱۹۰۷ء میں ہجرت کر کے ناگپور سے سولہ کلومیٹر کی دوری پر کامٹی میں جا بسا، جو اس زمانے میں تجارت کا مرکز تھا۔ اس خاندان کے بزرگ حاجی شیخ امیر تھے۔ موصوف کے چار بیٹے تھے جن میں سے دو نے نام پایا۔ بڑے صوفی مولوی لعل محمد تھے۔ وہ عالم اور درس و تدریس سے شغف رکھنے والے بزرگ تھے۔ انھوں نے سید غلام کبریا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور خود بھی صاحبِ اجازت تھے۔ بہت لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ مارچ ۱۹۵۵ء میں رحلت کی۔

شیخ امیر کے دوسرے بیٹے ہی حافظ یار محمد انور تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جب خاندان نواری سے کامٹی آیا ہے، تو میری عمر کوئی سات برس کی ہو گی۔ اس طرح ان کا سالِ ولادت ۱۹۰۰ء کے قریب ہونا چاہیے۔ کامٹی پہنچ کر شیخ امیر نے بیٹے کو تعلیم کے لیے یہاں کے مشہور استاد حافظ حاجی صفی اللہ کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے حاجی صاحب موصوف کی نگرانی میں قرآن ناظرہ ختم کیا اور اسے حفظ بھی کر لیا۔ اس کے بعد فارسی ایک دوسرے استاد منشی محمد اسحاق صاحب سے پڑھی۔ کسبِ معاش کے لیے اپنے آبائی پیشے کو ذریعہ بنایا۔

یو پی کے اکثر گھرانوں کے کامٹی میں بس جانے کے باعث یہاں اردو کا عموماً اور شعر و ادب کا خصوصاً اچھا خاصا چرچا تھا۔ سال بھر مشاعرے ہوتے رہتے، اور عشرۂ محرم کی مجالس تو بڑے اہتمام سے ہوا کرتی تھیں۔ انور کی شعر گوئی شروع ہو چکی تھی۔ وہ بھی ان مجلسوں میں شریک ہوتے اور وہاں سلام وغیرہ پڑھتے۔ اس کے بعد طبیعت غزل کی طرف راغب ہوئی، تو انھوں نے مشہور مقامی شاعر سعید کامٹوی (ف مئی ۱۹۳۰ء) سے اصلاح لینا شروع کی۔

سعید خود صاحبِ فن اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ایک زمانہ ہوا، ان کا ایک مجموعہ کلام "ارمغانِ جدید" کے تاریخی نام (۱۳۱۳ھ) سے شائع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں چند سے

منشی محمد غوث مدراسی سے اصلاح لی؛ بعد کو حاجی تجمل حسین تجمل جلالپوری (ف ۱۹۳۳ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ تجمل کا سلسلہ تین چار واسطوں سے ناسخ سے جا ملتا ہے، لیکن تعجب ہے کہ اگرچہ سعید کے کلام میں لکھنوی رنگ نمایاں ہے، مگر انور کے ہاں اس کا اثر بالکل برائے نام ہے۔ رفتہ رفتہ انور نے خود استادی کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس نواح میں ان کے شاگردوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

نیو کامنی کلب نے ان کے کلام کا انتخاب "تجلیاتِ انور" کے عنوان سے شائع کیا تھا، ہنوز بہت کلام غیر مطبوعہ موجود ہے۔ کلام کا جو انداز و معیار ہے، اس کے پیش نظر یہ اس لائق ہے کہ اسے ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

اپنے گھر کے ماحول اور تعلیم کے زیر اثر ساری عمر صوم و صلوٰۃ کے پابند رہے۔ ۱۹۶۱ء میں حج بھی کیا تھا۔ اخیر تک ایام رمضان میں مساجد میں تراویح پڑھاتے رہے۔ غرض متقی، پرہیزگار، پابندِ وضع بزرگ تھے۔ وہ اختلاج قلب کے مریض تھے۔ بدھ ۲۷ نومبر ۱۹۷۴ء (۱۲ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ) دن کے گیارہ بجے مرض کا شدید حملہ ہوا جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ اسی دن مغرب کے قریب مسلم قبرستان، کامٹی میں تدفین عمل میں آئی۔ حکیم عزیز قدوسی کامٹوی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا۔

اُٹھ گئے بزمِ جہاں سے، افسوس ‍ ‍ ‍ ناز تھا اہلِ سخن کو، جن پر
از سرِ آہ، کہا دل نے، عزیز! ‍ ‍ ‍ "حیف جاتے رہے حافظ انور"

(آ ۱۹۷۳ + ۱ = ۱۹۷۴ء)

صلبی اولاد میں چار بیٹے اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔

شاہ معین الدین احمد ندوی

یوپی کے ضلع بارہ بنکی میں ایک مردم خیز قصبہ ردولی ہے۔ یہاں سے بعض ایسی ہستیاں اٹھیں جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا اور آج تک ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ انھیں میں صابریہ چشتیہ سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ

عبد الحق رح (ف ۸۳۶ھ) بھی تھے۔ جن کے نام سے اہلِ دل کے سینے روشن اور ان کی
محفلیں آج بھی گرم ہیں۔ ردولی میں ان کا مزار مرجع الناس ہے۔ شاہ معین الدین احمد
ندوی انھیں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان نسباً فاروقی ہے۔

شاہ صاحب ۱۹۰۳ء میں ردولی میں پیدا ہوئے۔ گھر کی زمینداری تھی۔ ان کے نانا شاہ
شرف الدین تعلیمیافتہ ہونے کے باوجود نہیں چاہتے تھے کہ یہ مزید تعلیم کے لیے گھر سے باہر جائیں،
لیکن معین الدین احمد کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ انھوں نے دستور زمانہ کے مطابق
اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھیں اور مزید دینی تعلیم کے لیے لکھنؤ پہنچ
گئے۔ یہاں متوسطات تک کی مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل میں تحصیل کی اور اس کے بعد
تکمیل کے لیے ۱۹۲۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ لیا۔ اس عہد میں یہاں
دارالعلوم میں ہر مضمون کا استاد اپنے فن کا ماہر، تقریر و تحریر کے میدان کا شہسوار، طلبہ
کا دلی ہمدرد تھا۔ نوجوان طالب علم نے اس علمی ماحول سے اور اپنے اساتذہ سے بھرپور
فائدہ اٹھایا۔ اس زمانے میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی (ف مارچ ۱۹۲۶ء) دارالعلوم میں
تفسیر کے استاد تھے۔ عجیب و غریب آدمی تھے، یہ مولانا نگرامی۔ علم و عمل کا شعلۂ جوالہ
افسوس کہ یہ آبگینہ جلد ہی تندیٔ صہبا سے پگھل کر صرف ۲۷ برس کی عمر میں آنکھوں سے
اوجھل ہو گیا۔ شاہ معین الدین احمد ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ نگرامی مرحوم نے ان
میں جوہر قابل دیکھا، تو ۱۹۲۴ء میں ان کے دارالعلوم سے فارغ ہونے پر انھیں
اپنے استاد مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (ف نومبر ۱۹۵۳ء) ناظم دارالمصنفین
کے پاس بلوا لیے گئے۔ کیا شبھ گھڑی تھی وہ، جب ۲۱ سالہ نوجوان شاہ معین الدین احمد
نے دارالمصنفین کے احاطے میں قدم رکھا تھا۔ جو رشتہ اس دن قائم ہوا، وہ پچاس
سال کے بعد موت کے ساتھ ٹوٹا۔

مولانا سید سلیمان نے انھیں تربیت کے لیے (۲۵ روپے مشاہرہ) رفیق مقرر کر دیا۔ آہستہ
آہستہ انھیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ دارالمصنفین نے سیرۃ النبوی کی تالیف کے بعد صحابہ
کے حالات کی تدوین شروع کی تھی۔ اس کی ابتدائی دو جلدیں (خلفائے راشدین" اور

ان کی پہلی شادی عنفوان شباب میں ہوگئی تھی، لیکن جلد ہی یہ خاتون انھیں داغ مفارقت دے گئیں۔ جس کے بعد دوسری شادی ہوئی، لیکن یہی حادثہ پھر پیش آیا۔ گھر والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ پھر تاہل کا جوا گلے میں ڈال لیں۔ اس وقت عمر یہی ۳۵ برس کی رہی ہوگی۔ لیکن اس اللہ کے بندے نے کسی کی ایک نہ سنی، اور پھر نکاح نہیں کیا۔ ان بیویوں سے دو بچے (ایک لڑکا اور ایک لڑکی) تھے انھیں پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ لڑکا شاہ وددا احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آج کل کراچی میں ہے اور لڑکی ثمر فاطمہ اپنے گھر بار والی ردولی میں۔ اس کی شادی اپنے خاندان ہی میں ایک جوان صالح چودھری ادلیس احمد سے کردی تھی۔

صحت ہمیشہ ٹھیک رہی۔ ہاں کبھی کبھی تنفس کی شکایت کرتے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں جب دارالمصنفین کا اجلاس بمبئی میں ہوا ہے، تو اچانک وہاں پہلی مرتبہ دل کی شکایت محسوس کی۔ لیکن اس پر کوئی تشویش نہیں ہوئی آخری وقت بہت ہی دبے پاؤں آیا۔ جمعے کے دن ۱۳ دسمبر ۱۹۷۴ء کو حسب عادت تمام معمولات سے فارغ ہوئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آنکھ لگ گئی۔ جاگے، تو عصر کی نماز کے لیے وضو کا پانی طلب کیا۔ کرسی سے اٹھنے لگے، تو گر گئے، اور پھر نہیں اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب فوراً بلوائے گئے۔ انھوں نے دیکھ کر اعلان کیا کہ شاہ صاحب اپنے رفیق اعلیٰ کے حضور حاضر ہو چکے ہیں۔ اِنّا للّٰہِ وَ اِنّا اِلیہِ راجِعُون۔

ان کی وصیت کے مطابق میت اگلے دن ان کے وطن ردولی گئی اور وہاں چودھری خلیل احمد کی مسجد کے احاطے میں آخری خوابگاہ نصیب ہوئی:

آسماں تربت پہ تیری عنبر افشانی کرے

شیر محمد اختر گجراتی

میرے ہمعصر اور دوست اور ہموطن تھے۔ یعنی وہ بھی گجرات (موجودہ پاکستان) کے رہنے والے تھے۔ وہاں ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میاں محمد یوسف غالباً

اوورسیر تھے، اور سرگنگارام مرحوم (ف جولائی ۱۹۲۷ء) کے دوستوں میں تھے۔ نیر محمد نے دسویں درجے تک زمیندارہ ہائی اسکول (موجودہ زمیندارہ کالج) گجرات میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد انھوں نے پولیس ٹریننگ اسکول، پشاور میں داخلہ لے لیا، اور وہاں سے تربیت کی تکمیل کے بعد پولیس کے محکمے میں بھرتی ہو گئے۔

لیکن ان کا مذاق ادبی بلکہ تعلیمی تھا، پولیس کی نوکری کب تک چلتی! تین چار سال تو گھر والوں کے مجبور کرنے پر کسی نہ کسی طرح گزار لیے، بالآخر انھوں نے ۱۹۳۰ء میں استعفیٰ دے دیا۔ اور سال بھر بعد لاہور چلے آئے۔

انھوں نے نفسیات کا مطالعہ بطور خاص کیا تھا۔ لاہور آ کر انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا، جہاں وہ نفسیات کے موضوع پر طلبہ کو تعلیم دینے لگے۔ اردو میں اس مضمون کی نصابی کتابیں بہت کم تھیں! چنانچہ اس کمی کے پورا کرنے کو انھوں نے اسی زمانے میں چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے، جنھیں وہ نصاب کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

لاہور کے مسلسل قیام سے وہ وہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں اچھے خاصے متعارف ہو گئے اور ان کے احباب کا حلقہ وسیع ہو گیا۔

نظم و نثر دونوں میں درک تو حاصل تھا ہی، اب وہ رسالوں میں مضمون بھی لکھنے لگے۔ ان دنوں مولانا احسن اللہ خان تاجور نجیب آبادی کا ماہنامہ شاہکار بڑے ٹھسّے سے نکلتا تھا۔ اختر ایک دن اس کے دفتر گئے۔ مولانا تاجور ابھرتے ہوئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور انھیں آگے بڑھانے میں بڑی مسرت محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے اختر کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے انھیں شاہکار کا نائب مدیر مقرر کر دیا۔ پھر مولانا تاجور کا جنوری ۱۹۵۱ء میں انتقال ہو گیا، اور شاہکار بھی بند ہو گیا۔ اس کے بعد اختر پنجاب کے مشہور ماہنامے ہمایوں کے ادارے سے منسلک ہو گئے۔ یہاں وہ ۱۹۴۸ء تک کام کرتے رہے۔

اس دوران میں بھی ان کا مدرسۂ نفسیات جاری رہا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں انھوں نے اس موضوع پر اپنے دو ماہانہ رسالے شروع کیے (۱) "نفسیات" اور (۲) "نفسیاتی جائزے"۔ یہ

یہ دونوں مدتوں باقاعدگی سے جاری رہے۔
اب ان کی ادبی حیثیت مسلم ہوچکی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ ہفتہ وار "قندیل" (لاہور) کے مدیر مقرر ہوئے، اور ۱۹۷۰ء تک اس رسالے کو مرتب کرتے رہے۔ اس میں وہ ہر ہفتے "میں دیکھتا چلا گیا" کے عنوان سے ایک کالم "تماشائی" کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ یہ سب حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس میں وہ لاہور اور صوبے کی ہفتے بھر کی ادبی، سماجی، سیاسی سرگرمیوں پر ہلکے پھلکے انداز میں تبصرہ کرتے۔ ان کی زبان سلیس، سادہ اور بڑی جاندار تھی۔ مولوی عبدالحق مرحوم تک اُن کی زبان کے معترف اور مداح تھے۔
وہ حلقۂ اربابِ ذوق اور رائٹرز گلڈ کے بنیادی اراکین میں سے تھے، اور حلقے کے جلسوں میں خاص ذوق و مستعدی سے شریک ہوتے تھے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ حلقے میں حاضری دینے والے ادیبوں کا کلام نظم و نثر انھیں بآسانی قندیل میں اشاعت کے لیے مل جاتا۔ یوں اس عہد کے بیشتر قابلِ ذکر ادیبوں کے مضامین اور منظومات قندیل میں چھپتی رہیں اور پرچے کا معیار اپنے معاصرین کے مقابلے میں بہت بلند ہوگیا۔ وہ اپنے مستقل کالم "میں دیکھتا چلا گیا" کے علاوہ بھی افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ان کی تقریریں ریڈیو سے بھی نشر ہوتی رہتی تھیں۔
۱۹۷۱ء میں ان پر پہلی مرتبہ فالج کا شدید حملہ ہوا، اور وہ بہت دن تک نقل و حرکت سے معذور رہے۔ بارے باقاعدہ علاج سے بعد کو کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے، لیکن اب بھی کمزوری اتنی تھی کہ پھر انھیں کامل صحت کا ایک دن بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء کے اواخر میں ان پر پھر فالج گرا۔ اب کے وہ علاج کے لیے یونائیٹڈ کرسچین اسپتال چلے گئے۔ دو مہینے بعد وہیں اسپتال میں ۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء کو عالمِ بقا کو راہی عالمِ جاودانی ہوگئے۔ جنازہ اسی دن اٹھا اور قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلیہِ رَاجِعُون۔ بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور چھ بیٹیاں اپنے سوگواروں میں چھوڑے۔

مرحوم اپنی سخن فہمی اور بذلہ سنجی، سیر چشمی اور وضعداری کے لیے مشہور تھے۔ جن ایام میں قندیل کے مدیر تھے کئی جگہ سے زیادہ تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش ہوئی، لیکن انھوں نے ہمیشہ انکار کر دیا۔ پروفیسر محمد سرور (جامعی) جنھوں نے مولانا عبید اللہ سندھی پر خاصا کام کیا ہے، اختر مرحوم کے ماموں ہیں۔ محمد سرور صاحب نے کسی زمانے میں حمید نظامی مرحوم کے "نوائے وقت" کے جواب میں اپنا روزنامہ "آفاق" جاری کیا تھا۔ انھوں نے معقول تنخواہ پر اختر کو بھی اس کے ادارۂ تحریر میں شمولیت کی دعوت دی۔ محمد سرور صاحب کو خیال تھا کہ اختر میرا بھانجا ہے اور تنخواہ بھی معقول، بھلا اسے قبول کرنے میں کیا عذر ہوگا! لیکن انھیں بھی مایوسی ہوئی۔ اختر نے اپنی وضعداری نباہی اور "من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش" کہتے ہوئے قندیل میں جمے رہے۔

ایک اور بات! اختر ان کا تخلص نہیں تھا، نہ وہ شعر کہتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا: اختر صاحب! آپ شعر نہیں کہتے، تو یہ نام کے ساتھ تخلص کیوں لگا رکھا ہے؟ کہنے لگے: اختر تخلص نہیں ہے، بلکہ یہ سید امتیاز علی تاج قسم کی چیز ہے! انھوں نے بھی تو کبھی شعر نہیں کہا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شیر محمد قسم کے نام کچھ فوجی اور جنگجو حضرات ہی کو زیب دیتے ہیں۔ میں نے التباس سے بچنے کی خاطر اپنے نام کے ساتھ اختر کا اضافہ کر لیا۔

انھوں نے کوئی پچاس کے قریب کتابیں چھوڑی ہیں۔ ان میں نفسیاتی موضوعات ہیں، افسانے ہیں، ڈرامے (اردو اور پنجابی) ہیں، تاریخ اسلام ہے۔ لیکن ادیب اور مصنف سے بھی بلند تر وہ انسان تھے۔ با اصول، مرنجاں مرنج، دوستوں کے ہمدرد اور کنبہ پرور۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان سے عفو و کرم کا سلوک کرے! آمین!

سید لطیف الدین ادیب

الموڑہ کی جدید بولی میں ضمیر کا صرفی مطالعہ

پہاڑی زبان کو ہند آریائی زبانوں کے جنوب مغربی گروہ میں شمار کیا گیا ہے۔ خود پہاڑی زبان کے تین گروہ قرار دیے گئے ہیں: ۱۔ مشرقی؛ ۲۔ وسطی؛ ۳۔ مغربی۔ وسطی گروہ میں دو زبانیں شامل ہیں: (۱) کمایونی، (۲) گڑھوالی۔

اردو زبان میں جتنی کتابیں علم لسانیات پر ملتی ہیں، ان میں پہاڑی زبان کے متعلق صرف متذکرہ معلومات ملتی ہیں، جو دراصل گریرسن کی پیش کردہ لسانی تقسیم پر مبنی ہیں۔ ہندی زبان میں وسطی پہاڑی زبان پر نسبتاً زیادہ تحقیقی کام ہوا ہے، مگر ہندی یا اردو میں وسطی پہاڑی کی قواعد نہیں ملتی، جس کے بغیر وسطی پہاڑی بولی کی لسانیاتی تفہیم آسان نہیں ہے۔ قواعد تیار نہ ہونے کے باعث وسطی پہاڑی بولی میں تحریری ادب کا فقدان ہے۔

وسطی پہاڑی بولیوں میں کمایونی زیادہ اہم ہے، کیونکہ کمایونی کا عہد قدیم سے ہندستان کے میدانی علاقے کا ساتھ مذہبی و تاریخی تعلق قائم رہا ہے۔ علاقائی مطالعے کی بنیاد پر اب تک کمایونی کے متعدد اسالیب بنائے گئے ہیں، جن میں الموڑیا[۱] جو ضلع الموڑہ کی بولی ہے، اپنی تاریخی قدامت و مرکزیت کی وجہ سے زیادہ اہم ہے۔ الموڑیا کے مطالعے سے وسطی پہاڑی بولیوں کی تفہیم میں بڑی [illegible] ہے۔

الموڑیا ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ یہ عدالتی سرکاری زبان نہیں ہے۔ سرکاری کام ہندی میں ہوتا ہے۔ ضمائر کسی زبان یا بولی کا کینڈا سمجھنے میں بڑی مدد دیتے ہیں، لہٰذا اس

۱۔ اہلِ الموڑہ اپنی بولی کو الموڑیا کہتے ہیں۔

اس مضمون میں جدید الموڑیا میں استعمال ہونے والے ضمائر کا صرفی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔
ضمائر شخصی: الموڑیا میں ضمیر "میں" کے لیے تین الفاظ مروّج ہیں: (۱) مَیں ؛ (۲) مُوں؛
(۳) ہم جن کا استعمال مرد و عورت دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ مثال:
مَیں اُوں چھوں یا مُوں اُوں چھوں یا ہم اُوں چھوں = میں آتا ہوں۔ میں آتی ہوں
مجھے اور مجھ کو کے لیے الموڑیا میں، مُوں اور ہم میں کیں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثال:
مَیں کیں کتاب[۲] دِیو، یا مُوں کیں کتاب دِیو، یا ہم کیں کتاب دِیو : مجھے کتاب دو۔
مَیں کیں اُون دِیو، یا مُوں کیں اُون دِیو، یا ہم کیں اُون دِیو = مجھ کو آنے دو۔
الموڑیا میں میرا کے لیے مَیر اور میری کے لیے مِیر بولتے ہیں۔ مثال
مَیر[۳] کام کرد = میرا کام کرو۔ مِیر کتاب دِیو = میری کتاب دو۔
الموڑیا میں ضمیر جمع متکلم ہم مستعمل ہے۔ مثال: ہم اُون نو = ہم آتے ہیں۔
الموڑیا میں ہمیں کا متبادل لفظ ہمَن ہے۔ مثال: ہمَن کتاب دِیو = ہمیں کتاب دو
الموڑیا میں ہمارا کے لیے ہمَر اور ہماری کے لیے ہمَر بولتے ہیں:
ہمَر کام کرد = ہمارا کام کرو ہمَر کتاب[۴] دِیو = ہماری کتاب دو
تو: الموڑیا میں بھی ضمیر تو مستعمل ہے، جس کا استعمال مرد و عورت دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ مثال: تو اُوں چھے = تو آتا ہے۔ تو آتی ہے۔
الموڑیا میں تجھے کے لیے تُوے اور تجھ کو کے لیے تُوے کیں بولتے ہیں۔ مثال:
تُوے[۵] کام چھ : تجھے کام ہے۔ تُوے کیں کام چھ۔ تجھ کو کام ہے۔
الموڑیا میں تیرا کے لیے تیَر اور تیری کے لیے تیر بولتے ہیں۔ مثال:
یو تیَر کلم چھ = یہ تیرا قلم ہے۔ یو تیر[۶] کتاب چھ = یہ تیری کتاب ہے۔
الموڑیا میں تم کے لیے تم اور تُم بولتے ہیں جن کا استعمال مرد اور عورت دونوں کے لیے

۲۔ الموڑیا میں پرانا لفظ پُوتھی ہے مگر اب کتاب عام طور پر بولا جاتا ہے۔
۳۔ عام تلفظ مَرا در مرہے ۴۔ عام طور پر ہمَر بولتے ہیں یعنی م بسکون۔
۵۔ عام تلفظ تُوسے رائج ہے۔ ۶۔ عام تلفظ تِرہے یعنی ت اور را بالکسر۔

ہوتا ہے۔ مثال:

تم اوں چھا : تم اوں چھا : تم آتے ہو۔ تم آتی ہو۔

تمھیں کے لیے تمن اور تم کو کے لیے تمن کیں مستعمل ہے۔ مثال:

تمن کام چھ : تمھیں کام ہے۔ تمن کیں کام چھ : تم کو کام ہے

الموڑیا میں تمھارا کے لیے تمر اور تمھاری کے لیے تمر مستعمل ہے۔ مثال:

یو تمر کلم چھ : یہ تمھارا قلم ہے یو تمرو کتاب چھ : یہ تمھاری کتاب ہے۔

وہ الموڑیا میں وہ کے لیے اُ استعمال ہوتا ہے، جو مذکر و مؤنث دونوں ہے۔ مثال:

اُ اوں چھ : وہ آتا ہے اُ اوں چھ : وہ آتی ہے۔

قدیم اردو میں وہ کی جمع وے مستعمل تھی۔ الموڑیا میں وے کے لیے اُون استعمال ہوتا ہے۔ مثال

اُون اُنی : وے آتے ہیں۔ وے آتی ہیں۔

الموڑیا میں ضمیر اس کا اظہار ییے سے ہوتا ہے۔ مثال:

یے پیلھ لیو : اسے پی لو۔ یے کیں پیلھ لیو : اس کو پی لو۔

یے ک گھر چھ : اس کا گھر ہے یے ک کتاب چھ : اس کی کتاب ہے۔

ان کے لیے الموڑیا میں ان اور ین الفاظ استعمال ہوتے ہیں: مثال:

ین نام بتاؤ : ان کا نام بتاؤ ین کھا لیھ لیو : ان کو کھا لو

ینر گھر چھ : ان کا گھر ہے ینر کتاب چھ : ان کی کتاب ہے۔

الموڑیا میں اُس کے لیے ول اور اُن کے لیے اُنل مستعمل ہیں۔ مثال:

ول[11] لکھ کھو : اس نے لکھا ہے اُنل[12] لکھ کھو : انھوں نے لکھا ہے

الموڑیا میں اپنا، اپنی اور اپنے کے لیے آپن، آپن اور آپن[13] مستعمل ہیں۔ مثال:

آپن کام کرو : اپنا کام کرو آپن بات کرو : اپنی بات کرو۔

۷۔ بول چال کا تلفظ تمرو ہے یعنی ر بسکون۔ ۸۔ عام تلفظ پیلھی ہو یعنی ل بہ سکون اور ہیہ متحرک۔
۹۔ عام تلفظ بہ سکون اور ہیہ متحرک۔ ۱۰۔ عام تلفظ ینرو ہے یعنی ر بہ سکون۔
۱۱۔ عام تلفظ میں ل بہ سکون۔ ۱۲۔ تلفظ اُنل یعنی ن بالکسر اور ل بہ سکون۔
۱۳۔ سندی میں یہ لفظ [illegible] لکھا جائیگا۔ یہاں [illegible] الف ممدودہ ہو، اور نہ الف معا بلکہ یہ صوت انگریزی لفظ ROYAL کے O کی طرح ہے۔ میں نے اس صوت کے اظہار کے لیے الف کی علامت سا کو اپنا لیا ہے۔

آپن کا مَن کر دو = اپنے کام کرو۔
مندکرہ بالامثالوں کی روشنی میں الموڑیا میں استعمال ہونے والے ضمائر شخصی کے لیے یہ قاعدے مرتب ہو جاتے ہیں :

قاعدہ (۱) : جب ضمیر فاعل ہوتا ہے، اس کے ساتھ لِ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ الموڑیا میں لِ علامت فاعل ہے :

میں لِ کام کرد = میں نے کام کیا۔ توں لِ کام کرد = تو نے کام کیا۔
وی لِ کام کرد = اس نے کام کیا۔ ہم لِ کام کرد = ہم نے کام کیا۔
تم لِ کام کرد = تم نے کام کیا۔ اُن لِ کام کرد = انھوں نے کام کیا۔

قاعدہ (۲) : جب ضمیر واحد مفعول ہو، تو اس کے ساتھ کَیں کا اضافہ کر دیتے ہیں :

مَیں کَیں = مجھے یا مجھ کو؛ توَے کَیں = تجھ کو؛ اُ کَیں = اسے یا اس کو۔

قاعدہ (۳) : جب ضمیر جمع اور مفعول ہوتا ہے اس کے ساتھ نَ کا اضافہ کر دیتے ہیں :

ہمنَ (ہم + نَ) ہمیں؛ تمنَ (تُم + نَ) تمھیں؛ اِنَن (اِن + نَ) انھیں۔

قاعدہ (۴) : جب ضمیر مضاف الیہ ہوتا ہے، تو ضمیر کے ساتھ رُ، رَ کا اضافہ کر دیتے ہیں :

مَیر - میر - ہمَر - ہمُر؛ تیَر - تیَر - تمُر - تمُر؛ اِنَر - اُنَر - اِنَر - اُنَر۔

جدید الموڑیا میں آپ کا استعمال بطور تکریم ہونے لگا ہے۔ سردست یہ تعلیم یافتہ یا میدانی علاقے سے تعلق رکھنے والے افراد میں محدود ہے۔

اُردو قواعد کی رُو سے ضمائر شخصی کا استعمال بطور محبت، بےتکلفی، مدح، عبودیت وغیرہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے : تو میری آنکھوں کا تارا ہے (محبت)؛ تو نہیں سمجھ سکتا (بےتکلفی)
تو صاحب قِران ہے (مدح)؛ اللہ! تو کریم ہے (عبودیت)۔
الموڑیا میں ضمائر شخصی ان نزاکتوں کے ساتھ مستعمل نہیں ہیں

قاعدہ (۵) : انگریزی میں جن ضمائر کو REFLEXIVE اور ہندی میں نج واچک کہتے ہیں۔ اُردو میں ان کا شمار ضمائر شخصی میں ہوتا ہے جن کا اظہار خود، آپ کو، اپنے تئیں، اپنے آپ کو وغیرہ سے ہوتا ہے۔ الموڑیا میں اس ضمیر کے اظہار کے لیے آپوں سے کام چلا لیتے ہیں۔ مثال :
اُوں آپوں تو نہیں گا نے گر اُ نَر کام مَیں کَیں کَرن پڑ = وہ خود تو چلے گئے مگر ان کا کام مجھے کرنا پڑا

یہ استعمال جدید تر ہے عوامی سطح پر یہ ضمیر استعمال نہیں ہوتا ، یہ ہندی داں تعلیم یافتہ افراد تک محدود ہے۔

قاعدہ (۶): انگریزی میں جن ضمائر کو Emphatic اور ہندی میں دڑھتا سوچک کہتے ہیں، الموڑیا میں ان کے اظہار کے لیے آپھی[14] سے کام چلا لیتے ہیں۔ مثال:

میں آپھی گو چھوں = میں آپ گیا تھا۔ میں آپ گئی تھی۔ تو آپھی گو چھے = تو آپ گیا تھا۔

تو آپھی گے چھی = تو آپ گئی تھی۔ ؤ آپھی گو چھی = وہ آپ گیا تھا۔

ؤ آپھی گے چھے = وہ آپ گئی تھی۔ آپن کام آپھی کرؤ = اپنا کام آپ کرو۔

ضمیر موصولہ۔ الموڑیا میں ضمیر موصولہ "جو" ہے اس کی مختلف شکلیں مندرجہ ذیل ہیں:

جے (جس) فاعل واحد ؛ جن (جن) فاعل جمع ۔ جے (جس) مفعول واحد ؛ جنن (جن) مفعول جمع ۔ جے (جس) مضاف الیہ واحد ؛ جن (جن) مضاف الیہ جمع ۔

قاعدہ (۷): ہندا ضمیر موصولہ کو تصریفی شکل دینے کے لیے مندرجۂ بالا الفاظ میں علامت فاعل "ل" علامت مفعول "کیں" اور علامت مضاف الیہ "ذ" یا "ک" بڑھا دیتے ہیں۔ مثال:

"جو" بطور ضمیر موصولہ: جو پونٹ میں چڑل اُول گرل = جو پیڑ پر چڑھیگا، وہ گریگا۔

"جو" کی تعریفی شکلیں: او آدم[16] چھیوں جےل ورات چورائی = وہ آدمی تھا جس نے روٹی چرائی۔

اُول آدم چھ جنل وراٹ چورائی = وہ آدمی تھے جنھوں نے روٹیاں چرائیں۔

اُ آدم چھ یو جے کیں مارو = وہ آدمی تھا جس کو مارا۔

اُول آدم چھ جنن کیں مارو = وہ آدمی تھے جن کو مارا

جے کی کام چھ اُوی کرل = جس کا کام ہے وہ کریگا۔

جنز کام چھ اُ کرل = جن کا کام ہے وہ کرینگے۔

ہندی کا ضمیر موصولہ یعنی سمبندھ واچک جون اردو میں تو مستعمل ہے، جیسے جون سا، جون سی، جون سے مگر الموڑیا میں مستعمل نہیں ہے۔ الموڑیا میں کہ بطور ضمیر موصولہ مستعمل نہیں ہے۔

الموڑیا میں ضمیر موصولہ بہ تکرار جیسے جن جن، جس جس وغیرہ البتہ بضرورت بولتے ہیں۔ مثال:

میں جنن[17] رجنار پاس گیوں اُن[18]ل سب ایک کے جاب دے = میں جن جن کے پاس گیا انھوں نے سب ایک جواب دیا۔

ضمائر استفہامیہ: الموڑیا میں ضمائر استفہامیہ مندرجۂ ذیل ہیں:

کو (کون) ؛ کی (کیا) ؛ کے دکیں (کس) ؛ کنن (کن)

قاعدہ ۹: ان ضمائر کو تصریفی شکل دینے کے لیے حالت فاعلی میں علامت فاعل یعنی ل کی ضرورت نہیں ہے۔ مثال: کو کوں = کون کہتا ہے ؛ کو کوں چھ = کون کہتی ہے ؛

کی کوں = کیا کہتا ہے ؛ کی کوں چھ = کیا کہتی ہے۔

حالت مفعول میں علامت مفعول یعنی کیں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثال:

کتاب کے کیں دی دے = کتاب کس کو دے دی ؟ رپیے کنن کیں دے لا : روپے کن کو دوگے ؟

حالت مضاف الیہ میں کی یا ز کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثال:

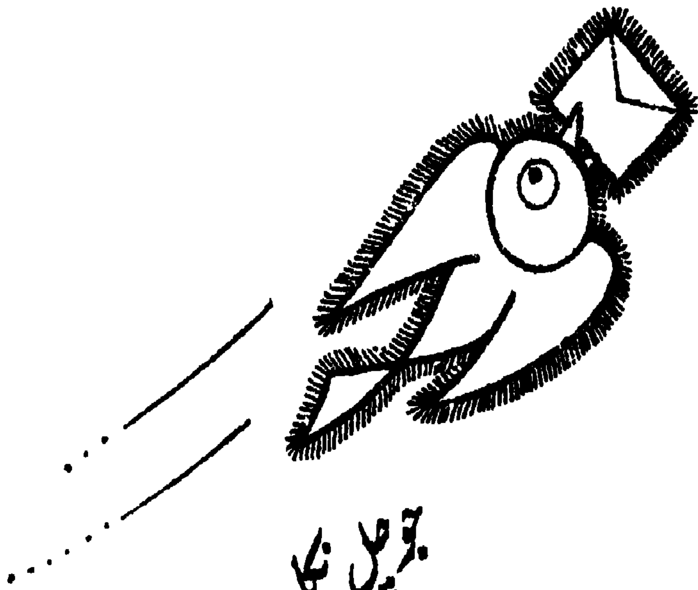
لیسکو کی کلم چھ = یہ کس کا قلم ہے ؛ یو کننز کلم چھ = یہ کن کا قلم ہے۔

پرانی اردو میں کن بطور ضمیر استعمال ہوتا تھا۔ الموڑیا میں یہ ضمیر بدستور استعمال ہوتا ہے۔

۱۴۔ یعنی آپ + ہی ۱۵۔ اس لفظ میں نون غنہ ہے۔ ۱۶۔ عام تلفظ آدْم یعنی دال ساکن اور میم بالکسر ۱۷۔ عام تلفظ جِنَنْ یعنی نون بالکسر اور لام بہ سکون ۔ ۱۸۔ عام تلفظ اُنِل یعنی نون بالکسر اور لام بسکون۔

قاعدہ (۱۰): کن کے ساتھ علامت فاعل لِ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثال:
کن لِ کرَو = کس نے کیا؟ کن لِ کن لِ کرَو = کس کس نے کیا؟
الموڑیا میں ان ضمائر کا تکرار بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثال:
کے کے چھ کوں = کس کس سے کہوں؟ کو کو آ چھی = کون کون آئے تھے؟
قاعدہ (۱۱): الموڑیا میں کون سا، کون سی، کون سے کا مفہوم کو سے ادا کردیتے ہیں حالانکہ سا، سی، سے کے لیے الموڑیا میں متبادل لفظ "ال" کو گرا "کو وال" نہیں بولتے، بدون "وال" ہی بولتے ہیں۔ مثال: کو کام کرَو = کون سا کام کیا؟ کو کتاب پڑھی = کون سی کتاب پڑھی؟
کو آم کھائیں = کون سے آم کھائے؟
ضمائر اشارہ: الموڑیا میں ضمائر اشارہ اُ (وہ) اور یو (یہ) ہیں۔ مثال:
اُ آم مِٹھ چھ = وہ آم میٹھا ہے۔ یو آم مِٹھو چھو = یہ آم میٹھا ہے۔
قاعدہ (۱۲): الموڑیا میں ضمائر اشارہ جب حرف کے ساتھ بولے جاتے ہیں، ان میں ل اور (ر) بڑھا دیتے ہیں۔ مثال:
وِئے ل سا پھ بیکھ یل = اُس سے صاف لکھا جائیگا۔ یئے ل کام نہ ہو = اس سے کام نہ ہوگا۔
اُنز کام نہ ہو = اُن سے کام نہ ہوگا؛ ینز کام نہ ہو = ان سے کام نہ ہوگا۔
الموڑیا میں "سے" کا متبادل لفظ "دِ" ہے۔ اُنز دِ کام نہ ہو یعنی ان سے کام نہ ہوگا۔ مگر بول چال میں بدون "دِ" کام چلا لیتے ہیں۔
صفاتِ ضمیری: الموڑیا میں صفاتِ ضمیری مندرجہ ذیل ہیں:
یَتُ + کَ (یتک) = اتنا؛ اُتُ + کَ (اُتک) = اتنا؛ جَتُ + کَ (جتک) = جتنا؛ کَتُ + کَ (کتک) = کتنا ۔ کے ۔
قاعدہ ۱۳۔ بول چال میں صفاتِ ضمیری مع کَ مستعمل ہیں۔ جب ان کا استعمال صرف صفت کے لیے ہوتا ہے، تو کَ محذوف ہو جاتا ہے۔ ویسے اس قاعدے پر بہت سختی سے عمل نہیں ہوتا۔ ضمیر ہو یا صفت، بدون کَ بھی بولتے ہیں۔ الموڑیا میں ضمائر کی تفصیل یہ ہے:
یَس = ایسا؛ کَس = کیسا۔ اُس = ویسا؛ جس = جیسا؛ تھوڑ = تھوڑا، چند، نیز مُن[19]
ایک = ایک؛ دوسر = دوسرا؛ دوی یہ = دونوں؛ بھوت = بہت
کوے[21] = بعض؛ سب = سب؛ ہر = ہر؛ پھلیان[20] = فلاں؛ کُتُ کیب = کئی۔
جدید الموڑیا میں کئی بھی ہندی تعلیم یافتہ یا میدانی علاقے سے تعلق رکھنے والے افراد بولتے ہیں۔ بعض، نیز، فلاں کے مترادفات الموڑیا میں نہیں ملتے اور انھیں کوے، مُن، دوسر اور پھلیان کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے۔

۱۹۔ عام تلفظ مُنُ یعنی نون بہ سکون۔ ۲۰۔ عام تلفظ دُلیُ۔ ۲۱۔ تلفظ کوئے۔



جو چل نکلے وہ منزل پہ پہلے پہنچ گئے

اگر آپ کو کوئی چٹھی لکھنی ہے تو ابھی لکھ کر ڈاک میں ڈال دیجئے۔
آخری ڈاک کے نکلنے کا انتظار نہ کرتے رہیے۔
اس طرح آپ کی ڈاک جلدی منزل مقصود پر پہنچے گی۔

ڈاک و تار



davp 74/[illegible]

بھاری انعام جیتئے

ہو سکتا ہے ایک لاکھ روپیہ آپ ہی کو مل جائے!

20.50 لاکھ روپے کے 11,116 انعامات

سال میں دو ڈرا

ایک	پہلا انعام	1,00,000	روپے
پانچ	دوسرا انعام	50,000	روپے فی انعام
دس	تیسرا انعام	20,000	روپے فی انعام
ایک سو	چوتھے انعام	5,000	روپے فی انعام
ایک ہزار	پانچویں انعام	500	روپے فی انعام
دس ہزار	چھٹے انعام	50	روپے فی انعام

ڈاک گھر کے سیونگز بنک میں 6 اپریل 1975ء سے پہلے پہلے 200 روپے یا اس سے زیادہ رقم جمع کر کے کھاتہ کھول دیجئے۔ آپ انعام کا انتظار کریں گے اور ساتھ ہی اپنی جمع شدہ رقم پر 5% سالانہ سود بھی پاتے جائیں گے جس پر انکم ٹیکس نہیں لگتا۔ آپ اپنے کھاتے سے لین دین بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ جمع شدہ رقم 30 ستمبر 1975ء تک کبھی بھی 200 روپے سے کم نہیں ہونی چاہئے۔ تب آپ کے کھاتے کو جنوری 1976ء کے ڈرا میں شامل کیا جائے گا۔ آپ اپنے اور اپنے کنبے کے ہر فرد کے نام پر، یہاں تک کہ نابالغ بچوں کے نام پر بھی، مختلف ڈاک گھروں میں ایک سے زیادہ کھاتے کھول سکتے ہیں۔

خاص بات

اگر جنوری 1976ء کے ڈرا میں آپ کا کوئی انعام بھی نہ نکلے تو

یاد رکھئے

کہ اگر آپ کے کھاتے میں ہمیشہ 200 روپے یا اس سے زیادہ رقم جمع رہے گی تو آپ اگلے ہر ڈرا میں انعام جیتنے کی توقع رکھ سکتے ہیں۔

جلدی کیجئے

آج ہی کھاتہ کھول دیجئے!



قومی بچت ادارہ

پوسٹ بکس 88، ناگپور

davp 74/408

تحریر

علمی مجلس دِلّی کا سہ ماہی رسالہ



مرتب:
مالک رام

Rs

Printed by Z. A. Abbasi at Kohinoor Printing Press,
Lal Kuan DELHI-6
and Published from "ILMI MAJLIS" OFFICE,
1429, Chhatta Nawab Saheb, Farrash Khana, DELHI-6.

تحریر

علمی مجلس دلی کا سہ ماہی رسالہ

(۳۲)

مرتب
مالک رام

جلد ۹ — اپریل/جون ۱۹۷۵ء — شمارہ ۲

چندہ سالانہ : پندرہ روپے — اس شمارے کی قیمت ۵ روپے
غیر ممالک سے: ۱/۲ ۲ پونڈ انگریزی / ۷ ڈالر امریکی

پرنٹر و پبلشر ظل عباس عباسی نے کوہ نور پریس، دلی میں چھپوا کر دفتر علمی مجلس، ۱۴۲۹ چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی ۶ سے شائع کیا

ملاحظات

تحریر کی مالی مشکلات بدستور پریشان کر رہی ہیں۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس طرح سے احباب کو یقین دلائیں کہ اس سے نہ صرف پرچے کے معیار پر ناخوشگوار اثر پڑنے کا اندیشہ ہے، بلکہ میری صحت پر بھی، جو پہلے ہی مخدوش حد تک سقیم ہو چکی ہے۔

اس پرچے کا ایک مضمون خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ یہ جناب راج کشور صاحب کا 'جدید پہیلیاں' ہے۔ پہیلی ہمارے لوک ادب کا اہم حصہ تھی؛ لیکن افسوس، کہ ہمارے ادیبوں نے ایک زمانے سے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اس سے ہمارے ادب کی ایک قدیم اور اہم صنف ناپید ہو گئی، وہیں ہماری نئی پود اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور انھیں صیقل کرنے کے ایک موثر ذریعے سے بھی محروم ہو گئی۔ ہمیں خوشی ہے کہ جناب راج کشور نے اس صنف ادب کا احیا کیا ہے۔ یہ قابل تقلید اقدام ہے۔

اگر ہمارے قارئین میں سے کچھ اصحاب ہندستان کی دوسری زبانوں کی پہیلیوں کے بارے میں کچھ لکھنا چاہیں، تو ہم شکریے کے ساتھ ان کے مضامین شائع کریں گے۔

مالک رام

راج کشور

جدید پہیلیاں

تمہید

پہیلی کیا ہے؟ پہیلی ایک ایسا فن ہے، جس میں حقیقت کا حلیہ اس حد تک بگاڑ دیا جائے کہ وہ سرسری نگاہوں کی پہنچ سے کہیں دور آگے نکل جائے۔ اور شرط یہ ہے کہ رمز شناس مناسب کوشش سے نہ صرف اسے پہچان سکیں، بلکہ ہمیشہ ایک ہی نتیجے پر پہنچیں۔ سیدھی سادی بات کو گھما پھرا کر کہہ دینے کا نام پہیلی ہے، تو کبھی کبھی پُرپیچ باتوں کے پیچ و خم نکال کر صاف کر دینا بھی پہیلی بن جاتا ہے:

اک ٹیڑھ سادگی میں اک سیدھ بانکپن میں

پہیلی کا مقام: انسان کی اعلیٰ ترین خصلتوں میں ایک مشکل پسندی کی بھی ہے۔ اگر خطرات کا سامنا نہ ہو، دشوار یاں سدِ راہ نہ ہوں، تو خوابیدہ صلاحیتیں کبھی بروئے کار ہی نہ آئیں اور ترقی رک جائے۔ تلاشِ حق، ناقابلِ عبور پہاڑ، بیکنار سمندر، تپتے ہوئے صحرا، خلائے بسیط، ریسرچ کی عرق ریزیاں، علوم کی دماغ سوزیاں، یہ نقشے، یہ شطرنج، یہ معمے، یہ پہیلیاں —— یہ سب ایک ہی راہ کے مختلف پڑاؤ ہیں۔

پہیلی بوجھنے کا گر: پہیلی کا کامیاب حل ڈھونڈنے کا گر یہی ہے کہ ماہر وہ راہِ عام سے ہٹ کر منزل کی تلاش کرے۔ ورنہ ٹھوکر کھائیگا، بھٹک جائیگا۔ اگر راہ کی ہمواری کا بھروسا کر بیٹھے، تو احتیاط معطل ہوجائیگی، ماحول میں ڈوب گئے، تو تہ کی خبر لاؤ گے۔ جانے بوجھے مجاز میں الجھے نہیں اور حقیقت پر لگا کر اڑی نہیں۔ کچھ الجھنیں تو عمداً پہیلی میں داخل کی ہی جاتی ہیں۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ ان سے زیادہ الجھنیں خود بوجھنے والے کا تحت الشعور، روایت پرستی، قدامت پسندی اس کی سہل انگاری مہیا کرتے ہیں۔ بقول اصغر گونڈوی

ایک پردہ آنکھ کا ہے، دوسرا محمل کا ہے

میرا ان پہیلیوں کا لکھنا محض ایک اتفاق تھا، بلکہ حادثہ تھا۔ دسمبر ۱۹۴۳ء (یا شاید ۱۹۴۴ء) تک، جب یہ سلسلہ شروع ہوا، میں نے نہ کبھی پہیلیاں لکھنے کی بات سوچی، نہ کوئی کامیاب یا ناکام کوشش ہی کی تھی۔ اتفاق سے میں اسی زمانے میں بیمار ہوگیا۔ بیماری نے طول کھینچا، نقل و حرکت پر پابندی لگ گئی۔ اس جبری تعطیل کے زمانے میں، ایک دن پہیلی بنانے کی اندرونی تحریک ہوئی۔ نتیجہ بہت اچھا نہیں تھا، تاہم تیر نشانے کے قریب جا بیٹھا۔ لگتا ہے، ایسا بدا تھا۔ پھر ہنسی مذاق میں کبھی کوئی پہیلی ہونے لگی۔ اب بچوں کی فرمائشیں بھی پوری ہونے لگیں۔ مشترکہ خاندان حاضرین کی کمی کو پورا کرتا رہا۔ گھر کی فضا میں مسکراہٹیں اور قہقہے بس گئے۔ رفتہ رفتہ پہیلیوں سے لگاؤ ہوگیا۔ ان کی تعداد بھی بڑھتی گئی؛

سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا (میر)

لیکن ان پہیلیوں کے کاروبار کو جاری رکھنے کا اصلی سہرا گھر کے بچوں کے سر ہے۔ وہ اسکول سے لوٹتے ہی بیٹھے انھیں اونچے اونچے رٹتے رہتے، گویا انھیں اسکول سے یہی کام ملا ہو۔ ان کا یہ شوق مزید پہیلیاں لکھنے کی کھلی دعوت تھی۔ پہیلیوں کی کسوٹی پر کسنے میں بھی وہی کارآمد ثابت ہوئے۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ پہیلی کا مضمون تو

میرے ذہن میں دوسرا ہوتا، لیکن بچے اپنے مطلب کی کوئی دوسری چیز تجویز کردیتے اور یوں اصلاح کی گنجایش نکل آتی۔ پھر بچے کسی نہ کسی وجہ سے دور ہوتے چلے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں اب پہیلیوں کا مزاج بدلنے لگا۔

ان پہیلیوں پر والدہ مرحومہ کا بہت گہرا اثر ہے۔ کتنے ہی الفاظ یا فقروں کے ٹکڑے جو اُن کی زبان پر رہا کرتے، پہیلی میں جوں کے توں آگئے ہیں۔ محاورات اُن کی زبان پر بےتکلفی سے آجاتے۔ اور میں انھیں نوٹ کرلیتا ہے۔ محاورے کے پردے میں کتنی ہی پہیلیاں ہوئیں۔ شاعری اور سنت بانی سے بھی انھیں بیحد دلچسپی تھی۔ اس کا اثر بھی جابجا پایا جاتا ہے۔

پہیلیاں بوجھنے میں سب سے تیز میری بیوی نکلیں۔ یوں خیال ہوتا جیسے انھوں نے کتاب کی طرح شروع سے آخر تک پڑھ رکھا ہے۔ لیکن اب ایک اور دلچسپ وجہ ذہن میں آئی ہے۔ وہ محاورے سے بالکل بےخبر ہیں۔ لہٰذا محاورے کی الجھن سے سے دامن بچاتی وہ سیدھی بوجھ پر جا پہنچتی ہیں۔

میرے ایک بزرگ پہیلیوں کے معاملے میں متضاد طبیعت لے کر آئے تھے۔ مشکل سے مشکل پہیلی تو یوں چٹکی بجاتے بوجھ لیتے۔ لیکن اگر کسی ہلکی پھلکی پہیلی سے سامنا ہو جاتا، تو شامت ہی آجاتی۔ اور بغلیں جھانکنے لگتے:

کبھی یہ جستجو جلوے کو بھی پردہ بناتی ہے (اصغر)

ہوتا دراصل یہ کہ وہ شست بہت دور کی باندھ کر بیٹھتے۔ ایسے میں معمولی شکار ناک تلے سے ہو کر نکل جائے، تو ان کی بلا سے۔

میرے ایک عزیز ان پہیلیوں سے بہت متاثر تھے۔ آرٹ ان کی زندگی کا تانا بانا تھا۔ اور پہیلیوں کا ادبی پہلو ان کے دل کے تاروں میں لرزش سی پیدا کر دیتا۔ اسی لیے میرا معمول تھا کہ جب بھی کوئی نئی پہیلی ہوتی۔ انھیں بھیج دیتا۔ اس کے پس منظر پر بھی روشنی ڈالتا اور تجزیہ کرتا۔ اس سے پہیلی پر نظرِ ثانی کا موقع ملتا۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی، وہ نئی پہیلیوں کے لیے تقاضا کرتے۔ بیسیوں مرتبہ

انھوں نے پہیلیوں کے مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کی۔
ایک بار لنگڑے آم کی پہیلی ہوئی:

چھوٹوں بڑوں کے منہ لگا ہے ، ہر محفل کی زینت ہے
ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے ، لنگڑا نے کی قیمت ہے

میں نے یہ پہیلی ایک محترم کو چٹھی میں لکھ دی۔ عرض کیا: "لنگڑا آم بھیجا ہے، شوق فرمائیے۔" دس بارہ دن کے بعد جواب آیا کہ "پہیلی بھیجنے کے لیے شکریہ، لیکن بوجھ کا پتا نہیں چلا ؛ اور لنگڑے آم کا پارسل بھی ابھی تک نہیں پہنچا"۔ عرض کیا: لنگڑا آم تو اسی لفافے میں تھا کھوجیے، وہیں مل جائیگا۔ کچھ روز بعد دوسرا خط ملا کہ لنگڑے آم کے ٹوکرے میں بھی وہ لطف نہ ملتا، جو اس کی پہیلی میں آیا۔
گھر کی فضا اور پہیلی :- ایک بار کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ مولی کی روٹی سامنے آئی۔ میرے ایک عزیز نے پوچھا۔ مولی کی روٹی پر پہیلی لکھی گئی ہے یا نہیں؟ اسی وقت ایک پنجابی پہیلی برآمد ہوئی۔

اوپر آٹا، نیچے آٹا وچ کسے دا چٹا جھاٹا
(اوپر نیچے تو آٹا ہے، اور بیچوں بیچ کسی کے سفید بال)

عزیزوں نے شکایت کی کہ پہیلی تو بیشک بن گئی اور یہ خوشی کی بات ہے؛ لیکن اس کے سننے کے بعد مولی کی روٹی کھانے کا مزا کرکرا ہو گیا۔
ایک بار ایک عزیز اگلے وقتوں کی باتیں لے بیٹھے۔ ان کے کوئی عزیز قینچی سے داڑھی ترشواتے اور موچنے سے فاضل بال اکھڑوا دیا کرتے تھے۔ موچنے کے نقطے پر میں نے انھیں ٹوک دیا "کتنا اچھا مضمون ہے، پہیلی کے لیے" اور اگلے دن میں موچنے کا خیال دل میں لیے سفر پر روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد پہیلی وارد ہوئی۔ یہ بھی پنجابی میں ہوئی۔ یاد رہے، پنجابی میں موچنے کو اُچا بھی کہتے ہیں: سنیے:

نائیاں دی صحبت وچ گذریا ، آپ نوں جانے اُچا
بیوے ٹے چھک چھک وال پٹیندا، اویکھو کیڈا لُچا

ہنا ہمیشہ نائیوں کی صحبت میں اور اس پر اپنی بڑائی کا گمان ۔ باپ کے بال کھینچ کھینچ کر
اکھاڑتا ہے : کیا الجھا ہے)

میرے ایک عزیز برسوں گنّے پر ریسرچ کرتے رہے ۔ جب انھیں ان پہیلیوں میں دلچسپی
ہوئی تو میں گنّے کی طرف توجہ دینے لگا اور کئی پہیلیاں لکھ ڈالیں ۔

تو میرے بابے کو چاہے ، میں تیرے بڈھے کو چاہوں

پہیلی کا ادبی اور تکنیکی پہلو : ادب زندگی کے بہت قریب ہوتا ہے، یہ زندگی کا
آئینہ دار ہوتا ہے۔ ادب میں زندگی کی تنقید ہوتی ہے ۔ بظاہر تو پہیلی جیسی صنف
کا، جہاں سیدھی سادی بات کہنے میں بھی فن کو سو سو جوکھم ہوتے ہیں، فن کے پیمانے
پر پورا اترنا قدرے مشکل معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن تجزیہ کیا گیا، تو صاف دکھائی دیا کہ
وقت کی شاہراہ پر زندگی اور پہیلی ساتھ ہی ساتھ گئے ہیں:

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو (اصغر)

ماتم ہوا، پہیلی میں بین بھر گئے، مصیبت کا سامنا ہوا، دستِ دعا بن گئی، واقعات
کا ذکر ہوا، تو افراد کے خاکے اُبھرنے لگے، تنقیدیں ہوئیں، پشیمانیاں ہوئیں، اور جب
حالات ناسازگار ہوئے، تو برسوں تک خاموشی رہی ۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۰ء تک
صرف ایک ہی پہیلی لکھی گئی اور دیکھیے، اس میں بھی کیسی بے بسی اور جھنجھلاہٹ ہے:

گھائل سا پنچھی بیچارا ، گرمی سے گھبرائے
اُڑ چلنے کی شکتی ہارا، پنکھ رہا ڈولائے (ہاتھ پنکھی)

پہیلی احساس کی پروردہ ہے ۔ محبت کا ماحول پیدا ہوا، کسی بات کو شدت سے
محسوس کیا، کوئی چیز دل کو چھو گئی ۔ اچنبھے میں آ گئے ۔ بس، پہیلی بننے کے امکانات
روشن ہو گئے ۔

ایسا لگتا ہے، ان پہیلیوں میں اکثر آمد ہی ہوتی ہے، آورد کا نام و نشان نہیں ہوتا۔
بہترین پہیلی وہ ہے، جس میں ردّ و بدل کی گنجائش بالکل نہ ہو۔ جیسے آپ اُسے
کہیں سے نقل کر رہے ہوں ۔ اس کے برخلاف بارہا یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عقل کی

ے

کارفرمائیاں ہوئیں، ساز و سامان ٹھیک کیا گیا۔ پینترے تجویز کیے گئے، محاورات کی تلاش ہوئی، لیکن اس کے باوجود پہیلی کا کہیں میلوں تک پتا نہ چلا۔ پہیلی لکھنے والے کی اپنی ہی دنیا ہوتی ہے اور اختیارات نہایت وسیع۔ صحیح تو ازن میں بات کہہ دینا اس کے ہاں معیوب ہے۔ اس کے لیے رعایت لفظی سے کام لینا روا، الجھی ہوئی تشبیہیں کام میں لانا یا تشبیہوں کا اُلٹ دینا ثواب۔ گھسے پٹے اور متروک الفاظ ہی کے کھوٹے سکے اس کی سرکار میں آزادی سے چلتے ہیں۔ اور وہ محاوروں پر جو دست درازی کرتا ہے، وہ الگ، غرض کون سا قانون ہے، جو اس کے ہاتھوں محفوظ ہے؟ لیکن وہ بھی کیا کرے! اسی جھوٹ کے سایے میں پل کر پہیلیاں پروان چڑھتی ہیں۔

اب یہی خیالات قدرے پہیلیوں کی مدد سے واضح کرتا ہوں:

۱۔ کسی لفظ کو توڑ دیا، تو پہیلی ہو گئی:

سُن بیگم کی رام کہانی — شیش محل میں رہا کریں
لیس لگائیں، جوڑ لگائیں — کیا کیا بتیا سہا کریں (گوند)

کسی لفظ کو جوڑ دیا، تو پہیلی ہو گئی:

ٹاٹ کا سندر ٹھاٹھ بنایا — راجا جی کے محل کو ڈھایا
جونہی جل کا چھینٹا دیا — اسی منٹ وہ پتھر بھیا (سیمنٹ)

کسی لفظ کو مروڑ دیا، تو کام بن گیا:

سر میں پیر دھرا ہے اس کے — پیر میں اُلٹا دھرا ہے سر (پیرس)

۲۔ کبھی محاورے کی آڑ میں پہیلی کہہ دی:

دال کا رسیا، تیل میں لوٹے — نام بڑا اور درشن چھوٹے (دال بڑا)

کبھی محاورے کو بگاڑنے سے پہیلی ہو جاتی ہے:

دیے تلے سب روشن روشن — دیے کے اوپر سایہ (بلب اور شیڈ)

محاورہ ہے "چراغ تلے اندھیرا"

مثبت اور منفی کی تمیز سے پہیلی بے نیاز ہوتی ہے۔

۳۔ کبھی کبھی ہم شکل، لیکن مختلف المعنیٰ الفاظ کو آپس میں الجھا دینے یا غلط ملط کر دینے سے پہیلی کے خدوخال ابھر آتے ہیں:

اک اک بال پہ کتنے دانے　　　دانے دانے پر اک بال

(گیہوں کی بالی)

تو کبھی مختلف زبانوں کے ہم آواز الفاظ کا آپس میں گٹھ جوڑ کر کے ایک لسانی مسئلہ کھڑا کر دیا جاتا ہے:

ایک انوکھی دیکھی یار　　　ماکھن جیسی کومل نار
ہندو کے گھر میں بسرام　　　مسلمان کا سا ہے نام

(کریم)

۴۔ پہیلی کو رسم و روایت کے حصار میں لا کھڑا کر دیا، تو عقل اسی چاردیواری کے اندر سر پٹکتی رہ گئی:

جوگی کی یہ کرامات　　　اگیا تھامے ننگے ہات

(چمٹا)

جاگیردارانہ نظام کا عیش رفتہ بھی آنکھوں میں ایک چکا چوند پیدا کیے بغیر نہیں رہتا:

راجا کے رنواس میں　　　رانی ہیں بتیا سن
سر پٹکیں دیوار سے　　　جل بل ہو دیں راکھ

(دیا سلائی)

کسی لوک کتھا کا اثر پہیلی میں آیا اور بچپن کی سہانی یادوں نے سر اٹھایا:

ایک دیو دم سادھے کھڑا　　　جیوڑا اک ڈبیا میں پڑا
منتھیا سی جوں جوں سرکائیں　　　خوب چلائے لاتیں باہنیں

(بجلی کا پنکھا اور ریگولیٹر)

۵۔ بے تکاپن اور بے جوڑپن پہیلی کی جان ہیں۔ گویا بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

جدید پہیلیاں

آپ ہی اس کو ناچ بجائے وہ ناچے تو پیٹی جاوے
(گلی ڈنڈا)

لوگوں کے قول و فعل میں تضاد پایا، بے جوڑپن دیکھا اور ریاکاروں پر برسنے لگے:

ہری بین کے انڈے سہرے ہری بھگت کو بد دعائیں پڑے
چھلی سے تو جی کتراتیں انڈے لیکن ڈٹ کر کھائیں (مٹر)

کہیں اُلٹے بانس بریلی والا قصہ ہوگیا:

ننھا سا منّا بالشت بھر کا لقمے بنا کر باوا کو دیتا (چمچہ)

یا روزمرہ کے تجربے کے بالکل اُلٹ بات نکل آتی ہے:

لال دمکتا سندر چہرہ دُھل کر ہوا ہے کیسا کالا (انگارہ)

طلسمات کے ماحول میں عقل دنگ رہ جاتی ہے:

کانچ کے پنجرے میں سونے کا پنچھی چٹکی بجائی چمک کر آیا
چٹکی بجائی جان ہی دے دی کانچ کے سونے پنجرے کا پنچھی
(بجلی کا بلب اور سوئچ)

لوہا اور عجائب کپڑے لتّے اُتر گئے تو بجھ غائب
(پیاز)

پہیلی میں محاورہ اور ضرب المثل: وہ چھوٹا سا فقرہ جو حیاتِ انسانی کے بہت لمبے تجربے پر مبنی ہوتا ہے ضرب المثل بن جاتا ہے۔ اگر کوئی معاملہ کسی ضرب المثل کی کسوٹی پر کھرا اُترا، تو گویا دلیل بازی ختم ہوگئی، اور طرفین نے ہتھیار ڈال دیے۔ پہیلی میں ضرب المثل کا استعمال آسان نہیں ہوتا، اس سے بوجھ بالعموم مشکل ہو جاتی ہے:

جھٹک جھٹک کر اسے اٹھایا بڑے جتن سے ہوش میں آیا
لاڈلا تب وہ ماں کا پوت کرنے لگا کھوڑے موت (لیمپ)

لاڈلا پوت کھوڑے موت ضرب المثل ہے:

دال کا رسیا، تیل میں لوٹے نام بڑا اور درشن چھوٹے (بڑا)

جدید پہیلیاں

کس نے سب پر کیچڑ پھینکا، کس نے یہ دیوار اٹھائی
اپنی کرنی اپنی بھرنی، کچھ سوچ کچھ سمجھو بھائی
(درنی)

کمر میں گیلا سا وستر، سینے میں سلگائی آگ
بھری سبھا میں رنگ جمائے لنگوٹی میں کھیلے پھاگ
(چلم)

تار تار سا چھایا چندوا، میلا سا ملبوس جالوں پر ٹوٹ کے پڑتا، ایسا مکھی چوس
(مکڑا)

زبان صدیوں منجھتی ہے، تب کہیں اس میں بول چال کا مخصوص انداز پیدا ہوتا ہے، محاورہ پیدا ہوتا ہے۔ محاورہ بول چال میں شان و شوکت پیدا کرتا ہے، تھوڑے الفاظ میں زیادہ معنی ادا کرتا ہے۔ محاورے کو نظر انداز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا پہیلی میں محاورے سے وضاحت کے بجائے پردے کا کام لیا جاتا ہے۔ ایسا مطلب کی بجائے لفظی مطلب حل ڈھونڈنے میں معاون ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ بھٹا: اینٹ سے اینٹ بجا دو آس میں
۲۔ دیا سلائی: سر پٹکیں دیوار سے، جل بل ہو دیں راکھ
۳۔ گراموفون: کالے کوسوں چلتا جاوے
۴۔ سرمہ: آئین مکھ کالا کیا، کالکھ سنت یہ ڈار
۵۔ تنکا: گو ٹوٹ ٹوٹ کر مرتا ہے، اک اک نے کان مروڑا ہو
۶۔ تنور: خود ہی مجھے جلاتے ہو، پھاہے دھرنے کیا آتے ہو
(جلے پر پھاہے دھرنا" محاورہ ہے)
۷۔ ڈگڈگی: جس اور بھی منہ کو موڑے ہے، اس اور ہی منہ کی پڑتی ہو
پھلکا اور توا: ایک تو پھر پھر گال پھلائے، دوجا اس پر تان اڑائے
۸۔ پیچ کس: میں وہ ڈوبی پھر نہیں ابھری

زبان: ان پہیلیوں میں ضرور زبان کی خامیاں رہ گئی ہونگی۔ کہیں کہیں پنجابی محاورہ بھی نادانستہ آیا ہوگا۔ میرے ذخیرۂ الفاظ کی کمی کی وجہ سے ممکن ہے کسی جگہ کوئی لفظ صحیح نہ بیٹھا ہو۔ تعلیم اور پیشے کے لحاظ سے ہندی اور اُردو دونوں سے بیگانگی رہی ہے

حفیظ اپنی بولی محبت کی بولی
نہ اُردو، نہ ہندی، نہ ہندوستانی

برج بھاشا میں پہیلی لکھنے کا رواج حضرت امیر خسرو سے شروع ہوا کہ یہ ان کی ننھیال کی زبان تھی۔ ان کے بعد قریب قریب سب لکھنے والے اسی رواج کی پیروی کرتے رہے لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ پہیلی کو بول چال کی زبان کے قریب لایا جائے۔

خیال ہوتا ہے کہ سنسکرت اور عربی اور فارسی میں بھی ضرور پہیلیاں رائج رہی ہونگی۔ اگر یہ درست ہے تو انھیں اُردو میں منتقل کرنا چاہیے۔ حضرت امیر خسرو، میرزا سودا، سید انشاء، بہادر شاہ ظفر، حکیم آغا جان عیش اور بعض دوسرے شعراء سے کافی تعداد میں پہیلیاں منسوب ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کی جانچ پڑتال کی جائے اور انھیں باقاعدہ مرتب کر کے کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔ ہندستان کی علاقائی پہیلیوں کو بھی ہندی اور اُردو میں منتقل کرنا چاہیے۔ ان کا مقامی رنگ مضمون میں تنوع اور تازگی پیدا کر دیگا۔ مروجہ پہیلیاں جو شہروں اور دیہاتوں میں ہزاروں لاکھوں کی زبان پر ہیں، انھیں بھی جمع کیا جائے۔ جہاں اصلاح کی گنجائش ہو، وہاں اصلاح کر دی جائے۔ اس طرح بہت سا عوامی لٹریچر محفوظ ہو جائیگا اور آیندہ کے لیے اس میں نئی روح بھی پھونکی جا سکتی ہے۔

پہیلیاں

۱
کریم

ایک انوکھی دیکھی یار! ماکھن جیسی کومل نار
شیشے کے گھر میں بسرام مسلمان کا سا ہے نام

۲
اینٹوں کا بھٹہ

مانگھ لاگے کئی ہزار محل ہوا بن کر تیار
مالک جب دیکھن کو آیا کیا جانے کیا جی میں آیا
بولا: "آگ لگا دو اس میں اینٹ سے اینٹ بجا دو اس میں"

۳
لکڑی

سورداس غریب کے نہ جورو نہ حبات
جنگل کی اک بالکا سنگ پھرے دن رات

۴
چمٹا دسپنا

جوگی کی یہ کرامات اگیا تھامے ننگے ہات

۵ ـ چرخا

امّاں نے اک بچّی پالا سُندر سُندر بولی
ہاتھ سے اُس کے جو لگا لیتا انڈوں سب تا جھولی

۶ ـ آئینہ

میں ہنسی تو ہنسن لاگا میں روؤں تو روئے
میں ناچی تو ناچن لاگا ایسا میت نہ کوئے

۷ ـ قلم

ننّھا جب مونڈ منڈاتا ہے خطوں کو ٹھیک کراتا ہے
اور تال میں ڈبکی لیتا ہے تو دل اک چنگی لیتا ہے
عرفان کی باتیں کہتا ہے بس علم کا دریا بہتا ہے

۸ ـ دیا سلائی

راجا کے رنواس میں رانی ہیں پچاس
سر پٹکیں دیوار سے جل بل ہو دیں راکھ

۹ ـ چمچا

ننّھا سا منّا بالشت بھر کا لقمے بنا کر باوا کو دیتا

۱۰ ـ ربر کی گیند

لالہ نے تو ند بڑھائی ہے اک کُرتی چُست چڑھائی ہو
پٹکیں تو اور بھی اُچھلے ہے یوں کانٹے سے دم نکلے ہو

۱۱ ـ خلال

دادی امّاں کا لاڈلا ہے یہ جب بھی دیکھو گلے لگا ہے یہ
ذرّہ بھر بھی چاہے کھاتی ہیں اس کو تھوڑا مگر چکھاتی ہے
سونے چاندی میں یوں تو ڈھلتا ہے جھوٹے پر اس کا جی مچلتا ہے

گراموفون

۱۲

ایک بار بھر پیٹ جو کھائے — کالے کوسوں چلتا جائے
باتوں باتوں منزل کاٹے — سبھی سُنیں کوئی بات نہ کاٹے

بنسری

۱۳

سُوکھ سُوکھ لکڑی بھئی — جَرجَر بھیا شریر
روم روم سے کہہ رہی — اپنے من کی پیر

آرسی

۱۴

دُلھن کوئی میکے سے سسرال آئی — تو ننھی بندریا سی ہمراہ لائی
لیے پھرتی انگلی سے اس کو لگائے — جو تاکے بندریا وہیں مُنہ دکھائے

سُرمہ لگانا

۱۵

آپن مکھ کالا کیا — کالکھ سندت پہ دار
سنتن کی جیوتی بڑھی — دُشمن کے آ دھار

قبرستان

۱۶

ایک گاؤں میں اچرج دیکھا — پڑا بینٹ سنسان
اپنوں نے بھی چُپی سادھی — مِتر بنے انجان

بجلی کا بلب

۱۷

کانچ کے پنجرے میں سونے کا پنچھی — چٹکی بجائی ہمک کر آیا!
چُٹکی، بجائی، جان ہی دے دی — کانچ کے سُونے پنجرے کا پنچھی

دروازہ

۱۸

ایک پہیلی میں کہوں — سُن رے، بالمکند!
جب وہ دونوں مل گئے — آنا جانا بند،

گلی ڈنڈا

۱۹

آپ ہی اس کو ناچ نچاوے — وہ ناچے تو بیٹھ جاوے

۲۰۔ مرچ

ننھی سی کامنی نے کلغی لگائی سر پر
موتی جڑا اُڑ زیور تمانی ہو سرخ چادر
گزرا ہو بچپنا گو، دھانی لباس چھوڑا
پر اب بھی کاٹ کھانا اُس نے کیا نہ چھوڑا

۲۱۔ بڑی (کھانے کی)

مشقت سے پس دال کائی ہوئی ہیں
کڑی دھوپ سہہ سہہ کے آئی ہوئی ہیں
اسی سے ہے نام اور عزت بھی ان کی
ہے سب کی زبان پر "بڑی بی! بڑی بی!"

۲۲۔ کیلنڈر

گن گن اک اک ماس بتایا
گن گن صبح شام بتائے
ورش کا منھ پر کال لکھا تھا
کال کا پلّہ تھام نہ پائے

۲۳۔ کوڑادان

دنیا بھر کا جو پھٹکارا
گھر سے باہر گیا جو دھارا
کھلا سدا ہے اُن پر دوارا
ایسوں کا بس یہی سہارا

۲۴۔ پرکار

اک پاؤں گڑا ہے دھرتی میں
اور ایک لگا ہے گشتی میں

۲۵ ہینڈ پمپ

جھٹک جھٹک کر اُسے اُٹھایا
بڑے جتن سے ہوش میں آیا
لاڈلا تب وہ ماں کا پوت
کرنے لگا کیوڑے موت

۲۶۔ چنری بیل

ایک بیل میں اچرج دیکھی
مالن کو لپٹا رے
چُن ری مالن! پھول جتن سے
نہیں کوئی رہ جائے
پھول ایسے سرکار ٹنکے ہیں
کون جو لینے پائے

۲۷۔ کھویا

اگنی تاپی، چمٹے کھائے
کچے پن کو دور بھگائے

ندی کی سی گئی روانی ۔ پارے کی سی گئی جوانی
وہ رنگت گوری دودھیلی ۔ پڑ گئی کیسی پیلی پیلی
کھویا کھویا سے کیسے کنارہ ۔ سمٹ رہا کیسا بیچارہ

۲۸۔ سیمنٹ

ماٹ کا سُندر ٹھاٹھ بنایا ۔ راجا جی کے محل کو دھایا
جونہی جل کا چھینٹا دیا ۔ اسی منٹ وہ پتھر بھیا

۲۹۔ ہتھ پنکھا

گھائل سا پنکھی بیچارا ۔ گرمی سے گھبرا سے
اُڑ چلنے کی شکتی ہارا ۔ پنکھ رہا ڈُلا ئے

۳۰۔ سیگرٹ

مڑھیا میں ٹولی کی ٹولی ۔ سیت برن سم دیہہ
جو اُٹھ بیٹھیں مُکھ سوں لاگے ۔ سبک سبک جیا دیہہ

۳۱۔ مالا

بھگتن سیوا ایوں رتے ۔ دیہی جیسے کاٹھ
پریم سوت میں بند رہے ۔ سُو کئے اوپر آٹھ

۳۲۔ بجلی کا پنکھا

اک نٹوا اچرج کرے ۔ لٹکا چھت، سوں بانس
اُلٹا ہو کر نت کرے ۔ پھولے بجید سانس

۳۳۔ حجامت کا بُرش

جٹا جوٹ اک ایسا تپسی ۔ دیہی کا ٹھ سمان
بھسم بھبوت سے رہے اچھوتا ۔ نت کرتا اشنان

۳۴۔ گرداھا

ایک پہیلی میں کہوں ۔ دھرتی گرد ا ہے سوئے
جوں جوں داکو کاٹیے ۔ چوکھا چوکھا ہوئے

۳۵۔ کارخانے کی چمنی

لم ترٹ نگ کھڑی ہے لشچل آسمان سے بات
مکھ سوں چھوٹ رہی چنگاری کیسی رہے لہرات

۳۶۔ چشمہ

آنکھوں میں جب آنکھیں ڈالیں روشن ہوئی خدائی
لوٹ آئے وہ بیتے لمحے کھوئی دولت پائی

۳۷۔ نقلی دانت

اِک اِک کر سب چل دیے اُجڑ گیا اِک گانو
دو گنتوں نے پھر دہاں ڈالا آن پڑاؤ
جُبتم جُٹا ہوئے رہیں داتا کِلکِل ہوئے
دو پاٹن میں آئے کے ثابت رہا نہ کوئے

۳۸۔ کرس بھری

گول مٹول سی اِک رسونتی نام کو ہی بس ترقع کرنا
ایسی دیدے پھٹی نگوڑی ہاٹ بجا رچا ہے وہ چڑھنا

۳۹۔ نکٹائی

گلے میں ڈال بہیاں، جھول رہی سجنی
منّو امیں گانٹھ دا کے، پیروں میں بیڑی
سینے سے لاگ جھول رہی سجنی

۴۰۔ دربان

یوں اُسے در پہ بار دیتے ہیں سو رہے تو نکال دیتے ہیں

۴۱ سکریو جیک

سر میں جوں جوں چکّر آئے، اونچا اونچا اُٹھتا جائے

۴۲۔ سیفٹی ریزر

کھیتی جب لہ لہ مسکائے دودھانے اونے بر کھائے
پھاوڑی سے جب کری صفائی بالوں کی سدھ کہیں نہ پائی

۴۳۔ روزانہ اخبار

آج تو بیں سب ہاتھوں ہات کل اس کی سب پھیکی بات

۴۴۔ چکّی

پتّھر کی دیوی سمجھ نہ آئے بھوگ لگاتے کیوں غرّائے

۴۵۔ بجلی کا پنکھا

سو داس جی دھیان مگن تھے چٹکی لیتی کسی نے چپکے
تجملّا کر سب سدھ گنوائی ہوا سے کینی ہاتھا پائی

۴۶۔ لاکھ کی مُہر

لاکھ موئی کا جھلسا منہ اڑی رہی ضد پر بدخو
جب جب بات کوئی سمجھائی ہر دم الٹی ہی دوہرائی

۴۷۔ ریشم کی گدّی

پیڑ سے چڑھی دولھنیا بیٹھی ٹکے شال میں بیسوں تارے
پیتم کا من ایسا چنچل کبھی لگائے کبھی اُتارے

۴۸۔ لوکاٹ (پھل)

دیہی جیسے ملدی ملدی اندر کیسی گانٹھ
جیون کی یہ کڑی منزل جیسے بنے الو کاٹ

۴۹۔ مسہری

پڑا قلعے میں ایک ہی سینک چھلنی چھلنی سب دیواریں
بیری ٹیک گئے سر کتنا ہار گئے کر کر یلغاریں

۵۰. بیل

بیلو نے جب پانو نکالے گھر والوں کی جلتی چھاتی
رہتی کہیں پر، کھاتی کہیں پر چھنیں کو ٹھے پھاندے جاتی

۵۱. تھرمس بوتل

اک جوڑواں کا عجب تماشا دیکھی دو اور مکھوا ایک
گرمی سردی کو نہیں مانے پکڑی ہے کچھ ایسی ٹیک

۵۲. بالوں کی سوئی

دُبلے پتلے پر نہ جاؤ بے بی کا سینہ ہے
بھری سبھائیں بال پکڑ کر یش کیرت ہر لینا ہے

۵۳. چوہے دان

اک چھوٹے سے گھر کے اندر طرح طرح کے چُنے ہیں کھانے
جو صاحب مہمان ہوئے ہیں باہر نکلیں تو جانیں

۵۴. کوئیلہ

کلموہے کو راکھ بنایا ایک جلے کو اور جلایا

۵۵. چھلنی

بم بم بھولا موج میں آئے تانڈو کے کچھ بھاؤ بتائے
پانو تلے سے ماٹی کھسکی بادا کیسے؟ اماں کس کی؟
ننھے منے بالک جاگے جانیں اپنی لے کر بھاگے
تونڈل سرما تھا ٹیکائیں گرتے پڑتے دائیں بائیں

۵۶. بلبلا

کیسا ڈرے اور ٹھمکے اک آنکھ مُندا تیرا ک
ٹک آنکھ ذرا سی جھپکے اور جان سے دھوئے ہات

۵۷ بُلبُلا

ننھے سے تیراک کو دیکھو کیا ڈرے اور ٹھٹکے
دہی کا بندھن ٹوٹے ٹک آنکھ جو اپنی جھپکے

۵۸ گیہوں کی بالی

اک اک بال پہ کتنے دانے دانے دانے پر اک بال

۵۹ کلہاڑی

کاٹھ کی ٹنگڑی، لوہے کا جوتا کاٹ لیت نج نپوتا

۶۰ دستانا

ہاتھوں چاہے پکڑ لیا پر چھو نہیں پائے

۶۱ لیمپ اور شید

دیے تلے سب روشن روشن دیے کے اوپر سایہ

۶۲ بیر بہوٹی

برکھا کی رُت آئی آئی شوق نے لی جی میں انگڑائی
مان بھری نے مان کو چھوڑا لال مخملی پہنا جوڑا

۶۳ چنگاری

ننھا یوں گھر چھوڑ سدھارا آوارہ جیسے کوئی تارا
چھن سی اک آواز ہوئی بس ختم وہیں پر واز ہوئی بس

۶۴ پرنالا

برکھا میں کیا کچھ سہتا ہے ہونٹوں پر نالہ رہتا ہے

۶۵ گنّا

توک توک جن کروا دینا دھرت تلے جن گڑوا دینا
نین پٹم جن کروا دینا بیری سے بدلہ یوں لینا
مُنہ شکر سے بھروا دینا

۶۶ اسٹوو

چھوٹی سی اک باوڑی ہوا کا انت نہ پار
نیر چڑھا آکاس کو برس رہے انگار

۶۷ اسٹوو

سُلگائیں کہیں، بجھائیں کہیں پھونکیں کہیں، بھڑکائیں کہیں

۶۸ دروازے کی گھنٹی

ننھا در سے لاگ کے رہتا آتے جاتے کچھ نہیں کہتا
کوئی جو اس کی آنکھ چھپائے جھٹ سے بھیتر چغلی کھائے

۶۹ کسوٹی

ماتھا رگڑا رگڑ رہ جائیں من کا کھوٹ گُرو جی پائیں

۷۰ بائیسکل

گو ہاتھ میں جکڑے ڈنڈے سے اور پیروں میں زنجیر سی ہے
دھرتی پر پاؤں نہیں پڑتے گردش بھی خوش تاثیر سی ہے

۷۱ آرام کرسی

پیٹھ سے اس کی پیٹھ لگائی باہوں پر رکھ دینی باہنہ
گود میں اس کی جو پایا ہے ایسا سکھ آرام کہاں

۷۲ راکھ دان

اک کنڈ دا پر اچرج آوے جیتے بھر تو گھیر
راکھ بھسم ادھ جلی لکڑیاں اور ہاڈ کا ڈھیر

۷۳ دبڑ کی مہر

بھر بھر لوتیں منہ پر کالک ایک ایک نے آن دبایا
لش ہے مس اس سے نہیں کہتی ہر دم قصہ وہی سنایا

۷۴ پیپر ویٹ

ایسی عقل سے عاجز آئے چڑھ بیٹھے جہاں کا غذ پائے

۷۵ کلپ

یہی ہے جی میں دانت گڑائے ملے نہیں بن ناک دبائے

۷۶ کلپ

سیکھو رکھا بس دانت گڑانا ناک دبائے بن نہیں مانا

۷۷ گوند (گم)

سُن بیگم کی رام کہانی شیشی محل میں رہا کریں
بیس لگائیں جوڑ ملائیں کیا کیا بپتا سہا کریں

۷۸ دروازے کا پردہ

جو کھوٹ تھامے کھڑے ہیں کب سے کھلے کھلے اور پردہ سب سے

۷۹ چندن

رگڑ رگڑ کر اپنا ماتھا ہر ماتھے پر شوبھا پاتا

۸۰ چیونٹی

کام بڑے اور ننھی جان مرنے بھر کو بھری اُڑان

۸۱ ذیابیطس

کئی کئی ایسے ناکارے گھر میں ناحق شکر ڈارے

۸۲ پتوں کا دونا

پتوں کے کپڑے تنکوں سلائے دوبارہ پھر کام نہ آئے

۸۳ بادام

نین رسیلے، کاٹھ کی پلکیں پلک اُگھارے نیناں ڈھلکیں

۸۴ مانگ

جنگل ایسا گھن کا جنگل بیلیں آپس میں گتھ جائیں
پگڈنڈی ایسی پگڈنڈی مت کر بھی مٹنے نہیں پائے

۸۵۔ رسّی اور گھڑا

پیتم چلے پاتال کو نا رکھنی گُل مال
دُبدھا میں رہی لٹکتی نہ گھر سنجے نہ لال

۸۶ پلیٹ فارم ٹکٹ

ٹکٹ کٹا یا پیسے دینے ریل چڑھے تکرار
یہ کیسا اندھیر ہے لوگو! کیسا اتیا چار

۸۷ ریڈیو کا ایریل

آسماں میں جال بچھایا پنچھی تو کوئی ہاتھ نہ آیا
پھانس لیے پر نالے اُن کے گانے اور ترانے اُن کے

۸۸ بڑا

دال کا رسیا تیل میں لوٹے نام بڑا اور درشن چھوٹے

۸۹ توس، چائے

پہلے بیری آپ ہی کاٹے آپ ہی اس پر مرہم لگائے
جب تک یہ سب گلے اتاریں شربت سا کچھ گرم پلائے

۹۰ اردی

کیا لائی ہے کو بجری کیا لائی سوغات میلی ملی اوڑھنی، اور اجلے اجلے گات

۹۱ مٹر

ہری من کے انڈے ہرے ہری بھگت دبدھا میں پڑے
چھلکے سے تو جی کترائیں انڈے لیکن ڈٹ کر کھائیں

۹۲ رات کی رانی

ہرا سا بانا، موتی سے پھیلے خوشبو ہے مہکانی سی
رات کو سونے باغیچے میں کون کھڑی ہے رانی سی

۹۳ فٹ بال

دم سادھے ہے منہ باندھے ہے
لات کھائے ہے بھاگ جائے ہے

۹۴ پستہ

لال گال اور پست قامت کوئی پہاڑی دکھتا ہے
دھنوانوں کے دسترخوان پر صبح شام جو لیتا ہے

۹۵ پرمٹ

کسی پرمٹ کے چکر میں وہ آئے کہ پھر چکر لگاتے دن بتلائے

۹۶ کدو کش

اُس مقدس مقام کے راہی اونچی نیچی سی راہ پکڑتے ہیں
پرزہ پرزہ نہ ہو رہیں جب تک ان کے ارمان کہاں نکلتے ہیں

۹۷ بجلی کا کھڑا پنکھا

ایک دیو دم سادھے کھڑا جیوڑا اک ڈبیا میں پڑا
ننھیا سی جوں جوں سرکائیں خوب چلائے لاتیں بانہیں

۹۸ کتا اور مالک

چھ ٹانگیں اُٹھ چلیں سیر پر ایک میں تھوڑی کان
ایک ہی رسی بندھا ہے کانو اور کلیان

۹۹ ستارہ ٹوٹنا

سلیٹ پر لکیر، جو لکھے اور مٹائے وہ ہاتھ نظر نہ آئے

۱۰۰ سل بٹہ

پتھر کے دو دیوتا کشتی لڑیں بچاری پس پس مریں

۱۰۱ چکلا بیلنا

اماں باوا کاٹھ کٹھیلے گود کے کھیلے ڈھیلم ڈھیلے

کیتلی

۱۰۲

اندر پانی باہر آگ — اس برہمن کا یہی سہاگ

کھیر

۱۰۳

دودھیا جل اور دودھیا اچھ — باہمن سگلی ڈالی چاکھ

پانی کا نل

۱۰۴

گو ٹوٹ ٹوٹ کر مرتا ہے — گھر گھر کا پانی بھرتا ہے
کس نے اس کو چھوڑا ہے — اک اک نے کان مروڑا ہے

ڈاکٹر، ٹیکا، فیس

۱۰۵

رہا کہاں وشواش کسی کا — جھوٹی مالا، جھوٹا ٹیکا
دکھیاروں پر ڈنک چلائے — کوڑی پیسہ سب لے جائے

ڈاکٹر، اوپریشن، فیس

۱۰۶

زخم کھائے اور لہو بہایا — تب کہیں دل کو چین آیا
بیری سے یوں بدلہ چکایا — مٹھیوں اس پر زر لٹایا

پانی کا جگ

۱۰۷

پیٹ میں پانی کمر پہ ہاتھ — کھانے پر البتہ ساتھ

دروازے کا کھٹکا

۱۰۸

راہ باندھے لیٹا دربان — لاکھ کہو نہیں دھرتا کان
جونہی کوئی کان مروڑے — کھٹ سے اٹھے راستہ چھوڑے

پیاز

۱۰۹

لو یہ اور عجائب، کپڑے لتے اترگئے تو بچہ غائب

پائیدان

۱۱۰

سادھ سنگت کے جوتے چھاڑے — اس پر ہردم کھائے لتاڑے

اسٹول

۱۱۱

سر سپاٹ اور ترچھی ٹانگیں

گلدستہ

۱۱۲

بن باس جو کرتے تھے — گھر بار بسا دیں ہیں
مینہ دھوپ جو سہتے تھے — اب سایے میں آئے ہیں

بادام، ناریل

۱۱۳

کھوپڑی کاٹھ کی دماغ تر — کہو پہیلی، مرلی دھر!

کُپّی، قیف

۱۱۴

منہ بڑا اور پیٹ ذرا سا — ادھر پیا اور اُدھر پیاسا
پینے کی لت ایسی ڈالی — بیسوں بوتل کر دیں خالی

نَدّاف، دُھنیا

۱۱۵

فرصت کی گھڑیوں کا مصرف — اندر دیوتا یوں فرمائیں
دُھنک لیے دھرتی پر بچریں — اولوں کے یہ میگھ بنائیں

رنگریز

۱۱۶

بارہ مہینے ہولی کھیلے — نٹ کھٹ کی ایسی ہے لیلا
کپڑوں اُجلوں پر رنگ ڈالے — چھوٹے نہ ہرگز میلا کچیلا

تنور

۱۱۷

خود ہی جب اُسے جلاتے ہو — بھلا ہے دھرنے کیا آتے ہو

سُنیاری کا ٹھنا

۱۱۸

مونڈے سر قینچی چلوائی — لٹ پر کٹ کٹتی ہی آئی

دودھ متھنا

۱۱۹

یہی متھو کے اور کچھ کے — اِس کا پیار اور اُس کا دُلار

۱۲۰ پارہ (سیماب)

ایسا ہے قسمت کا مارا
تڑپے ہے بس پارہ پارہ

۱۲۱ رُوئی

گھر چھوٹا، بچے بھی چھوٹے
دیہہ ہوئی ہے گا لا
اس پر جاکر سُوت بنی
قسمت کو کس نے ٹالا

۱۲۲ ڈگڈگی

کیا کٹھن ہے جیون کی منزل
ڈگ ڈگ پر جان نکلتی ہے
جس اُور بھی مُنہ کو موڑے ہے
اس اُور ہی مُنہ کی پڑتی ہے

۱۲۳ ہاتھی

جھومتا جائے، ٹھہرا چلتا
سردی گرمی پنکھا جھلتا

۱۲۴ طبلچی اور طبلہ

ایک گُروجی اور دو چیلے
بھری سبھا آئے البیلے
گُرو تے اُن کی مشکیں لی کس
مار مار کر دینا بے بس
چیلے جوں جوں شور مچائیں
گرو خوشی سے پھولے جائیں

۱۲۵ جلیبی

ڈگ ڈگ پر بل کھاتی جائے
رگ رگ میں وہ شہد بسائے

۱۲۶ گول گپّے

کئی کئی ہیں ایسے بوٹے
پانی سنگ بہی جائیں لوٹے

۱۲۷ قلفی

مٹکے نے دے ڈالے انڈے
کوڑے کرکٹے اور ٹھنڈے ٹھنڈے

۱۲۸ کافور

اور سنو کلجگ کی بات
برف کے ٹکڑے لاگی آگ

کیکڑا

۱۲۹

یہ بھی ہے انداز کسی کا بڑھنا آڑا، چلنا سیدھا

تالی

۱۳۰

قہر کہیں، انعام کہیں ایک ہاتھ کا کام نہیں

شہد

۱۳۱

بن پانی سے شہر بسا بنا بن چینی ہوئی مٹھاس
بس ٹوٹا ہے، کچھ جھوٹا ہے ہٹ تیرا ستیا ناس

سُرمہ لگانا

۱۳۲

دوات میں پانی نہیں، ہولڈر میں نب نہیں، لکھنے کو کورا کاغذ نہیں
لیکن وہ خوشخط لکھا وٹ آنکھوں نور کلیجے ٹھنڈک

فوٹو گرافر

۱۳۳

اس کی جانب گھورے جانا ادھر اُدھر تکنا کبھی پاپ
بھرسک دانت نکالے رہنا کہاں سے آئے ہم کو آپ

بیساکھیاں

۱۳۴

وہ بغلوں میں اس کو کھینچے یہ سر ہی پہ اُسے بٹھائے
آپس میں یوں ناز اُٹھاتے جیون کی راہ طے ہو جائے

کھونٹی

۱۳۵

دیوار سے لگ کر کھڑی ہو یوں جو چیز کہو، سو تھام رکھوں

ہچکی

۱۳۶

بسرایا، تو جیا اُداس یاد کیا، تو اُکھڑی سانس

چائے کا سیٹ

۱۳۷

پہلی کی اچھی دُودھ کی دتیاں دوجی کرتی میٹھی بتیاں
تیجی رنگ اور بُو میں ڈوبے مالتی اپنے گر بھ میں کھولے

دیکھ آئے ان کا گھر بار چینی کے در اور دیوار

۱۳۸- خوبانی

وہ سرخی سفیدی، وہ پھولے سے گال
وہ بادام سی خوشنما ایک ہی آنکھ
شہد اور ماکھن کی گویا حلاوت
یہ خوباں کی اک مختصر سی حکایت

۱۳۹- ناریل

کاٹھ کی کھوپڑی، مونج کی زلفیں

۱۴۰- کھٹمل

بلڈ بنک کے یہ کارندے کھٹیا پر پڑتے ہی کھائیں
دبلا موٹا کچھ نہیں دیکھیں بچوں پر یہ ترس نہ کھائیں

۱۴۱- بھیڑ

بھیڑ چال، فیشن کی ایسی ہردم خالص اُونی سوٹ
ٹاٹا سادہ بھی ایسا کتا بتنی اترا کلبوت

۱۴۲- خرگوش

لب پر لاکھے کی لالی اور انکھیا مست، جلالی
سر پر کلغی کا جوڑا اور ہونٹ پھٹا سا تھوڑا

۱۴۳- چاندی

رکھتی ہے یوں اونچی نسبت باندی ہے زرداروں کی
جوں جوں روپ بدلتی جائے چاندی ہوئی سناروں کی

۱۴۴- مالی

عالم میں پیوند لگاتا تیکھے نینوں چشمہ چڑھاتا
ان پڑھ رہے قلم کا ماتا ادھر اجاڑے ادھر بساتا

ناک

۱۴۵

جس کے مارے بو اور باس وہ کٹے تو ستیا ناس

گلہری

۱۴۶

باغ میں اک چنچل سی گڑیا پیڑ پہ لادا ڈھیر
چاک چاک دانت چلائے گٹھلی بچے نہ بیر

رنج

۱۴۷

نٹ دنیا میں پورا ماہر بار ہیں اس کو بیسوں پیچ
یہی اگر نہ ہاتھ بٹائے بڑے بڑے رستم بھی ہیچ

آسیب۔ سایہ

۱۴۸

گھر بار سے گو بے دخل ہوئے اس پر بھی آن نکلتے ہیں
ان کی چاہت وہ آفت ہے سایے سے سبھی سہمتے ہیں

اود بلاؤ

۱۴۹

انوکھی بلّی ماچھ کا چاؤ دھرتی چھوڑ کر ندی پڑاؤ

شتر مرغ

۱۵۰

اونٹ کوئی جا کر گڑگڑایا پنکھ لگا دے مجھے خدایا
اللہ نے نعمت دے ڈالی لیکن دو ٹانگیں رکھوا لیں

سیپ

۱۵۱

اندر پاٹا اور باہر پاٹا موتی کی متیا کاٹھ کاٹھا

شکر

۱۵۲

بڑ بھیّا تو بھیلی جھیلی بہنیلی سب دانا دانا
آن کے منہ میں گھی اور شکر جو بوجھے وہ چتر سیانا

بناسپتی گھی

۱۵۳

سر اور تن پہ چاہے اوڑھو چاہے پیٹ کی آگ بجھالو

مشعل چاہیے کو لو روشن   گھی کی چاہیے نالی بہا لو

۱۵۴۔ پیچ اور پیچ کش

ساتوریا سنگ کھیلی گھری
آپ تو نرٹ کھوٹا ہونے ہیں چیت
میں وہ ڈوبی، پھر نہیں ابھری

۱۵۵۔ بسنت پنچھی کا میلہ

بہار آئی غنچہ دہن کھل پڑے   کھلنڈروں سے کھل کھل کے چھینٹے لڑے

۱۵۶۔ بانک

بانکوں کا بس داؤں یہی ہے   فولادی پھیلایا پنجہ
ہلت جلت ناممکن کر دی   پیچ گھمایا کیا شکنجہ

۱۵۷۔ چھاتا

برکھا آئی، پنچھی آئے   لگے مٹکنے راہوں پر
پنکھ کبھی دہی پر دھاریں   کبھی ڈال لیں بانہوں پر

۱۵۸۔ سوراخ کا برما

کس کٹھور پیا تور، جھومت!
ایک ہاتھ سوں منڈ پاپکڑی   دوجے سوں رسی کو کھینچت
ساتوراایسی کھاوے گھمریاں   کاٹھو کے ہردے کو بیندھت

۱۵۹۔ نکل (NICKLE)

نکل زیادہ تو دولیتا   دھن دولت ہے گھر کی باندی
چکر کے چکر میں رہتا   نہ تو سونا نہ ہی چاندی

۱۶۰۔ فاؤنٹن پین

پی پیئں ہیں جب یہ ماتے   من کی بات سبھی کہ جاتے
پیا نہیں تو سادھیں موَن   لاکھ بلاؤ، بولے کون!

١٦٠ نٹ بولٹ

وہ پُرش کا ٹونا مان   چوڑی پہن رچایا پان

١٦١ تسبیح ۔ مالا

گنگنائیں سانجھ پربھات   سنو سنو بات کی ایک ہی بات

١٦٢ کڑاہی

کان پھٹا جوگی

کھائے، پیے اور اگنی تاپے   چیلوں کو سکھ آنند دیا پے

١٦٣ ڈراپر (DROPPER)

تال سے گگری بھر بھر لاویں   نینوں کی بس پیاس بجھاویں

١٦٤ پنسل تراش

سکھی سنو اب اس کی بات   منہ میں جس کے ایک ہی دانت

چکر پر چکر جو کھا دے   سوکھے رُوکھ چبائے گرا دے

١٦٥ کھرپا

کلائی کاٹھ، پنجہ اسپاتی   گھانس چھیل کر ڈھیر لگاتی

١٦٦ قلعی

میلی چادر نہیں اُتری   اُوپر اوڑھ لیتا ہیں اُجلی

١٦٧ چلمن ۔ چک

سینہ چھلنی ہو رہا   دیہی تو کا ٹوک

نہ کھانڈا ہے ہاتھ میں   نہ کاندھے بندوق

ایسے ڈھب سوں بانگرا   جھول رہیو ہے دوار

مکھی مچھر تک نہیں   آنے پاویں اس کے پار

١٦٨ حقہ، چلم

پہن رکھا گیلا سا دستر   سینے میں سلگائی آگ

بھری سبھا میں رنگ جمائے لنگوٹی میں کھیلے پھاگ

پنسل

۱۶۹

لکڑی کے گھر میں رہا کرے مُنہ بند سی اک سُریلی ہے
تب ہی مُنہ سے کچھ پھوٹے ہے جب ٹھیک سے کاٹی چھیلی ہے

ہرن

۱۷۰

اک بن باسی کا یہ حال پہنے ہے کیول مرگ چھال
بَن رہیں ہر دم گھبرا ئے دوڑ میں گھوڑوں کو شرمائے

فٹ بال

۱۷۱

کیسی ہوا گرہ میں باندھی کیسے بھینچ رکھے ہیں دانت
کیسا اودھم مچایا اس نے جنتے جنتے کی سب ہے لات

بیری کا درخت

۱۷۲

لاڈوں پیاروں جُھلی جُھلائی گہنوں پاتوں سجی سجائی
پہن لیا جب سُوہا بانا ایک اک نے پتھر تانا

ترپ کا پتّا

۱۷۳

جیسوں ہی کو کاٹ گرا ے بڑے بڑے شاہوں کو جیتے
اس کا دبا ہر کوئی مانے اس کے آگے سب رنگ پھیکے

پودوں کو پانی دینے کا فوّارہ

۱۷۴

گو بھری رکھی ہے پانی کی پکھال قطرہ قطرہ دے رہا ہے بدخصال

گھنگرو

۱۷۵

بھولے کتھک کی جرما تا ہو موہے اچنبھا آوے ایسو
قید سے باہر اُلٹا جُنتی بھتیر ناچے گا وے کیسو

سلیٹ پر لکھائی

۱۷۶

لکڑی کا ٹھوں گھیرا سمرو دو، سُرمئی کالا رنگ

کونجیں انڈے دے اُڑ جائیں　　دودھیا دودھیا رنگ

لنگڑا آم

۱۷۷

چھوٹے بڑے کے منہ لگا ہے　　ہر دعوت کی زینت ہے
ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے　　لنگڑا اُنے کی قیمت ہے

بیڈمنٹن

۱۷۸

جال لیے چڑیوں پر لپکیں　　چڑیاں اُڑ اُڑ جائیں
منہ موڑ جونہی جال کو پٹکیں　　چڑیاں مُڑ مُڑ آئیں

مصوّر

۱۷۹

ظاہر میں کوئی آنکھوں کو　　اَن دیکھی چیز سُجھاتا ہے
گونگے کے من کی کہتا ہے　　دیکھا بس لہو دوڑاتا ہے

زچّہ

۱۸۰

گھر تھے دو اور لوٹے تین　　چک اُٹھے میاں غمگین

خس کی ٹٹی

۱۸۱

ٹپکا ہے، نکہتیں ہیں، ہوا ہے بہار کی
باندھے ہو سماں پیرہن تار تار بھی

چائے کی کیتلی

۱۸۲

کاڑھا پیے، تانے دُولائی　　تب اُترے تو شامت آئی

کٹھل

۱۸۳

لڈّوؤں بھرا تھیلا　　ہر لڈّو میں بادام
سبھی اورسے باڑ لگائی　　پیڑ سے رکھا ٹانگ

مکڑا

۱۸۴

تار تار سا چھایا چندوا　　میلا سا ملبوس
جہانوں پہ ٹوٹ کے پڑتا　　ایسا مکھی چوس

۱۸۵ گراموفون کا توا

کالے کلوٹے کی یہ شیخی کہے ہے پھر پھر الٹی سیدھی

۱۸۶۔ ناریل

آنکھ مندی اور جٹا بڑھائی دل دریا، چت اُوجلائی

۱۸۷۔ لاؤڈ اسپیکر

ایک کہے، کتنے دہرائیں دور دور تک باتیں جائیں

۱۸۸۔ کتاب

گیان کی گنگا بہتی جائے دو کتوں کے بیچ
من اپنے کی سوکھی دھرتی سینچ سکے تو سینچ

۱۸۹ کتاب

گیان گنگا کے دونوں گھاٹ سوکھے، نرجن اور سپاٹ

۱۹۰ بجلی کا پنکھا

سارس کی اک سندر ٹکڑی سر اوپر منڈرائے
جہاں بجی جادو کی چٹکی پنکھ دہیں تھرائے

۱۹۱ سیفٹی ریزر

دو موہنا بھیڑا

لپک لپک گو چیر کر دوڑے نام کو اک تنکا نہیں چھوڑے

۱۹۲۔ بال کاٹنے کی مشین

پائوں دبائیں دیویداس... نکلی اُدھر چبائے گھاس

۱۹۳۔ قینچی

دو دتیوں نے لیے وہ لتے کُتر کُتر سب کپڑے رکھے

۱۹۴۔ گڑیا

ننھی منی بٹیا کھائے نہ پیے، اور جگ جگ جیے

توا

۱۹۵-

کال کلوٹے تپسوی کا ایسا ہوا ہے سر آگ
ان پائے اور ترت لٹائے، بھولی رہے بے داغ

گڑیا

۱۹۶-

بڑے ادب سے منی بیٹھی پلو سر پر ڈال
کھائے پیے نہ بیٹھے لیٹے۔ ایسا کرے کمال

نام کی تختی

۱۹۷-

لگ رہی دیوار سے تصویر سی — نام مالک کا سدا جپتی رہے

دیا (چراغ)

۱۹۸-

جیسے تٹ پر رمی ہے دھونی — تلیا سوکھ سوکھ بجھی اوتی

پتنگ

۱۹۹-

کاغذ کا گھوڑا، تاگے کی باگ — جوں جوں کھینچیں، بھاگم بھاگ

بگلا

۲۰۰-

ندی کنارے سادھو اترا — کرے ہری کا جاپ
انس ماچھ کو اتما نے — کند مول میں پاپ

چمنی

۲۰۱-

دھرتی حقہ، آکاش دھواں — دیوار پہاڑ جا نکلا کہاں

لیپ کا سال

۲۰۲

چار برس میں بابا آویں — باندھ گانٹھ میں دام
گیارہ بیٹے حصہ ڈالیں — بارھویں کو انعام

ریشم کا کیڑا

۲۰۳

پتوں کا ٹفن اور ریشم کا کفن

تکیہ
۲۰۴
گودیں واکی رکھیں سیس سدا سدا اپنی آسیس
گنّا
۲۰۵
دھرتی تلے دبائے پر بھی ملا نہ کچھ بھی چین
پھوٹ پھوٹ کر باہر آئے آنسو وا کے نین
سرمے کی سلائی
۲۰۶
اندھے کنویں سے لونڈا نکلا اُنگی کا لک اور ڈھول
جا پھولوں کی سیج پہ لوٹا کالے چھٹے پھول
ہولی
۲۰۷
سردی کی جب رُت ہوئی سب نے رنگیں بتھی کھولی
بوڑھے، بچے اور سیانے مل کر اودھم لگے مچانے
پیاز کاٹنا
۲۰۸
سوسو اُدھر بنائے ٹکڑے رو رو اِدھر سنائے دُکھڑے
اسٹوو
۲۰۹
اندر جالی، باہر جالی بیچوں بیچ جلے دیوالی
کولھو کا بیل
۲۱۰
کندھوں پر جیون کا جوآ بے منزل کی راہ
آنکھ موند چلا جاوے بس بھولا، سب بے پرواہ
کولھو کا بیل
۲۱۱
بہت کاٹے ہیں گو چکر ابھی تک روز اوّل ہے
مرے پاؤں ہیں منزل پر مرے پاؤں میں منزل ہے
پیاز
۲۱۲
گول مول اور پیازی رنگ بسی ہے کپڑوں میں دُرگندھ

نمکدان
۲۱۳
میز پہ حاضر دونوں جو ہوں کاٹنے پر چھڑکے ہی نون

کتکا
۲۱۴
سراپا پردے میں لپٹا سونٹا پایا ہے اس گت کا

دیا (چراغ)
۲۱۵
دن کو سویا، رات کو جاگا، ہر دے تاپ سوں جلے ابھاگا

جگالی
۲۱۶
ایک گھڑی جو کھائے چار گھڑی مکھ چائے

جھالڑاں
۲۱۷
چیچک رُو کمہار کا جایا کُھرچ کُھرچ جن میل چھڑایا

مور
۲۱۸
رنگا رنگی کپڑے پہنے پیہو پیہو، شور
جنگل میں جا منگل کرتا کیا مور اور تور

چاقو
۲۱۹
مار کاٹ کبھی، موڑے انگ شانتی کبھی نہ ہو وے بھنگ

کرنی
۲۲۰
کس نے کس پر کیچڑ ڈالا کس نے یہ دیوار اٹھائی
اپنی کرنی، اپنی بھرنی کچھ سوچو، کچھ سمجھو بھائی

بھارت میں منصوبہ بند ترقی کے جنم داتا
جواہر لعل نہرو کی یاد میں

ترقی کے لئے سوشلسٹ یا سرمایہ دارانہ طریق کار کوئی ایسا جادو نہیں جس سے ملک میں غریبی کی جگہ فوراً امیری آجائے۔ غریبی دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے سخت محنت کرنا، ملک کی پیداواری صلاحیتوں کو بڑھانا اور اس کے پھل کو سماج میں جائز طور پر بانٹنے کا بندوبست کرنا۔

—— جواہر لعل نہرو



davp 76/71

محمد شرف الدین ساحل

بیان میرٹھی

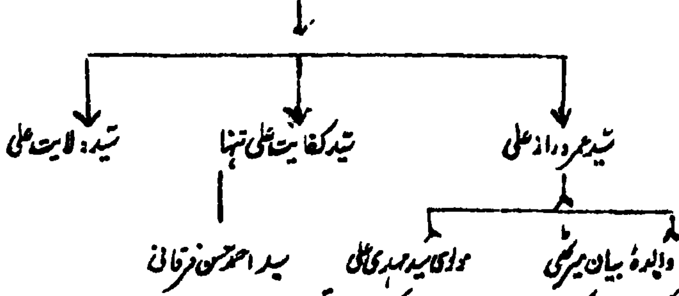
خاندان: بیان کے آبا و اجداد سادات کی قدیم بستی جارچہ، ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام سید گوہر علی تھا، جو لوگوں میں میر صاحب کے نام سے مشہور تھے[1]۔ ان کے والد کا نام سید کرامت علی تھا۔ بیان اپنے والد کے نام کا سجع کہا تھا: بہر کرامت کا گوہر علی۔ سید گوہر علی کا موضع الدین، ضلع میرٹھ کے رئیس سید عمر دراز علی کی صاحبزادی سے عقد ہوا، تو انھوں نے آبائی وطن چھوڑ کر میرٹھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ گوہر علی خاصی علمی صلاحیت کے مالک اور علوم متداولہ پر عبور رکھتے تھے۔ ۴ مارچ ۱۸۹۳ء کو میرٹھ ہی میں ان کا انتقال ہوا[2]۔ سید گوہر علی کے آٹھ بیٹے تھے۔ (۱) اصغر حسین؛ (۲) محمد مرتضیٰ بیان یزدانی؛ (۳) یعسوب الدین؛ (۴) سلطان الحق؛ (۵) ابوالحسن؛ (۶) محمد (۷) حسین شرف اور (۸) آغا علی آغا۔ سید محمد کا انتقال عین جوانی میں والد کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ بیان یزدانی، سید ابوالحسن اور سید آغا علی کو چھوڑ کر باقی تمام

۱۔ روزنامہ امروز کراچی، ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء: ۷

۲۔ ماہنامہ لسان الملک، مارچ/اپریل، ۱۸۹۳ء

بھائی معزز عہدوں تک پہنچے۔ سید اصغر حسین عدالت میرٹھ میں ہیڈ کلرک رہے۔ سید یعقوب الدین ضلع جالون میں امین کورٹ کے عہدے پر مامور تھے۔ سید سلطان الحق الہ آباد کمشنری میں سررشتہ دار کے مرتبے پر فائز ہوئے اور سید حسین شرف علیگڑھ میں نائب تحصیلدار تھے[3]۔

اردو اور فارسی کے جید عالم اور بلند پایہ شاعر سید احمد حسن فرقانی، شاگرد باقی میرٹھی رشتے میں بیان کے ماموں تھے تفصیلات کے لیے شجرہ دیکھیے:



گویا فرقانی کی چچا زاد بہن بیان کی والدہ تھیں۔

فرقانی غالب کے ہمعصر تھے۔ غالب اور فرقانی میں خط و کتابت بھی تھی۔ غالب کے دو خطوط ان کے نام ملتے ہیں[4]۔ منشی سجاد حسین ریحانی (۱۲۶۸ھ - ۱۳۰۰ھ) اور منشی کرار حسین روحانی دونوں فرقانی ہی کے بیٹے تھے[5]۔

حضرت فرقانی کو بیان کے والد سے بڑی عقیدت و محبت تھی۔ ایک قطعے میں کہتے ہیں:

ازاں روز یکہ در بخشد صدف را ابر نیسانی
نیامد در کف بحر سیادت چوں تو یک گوہر
چہ پرسی ماجرائے من کہ از رنج فراق تو
دلم چوں لولو سوراخ است و چوں رشتہ تنم لاغر

۳۔ ماہنامہ لسان الملک، مئی ۱۸۹۳
۴۔ ماہنامہ نقوش مکاتیب نمبر (۲): ۴۶۸
۵۔ خم خانۂ جاوید جلد سوم ص ۲۰۲

بیان کا خاندان علمی اور ادبی لحاظ سے مالامال تھا ۔ نانا اور والد دونوں بلند پایہ عالم تھے ۔ عربی اور فارسی پر انھیں پوری دسترس حاصل تھی ۔ بھائی بھی پڑھے لکھے تھے ۔ سید آغا علی آغا اور رشید حسین شرف کو بھی شاعری کا شوق تھا ۔ لسان الملک میں ان کا کچھ کلام شائع ہوا ہے ۔ سید محمد عربی اور فارسی کے عالم تھے بغرض "لغت" پر عربی زبان میں ان کی لکھی ہوئی تقریظ اس حقیقت پر شاہد ہے ۔ سید ضیاء الاسلام عیان میرٹھی اس خاندان کے آخری شاعر گزرے ہیں ۔ یہ سلطان الحق کے بیٹے اور بیان کے سگے بھتیجے تھے ۔

بیان کے خاندان کے لوگ ۱۹۴۷ء تک میرٹھ ہی میں آباد رہے ۔ آزادی کے بعد یہ لوگ پاکستان منتقل ہو گئے ۔ اس خاندان کی صرف ایک نام لیوا رابعہ خاتون پنہاں میرٹھی کا پتا چلتا ہے جو راولپنڈی پاکستان میں مقیم ہیں ۔ یہ صفی صاحب کی بیٹی ہیں ۔ صفی رشتے میں بیان یزدانی کے یک جدی بھائی تھے ۔ یعنی وہ کرامت علی (بیان یزدانی کے دادا) کے چچا کے خاندان سے تھے ۔ اسی لیے بعض تذکروں میں پنہاں کو بیان یزدانی کی بھتیجی کہا گیا ہے۔[6]

بیان کا پورا نام سید محمد مرتضیٰ تھا ۔ اُردو میں بیان اور فارسی میں یزدانی تخلص کرتے تھے ۔ مذہباً اثنا عشری شیعی تھے۔[7] سلسلۂ نسب حضرت امام رضا سے ملتا ہے۔[8] ان کی پیدائش نانا کے مکان پر ہوئی تھی، جو اس وقت جھانسی (بندیل کھنڈ) میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر مامور تھے۔[9] لیکن بعد کو انھوں نے میرٹھ میں نشوونما پائی اور زندگی کا بڑا حصہ اسی شہر میں گزارا، اس لیے میرٹھی کہلائے ۔

۶ ۔ تذکرۂ شاعرات پاکستان (از شفیق بریلوی) : ۱۳۷

۷ ۔ روزنامۂ امروز ۔ (۲۴ ستمبر ۔ ۱۹۵۸ء) : ۷

۸ ۔ آجکل (ستمبر ۔ ۱۹۷۰ء) : ۲۳

۹ ۔ روزنامہ امروز و ماہنامہ آجکل

باوجود تحقیق بسیار بیان کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ بعض کتب و رسائل میں ان کی تفصیل دیکھیے:

خم خانۂ جاوید	۱۸۴۰ء
ماہنامہ آجکل	۱۸۵۰ء
روزنامہ امروز	۱۸۵۶ء
ماہنامہ مخزن	۱۸۶۰ء

اوّل اور چہارم سنہ ولادت قیاس پر مبنی ہے ملاحظہ ہو:

ساٹھ سال کے قریب عمر پاکر ۱۹۰۰ء میں بمقام میرٹھ انتقال کیا (خم خانۂ جاوید)

تقریباً چالیس سال کے سن میں ۱۲ مارچ ۱۹۰۰ء کو اردو زبان کی شاعری کی صدر نشینی چھوڑ کر ہمیشہ کی تنہائی اختیار کی ۔۔۔۔ (مخزن مارچ ۱۹۰۴ء)

امروز کے مقالہ نگار نے جو سال پیدائش تبلایا ہے،[1] اس کی تردید خود انھیں کے تبلائے ہوئے ایک واقعہ سے ہوتی ہے لکھتے ہیں:

> بیان بہت گورے چٹے تھے۔ ایک مرتبہ تلنگوں نے انھیں انگریز بچہ سمجھ کر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں پکڑ لیا اور ڈیڑھ سو روپے لے کر چھوڑا۔

اگر یہ واقعہ درست ہے تو مقالہ نگار کے تبائے ہوئے سال کے مطابق بیان کی عمر اس وقت تقریباً ایک سال کی رہی ہوگی، اور اس عمر میں تلنگوں کا انھیں پکڑ لینا محال ہے۔ اس واقعے سے مخزن کے مضمون نگار کا قیاس بھی غلط ہو کر رہ گیا۔ واقعۂ مذکورہ کے اعتبار سے خم خانۂ جاوید میں تبائے ہوئے قیاسی سنہ کے مطابق ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بیان کی عمر ۱۷ سال اور آجکل کے مضمون کے مطابق ۷ سال کی ہوتی ہے۔ اور ۷ سال کی عمر میں تلنگوں کا انھیں پکڑ لینا قرین قیاس ہے، نہ کہ ۱۷ سال کی عمر میں۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ بیان ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے ہوں۔

۱۔ امروز کے مقالہ نگار کا نام "خدا بندہ" چھپا ہے۔

تعلیم و تربیت: بیان نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی اور اپنی خدا داد ذہانت کی بدولت بہت جلد ابتدائی درسی نصاب ختم کر لیا۔ بعد کو میرٹھ کے ایک شیعی عالم مرزا باقر علی بیگ سے عربی اور فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں[11]۔ پھر خود ہی تمام علوم و فنون کا بنظرِ غائر مطالعہ کر کے بہت جلد اپنی علمی استعداد کو مستحکم اور وسیع بنا لیا۔ ان کے اردو اور فارسی کلام سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ انھیں مختلف علوم میں دستگاہ تھی۔ فارسی اور عربی، حدیث اور فقہ، منطق، فلسفہ، تصوف، ہیئت اور نجوم سب کا علم ماہرانہ تھا۔

شاعری کی ابتدا: بیان نے جس خاندان میں آنکھیں کھولی تھیں، وہ خالص ادبی اور شعری تھا۔ ادھر میرٹھ کی فضا شعر و ادب کی کیفیتوں سے معمور تھی۔ جگہ جگہ شعر و شاعری کے تذکرے تھے اور شاعر بھی کثرت سے ہوتے تھے۔ بیان کو شاعری کا شوق ابتدائے سنِ شعور ہی میں ہو گیا تھا۔ مزاج بھی شاعرانہ تھا، لہٰذا اکتسابِ درسیہ کی تکمیل کے بعد کسی کے آگے زانوئے ادب تہ کیے بغیر شعر کہنا شروع کر دیا۔ البتہ آگے چل کر سید احمد حسن فرقانی میرٹھی نے ان کے ذوقِ شعری کو تقویت پہنچائی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ بیان صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمان تھے اور فہیم و ذکی بھی بہت جلد اس فن میں مہارت حاصل کر لی اور اپنے ذاتی جوہر، علمی قابلیت اور مشقِ سخن سے خود استادی کا درجہ حاصل کر لیا۔

کال کوٹھری: اوائل عمر میں بیان کے والد انھیں شعر و سخن میں اوقات گزاری سے منع فرماتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے بہانہ کیا کہ مجھ کو روشنی میں چکا چوند لگتی ہے اور پھر گھر کے ایک اندھیرے کمرے میں تنہا رہ کر اپنا شوق پورا کرنے لگے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ انھوں نے جو الفاظ زبان سے نکالے تھے۔ آخر وہی ہو کر رہا۔ اور وہ واقعی چکا چوند کا شکار ہو گئے۔ بعض اسے وہم کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ حکیم محمود خان کا خیال تھا کہ یہ مرض ذہین لوگوں کو ہوا کرتا ہے۔ غرض کہ بیان پھر اس کوٹھری سے

11۔ روزنامہ امروز: 7

باہر نہ نکلے اور عنفوان شباب سے آخر عمر تک وہیں گوشہ نشین رہے۔
اسی کال کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے بیان شاعری اور علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ یہیں ہمہ وقت شاگردوں کا مجمع رہتا، ان کی غزلوں پر اصلاح دی جاتی، شعر و شاعری پر بحث ہوتی، اخباروں کے لیے مضامین لکھے جاتے، مخالفوں کے جواب تحریر ہوتے، شاعری کے گلدستوں کی آرایش کی جاتی اور اخبار و رسائل کی ترتیب و تدوین کا کام ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اندھیری کوٹھری ادبی اعتبار سے ایک ایسی زرخیز جگہ تھی جس میں ہمیشہ رنگ برنگ کے پھول کھلتے رہتے تھے، جو اپنی بوقلمونی، رنگارنگی اور شادابی سے آج تک حلقۂ ادب کو پُربہار بنائے ہوئے ہیں۔

تحریک سرسید سے دلچسپی: ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کے دل و دماغ پر خوف و ہراس چھا گیا تھا۔ سرسید احمد خاں کی مفکرانہ نگاہیں اس حقیقت کو پا گئیں کہ حکومت وقت کی حمایت کے بغیر مسلمانوں کا ترقی کی منزل کو چھونا اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو انگریزوں پر اعتماد کرنے کا مشورہ دیا اور مغربی علوم سے روشناس کرا کے یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کے بالمقابل کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ "مدرسۃ العلوم علیگڑھ" اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ جب ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن کے ہاتھوں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو چاروں طرف سے مخالفت ہوئی۔ لیکن بعض دور اندیش حضرات نے اس تحریک کی ہر طرح سے موافقت کی۔ اسی آخری گروہ میں بیان میرٹھی کا اسم گرامی بھی قابل ذکر ہے۔

جس وقت سرسید کی یہ اصلاحی اور تعلیمی تحریک اپنے شباب پر تھی، بیان جوانی کے دور سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے ہر طرح سے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ اپنے حجرے سے باہر آکر مقامی جلسوں اور مشاعروں میں شریک ہوئے۔ اور سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک کی شان میں قصائد پڑھے۔ "خدا بندہ" اپنے مضمون میں ایک

جلسے کا ذکر یوں کرتے ہیں:[۳]

ان کی (بیان) کی جوانی کا زمانہ تھا کہ علیگڈھ کے مدرستہ العلوم کا چرچا ہوا اور ہر طرف سے مخالفت کا طوفان امڈ پڑا۔ لیکن بیان نے علیگڈھ کی اس تعلیمی تحریک کی حمایت کی۔ میرٹھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا کا جلسہ منعقد ہوا، تو اس میں شرکت کی اور فارسی کا ایک قصیدہ پڑھ کر سنایا جس کی اٹھان، الفاظ کے زور و شور اور ترکیبوں کی پختگی کو دیکھ کر قاآنی یاد آ جاتا ہے۔

اسی طرح جب جلسۂ عام نوچندی میں سر سید احمد خان کو دعوت دی گئی، تو بیان کی طرف سے ایک نظم اس جلسے میں پڑھی گئی، جس کے چند اشعار درج ہیں:

تا کجا اے دوستو! خواب گراں — آن پہنچا پیشوا سے کاروان
چاہیے آنکھیں بچھائیں زیر پا — شان حق آپ اور ہمارے میہمان
آپ کی تقریر کے اعجاز نے — ڈال دی ہے ہمت مرداں میں جان
زیر گردوں پھر وہ گلشن ہو ہرا — آ گئی ہے جس کے گوشوں میں خزاں
افتخار ہند سید کے قدم — پھر بھی دکھلائے خداوند جہاں

پھر اٹھے کلاس سے گلبانگ جرس
آئے پھر کاغذ سے آواز بیان

۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو قوم کے اس محسن نے جب دنیا سے انتقال کیا، تو ان کے دوسرے رفقا کی طرح بیان بھی اس حادثے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے سر سید احمد خان کا جو مرثیہ کہا ہے وہ ان کے رنج و غم کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ چند شعر دیکھیے:

قہر ہے سر سید احمد خان بہادر کی وفات — وہ زمیں کا فخر، جو زیر آسماں سے اٹھ گیا
راج پیتر لٹ گیا، اے قوم! اے حرماں نصیب — تیرے سر کا تاج تخت ہندوستاں سے اٹھ گیا
وہ عماد المکلت تھا، وہ ستون سلطنت — ہائے قیصر! قیصر ہندوستان سے اٹھ گیا

۳۔ ایضاً

اے کہ جس نے ڈال دی تھی قوم کے مُردوں میں جان | وہ مسیحا دستِ مرگِ ناگہاں سے اٹھ گیا
اے دلِ نالاں جرس سن! کرتے ہیں فریاد کر | کاروان سالارِ ملت کارواں سے اٹھ گیا
اے علیگڈھ! بہتر ہے بر باد دن کو اب یکیکا کون | خانہ آرائے ترقی، خانماں سے اٹھ گیا
جب ہوا کاندھا جنازے کو ہوئی بیتاب قوم | دھڑ ترا بیچارہ گیا اور سر جہاں سے اٹھ گیا

شعر کیسے، نظم کس کی، نالہ کیا، فریاد کون!
شعلۂ آتش، دلِ گرمِ بیاں سے اٹھ گیا

آٹھ اشعار پر مشتمل فارسی زبان میں ایک تاریخی قطعہ بھی کہا تھا۔ اس میں تاریخ کا شعر یہ:

چوں وفات از میاں، شد سالِ او
"سید احمد خاں فنائی القوم گشت"
(۱۸۹۸)

ذوقِ صحافت:۔ بیان کی صحافتی زندگی کا آغاز مدیر رسالہ کی حیثیت سے ہوا۔ انھوں نے سب سے پہلے "جلوۂ طور" کی ادارت کی۔ پھر ۱۸۸۱ء میں اپنا ذاتی ہفت روزہ طوطیِ ہند جاری کیا۔ یہ پرچہ مطبع حدیقۃ العلوم، میرٹھ سے شائع ہوتا تھا، جو اُن کی ذاتی ملکیت تھا۔ اس کے مہتمم ولایت علی خاں حاجی داود اور ایڈیٹر کرار حسین روحانی تھے۔ بعد کو سید سجاد حسین رتجانی اس کے مالک ہو گئے۔ اس میں خبروں کے علاوہ ادبی اور تنقیدی مضامین اور منظومات بھی شائع ہوتی تھیں۔ طوطیِ ہند کبھی کبھی اپنے معاصرین سے بھی الجھا رہتا تھا۔ جس زمانے میں اس کا اجرا ہوا ہے "اودھ پنچ" اور "اخبار فتنہ" کے درمیان تیز و تند صحافتی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ بیان نے پہلے اخبار فتنہ کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع کیا، حال آنکہ بیان کے تعلقات ابتدا میں ریاض خیر آبادی (ایڈیٹر فتنہ) سے بہت اچھے تھے اور نادم سیتاپوری کے بیان کے مطابق:

"ریاض، آزاد (محمد نذیر) اور محمد مرتضیٰ بیان میرٹھی کا اتحاد ثلاثہ ایک خاموش بساطِ شعر و ادب بنا ہوا تھا۔ ان تینوں کے درمیان ایک مسلسل روزنامچہ گردش کناں رہتا، جس میں نجی زندگی کے علاوہ ادبی اور سماجی

زندگی کے چٹخارے بھی ہوتے تھے۔ فل اسکیپ سائز کا یہ روزنامچہ برابر
ان تینوں کے گرد چکر کاٹتا رہتا تھا اور اس میں یہ تینوں افراد اضافہ کرتے
رہتے تھے۔ خانگی مصروفیات اور نجی زندگی کے علاوہ اس ڈائری میں
تازہ افکار بھی ہوتے تھے اور حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی۔

بعد کو منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ سے ٹھن گئی جس نے اتنی شدت اختیار کی کہ بات
ضلع جگت سے گزر کر پھکڑ بازی اور گالی گلوچ تک پہنچ گئی۔ اودھ پنچ کے ادارۂ تحریر
میں ایک سے ایک بڑھ کر انشاء پرداز اور شاعر تھا۔ یہ حضرات بیان کے اخبار طوطی ہند
کی رعایت سے چڑیا گھر کا تلازمہ اور اصطلاحات استعمال کر کے ان کا مذاق اڑاتے تھے۔
لیکن بیان تنہا ان سب کے اعتراضات کا جواب مختلف ناموں سے نظم و نثر میں دیتے۔
انھوں نے طوطی ہند میں (اودھ پنچ کے بالمقابل) میرٹھ پنچ کے عنوان سے ضمیمے کا اضافہ
کیا۔ یہ ہر جمعے کو چار صفحے پر شائع ہوتا تھا۔ میرٹھ پنچ کا چندہ ڈیڑھ روپے سالانہ
تھا۔ افسوس کہ طوطی ہند اور میرٹھ پنچ کے پرچے اب نایاب ہیں، لہٰذا نمونہ پیش کرنے
سے قاصر ہوں۔ جناب امداد صابری نے طوطی ہند کے خلاف اودھ پنچ کے مضمون کا
جو نمونہ اپنی کتاب میں پیش کیا ہے، اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے، تاکہ معرکہ آرائی کے
معیار کا اندازہ ہو سکے[۱۴]۔ مضمون کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:

نہ سمجھو نکو باتو بتا دیں دل میں اپنے کیا سمجھتے ہیں (؟)
تمھیں بھی ہم سگِ قصاب کا پلا سمجھتے ہیں
گدھے میرٹھ کے اپنے کو خرِ عیسیٰ سمجھتے ہیں
پناہِ تاج و کلاہ و کشورِ معنیٰ سمجھتے ہیں
دوات اک کوس شاہی ہے قلم ڈنکا سمجھتے ہیں
اوکھلیس ہو، مصرع نہیں اصلا سمجھتے ہیں
فقط اتنا سمجھتے ہیں کہ ہم خمسا سمجھتے ہیں

۱۴۔ تاریخ صحافت اردو، امداد صابری ج ۳: ۱۱۷

نہ واقف شائگاں سے ہیں، نہ کچھ ایطا سمجھتے ہیں
درودرگاہِ دل پر سشیر کا پھیرا سمجھتے ہیں
صریر کلک کو اب شیر کا لغرا سمجھتے ہیں

اے ذوناب! تو یہ بھول گیا کہ جناب آپ ہی کی مبلغ استعداد حُسن لیاقت پر کیا کم شور و غوغا تھا خمسہ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۸۸۱ء میں اپنے حضرت اُستاد کو کیوں کر آباد کیا! اگر بقول شخصے "خود فراموشی کند" نامہ۔ لہذا استاد ۱۵ کا مضمون ہے تو خیر، اگر واقعی آپ کے اُستاد جی کا وہ خمسہ تصنیف شریف ہے، تو لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ ما نتا ہوں مصرعوں کو ایسا گانٹھا ہے، جیسے دیہاتی چار چیا جوتا گانٹھتے ہیں۔ ہر مصرعہ بادِ ہوائی گوز شتر، کوئی کل درست نہیں۔ الفاظ بے معنی، ترکیب لا یعنی۔ "پناہ تاج وگاہ کشتو و معنی کیا خوب، لونڈا اسے بہ نظر ظرافت ترکیب دی گئی ہے۔ کچھ اور نہ سمجھنا۔ الفاظ کے سوا معنی خاک نہیں۔ مصرعِ ثانی کی ترکیب بھی نئے فیشن کی۔ مصرعِ ثالث، مصرعِ چہارم کے مقابل میں اگر کوئی بانگ بول اُٹھا ہے۔ اے چیار، پوری فکر کیوں نہ کی، اپنے ہی شعر پر مصرعے لگائے ہوتے۔

طوطیِ ہند سے علیحدگی کے بعد بیان نے ۱۰ جون ۱۸۸۷ء کو ماہنامہ لسان الملک جاری کیا اس کا شمار اس زمانے کے معیاری رسائل میں ہوتا تھا۔ ۲۰ صفحات کا یہ ماہنامہ بڑے ہی اہتمام کے ساتھ مطبع حدیقۃ العلوم میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ سالانہ چندہ دو روپے تھا، اس کے مہتمم منشی احمد صاحب شفق تھے۔ پرچے کی کتابت و طباعت بھی عمدہ تھی۔ اس میں ہر ماہ دو مصرعے دیے جاتے تھے۔ مصرع برائے دیوانِ عام اور مصرع برائے دیوانِ خاص۔ شعرا سے دونوں طرحوں میں طبع آزمائی کی درخواست کی جاتی تھی۔ اور انھیں دونوں عنوانوں کے تحت موصولہ غزلوں کا انتخاب شائع ہوتا تھا عموماً دیوانِ خاص کے لیے اساتذہ اور دیوانِ عام کے لیے مبتدی شعرا غزلیں ارسال

دستے تھے۔

شاید یہ تخصیص اسی لیے تھی۔ بیان کی اُردو اور فارسی غزلوں اور دیگر منظومات کے علاوہ اس میں ان کے بیشتر شاگردوں کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ بیان اس کا اداریہ خود کبھی نظم اور کبھی نثر میں لکھا کرتے تھے۔ سید صاحب جہاں ایک بلند پایہ شاعر تھے، وہیں مؤثر نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثر نگاری کے کامیاب نمونے لسان الملک کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ انھیں ناول نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔ جون ۱۸۹۳ء کے شمارے سے ان کا ناول "خدا پرست کا ناول المسمیٰ بہ گل عباس" قسط وار شائع ہونا شروع ہوا تھا اور یہ سلسلہ آخری شمارے تک جاری رہا۔ اس میں انھوں نے استاد و شاگرد کا مکالمہ لکھ کر تصوف کے رموز و حقائق یعنی خدا کیا ہے، خدا کی صفات اور نبوت و رسالت پر مدلل بحث کی ہے۔ عباس در اصل شاگرد کا نام ہے، جو روزانہ اپنے استاد کی خدمت میں درس لینے جاتا ہے اور ان سے اس ضمن میں سوالات کے جوابات حاصل کرتا ہے۔ یہاں پانچواں دن یا پانچواں سبق، کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:[15]

استاد: ہاں آج تمھیں خدا کی صفات کا بیان پڑھائیں گے، تاکہ معلوم ہو کہ وہ کیسا خوبیوں والا ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک صفاتِ ثبوتیہ، وہ صفتیں جو اس کی ذات میں موجود ہیں۔ دوسرے، صفاتِ سلبیہ، وہ صفتیں جو اس کی ذات سے مفقود ہیں۔ پہلے ثبوتیہ کا اثبات ضرور ہے۔ سو اچھی طرح یاد رکھو کہ وہ آٹھ ہیں۔ اول وہ قدیم ہے اور ازل سے ابد تک رہیگا۔

شاگرد: جی درست، مگر کیوں، کیا وجہ، کس طرح؟

استاد: ارے میاں! اس میں کیا کھٹکا ہے؟ قدیم نہیں، تو حادث ہو۔ حادث کہتے ہیں بیچ میں پیدا ہونے والے کو۔ تو لازم آئیگا کہ خدا کے حدوث سے پہلے زمانہ خدا سے خالی تھا۔ اور از روئے عقل محال ہے۔

۱۵۔ ماہنامہ لسان الملک (ستمبر، اکتوبر ۱۸۹۴ء): ۷۔۸

شاگرد: کیوں محال ہے؟

استاد: اس لیے کہ کوئی ملک بے بادشاہ نہیں۔ کوئی کارخانہ بے کارفرما دار کے نہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے گھر کے لیے بھی کوئی منتظم ضرور ہے اتنے بڑے گھر میں جس کی انگنائی زمین اور چھت آسمان، کوئی مالک نہ ہو تو گھر کا کام کاج کیونکر چلے۔ مکتب کا میانجی کہیں چلا جاتا ہے، تو دیکھو لڑکے کیا اودھم مچاتے ہیں! مکان کا مالک کبھی اوجھل ہو جاتا ہے، تو خدم و حشم کیسے بن سرے ہو جاتے ہیں!

شاگرد: بے شک یہ تو صاف تجربے سے نظر آتا ہے کہ کوئی زمانہ خدا سے خالی نہ ہونا چاہیے۔

استاد: اسے تیرے منہ میں گھی شکر، زیادہ نہ شک کر تو پھر حادث ہوا اور فانی ہوا تو وہی قباحت بعدِ فنا لازم آئیگی اور وہ بھی محال ہے اس لیے اس شہنشاہِ ملکِ قدیم کو واجب الوجود کہتے ہیں۔ یعنی ہر زمانے میں اس کا ہونا واجب ہے اور نہ ہونا اس کی ذات سے کچھ لگاؤ نہیں رکھتا۔ یا کبھی ہونا کبھی نہ ہونا اس کا دامن جاہ و جلال ایسے داغ دھبوں سے پاک صاف ہے۔

بیان کے دو اور مختصر ناول "صندلیہ کی سیر" اور "عشق عظیم" بھی لسان الملک میں شائع ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں "حل المطالب" کے عنوان سے دیوانِ غالب کی شرح بھی قسط وار چھپتی رہی ہے۔ شرح کلامِ غالب کا سلسلہ دسمبر ۱۸۹۵ء سے شروع ہوا اور ردیف "الف" سے آگے نہ بڑھ سکا تھا کہ بیان کا انتقال ہو گیا۔ شرح کی ابتدا سے پہلے بیان کے یہ الفاظ دیکھیے![16]

حق تو یہ ہے کہ مرزا مرحوم اپنے زمانے میں یکتائے عصر تھے۔ ہندستان میں مرزا عبدالقادر بیدل کے بعد ایسا نازک خیال کوئی پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے اردو غزل کو شہوانی لذات کا کھلونا نہیں بنایا، بلکہ عشق و

۱۶۔ ماہنامہ لسان الملک دسمبر ۱۸۹۵ء جلد ۹ : شمارہ ۱۲: ۴-۵

عاشقی کے مضامین کو حکیمانہ پوشاک پہنا کر اربابِ نظر کے سامنے صدرِ مجلسِ فصاحت پر لا بٹھایا۔ دلی کی زبان، پھر اس میں تازہ معنی کی جان! اس پہ کرشمہ ہائے حسنِ بیان!

اے تو مجموعۂ خوبی، ز کدامت گویم

البتہ مضامین میں ان کے باریک خیالات نے شاہدوں کے گھونگھر والے بالوں کی طرح ایک الجھاؤ پیدا کیا، لیکن وہ زلفوں کی الجھن، معشوقیٔ تقریر کا حسن و جمال قد کا ان کا شعری اور خوبانِ چگسی کے عارض پر لونڈ کی طرح اور بڑھاتی رہی۔ البتہ ہر کس و ناکس کی یہ مجال نہ ہوئی کہ اپنی انگلیوں سے مضامینِ باریک کی گتھیاں کھول سکے؛ بلکہ اچھے اچھے موشگاف عاجز آ گئے۔ درین والا ایک مدت سے ہم دیکھتے ہیں کہ مشکلاتِ کلامِ غالب کی دھوم مچی ہے اور بیشتر مغرورین اور متحصلین اشعار کے معنی پوچھتے پھرتے ہیں۔ خود ہم کو اپنے عزیز وقت صرف کرنے کا اکثر نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ نیز دیگر اہلِ دعویٰ کے بتائے ہوئے معانی غیر واقع کا تذکرہ بھی ہم تک پہنچا ہے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ ہم رسالہ لسان الملک میں تھوڑی سی جگہ بقدرِ امکان معلومت شرحِ اشعارِ غالب کی نذر کیا کریں، تاکہ اہلِ شوق اور ہمدردوں کی وقت سے بچو نہیں اور کاغذی روشن تحریر ہمیشہ کے لیے جستجو کو مشکلات کی تاریکی میں چراغِ ہدایت دکھاتی رہے:

سرمایۂ ما جملہ نصیبِ دگر انست
چوں غرۂ شوال کہ عیدِ رمضان است

بخوفِ طوالت یہاں صرف دیوانِ غالب کے مطلعِ اوّل کی شرح درج کی جاتی ہے[۱۷]:

۱۷۔ ماہنامہ لسان الملک (دسمبر ۱۸۹۷ء) جلد ۹: شمارہ ۱۲: ص ۶

بیان میرٹھی

نقشؔ فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا

حضرت کا دیوان وہ تنک مزاج معشوق ہے، جس کی چوٹی کا پھول یہ ہے۔ نغمہ سنج بلبلیں اس پر چہچہہ کرتی ہیں اور کسی کی آواز گلدستۂ پھول تک نہیں پہنچتی۔ اب کے کلکِ مشکل پسند کا نقش نہیں، کرسی پر ایک نازک مزاج بادشاہ کمالِ کبر و نخوت سے گوشۂ ابرو خم کیے ہوئے تاجِ مرصع ترچھا رکھے ہوئے، ناز و تمکین کے ساتھ خاموش بیٹھا ہے ؎

اے عندلیبِ نالاں! دم در گلو گیر
گوشِ گل است نازک، تابِ سخن ندارد

حضرت بیان نے عالمِ رویا میں ایک روحانی اجازت بمشکل حاصل کی ہو، اس لیے اس قدر لب کشائی کی، دلبری کرتے ہیں اور منتظران سخن کی سیری:

از بسکہ بہر دام فتادیم در امیدم
در دستِ کسے نیست کہ مشتا پر نمانیست

دیوان کا دیباچہ ہے حمدِ الٰہی کا بیان ہے اور نقاش کے کمالِ صنعت گری کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں تصویر بول اٹھی۔ مصوّر کی معجز نگاری یہی ہے کہ نقش نگار کا حسن خود اس کی شہادت ادا کرے چہ جائے کہ نوبت بفریاد پہنچی۔

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا" معشوق کو ستمگر کہتے ہیں۔ ستم کا حال عاشقانِ دل دادہ کی فریاد خوانی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ شوخیٔ تحریر نے ذاتِ نقش پر وہ ستم کیا ہے "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

مرزا صاحب فارسی نژاد سلجوقی ترک تھے۔ فارسی محاورات دل میں بسے ہوئے ہیں۔ وہی لب سے ٹپکتے ہیں۔ ایران کا دستور تھا کہ فریادی لوگ کاغذ کا لباس پہن کر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے تھے، تاکہ

کمال مظلومیت کا کاغذی ثبوت دیں۔ اس لیے جو تصویریں کاغذ پر کھینچی جاتی ہیں اور قلم کی نقاشی سے صورت پذیر ہوتی ہیں، ان کا کاغذی پیرہن ہونا ظاہر ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ مصورِ حقیقی کی تعریف کسی دوسرے سے کیا ہو سکتی ہے، خود نقش اس کی ثناء بلکہ اس کے حسن و خوبی سے بےچین ہو کر فریاد کرتا ہے۔ پس اس سے بڑھ کر نقاش کی کمالِ صنعت کیا ہو سکتی ہے اور حمد میں اس سے افزوں شاعر کیا کہہ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ صَوَّرَکُم فَاَحسَنَ صُوَرَکُم آیۂ قرآنی ہے یعنی صورت بنائی ہے تمہاری سو کیا اچھی صورتیں تمہاری۔ مرزا صاحب کا غالباً اسی طرف اشارہ ہے۔

سان الملک، مولانا حالی کی اردو میں اصلاحی تحریک، کا سخت مخالف تھا۔ دوسرے نمارے ہی سے بیان نے اس تحریک کے خلاف باقاعدہ منظوم تنقید شروع کر دی تھی جس ے ان کی علمی لیاقت اور شاعرانہ صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز اردو میں منظوم تنقید ا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ ۴ سال اشاعت پذیر رہ کر یہ ماہنامہ بیان کی وفات کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔ انھوں نے ایک ظریفانہ رسالہ "طوفان" بھی جاری کیا تھا جو سان الملک کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوتا رہا۔ میرے پاس اس کے ابتدائی چار شمارے یں جن پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ صفحات کی مجموعی تعداد ۲۸ ہے۔ ابتدائی نین شمارے آٹھ آٹھ صفحات کے ہیں۔ آخری شمارہ چار صفحات کا ہے۔ اس میں انھوں نے ایڈیٹر "کمال منہ" کی اچھی طرح درگت بنائی ہے۔ سرورق کے نصف حصے پر یہ اشعار ہیں ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	خنجرِ بُرّاں ہے پئے دیوِ رجیم
لشکرِ طوفاں سبب قوم درآمد	خطبۂ لاعاصم الیوم خواند
آج ہے جوشش پہ طوفاں میرا	دل ہے جو شان و خروشاں میرا
پڑھ کے بسم اللہ رکھتا ہوں قدم گھمسان میں	آج دیکھو کون ٹھہرے سامنے میدان میں
پھر آواز آنے لگی اے حبیب!	کہ نصرٌ من اللہ فتحٌ قریب

صورتے گر دو مجسم فتح گوید آشکار　　لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

"ذوالفقار قاتل فجار" (پہلا دم) کے عنوان سے مضمون شروع ہوتا ہے۔ اس میں چار طنزیہ نظمیں بھی ہیں مسدس "طفلِ شگاف" (کھوسٹ اخبار کے مسدس کی جھاڑ) کے چند بند قلمبند کیے جاتے ہیں:[18]

کھا کھا کے لقمہ ہائے حرام ایڈیٹری　　گندہ کیا ہے تو نے مشام ایڈیٹری
اللہ میڈ کی کو نکام ایڈیٹری　　تہمت ہے اس کلال پہ نام ایڈیٹری

تجھ کو کہاں نصیب مقام ایڈیٹری
بڑھیا کا کوٹھا ہے کوئی بام ایڈیٹری

جا سامنا ہمارا نہ اوطفل شوم کر　　سفاد شیت کو تری رکھ دینگے توم کر
نیزے ہزار چھوڑ دیے ہم نے چوم کر　　جنگل میں ہم اٹھائینگے ہتھیار گھوم کر

تجھ کو کہاں نصیب مقام ایڈیٹری
بڑھیا کا کوٹھا ہے کوئی بام ایڈیٹری

کوس فلک میں ہو مرے ڈنکے کا غلغلا　　اب تک اودھ میں ہے میری ٹیموں سے زلزلا
گھٹتا ہے کوئی شیر جو اندن کا ولولا　　رہ جائیگا تو پہلے ہی دھکے سے تلملا

تجھ کو کہاں نصیب مقام ایڈیٹری
بڑھیا کا کوٹھا ہے کوئی بام ایڈیٹری

پڑنے لگینگے چاند پہ جب ٹھائیں ٹھائیں ٹھائیں　　کٹنے لگینگی اوکھلیاں دھائیں دھائیں دھائیں
ہلڑ مچیگا چاروں طرف ہائیں ہائیں ہائیں　　لونڈے یہ بھول جائینگے سب آئیں بائیں شائیں

تجھ کو کہاں نصیب مقام ایڈیٹری
بڑھیا کا کوٹھا ہے کوئی بام ایڈیٹری

ہم سے نہ او کلال، کبھی رنگ لائیو!　　محفل میں اپنی دخترِ رز کو نچائیو
اور بن بٹو میں جا کوئی اڈا بنائیو!　　دیوث اس سے یہ تو بھاڑ کھائیو

---

18 - طوفان: ۸

بیان میرٹھی

تجھ کو کہاں نصیب مقام ایڈیٹری
بڑھیا کا کوٹھا ہے کوئی بام ایڈیٹری

تصانیف: بیان اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں مختصر طور پر کتابچے طبع کروائے تھے ان کا خاصا کلام طوطیِ ہند، لسان الملک، ملونا اور جلوۂ یار میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ ان کے انتقال کے وقت ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا مسودہ ان کے شاگرد پروفیسر گرامی کے قبضے میں تھا۔ وہ عرصے تک اس کی تدوین میں مصروف رہے، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ اصنافِ سخن کے لحاظ سے انھوں نے تین کتابیں، عطر مجموعہ، نعت، رنگِ شہادت اور جواہرِ لاثانی شائع کروائی تھیں۔ پروفیسر گرامی اب اس دنیا میں نہیں اور ان کے خاندان کے تمام افراد بھی پاکستان جا چکے ہیں۔ لہٰذا معلوم نہیں کہ بیان کے بقیہ کلام کا کیا حشر ہوا، ضائع ہو گیا یا ادبی ڈاکوؤں نے اس پر قبضہ جما لیا۔ مجھے جب دیوانِ بیان کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا، تو تلاش و تحقیق شروع کی۔ شکر ہے کہ پانچ کتابچے جواس خمسہ، پنجۂ فولاد، رخصتِ عروس اور جواہرِ لاثانی کے علاوہ مجھے بیان کا تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام مختلف ذرائع سے مل گیا ہے — دیوانِ بیان کی ترتیب کا کام بھی اب تقریباً مکمل ہو چکا ہے، مگر مذکورہ کتابچوں کے نہ ملنے کا افسوس رہیگا۔ بیان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کی تفصیل یہ ہے:

پاسخِ ہند: ۲۰ صفحات کا یہ کتابچہ مطبع حدیقۃ العلوم، میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ بیان نے یہ نظم حالی کی نظم شکوۂ ہند کے جواب میں کہی تھی۔ یہ اتنی مقبول ہوئی کہ ان کی زندگی ہی میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہو گئے تھے۔ میرے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ہے، جو ۱۸۹۹ء میں طبع ہوا۔ بیان نے شکوۂ ہند (حالی) کے برعکس پاسخِ ہند میں اپنے زورِ قلم سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہماری غفلت و کوتاہی کا سبب ہماری کم ہمتی ہے۔ اس میں ہندوستان کی سرزمین کو موردِ الزام قرار دینا دانشمندی سے بعید ہے۔ ابتدا میں دو صفحے کا دیباچہ شامل ہے، جو اس رُباعی

بیان میرٹھی

سے شروع ہوتا ہے:

بازارِ جہاں میں ناروا چیز ہوں میں
مٹی سے بنا ہوا، واہ کیا چیز ہوں میں
اعجازِ بیاں کجا، کجا ستو کلاہ
ناکارہ و نارسا و نا چیز ہوں میں

دیباچے میں لکھتے ہیں:

حمد و ثنا کے بعد مٹی کا بنا ہوا پتلا جس کی حقیقت خالی ہے اور شہرت بے ذوالی ہے، بیان کرتا ہے کہ پانچ ہند کی تحریر سے صیت کمال کی زیادہ تر نشو نما اور آوازِ کلام کی بیشتر نمود و نمو مقصود نہ تھی، بلکہ آگندہ گوش قوم کو سود مند پند سنانے کے لیے ملا کر دو آوازوں کا بلند کرنا مد نظر تھا۔ کیا اچھا کہا ہے:

بہرا جو ہوں، تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

البتہ نصیحت کا یہ پیرایہ بدل گیا ہے۔ صاحبِ شکوۂ ہند نے ہند کو ہدفِ ملامت بنایا، گویا ایک بے الزام و کہ کر دوسرے کو نصیحت کا دکھڑا سنایا۔ ہم کو یہ پیرایہ پسند نہ آیا کیونکہ جان بچانے کو کاہل وجودوں کے لیے اتنی سی آڑ بھی بہر فرار کافی تھی۔ ہم نے تہدید اور تنبیہ کے لشکر کا گھونگھٹ توڑا اور غفلت کی میٹھی نیند سونے والوں پر قائمہ و رسالی نصیحت کا چھاپا مارا۔ سننے والے اگر ان نیک فرجام نصیحتوں کو کشورِ دل میں امن و امان کے ساتھ جگہ دیں گے، تو دینی و دنیوی فتوحات حاصل کرنے میں ان کو کسی دشواری و مشکل کا سامنا نہ ہوگا۔ پانچ ہند پہلے میرے کسی عزیز کی خواہش سے کسی اور مطبع میں مطبوع ہوا تھا، لیکن کثرتِ اغلاط کے سبب نامطبوع رہا۔ اس لیے طبع ثانی کے لیے میرے

بیان میرٹھی

سچے مہربان بابو رام چندر صاحب ویش مالکِ نیّرِ ہند نے تحریک کا متن لکھا اور اس پر میرے قدیم ہم ربط منشی بنارسی داس صاحب ضبط ایڈیٹر و منیجر اخبار نے کوشش کا حاشیہ چڑھایا اور پھر منشی محمد محسن صاحب خوش نویس مطبعِ نیّرِ ہند نے حسنِ سعی کی جدول کھینچی ۔

اب حضرت یزدانی کا محاصرہ ہو گیا اور فرمائشِ احباب سے باہر نہ جا سکے۔ خوشی سے طبعِ ثانی کی اجازت دی اور دیباچہ دوم کا نقشِ اول صدرِ کلام کی کرسی پر بٹھا دیا۔ با ایں ہمہ الضرام و اہتمام اگر کسی کے قدمِ قلم سے یا لغزش واقع ہوئی ہو تو اہلِ ہمم گوشۂ دامنِ کرم سے ڈھک دیں اور بشریت پر محمول فرمائیں اور مصنف و مہتمم کے لیے دستِ دعا اٹھائیں۔

دیباچے کے اختتام پر یہ رُباعی ہے:

اعجازِ بشر ہے عجز کوشی کے لیے
یہ جنس نہیں خود فروشی کے لیے
پوچھو نہیں یہ بات پردے سے غافل!
ہے خانۂ چشم عیب پوشی کے لیے

یہ نظم ۴۴ صفحات پر چھپی ہے اور اس میں خاتمہ اور مقطع ملا کر کل ۱۸ بند ہیں۔ ہر بند ۱۱ شعر پر مشتمل ہے۔ پانچِ ہند کے سلسلے میں ایک غلطی کا ازالہ لازمی ہے۔ لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید میں اور رام بابو سکسینہ نے تاریخِ اُردو ادب میں لکھا ہے کہ بیان نے مسدسِ حالی کے جواب میں ایک کتاب لکھی تھی۔ یہاں ان حضرات سے سہو ہوا ہے۔ بیان نے مسدسِ حالی کے جواب میں کوئی کتاب نہیں لکھی تھی، البتہ شکوۂ ہند کے جواب میں یہ کتابچہ تحریر کیا تھا۔

جُرمانۂ آفتاب: ۱۶ صفحات کا یہ کتابچہ بھی مطبع حدیقۃ العلوم میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ جرمانۂ آفتاب ایک طویل نظم ہے جس میں بیانؔ نے آفتاب پرستوں

سے خطاب کیا ہے۔ سرورق کی عبارت اسی طرح ہے۔ اوپر لا احب الآفلین جلی
حرفوں میں درج ہے۔ پھر مثنوی لاجواب توحید آفتاب المسمیٰ بہ مجموعۂ آفتاب
لکھا ہوا ہے۔ اس کے نیچے مصنف، مطبع اور کاتب، "بشیر الدین" کا نام تحریر ہے۔
صفحہ ۲ پر نواب علی مراد خان بہادر والیِ سندھ کے نام دیباچہ ہے، جو اس شعر سے
شروع ہوتا ہے ؎

ہے حق میں آفتاب پرستوں سے پوچھیے
تصویر حسن کی ہے ورقِ آفتاب میں

دیباچے کے الفاظ یہ ہیں:

عہد میں وہ بچہ بولا جس کو روح القدس نے زندہ کیا۔ جس طرح اس کو
خدا نے زندگی دی ہے اسی طرح اس نے دینِ خدا کو دیر تک زندہ رکھا ؎

از دمِ فیضِ تو کہ ریزہ شدہ — عہد نشین عیسیٰ دو سالہ شدہ

ہنر بھی ایک روحانی پتلا ہے۔ اس پتلے کے لیے دولت کی تائید روح القدس
کا فیض جان پرور ہے۔ ہنر کے بوسیدہ قالب میں دولت روح پھونکتی
ہے اور دولت کے مبارک نام کو ہنر زندہ رکھتا ہے ؎

ہنر از کجا یافت قدرے تمام — بدولت خداے بر آورد نام

فردوسی کو محمود نے حیاتِ جاوید بخشی اور محمود کو فردوسی نے بقائے دوام۔
ازلی خدا کے ابدی لطف سے نہ آج تک بابِ فیض بند ہوا، نہ بحرِ کرم
خشک ع

نیست خدا ممسک و قدرت بخیل۔

ہنوز آں ابرِ رحمت دُرفشانست — مے و میخانہ با مُہر و نشانست

یزدانی ثانی کے معنوی فرزند گمنامی کے کونے میں چادرِ بےپروائی کے
گوشے لپیٹے ہوئے بےحس و حرکت پڑے تھے۔ کوئی کروٹ بدلنے والا
تھا، نہ جان ڈالنے والا۔ ناگاہ صیتِ اقبالِ عطاگستری و آوازہ

بیان میرٹھی

اخلاقی سرپرستی نے تخت گاہ حیدرآباد سندھ سے آکر ناامیدی کو امید دلائی اور دلِ مایوس کی ڈھارس بندھائی اور رجالِ دادگانہ زاویۂ خمول کو یک بیک جلا دیا ؎

بلند نام ترا تا دوام زندہ ہوا
کہ تیرے دم سے ہمارا کلام زندہ ہوا

اس کے بعد "القطعۃ فی شکر المنعم" کے عنوان سے والی سندھ کی شان میں قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ جو ۲۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ قصیدے کا مطلع یہ ہے ؎

سپہر جھک کے سلامی ہوئے کہاں تک لیے
علی مراد بہادر سے جم نشاں کے لیے

نظم ص ۴۰ سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں انھوں نے جو عنوانات قائم کیے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

حمد، نعت، افتخار دنیا و دین، چراغ آسمان و زمین، حضرت خاتم المرسلین، نفی غیر کا تقاضہ، جلوۂ ذات کی تمنا، پردۂ ماسوا کا تعب، لمعۂ توحید کی طلب، آفتاب کی طرف خطاب اور آفتاب پرستی کا عتاب، آفتاب کا جواب اور گردش تقدیر کے اسباب، آفتاب کا اظہار اور اپنی ذوقی کا اقرار، ایک ہندو کی کہانی اور آفتاب پر تیر دبانی، قاضی اسلام کی حکایت اور اہلِ اسلام کی شکایت، مطلب کی طرف بازگشت اور ہندو کی سرگزشت، آفتاب کی فضیحت اور آفتاب پرستوں کو نصیحت، کتاب کا خاتمہ۔

عطرِ مجموعۂ نعت: بیان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھی۔ بعد کو سید محمود علی گرامی نے دوبارہ مرتب کر کے اہتمام سے چھپوائی تھی۔ میرے پیشِ نظر پروفیسر گرامی کا مرتب کردہ نسخہ ہے۔ جو ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں مرتب کا لکھا ہوا دو صفحے کا دیباچہ

1

ہے۔ کلام صفحہ ۲ سے شروع ہو کر، ۴ پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ایک مثنوی "منزل بن" ۲۴ نعتیں، ۲۰ بند کا ایک مسدس، ۱۳ بند کا ایک مثلث، ۱۱ شعر کا ایک مستزاد، آٹھ بند کا ایک خمسہ، قدسی کی نعت پر تضمین، بلغ العلیٰ بکمالہ پر نو بند کی تضمین۔ نظامی گنجوی کے شعر "اے مدنی برقع و مکی نقاب / سایہ نشیں چند بود آفتاب" پر گیارہ بند کی تضمین، ۳۵ بند کی ایک نعتیہ نظم۔ بعنوان (معراج الکلام فی نعت سید الانام) مولوی محمد عمر کی نعت پر ۲۲ بند کی تضمین، دو نعتیہ غزلیں، اور آٹھ رباعیاں شامل ہیں۔ آخر صفحے پر "التماس مصنف" کے عنوان سے بیان کے قلم سے لکھا ہوا یہ خاتمہ ہے:

میں کیا اور میری نازرالیاں کیا۔ مٹھی بھر مٹی کو بوند بھر پانی سے گوندھو اور سوچو کہ اس ناچیز سے کچھ ہوگا، کچھ نہ ہوگا۔ اور پھر یہ ہو کا مقام جہاں اچھے اچھے تھک رہے۔ بڑے بڑے ٹھٹھک رہے ہیں یزداں کی ہمزبانی اور یزدانی۔ ع

این خیالست و محالست و جنون

نکوئیوں کی دُھن زیادہ اور نیکی کے نام ورق سادہ۔ اسلام کی حالت گرداب سے زیادہ ترنازک، احداث کا طغیان بحر محیط سے زیادہ پُر شور۔ دلولا اٹھا کر کچھ کیجیے اور بعد مرگ زندہ رہیے۔ حضور میں چلیے، تو سفارش نامۂ معاصی لے چلیے ؎

محمد عربی کآبروے ہر دو سراست
کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

اے پڑھنے والو، عنقریب ہم صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح اٹھ جائیں گے اور چند دعائیہ حرفوں کے محتاج ہوں گے۔ وہ ممدوح جس کی شان میں ہے آیۂ نعلیٰ خلق العظیم اس کی سچی پیروی کا دم بھرنا اور چند لفظوں سے بخل نہ کرنا اللھم اغفرلی ولوالدیہ وللمومنین یوم یقوم الحساب بجر

بیان میرٹھی

بحرمۃ النبی و آلہ طیبات

کتاب کی اشاعت پر بیان نے جو قطعۂ تاریخ کہا تھا، وہ بھی اسی نسخے پر درج ہے:

در بیلے کہ رطب افشاند قلم — گفتمش مجمع شیرینی نعمت

قدسیاں را شدہ عطر آگیں مغز — از گل انگیزی رنگینی نعمت

خود ز ممدوح توقع دارم — قطرے ابر گہر بینی نعمت

بسکہ خوش کردہ مشام جاں را — رنگ آئین ز خوش آئینی نعمت

گفت یزدانی ما سالِ جمل

"عطر مجموعۂ رنگینی نعمت" (۱۳۰۳)

رنگِ شہادت: یہ کتاب سید محمود علی گرامی اسسٹنٹ پروفیسر ڈویژنل کالج، میرٹھ نے بیان کے انتقال کے بعد مرتب کرکے ۱۹۱۴ء میں مطبع دتی پرنٹنگ ورکس، دہلی سے طبع کروائی تھی۔ طباعت و کتابت بہت عمدہ ہے اور کتاب کے نسخے کی ۱۰ آنے قیمت تھی۔ سرورق پر کتاب اور مطبع کا نام قیمت اور سنۂ اشاعت کے ساتھ یہ دو رباعیاں درج ہیں:

فلک سے ہے عرصہ مرے کلک کے تگاپو کا
مرا کلام کسی معرکے میں کب چوکا
من البیان لسحرا کی دھوم ہے ہر سو
گواہ قولِ نبی ہے بیان کے جادو کا

نقاش نہیں صانعِ قدرت کے سوا
کھنچتا نہیں نقشہ یدِ قدرت کے سوا
فیاض ازل سے فیض جاری ہے بیاں!
ہوتا نہیں کچھ ختم نبوت کے سوا

ابتدا میں مرتب کا لکھا ہوا دیباچہ ہے۔ کلام ۸۰ صفحات پر چھپا ہے۔ اس میں تین

بیان میرٹھی

طویل مراثی، نو رباعیاں، ایک نظم "غم کا نیچرل سماں"، ایک مسدس، ایک مثلث ناسخ کی غزل پر تضمین، گیارہ سلام اور ساقی نامہ "محرم" شامل ہیں

جواہر لاثانی: بہت تلاش کے باوجود اس کتاب کا نسخہ فراہم نہ ہو سکا۔ رنگ شہادت کے دیباچے میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ پروفیسر گرامی ہی اس کے بھی مرتب تھے۔ یہ بیان کی نیچرل نظموں کا مجموعہ ہے۔

رخصت عروس: ایشیائی شاعری کی الوداع کے نام سے بیان نے ایک طویل نظم لکھی تھی جو لسان الملک میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ نظم کی مقبولیت کے باعث بیان نے اسے مطبع حدیقۃ العلوم، میرٹھ سے "رخصت عروس" کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع کروایا تھا۔ اس کا بھی کوئی نسخہ نہ مل سکا۔

پنجۂ فولاد: یہ کتابچہ اب نایاب ہے۔ لسان الملک کے پرچوں میں اس تصنیف کا نام ملتا ہے۔

حواس خمسہ: اس کے صرف چار صفحات دستیاب ہوئے ہیں۔ جن پر دیباچہ تحریر ہے کتابچہ مطبع حدیقۃ العلوم، میرٹھ میں چھپا تھا۔

یادگار یزدانی: کتب خانہ منظاہر العلوم، میرٹھ کی فہرست کتب میں یہ نام ملتا ہے۔ شاید بیان کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔

حل المطالب: شرح کلام غالب۔ لسان الملک میں شائع ہونا شروع ہوئی تھی۔ بیان کی وفات کے باعث یہ نامکمل رہی؛ غالباً کتابی شکل میں شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

گل عباس: یہ ناول لسان الملک میں قسط وار شائع ہو چکا ہے۔ غیر مطبوعہ تصانیف میں غیر مطبوعہ کلام کے علاوہ شرح قانون بوعلی سینا (ترکی زبان میں ایک رسالہ) اور رقیع سندی (خطوط کا مجموعہ) ہے اوّل الذکر کا نسخہ نذر دیمک ہو چکا ہے مؤخر الذکر قلمی نسخہ اچھی حالت میں ہے اور فل اسکیپ سائز کے ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں فرقانی میرٹھی، مولوی حسین احمد، سید محبوب الدین، ولایت

جادو، بشیر الدین عاقل، منشی عبدالحامد، مرزا عنایت علی اثر، سجاد حسین ریحانی اور دیگر تلامذہ، احباب اور رشتہ داروں کے نام بیان کے خطوط ہیں۔

تلامذہ: بیان کے تلامذہ کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ بیان مسلم الثبوت استاد، پختہ مشق اور فطری شاعر تھے۔ لہٰذا نو مشق شعراء زیادہ تر انھیں کے پاس اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجتے تھے۔ ان کے اکثر شاگرد خوش گو، خوش فہم ہوئے ہیں۔ لسان الملک اور مختلف ذرائع سے ان کے مندرجہ ذیل شاگردوں کا پتہ چلتا ہے:۔

مولانا اکبر وارثی میرٹھی، مولانا سید ابوالحسن ناطق گلاؤٹھوی، سید ضیاءالاسلام عیاں میرٹھی، منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی، منشی رگھبیر سہائے بریاں جہان آبادی، حافظ کریم بخش آزاد میرٹھی، منشی علی حسین صیغم بلند شہری، مولوی سید محمود علی بلگرامی، منشی بال سروپ شکن، خان بہادر بشیر الدین تسخیر میرٹھی، احمد جان تبسم، نور الحسن یاس، اختر خیر نگری، مولانا سید سراج احمد سراج الدنی، منشی بہادر خان ناچیز، منشی موہن لال خمار، منشی برکت اللہ خان ادیب، منشی اصغر حسین قمر، سید زوار حسین ستم، منشی بدیع الدین جوہر، منشی حیدر حسین خفی امروہی، منشی عبدالحکیم محشر، افضل جان افضل، منشی ولایت علی جادو، منشی رام پرشاد شاد سہارنپوری، انور میرٹھی، آزاد میرٹھی، منشی طفیل حسین تعلی، نور میرٹھی، شمس الدین شمس میرٹھی۔

امراض: بیان اپنی تمام زندگی امراض اور ذہنی پریشانیوں کا شکار رہے۔ انھیں روشنی میں بلا وجہ حد درجہ تکلیف ہوتی تھی۔ اور اسی شک میں وہ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ جس کمرے میں گوشہ نشین تھے اس کے دروازے اور کھڑکیوں پر پردے پڑے رہتے تھے، تاکہ باہر کی روشنی اندر نہ آسکے۔ ہمیشہ ودنی کپڑے کی ایک گٹھری بنا کر سر کی گدی پر رکھا کرتے تھے اور اگر کسی کام سے مجبوراً نکلنا پڑتا تو خواہ کوئی موسم یا وقت ہو چھتری ضرور لگا لیتے تھے۔ کوئی پوچھتا کہ حضرت آپنے چھتری کیوں لگا رکھی ہے، تو کہتے کہ تارے دماغ میں چبھتے ہیں۔ کبھی کبھی پالکی پر بیٹھ کر بھی نکلتے تھے۔ اسی طرح شور وغل سے بھی بیحد

پریشان ہوتے تھے، یہاں تک کہ اگر گھر کے کسی گوشے میں چھالیا کٹ رہی ہو تو اُس کی آواز سن کر چلّا اٹھتے[19]۔ انھیں صفائی کا مطلق خیال نہ تھا۔ ہمیشہ ایک لحاف اوڑھے رہتے اور پلنگ ہی پر نہا لیا کرتے تھے۔ وہ آخیر عمر تک اسی ذہنی عارضے میں مبتلا رہے البتّہ اس کی شدت چند برس رہی۔ بعد میں اندھیرے کمرے میں رہنا ترک کر دیا تھا گدّی سے گٹھری اُتار کر کاندھوں پر رکھ لی تھی۔ شور و غل سے بھی تکلیف نہ ہوتی تھی[20]۔ بیان کے خطوط میں بھی اُن کی مسلسل بیماری، جسمانی ضعف اور ذہنی پریشانیوں کے اشارے ملتے ہیں۔ چند اقتباس دیکھیے:۔

میرا حال سنیں۔ بیمار ہیں، بیکار ہیں، دنیا سے بیزار ہیں، ہمہ تن زار ہیں بلکہ آزار ہیں۔ زحمتِ امراض سے ناچار ہیں، رحمتِ الٰہی کے طلبگار ہیں۔ بیٹھتے ہیں گھر کی طرح، اُٹھتے ہیں چھپّر کی طرح، چلتے ہیں جنازے کی طرح۔ خدا عفو و عافیت دے[21]۔

جب تمہارا خط آیا تھا میں تپ لرزہ میں مبتلا تھا اور اس بلا کا تپ لرزہ تھا گویا زمین کو بھونچال آیا تھا۔ کئی دن بے ہوش رہا۔ بعض کو حیات میں تردّد رہا[22]۔

شفا کہاں۔ مرض بڑھتا رہا، جوں جوں دوا کی، میں بیمار چلا جاتا ہوں! غلط کہتا ہوں۔ اب اس قدر ضعف ہے کہ چلا نہیں جاتا۔ لیکن،

غضب ہے شوقِ رسائی وہ دور ہی منزل	چلا ہی جاتا ہوں گو چلا نہیں جاتا

۱۹۔ روزنامہ امروز کراچی، نیز خمخانۂ جاوید حصّہ اوّل

۲۰۔ روزنامہ امروز، کراچی (محمود ذوقی)

۲۱۔ تیغِ ہندی (قلمی): ۹۱

۲۲ ایضاً : ۹۳

پہلے پڑا تھا۔ مگر بھلا تھا اب اچھا نہیں ..... پلنگ پر پڑا کبھی ہوش ہے، کبھی بیہوش ہوں"[23]

وفات: ۱۸۹۹ء کے موسمِ سرما میں بیان کو بخار آنے لگا۔ پھر کھانسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بخار نے آگے چل کر شدت اختیار کرلی جس کے باعث قویٰ اور مضمحل ہوگئے۔ ہمیشہ سے چارپائی پر ہی بیٹھے بیٹھے ورزش کرنے کے عادی تھے۔ اس عالم میں بھی ان کا یہی معمول رہا۔ اتفاقاً ایک دن ہاتھ چھوٹ گیا اور نیچے آ رہے۔ شدید چوٹ آئی جس سے جانبر نہ ہوسکے۔ یہ حادثہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء کا ہے۔ دلّی دروازہ میرٹھ کے باہر احمد حسن فرقانی کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ قبر پر کوئی کتبہ یا نشان نہیں ہے۔

متعدد شعراء نے مرثیے اور تاریخی قطعات لکھے۔ امیر مینائی نے مصرعِ ذیل سے تاریخِ وفات نکالی

یزداں بخش، خوابِ یزدانی را
(۱۳۱۷)

محمد علی رغبت انصاری نے تین تاریخیں کہی ہیں۔ ان میں سے دو یہ ہیں:[24]

ہاں بگو رغبت! مصرعِ تاریخ
"حشر زادست و مردہ یزدانی" (۱۳۱۷)

تاریخ یہ رغبت! لکھ میری
"میرٹھ کا بجھا چراغ اب آہ" (۱۹۰۰ء)

انیسِ ہند میرٹھ کے مختلف شماروں میں بیان کے انتقال پر بہتیرا تاریخی قطعات اور مرثیے شائع ہوئے ہیں۔ ادیب میرٹھی، منشی پربھو دیال عاشق لکھنوی، منشی متصدی لال طرب، جگدمبا پرشاد مہر جہاں آبادی، منشی لچھمن لال شوقی، بابو منگل سین بیدل، جھنجھانوی، رائے میکو لال عشرت رئیس لکھنؤ کے نکالے ہوئے تاریخی مادّے

۲۳۔ تیغِ ہندی ص ۹۵

۲۴۔ کلیاتِ بیان (نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۲ء): ۳۵۰ - ۳۵۱

دیکھیے پہ ۲۵

حق مغفرت کرے مرے اُستاد کی ادیب   اس مبتلائے غم کی یہ دل سے دعا ہو آج
تاریخ کے لیے دلِ ہمدرد نے کہا   کردو۔ کہ "بادشاہِ سخن مرگیا ہے آج"

(۱۳۱۷ = ۱۳۱۳   + ۴)

یوں دل شکستہ ہو کے دلِ زار نے کہا
اس "دہرِ بے ثبات سے ہو ہو بیاں گیا"

(۱۳۱۷ = ۱ - ۱۳۱۸)

ہے طرب کے لب سے یہ مصرع بلند
"اب گئی میرٹھ سے بس شانِ سخن"

(۱۹۰۰ = ۱۸۹۱ + ۹)

ادب آموزِ زماں تھے وہ منتشر!   لکھ دے تاریخ : "غمِ مرگِ ادیب"
۱۳۱۷

شوقؔ! لکھ تاریخ از روے اِلم   "بے صدا ہے بلبلِ باغِ سخن"
۱۹۰۰

بیدلؔ از روے حیرتِ دل گفت   "سمتِ ایزد گرفتہ یزدانی"
۱۳۱۷

بگو عشرتؔ ایسی سال نوشتش   "بلیغ الملک رفت اے ہائے ہو ہو"
۱۹۰۰

مراثی میں منشی رگھبیر سہائے بریاں جہان آبادی اور منشی محمد افضل خان افضل کے مرثیے بہت مؤثر و دردناک ہیں۔ افضل کے مرثیہ کے چند بند دیکھیے[26]

۲۵۔ انیسِ ہند، میرٹھ (۱۳ مارچ ۱۹۰۰ء، ۴ اپریل ۱۹۰۰ء)
۲۶ انیسِ ہند، میرٹھ (۲۸ مارچ ۱۹۰۰ء - ۱۰

وہ سپہرِ سخنوری، ہیہات — بحرِ ذخّارِ شاعری ہیہات
فخرِ جامی و عنصری ہیہات — رشکِ عُرفی و انوری ہیہات
نیّرِ عزّ و اعتلا افسوس
برجِ خاکی میں چھپ گیا افسوس

طوطیِ گلشنِ سخندانی — بلبلِ گلبنِ گُل افشانی
خسروِ کشورِ غزل خوانی — گوہرِ افسرِ ہمہ دانی
غیرتِ انوری و خاقانی
رشکِ غالب، بیان یزدانی

آفتابِ سپہرِ جاہ و جلال — بادشاہِ دیارِ فضل و کمال
ناثر و ناظم و بلند خیال — شاعرِ بےعدیل و بے تمثال
چشمۂ فیض، شہرۂ آفاق
معدنِ حلم و مخزنِ اخلاق

اخترِ سعدِ آسمانِ علوم — گوہرِ آبدارِ کانِ علوم
گلِ خوش رنگِ گلستانِ علوم — روشنی بخشِ خانمانِ علوم
منشی بےنظیر و لاثانی
عزت افزائے نامِ فرقانی

گلزارِ سخن کا تھا اک مرد — فرد میں لاکھوں کے تھا بس فرد
گرم مضمون وہ کہ دل ہو سرد — سُن کے حاسد کا رنگِ رُخ ہو زرد
حُسنِ بندش جو دیکھ پائے وہ
ساری ترکیب بھول جائے وہ

شخصیت: بیان شکل و صورت کے اعتبار سے بہت حسین و جمیل شخص تھے۔ اسی لیے لوگ ان کے بچپن میں انھیں "لالہ" کہہ کر پکارتے تھے۔ انھیں دنیاداری کی مطلق پروا نہ تھی، چنانچہ عمر بھر شادی نہ کی۔ بڑے صلحِ کل، پاک طن، ظریف الطبع اور

آزاد منش تھے۔ خلوص، تواضع، ہمدردی اور بے تعصبی ان کی فطرت کا خاصہ تھی، جس کا ثبوت ان کے عزیز احباب و تلامذہ کی کثیر تعداد سے فراہم ہوتا ہے۔ سنجیدہ مسائل پر غور و فکر کے بعد لکھنے کے عادی تھے۔ لیکن کوئی انھیں چھیڑ دیتا تو پھر وہ کسی کے دوست نہیں تھے وہ گل افشانیاں کرتے کہ حریف بوکھلا جاتا۔ ایڈیٹر اور صحافی کی حیثیت سے سیاسی اور ملکی معاملات سے بھی باخبر رہتے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ انھیں شعر گوئی اور نثر نگاری کے علاوہ اور کسی چیز سے ذہنی لگاؤ نہیں تھا۔ ان کی اندھیری کوٹھری ہی ان کی کائنات تھی۔ اسی لیے بعض احباب انھیں "گودڑ کا لعل" کہا کرتے تھے۔ ان کی ادبی تخلیقات وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی اور اس وقت کے مؤقر جرائد و رسائل کے مدیر صاحبان ان کی تحریروں کے ساتھ ان کے نام سے پہلے طوطیِ ہند، بلیغ الملک، فصاحت الملک ہمدانی، سید الشعرا، رشکِ انوری و خاقانی، حسان الہند، سحبان العجم، جیسے گرانقدر القاب کا اضافہ کرتے تھے۔

بیان جتنا اچھا کہتے تھے، اتنا ہی اچھا پڑھتے بھی تھے۔ ان کے پڑھنے کا انداز پرجوش مؤثر اور پرکیف تھا۔ آغا اشہر لکھنوی لکھتے ہیں[27]:

> ایک مرتبہ مرحوم (بیان) کے نامی شاگرد حکیم بلند شہری سے میں نے ان کی طرزِ شعر خوانی کے متعلق کچھ پوچھا، تو انھوں نے کہا کہ استاد مرحوم الفاظ پر زور دے کر پڑھتے تھے اور آواز میں بھی ایک خاص جذب کی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ اس کے بعد حکیم مرحوم نے اس رنگ میں ایک شعر پڑھ کر سنایا، واقعی جوشیلی طرزِ ادا تھی۔

شاعری پر مختصر تبصرہ: بیان اردو شاعری کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس میں قدیم و جدید کی آمیزش تھی۔ ایک طرف ناسخ کی شاعری کا رنگ عام ہو چکا تھا، ذوق، غالب، اور مومن کا آخری زمانہ تھا۔ انیس و دبیر اپنی شہرت کے دائمی نقوش بنانے میں سرگرمِ عمل تھے اور داغ و امیر میدانِ شاعری میں اپنے کمالات کا ڈنکا بجا رہے

۲۷۔ ماہنامہ مرقع لکھنؤ (دسمبر ۱۹۲۶ء) مضمون جذبات شعر کا اظہار

تھے۔ دوسری طرف آزاد، حالی اور اسمٰعیل میرٹھی جدید شاعری کی ترویج و اشاعت میں معروف تھے۔ بیان کی ترتیب اور تعلیم گو مشرقی تھی، مگر شعوری اور سماجی اعتبار سے وہ زمانے کی بدلتی قدروں سے متاثر تھے اسی لیے انھوں نے اپنی شاعری کی اساس روایت و جدیدیت پر رکھی جس سے ان کی شاعری قدیم و جدید خیالات کا حسین سنگم بن گئی۔

بیان نے روایت کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے غزلیں، نعت، مراثی، قصائد، سہرے، قطعات اور رباعیات کہی ہیں اور شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات کو اپنا کر جدید قسم کی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی غزلوں میں ان کے معاصرین ناسخ، غالب، امیر مینائی اور داغ کا رنگ جھلکتا ہے۔ قصائد میں سودا کا تتبع کیا ہے اور مراثی میں انیس کا۔ نیچرل شاعری میں وہ آزاد، حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ روزمرہ زندگی اور نیچر سے متعلق نظمیں ان کے تجربات حیات اور قوت مشاہدہ کی آئینہ دار ہیں اور شاعرانہ مصوری کی نادر مثال۔ یہ نظمیں بھی سادہ اور سلیس زبان میں ہیں۔ بیان کے انتقال کے دوسرے دن انیس ہند نے اپنے اداریے میں لکھا تھا:[۲۸]

> جناب بیان کئی وجوہ کی بنا پر نامور شعرا میں شمار کیے جاتے تھے اور باوجود خلوت نشینی اور اعصابی مرض کے وہ زمانے کی ضروریات اور شاعری کے مذاق سے کما حقہ آگاہ تھے اور انھیں کسی کے آگے زانوے ادب تہ کرنے کے باوجود وہ کمال حاصل تھا جو دوسروں کو زمانے کی خاک چھاننے پر بھی حاصل نہیں ہوتا۔ وہ ریختہ کے میرو میرزا تھے، تو فارسی کے نظیری ظہوری اور قصائد میں تو رشک انوری و خاقانی آپ کا لقب مشہور تھا۔ آپ کو نیچرل شاعری کے اندر بھی دستگاہ تھی اور اس رنگ کی تصانیف موجود ہیں۔ زود طبیعت کا یہ حال تھا کہ طبیعت ہمہ وقت موزوں رہتی تھی اور کاتب کو بلا تکلف شعر لکھواتے چلے جاتے تھے، الغرض وہ قدرتی طور پر جامع الصفات شخص اور ہمہ داں شاعر تھے۔

انیس ہند ۱۴ مارچ ۱۹۰۰ء

اس میں شک نہیں کہ بیان کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ ایک وہبی اور وجدانی شاعر تھے اور انھیں زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں صداقت، تاثر اور جذبات کی گہرائی پائی جاتی ہے۔ ۱۹۲۴ء کے ادبی دنیا میں سر عبدالقادر نے بیان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ "وہ ایک فطری شاعر تھے، زبان پر انھیں قدرت تھی اور کلام میں بے ساختہ پن تھا"۔ لالہ سری رام ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:[29]

مبداء فیاض سے شعر گوئی اور سخن فہمی کا نہایت شستہ اور صحیح مذاق آپ کو ملا تھا۔ فارسی کلام سے بہت ذوق تھا، اس میں نہایت قابلیت کے ساتھ داد سخنوری دی ہے۔ جملہ اصناف سخن پر قادر تھے۔ ایک عجیب کمال ان کی ہمہ گیر طبیعت میں یہ تھا کہ جس رنگ میں چاہتے تھے، فکر سخن کرتے اور پھر یہ نہیں کہ قافیہ پیمائی ہو، بلکہ فی الحقیقت اس رنگ میں اپنے زور طبیعت سے وہ وہ اختراعیں کرتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے۔ مثلاً ان کے بعض شعر مرزا غالب کے رنگ میں ایسے لاجواب ہوتے تھے کہ اجنبی کو مرزا غالب کے کلام کا دھوکا ہو جاتا"

بیان کے کلام پر بالاستیعاب نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں وہ تمام خصوصیات شاعری اور لوازمات فن موجود ہیں، جو کسی بڑے کامیاب شاعر کی شہرت یا بقائے دوام کا باعث ہوتے ہیں۔ نازک خیالی، تناسب لفظی، معنی آفرینی، بداعت اسلوب، تخیل پرواز، ندرت خیال، جوش جذبات، شاعرانہ مصوری، محاکات، صنائع بدائع، غرض کیا ہے۔ جو ان کے کلام میں موجود نہیں۔ ان کے ہمعصروں میں بلاشبہ بڑے بڑے نام ہیں۔ اور تاریخ ادب میں وہ آفتاب و ماہتاب کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ بیان کا درجہ بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ کیا خوب کہا ہے سرور جہاں آبادی نے:

میر و مرزا سے زیادہ ترا رتبہ نہ سہی	ان سے کم تھا ترا ملبہ، یہ نہیں ہم کیونکر
چوم لیتی تھی فصاحت ترا منہ وقت کلام	اے بیاں! ختم تھی اعجاز بیانی تجھ پر

۲۹۔ خم خانۂ جاوید۔ حصہ اول ص ۴۲۴

مالک رام

وفیات

چغتائی، عبدالرحمن (خان بہادر)

کون ہے، جس نے جامع مسجد اور لال قلعہ دلّی یا تاج محل آگرہ کا نام نہ سنا ہوگا! لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان عالیشان اور شہرہ آفاق عمارتوں کے نقشے لاہور کے دو فنکاروں نے تیار کیے تھے! ان کے نام تھے: احمد اور حامد۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ عہد شاہجہانی کے مؤرخوں نے ان کے نام استاد العصر احمد اور نادر العصر حامد لکھے ہیں۔ ان کے نام سے منسوب "کوچہ استا حامد" آج بھی اُن کی یاد تازہ کرنے کو موجود ہے۔ فن عمارت اس خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ قائم رہا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے میر عمارت بابا صدر الدین چغتہ اسی خاندان کے نام لیوا تھے۔ ان کے بیٹے میاں رحیم بخش تھے اور میاں رحیم بخش کے میاں کریم بخش چغتہ۔ یہ دونوں باپ بیٹے بھی میر عمارت اور معمار تھے۔ میاں کریم بخش کا ۱۹۱۳ء میں انتقال ہوا۔ ۸۰ سال سے زیادہ عمر پائی۔

میاں کریم بخش چغتہ کے تین بیٹے ہوئے۔ عبدالرحمٰن، عبداللہ اور عبدالرحیم۔ یہی عبدالرحمٰن، ہمارے مشہور مصوّر اور فنکار عبدالرحمٰن چغتائی ہیں، جن کا ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ عبداللہ ہمارے علمی حلقوں میں ڈاکٹر محمد عبداللہ

چغتائی کے نام سے معروف ہیں، اور ان کا نام سوانح اقبال میں متعدد مقام پر آتا ہے۔
انھوں نے سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے "تاج محل" کے موضوع پر اپنے مقالے سے
ڈاکٹریٹ کی سند لی تھی۔ عبدالرحیم سب سے چھوٹے ہیں۔ انھوں نے ساری عمر عبدالرحمٰن
چغتائی کی معیت اور خدمت میں گزاری ہے دونوں بحمدہ تعالیٰ زندہ ہیں!
عبدالرحمٰن چغتائی لاہور میں ۲۱ ستمبر ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی بسم اللہ مسجد میں
ہوئی، اور انھوں نے قرآن ناظرہ ختم کیا تھا، بعض سورتیں جو انھیں آخر تک حفظ
تھیں، وہ اسی ابتدائی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ مسجد کی مکتبی تعلیم کے ساتھ ہی ان کے والد نے
انھیں اپنے بہنوئی میاں میراں بخش نقاش (ابن بابا عمرالدین نقاش) سے نقاشی اور
مصوری کے اسباق لینے کی ہدایت کی تھی۔ میاں میراں بخش اپنے فن کے ماہر اور اس
حیثیت سے سرکاری حلقوں میں بھی معروف تھے۔ حکومت نے ان کی عظمتِ فن کے
اعتراف میں انھیں مسجد وزیر خان (لاہور) میں حجرے عطا کیے تھے۔ اس زمانے میں
یہ حجرے مصوروں، نقاشوں، خطاطوں کو حکومت کی طرف سے اعزاز واکرام
کے طور پر دیے جاتے تھے۔ بابا میراں بخش نے ۱۰۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔
عبدالرحمٰن چغتائی میو اسکول جانے تک ان سے مستفیض ہوتے رہے تھے۔
مسجد سے فارغ ہو کر ان کا ریلوے ٹکنیکل اسکول، لاہور میں داخلہ ہوا، لیکن چھٹے
درجے کے بعد تعلیم کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ چندے پتنگ بازی اور آوارہ گردی
کے بعد انھوں نے پھر اسی اسکول سے ۱۹۱۱ء میں پرائیویٹ طور پر مڈل (آٹھویں درجے)
کا امتحان پاس کیا۔
جیسا کہ بیان ہوا، فن اور آرٹ ان کے خون میں تھے۔ مڈل اسکول امتحان کے بعد انھوں
نے خود بخود میو اسکول آف آرٹ، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں یہاں ڈرائنگ،
نقشہ سازی (ڈرافٹ مینی)، لوہاری اور بڑھئی کے کام کی تعلیم کا خاصا انتظام تھا۔
عبدالرحمٰن چغتائی آخری درجے کے امتحان (۱۹۱۴ء) میں صوبۂ پنجاب میں اول آئے
تھے۔

ہو اسکول کے امتحان میں کامیابی کے بعد اولاً انھوں نے کرسچین ہائی اسکول، گوجرانوالہ میں ڈرائنگ ماسٹر کی نوکری اختیار کر لی۔ لیکن یہاں ان کا دل نہیں لگا۔ گوجرانوالہ میں وہ صرف چند مہینے رہے اور استعفیٰ داخل کر کے واپس لاہور چلے آئے۔ ان کی مادر علمی (میو اسکول) نے محسوس کیا کہ ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھانا چاہیے چنانچہ اسکول میں فوٹو لیتھوگرافی کا درجہ کھولا گیا، جس کے انچارج چغتائی صاحب مقرر ہوئے۔ وہ اس عہدے پر ۱۹۲۴ء تک رہے اور پھر مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے عمر بھر کہیں ملازمت نہیں کی۔

میاں میراں بخش نقاش کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ انھوں نے عنفوانِ شباب میں مصوری شروع کر دی تھی۔ چنانچہ پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی، لاہور کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۹ء میں چغتائی کی آبی رنگی تصاویر کا بھی سراغ ملتا ہے۔ لیکن ابھی تک ان کی مصوری کی شہرت ان کے احباب ہی تک محدود تھی، اور وہ عوام سے متعارف نہیں ہوئے تھے۔ ان کی شہرت کو عام کرنے میں پروفیسر (ڈاکٹر) محمد دین تاثیر (ف نومبر ۱۹۵۰ء) اور ماہنامہ نیرنگِ خیال کا بہت ہاتھ ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ نیرنگِ خیال کے شروع کرنے والے ہی تاثیر اور چغتائی تھے۔ اس کی داغ بیل تاثیر کے مکان ہی پر پڑی، اور انھیں نے حکیم یوسف حسن کو یہ پرچہ جاری کرنے کا مشورہ دیا، چونکہ ان کے پاس سرمایہ تھا، جسے وہ اس کے اخراجات کے لیے لگا سکتے تھے۔ ہاں، بعد کو دوسرے احباب (نیاز منداں لاہور) سے بھی مشورہ کیا گیا تھا اور سب نے دستِ تعاون بڑھانے کا وعدہ کیا۔

نیرنگِ خیال وسط ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا اور اس کے پہلے ہی شمارے میں چغتائی کی بنائی ہوئی ایک تصویر شامل تھی۔ اس کے بعد بھی وہ باقاعدگی سے اپنی تخلیقات نیرنگِ خیال میں شائع کرتے رہے۔ غرض کہ یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ چغتائی اس سے پہلے سے مصوری کر رہے تھے، لیکن وہ عوام سے نیرنگِ خیال ہی کے ذریعے سے متعارف ہوئے۔ تاثیر نے ان کے فن اور تکنیک کے بارے میں اور ان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کی وضاحت کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ تاثیر نے محض چغتائی

کے آرٹ پر لکھنے اور اس کی باریکیوں کو اُجاگر کرنے کی خاطر یورپ کے بڑے بڑے مصوّروں اور فنونِ لطیفہ کے ماہروں کی تخلیقات اور تصنیفات کا غائر مطالعہ کیا تھا' تاکہ وہ چغتائی کے فن پر کما حقہ لکھ سکیں اور دوسرے عالمی مصوّروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرکے ان کے مابہ الامتیاز پہلو دکھا سکیں۔ اس سے قبل تاثیر اس فن سے بالکل نابلد تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگرچہ چغتائی نے اصول کی حد تک تو اپنے بزرگ میاں میراں بخش اور میو اسکول کے اساتذہ سے ضرور استفادہ کیا تھا، لیکن اس کے بعد اس میدان میں انھوں نے جو فتوحات حاصل کیں اور دنیائے تصویر و فن کے خزانے میں جو بے بہا اضافہ کیا، وہ سرتاسر ان کا اپنا کارنامہ اور ان کے زورِ بازو کا ثمرہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک میں عالمی شاہکاروں کا قریبی اور غائر مطالعہ اور معاصر مصوّروں اور فنکاروں اور نقّادوں سے بالمشافہہ تبادلۂ خیال نہیں کرتا' میرے فن میں وسعت اور عالمگیریت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۶ء میں دو مرتبہ یورپ کا سفر کیا۔ پہلے سفر میں ان کے چھوٹے بھائی محمد عبد اللہ چغتائی بھی ان کے ساتھ گئے تھے۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال بھی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے۔ اقبال نے اپنے مشوروں سے مستفید کیا اور مختلف اکابر سے ان کی ملاقات میں بھی راہنمائی کی۔

ان سفروں میں انھوں نے یورپ کے تمام بڑے بڑے شہروں اور وہاں کے عجائب گھروں اور تصویر خانوں کی سیر کی اور ان کے مہتموں سے ملے۔ نیز مختلف مقامات کے وہ حسین مناظر بغور دیکھے، جو اکثر مصوّر اپنی تخلیق کے لیے پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ انھیں سفروں میں وہ یورپ کے مشاہیرِ علم و فن اور مقتدر مصوّروں سے بھی ملے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان سفروں اور ملاقاتوں کا ان کے فن کی بالیدگی اور پختگی، اور شخصیت کی تشکیل اور نکھار میں کتنا ہاتھ رہا ہوگا۔

یورپ سے واپسی کے بعد اپنے فن میں تانبے کی پلیٹ پر لوہے کے قلم سے تصویر بنانے

(یعنی اچینگ Etching سے) کا اضافہ کیا ۔ اب تک ان کی توجہ زیادہ تر خطوط پر
مبذول رہی تھی ۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ محض خطوط کے پیچ و خم سے جیتی جاگتی
تصویر بنا دینے میں ان کا کوئی حریف نہیں اور اس کا راز ان کی ڈرائنگ میں غیر معمولی
قدرت میں پوشیدہ ہے ۔ یہی کام انھوں نے اچنگ سے لیا ۔ یاد رہے کہ ان سے قبل کسی
ہندستانی مصوّر نے فن کی اس شاخ کا ایسا بھرپور نمونہ پیش نہیں کیا تھا ، اس کا
سہرا بجا طور پر چغتائی کے سر ہے ۔

اب ان کا بجا طور پر ہندستان کے صفِ اوّل کے مصوروں اور فنکاروں میں شمار ہوتا
تھا ۔ ۱۹۳۴ء میں حکومتِ وقت نے ان کی خدمات کا اعتراف "خان بہادر" کے
خطاب سے کیا ۔ یہاں غالباً ایک بات کا ذکر بے محل نہیں ہوگا ۔ انگریزی عہد میں یہ خطاب
بالکل سیاسی نوعیت کے تھے اور بالعموم حکومت کے چہیتے جانثاروں اور جی حضوریوں
تک محدود (خان صاحب) ۔ البتہ ایک آدھ مرتبہ غیر سیاسی اور علمی و ادبی افراد کے
حصے میں بھی آ چکا تھا ۔ لیکن چغتائی کو یہ خطاب محض اپنی فنی اور ادبی خدمات کی وجہ
سے ملا تھا ۔ ان سے پہلے جن چند غیر سیاسی اشخاص کو اس طرح کا خطاب ملا تھا ،
ان میں علامہ اقبال اور رابندرناتھ ٹیگور کے نام نمایاں ہیں ۔

پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد ۱۹۶۰ء میں وہاں کی حکومت نے انھیں "ہلالِ امتیاز" کے
اعزاز سے نوازا ۔ ۱۹۶۴ء میں مغربی جرمنی کے سابق صدر ڈاکٹر ہنرک لیبکے پاکستان
کے دورے پر آئے تھے ۔ انھوں نے چغتائی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ۔ لہٰذا
اگلے دن جب موصوف علامہ اقبال کا مزار دیکھنے گئے ، تو ان کی خواہش کے مطابق
وہاں ان سے چغتائی کا تعارف کرایا گیا ۔ ڈاکٹر لیبکے ، چغتائی کے فن کے بڑے مدّاح
تھے ۔ چنانچہ انھوں نے خاص طور پر اپنے وزیر والٹر شیل (موجودہ صدر مغربی جرمنی)
کو چغتائی کے مسکن (راوی روڈ) پر ان کی خدمت میں سونے کا تمغہ پیش کرنے کو بھیجا ،
جو گویا مغربی جرمنی کی طرف سے ان کی فنی میدان میں خدمات کا اعتراف تھا ۔
ان کی چھ کتابیں فن اور تصویر کے موضوع پر شائع ہوئی ہیں ۔ سب سے پہلے ۱۹۲۸ء

ہیں مرقع چغتائی منصۂ شہود پر آئی جس میں غالب کے کلام کو تصویروں کے پیکر میں
پیش کیا گیا ہے۔ یہ گویا ان کی شہرت کا سنگِ بنیاد تھا۔ اس کا مقدمہ علامہ اقبال نے
لکھا تھا۔ اس میں ۲۴ رنگین اور دس سادہ تصویریں ہیں۔ اس کا ایک خاص ایڈیشن
شائع ہوا تھا، جس کی قیمت ۱۲۵ روپے فی نسخہ تھی اور ایک عام جو سترہ روپے
میں بکا تھا۔ دونوں میں کاغذ کے تفاوت کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں تھا۔ اس سلسلے
میں لطیفہ یہ ہے کہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہ اعلیٰ ایڈیشن جرمنی میں چھپا ہے، حالانکہ
یہ لاہور ہی میں چغتائی صاحب کے آبائی مکان "واقع کوچہ چابک سواران لاہور میں
خاص مشین سے طبع ہوا تھا۔ اس کی دیدہ زیب کتابت اور اعلیٰ معیارِ طباعت اور
تجلید سے سب لوگ دھوکا کھا گئے۔ اس کام میں ان کے سب سے چھوٹے بھائی عبدالرحیم
چغتائی ان کے دستِ راست اور ہر طرح مددومعاون رہے بلکہ سچ یہ ہے کہ عبدالرحیم
صاحب نے اپنی پوری زندگی بڑے بھائی کی خدمت میں وقف کر دی۔ عبدالرحمٰن
چغتائی کو اپنے تخلیقی کام کے سوا اور کسی کام سے کام نہیں تھا۔ اس کے بعد تصاویر
پر چوکھٹے لگوانا، انھیں نمائشوں میں بھیجنا اور واپس منگوانا، کتابوں کا شائع کرنا،
ان کی تقسیم اور نکاسی کی نگرانی۔ غرض سب کام عبدالرحیم صاحب کی نگرانی میں
ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر بار کے سب اخراجات بھی انھیں کے ہاتھوں سرانجام
ہوتے تھے۔

مرقع چغتائی کے سلسلے میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی
تو اس کی تمام اصلی تصاویر سر اکبر حیدری نے نظام پیلس (حیدرآباد، دکن) میں
لگانے کے لیے لے لی تھیں۔ لیکن جب شہزادی دُرِّدانہ (نظام عثمان علی خان مرحوم کی
بڑی بہو اور نواب اعظم جاہ ولی عہد کی بیگم) نے انھیں دیکھا تو فرمایا کہ تصاویر وہاں نہ بھیجی
جائیں، میں انھیں اپنے محل میں لگاؤں گی۔ خدا معلوم اب وہ کہاں ہیں؟

نقش چغتائی، ان کا دوسرا کارنامہ تھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس
میں غالب کے پورے اشعار کو مصوّر کیا گیا ہے۔ یہ بھی بڑے اہتمام سے نکلی۔ حجم کی

چکدار جلد ہے اور بڑھیا کاغذ، ہر صفحے کی جدول کی تزیین اور دو رنگی چھپائی۔ اس میں کل ۹ تصویریں ہیں، جن میں سے صرف ایک رنگین ہے، بقیہ سب سادہ، سپید و سیاہ ہیں۔

اسی نقش چغتائی کا دوسرا ایڈیشن (نقش ثانی) غالباً ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا (تاریخ درج نہیں) یہ پہلے ایڈیشن سے بہت مختلف ہے۔ تصویروں میں بھی تفاوت ہے اور ان کی تعداد میں بھی۔ اس میں چھ رنگین تصویریں ہیں اور سولہ سادہ، سپید و سیاہ۔ اسی دوسرے ایڈیشن کا ہو بہو چربہ تیسری مرتبہ ۱۹۶۵ء میں چھپا۔

اس کے بعد ان کی یہ کتابیں شائع ہوئیں:

۱۔ نقاشِ چغتائی: ۱۹۳۶ء
۲۔ مندی نقاش چغتائی: ۱۹۵۲ء (اس کا ایک مختصر ایڈیشن بہت پہلے دلی کی ایک فرم نے شائع کیا تھا۔)
۳۔ عملِ چغتائی: ۱۹۶۸ء
۴۔ تیمور کا گھرانا: ۱۹۷۲ء

عملِ چغتائی میں در اصل کلامِ اقبال کو مصوّر کیا ہے، جس طرح پہلی دو کتابیں مصوّر کلامِ غالب ہے۔ اقبال کو مصوّر کرنے کی خواہش خود علامہ اقبال نے مرقعِ چغتائی کی اشاعت کے بعد ظاہر کی تھی۔ چغتائی نے ۱۹۴۰ء میں اس پر کام شروع کیا تھا؛ اس کی تکمیل کہیں ۲۸ برس بعد ہوئی۔ یہ بڑے (۱۵" × ۱۲") سائز کے ۲۵۰ صفحات کی کتاب ہے؛ اس میں ۴۰ چار رنگی نقاشیر ہیں اور ۲۴ یک رنگی؛ شروع میں جسٹس سر عبد الرحمٰن کا دیباچہ ہے۔ کتاب بہت اہتمام سے شائع ہوئی ہے اور ہر لحاظ سے اقبال اور چغتائی دونوں کے شایانِ شان ہے۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس کی تیاری اور طباعت پر تین لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ ابتدا میں ۲۵۰ جلدوں کا ایک خاص ایڈیشن بھی شائع ہوا تھا، جس کی قیمت پندرہ سو روپیہ فی نسخہ تھی۔ اس کا اجرا سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ہاتھوں لاہور آرٹ کونسل میں ہوا تھا اور حکومت پاکستان نے اس

خدمت کے اعتراف میں چغتائی مرحوم کو دو لاکھ روپے کا انعام عطا کیا تھا۔
مندرجۂ ذیل کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں:

۱۔ **عمر خیام** (مصوّر): اس پر انھوں نے ۳۰۔۴۰ برس کام کیا تھا۔ کتاب مکمل ہو چکی تھی۔ اس میں لوئی ۶۰۔۷۰ تصویریں ہیں۔ تمام تصویروں کی کوجیں اور بلاک وغیرہ بن چکے تھے؛ اور وہ اسے شائع کرنے کا انتظام کر رہے تھے کہ موت کا بلاوا آ گیا۔ خدا معلوم اب اس کی اشاعت کا کیا انتظام ہوگا۔ چغتائی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب اس قرض کی ادائی ہے جو مغرب عمر خیام کی قدر و منزلت کر کے اور اس کے متعدد مصوّر ایڈیشن شائع کر کے ہم اہلِ مشرق سے وصول کرنے کا حقدار ہے۔

۲۔ **چغتائی آرٹ**: یہ کتاب تقسیم ملک سے قبل زیر طباعت تھی کہ فسادات کے باعث کام درمیان میں رہ گیا۔ اس کے بعد وہ عملِ چغتائی کی تکمیل میں لگ گئے اور اس پر توجہ نہ دے سکے۔ بہر حال اس کا پورا سامان موجود ہے۔

۳۔ **کارِ چغتائی**: یہ دراصل غالب کے سلسلے کی تیسری کتاب ہے یعنی مرقعِ چغتائی اور نقشِ چغتائی کے بعد انھوں نے غالب کے جن مزید اشعار کو مصوّر کیا تھا، یہ ان کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۳۰۔۴۰ نئی تصویریں ہیں۔ یہ کتاب بھی تقسیم ملک کے وقت زیرِ طبع تھی۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر ایک تصویر کے ساتھ اردو میں کچھ اشارے لکھے ہیں۔ "عملِ چغتائی" میں بھی ہر ایک تصویر کے ساتھ تقریباً دو دو صفحے کے اشارات ہیں یہ سب مرحوم کے اپنے لکھے ہوئے ہیں۔

۴۔ **ماڈرن آرٹ میں چغتائی کا حصہ** (انگریزی)
۵۔ **چغتائی اور اس کے نقاد** (")
۶۔ **نغمۂ لذت** (")
۷۔ **چغتائی کی عریاں تصویریں** (")

وہ اردو میں افسانے بھی لکھتے تھے اور فنی موضوعات پر مضامین بھی۔ ۱۹۴۷ء میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے (کاجل اور لگان) شائع ہوئے تھے۔ اپنی وفات سے پہلے

ب اور مجموعہ "ستادن" کے عنوان سے مرتّب کیا تھا۔ اس میں تین طویل افسانے ہیں:
۱) ستادن ؛ (۲) بانجن ؛ (۳) لندن سے ایک خط۔ ستادن میں دوسری جنگِ عظیم
لے اس زمانے کی داستان ہے، جب حسنِ اتّفاق سے اُردو کے بعض مشہور ادیب (تاثیر،
یدملک، پطرس بخاری وغیرہ) دِلّی میں جمع ہو گئے تھے۔ بانجن کشمیر سے متعلق ہے۔ ۱۹۲۹ء
موسمِ گرما میں وہ کشمیر گئے تھے۔ اس افسانے میں اسی زمانے کے تاثرات قلمبند کیے ہیں تیسرا
فسانہ ظاہر ہے کہ سفرِ لندن کی یادگار ہے۔ سنا ہے کہ ان کے غیر مطبوعہ افسانوں کی بھی
خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔

انھوں نے اپنے شوق سے مختلف ممالک کے مشہور مصوّروں کی تخلیقات کا اچھا ذخیرہ جمع کیا تھا۔ آرٹ سے متعلق مطبوعہ کتابیں بھی بہت تھیں۔ کیا اچھا ہو کہ ایک "چغتائی عجائب گھر" قائم کر دیا جائے، جس میں ان کی سب چیزیں محفوظ کر دی جائیں۔ وہ خود بھی یہی چاہتے تھے ؛ اس طرح ان کی وصیّت بھی پوری ہو جائیگی۔

وہ شخصی زندگی میں بہت سادہ تھے۔ دن رات اپنے فن کی دھن میں رہتے، گھر سے بھی بہت کم نکلتے تھے۔ کسی قسم کی علّت نہیں تھی ؛ نہ سگرٹ پیتے تھے، نہ شراب حالانکہ ان کے بیشتر دوست اور ملنے والے سگرٹ پیتے تھے اور ان میں سے کئی فنکار قسم کے حضرات تو شراب کے بھی رسیا تھے۔ چغتائی صاحب تاش کے پتّوں تک کو نہیں پہچانتے تھے۔ مصوّری کے علاوہ ان کا دوسرا سب سے بڑا شوق پتنگ بازی تھا۔ اپنے پتنگ خود ہی بناتے تھے۔ ان کی ساخت اور شکل و صورت میں طرح طرح کی اختراعات کی تھیں۔ جوانی میں کھیل کود کا شوق بھی رہا تھا، بلکہ شروع میں تو اسی لت کے مارے جلد سے تعلیم کا سلسلہ ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کرکٹ، بندوق کا نشانہ، مچھلی کا شکار ان کے دل پسند مشغلے تھے۔ کرکٹ میں گیند اتنی تیز اور زور سے پھینکتے تھے کہ وکٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی تھی۔ پیراک بھی اچھے تھے۔

بروز جمعہ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو اپنے خالق کے حضور حاضر ہو گئے۔ جنازہ اگلے دن اٹھا اور انھیں امانتاً اپنے بزرگوں کے نزدیک لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں

سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کے اعزّہ چاہتے ہیں کہ انھیں ایک خاص مقبرے میں دفن کیا جا' اسی لیے جب تک اس کے انتظامات مکمل نہ ہو جائیں، فی الحال انھیں میانی صاحب میں امانتاً دفنایا گیا ہے۔ بلکہ خود ان کی خواہش تو یہ تھی کہ چغتائی عجائب گھر ہی میں اُن کا مدفن بھی بنے۔ انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی (وزیر النسا بیگم) اپنے خاندان ہی سے تھیں۔ ان کے والد کا نام میاں محمد بخش چغتائی تھا۔ اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی؛ ان کا ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو انتقال ہو گیا۔ دوسرا نکاح انھوں نے ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں کیا تھا۔ یہ بیگم (کشور بانو) امرتسر کے ایک کشمیری خاندان سے ہیں۔ ان کے بطن سے دو بچے ہوے۔ بڑی بیٹی (مسرت) نے فلاسفی میں ایم اے کیا اور پنجاب بھر میں اوّل رہیں۔ وہ شادی شدہ اور اپنے گھر بار والی ہیں۔ ان سے چھوٹا ایک بیٹا عارف الرحمٰن چغتائی ہے۔ عارف میاں نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ایم اے تک تعلیم پائی ہے۔ وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتے ہیں اور ان کے دو مختصر مجموعے شائع بھی کر چکے ہیں۔

دیوان سنگھ مفتون، سردار

پنجاب (پاکستان) کے ضلع گوجرانوالہ میں ایک خاصا بڑا قصبہ حافظ آباد ہے۔ یہ تحصیل کا صدر مقام بھی ہے۔ تقسیمِ ملک (۱۹۴۷ء) تک کھتری قوم کی کھنہ برادری کا یہاں کے عائد میں شمار ہوتا تھا۔ اسی برادری کے ایک سکھ گھرانے میں ڈاکٹر ندھان سنگھ تھے۔ وہ سرکاری ملازمت میں تھے اور ڈاکٹر کی حیثیت سے پنجاب کے مختلف مقامات میانوالی جہلم وغیرہ میں تعینات رہے تھے۔ جب وہ جہلم کے سرکاری اسپتال کے انچارج تھے، تو ۱۴ اگست ۱۹۰۸ء کو ان کے گھر دوسرا لڑکا اور (چوتھا بچہ) پیدا ہوا۔ اس سے پہلے ان کی اولاد میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا کرتار سنگھ موجود تھے۔ اس نومولود کا نام انھوں نے دیوان سنگھ رکھا۔ یہی بچہ آگے چل کر سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ریاست ہوا اور اس نے تاریخِ صحافتِ اُردو میں لافانی مقام حاصل کیا۔

یوان سنگھ صرف ۱۴ دن کے تھے کہ ان کے والد ڈاکٹر ندھان سنگھ کا جہلم ہی میں انتقال
ہو گیا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ ڈاکٹر ندھان سنگھ نے اپنی
طویل ملازمت کے دوران میں بہت کچھ کمایا اور پس انداز کیا تھا۔ اس کے علاوہ غیر
منقولہ جائداد بھی کم نہیں تھی۔ اگر حالات معمول کے موافق رہتے تو ان کے پس ماندگان
کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے تھی۔ لیکن ہندو سماج میں (اور وہ بھی آج سے
۸۰ سال قبل کے سماج میں) بیوہ کی حالت بہت زدہ تھی۔ رشتے دار اور عزیز قریب
اس غریب کے اور اس کے یتیم بے سہارا بچوں کے سر پر ہاتھ رکھنا اور ان کی حمایت
کرنا تو درکنار، اس تاک میں رہتے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، اسے بھی ہتیا لیں۔ ڈاکٹر
ندھان سنگھ کی وفات کے وقت بڑی لڑکی ۱۸ برس کی تھیں، کرتار سنگھ دس برس کے
تھے۔ اور ان سے چھوٹی (دوسری) لڑکی پانچ برس کی تھی۔ اور دیوان سنگھ تو جیسا کہ
اوپر ذکر ہوا، صرف ۱۴ دن ہی کے تھے۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی
بیوہ بالکل بے یار و مددگار رہ گئی تھیں۔ اراضی اور مکانات پر مرحوم کے ایک بھائی
نے قبضہ کر لیا اور ان بچوں کے جوان ہونے پر بھی یہ جائداد واپس دینے سے انکار کر دیا۔ گھر
میں کچھ اندوختہ تھا، وہ آہستہ آہستہ بچوں کی پرورش اور دو لڑکیوں اور بڑے بیٹے
کی شادی کے مصارف میں ختم ہو گیا۔ جب نقد اور زیورات ٹھکانے لگ گئے۔ تو
اثاث البیت فروخت ہونے لگا۔ قصہ کوتاہ، دیوان سنگھ کی عمر دس بارہ برس کی
ہو گی، کہ گھر میں افلاس اور ادبار نے ڈیرا ڈال دیا تھا۔

ان حالات میں بالعموم سب سے چھوٹا بچہ سب سے زیادہ گھاٹے میں رہتا ہے؛ اس کی
تعلیم و تربیت نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ دیوان سنگھ ششم ہشتم یا پانچویں تک
تو پڑھ سکے۔ اس کے بعد ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گھر میں روزمرہ کے اخراجات
تک پورا کرنے کے لالے پڑے ہوئے تھے، ان کی فیس اور کتابوں وغیرہ کے لیے
کہاں سے آتا! چنانچہ یہ خالصہ ہائی اسکول، گوجرانوالہ سے جہاں انھوں نے داخلہ
لیا تھا، تین چار دن بعد گھر واپس آ گئے۔

ان صاحب نے لکھا کہ اس میں شک نہیں، کہ تمھارے قلم میں غیر معمولی زور ہے اور کامیاب صحافی بننے کی صلاحیت بھی، تجربہ کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ اس رائے نے دیوانہ را ہوئے بس است، کا کام کیا۔ انھوں نے بھائی مول سنگھ کو لکھا کہ میں ۶۰ روپے ماہانہ پر خالصہ اخبار کی ادارت قبول کرتا ہوں۔ اور مالسہ میں اپنا جما جمایا چلتا کاروبار چھوڑ کر لاہور پہنچ گئے۔

وہ اس اخبار میں مشکل سے چار مہینے رہے ہوں گے۔ بےشک، ان کے زوردار اداریوں سے پرچہ بہت مقبول ہوگیا۔ لیکن ان کی تحریریں حکومت کی نظر میں خلاف قانون ٹھہریں۔ اور پرچے کے مالک اور طابع اور ناشر پر متعدد مقدمے قائم ہو گئے۔ ایک معاصر (شیر پنجاب) کے ایڈیٹر سردار امر سنگھ (ف جولائی ۱۹۴۸ء) نے بھی ازالۂ حیثیت عرفی اور ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ کونسا اخبار اتنے "لائق" مدیر کا خرچ برداشت کر سکتا ہے! ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔ قدرتاً دیوان سنگھ ملازمت سے برخاست ہو گئے۔

اب یہ بیکار تھے، لیکن مایوس نہیں۔ چندے ادھر اُدھر کچھ اخباروں میں کام کیا، تاہم حالات تسلی بخش نہیں تھے۔ بہرحال انھوں نے محسوس کر لیا کہ اب صحافت ترک کر کے کوئی اور پیشہ اختیار کرنا ممکن نہیں۔ اور صحافت میں ان کی تعلیم و تربیت بمنزلۂ صفر کے تھی۔ فیصلہ کیا کہ اگر صحافت ہی کو بقیۂ عمر کے لیے ذریعۂ معاش بنانا ہے، تو لازم ہے کہ اسے کسی کامل استاد سے سیکھا جائے۔ مشہور صحافی رام پرچپال سنگھ شیدا (ایڈیٹر ہندستان) ان دنوں لاہور میں رہتے تھے اور دیوان سنگھ مفتون کے ان سے مراسم تھے۔ انھوں نے شیدا صاحب سے پوچھا کہ اردو صحافت میں سب سے لائق اور تجربہ کار کون صاحب ہیں؟ شیدا نے سید بشارت علی جالب دہلوی (ف جولائی ۱۹۳۰ء) کا نام لیا، جو اس زمانے میں روزنامہ ہمدم، لکھنؤ کے مدیر تھے۔ اس پر دیوان سنگھ نے جالب صاحب کو لکھا کہ میں آپ سے صحافت سیکھنا چاہتا ہوں، اگر آپ اجازت دیں اور میرے لکھنؤ میں بسر اوقات کے لیے کچھ مقرر فرما دیں، تو میں حاضر خدمت ہو جاؤں

جالب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یاد دہانی کرائی، تو اب کے بھی صدائے برنخاست۔ دیوان سنگھ بھلا یوں کہاں ٹلنے والی اسامی تھے۔ انھوں نے ریل کا ٹکٹ خریدا اور لکھنؤ پہنچ گئے۔ ساتھ کا مختصر سامان ایک گوردوارے میں رکھا اور ہمدم کے دفتر جا دھمکے۔ جالب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فرمایا کہ چونکہ ہمارے دفتر میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی، اس لیے میں کوئی جواب نہیں دے سکا۔ دیوان سنگھ نے کہا کہ اگر صرف ۲۰ روپے ماہانہ کا انتظام ہو جائے، تو میں یہاں رہ کر آپ سے کچھ حاصل کر لوں۔ جالب نے پھر نفی میں جواب دیا اور کہا کہ کوئی خالی جگہ ہے ہی نہیں، تنخواہ کا کیا سوال ہے! اب دیوان سنگھ نے کہا کہ میں چپراسی کے طور پر بھی رہنے کو تیار ہوں، کیونکہ میرا مقصود تو آپ کے دفتر میں، آپ کے نزدیک رہنا ہے، تاکہ آپ سے کچھ حاصل کر سکوں۔ اس پر بھی جالب نے وہی جواب دیا کہ چپراسی کی جگہ بھی خالی نہیں ہے۔ اس پر اس مرد قلندر نے کہا کہ اچھا فرمائیے کہ کیا آپ کو میرے بغیر تنخواہ لیے مفت کام کرنے پر بھی کوئی اعتراض ہے؟ جالب نے کہا کہ بھلا کسی کے مفت کام کرنے پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے! اس پر انھوں نے شہر میں ایک کیمسٹ کی دکان پر پندرہ روپے ماہانہ کی نوکری ڈھونڈھ لی۔ دن بھر ہمدم کے دفتر میں مفت کام کرتے۔ چھ بجے شام سے آدھی رات تک اس کیمسٹ کے ہاں رہتے اور جب وہاں سے چھٹی ملتی، تو گوردوارے آ کر پڑ رہتے۔ وہ لکھنؤ میں غالباً چھ مہینے رہے۔ اور شاید اور رہتے، لیکن سخت بیمار پڑ گئے اور جب علاج معالجے سے اچھے ہو گئے، تو لاہور واپس چلے آئے، اور رشید صاحب کے اخبار "ہندستان" میں نوکری کر لی۔

اس واقعے سے دیوان سنگھ کے کردار اور ان کی کامیابی کا راز کھلتا ہے۔ اگر ان کے سامنے کوئی مقصد ہوتا، تو وہ اس کے حصول کی خاطر راہ کی مشکلات سے گھبرا کر کبھی اس سے دست بردار نہیں ہو جاتے تھے۔ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام سے بھی جی نہیں چراتے تھے۔ ان کی تمام کامیابیوں کا راز انھیں دو باتوں میں پنہاں ہے: مشکل سے نہ گھبرانا اور محنت سے جی نہ چرانا۔

"یہ ہندستان" میں کام کرتے تھے کہ ان سے مشہور سکھ لیڈر ماسٹر موتا سنگھ نے کہا کہ مہاراجا پٹیالہ کے آدمی بھسوڑ (ریاست پٹیالہ) کے قومی کارکن بابو تیجا سنگھ کو بہت تنگ کر رہے ہیں کیونکہ بابو صاحب نے مہاراجا کی بعض ناجائز خواہشیں پوری کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر دیوان سنگھ بھسوڑ پہنچے، ماسٹر موتا سنگھ اور بابو تیجا سنگھ سے ملے، سارے حالات سنے۔ مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر طے پایا کہ مہاراجا بہادر کی کارگزاریوں کا بھانڈا پھوڑا جائے، اخباروں میں مضمون لکھے جائیں اور دیوان سنگھ حالات بےنقاب کرنے کے لیے اردو میں ایک پمفلٹ بھی لکھ کر شائع کریں۔

قرارداد کے مطابق دیوان سنگھ نے پمفلٹ بعنوان "خون شہادت کا تازہ قطرہ" لکھا اور چھپوا دیا۔ وہ اس کے ۲۰۰ نسخے جلدی سے تیار کروا کے دفتری کے ہاں سے اٹھا لائے اور انھیں دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ شدہ شدہ اس کی خبر مہاراجا کے آدمیوں کو بھی ہو گئی۔ انھوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا، جس پر حکومت نے پمفلٹ بحق سرکار ضبط کر لیا اور پولیس نے دفتری کے ہاں سے بقیہ ۱۸۰۰ نسخے اپنے قبضے میں لے لیے۔ جب دیوان سنگھ کو حالات کی خبر ملی، تو انھیں افسوس ہوا کہ کی کرائی محنت ضائع گئی۔ لیکن انھوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ بھسوڑ پہنچ کر پھر ماسٹر تارا سنگھ اور بابو تیجا سنگھ سے مشورہ کیا۔ دونوں نے کہا کہ کچھ ہو، پمفلٹ دوبارہ شائع ہونا چاہیے۔ اس پر یہ دلی آئے، یہاں اس کی کتابت کرائی اور ایک دن میں اسے طبع کرا کے دو ہزار نسخے لے کر واپس روانہ ہو گئے۔ رستے میں لدھیانہ، جالندھر، امرتسر کے ڈاک خانے سے مختلف دوستوں کو اس کے پمفلٹ بھیجتے ہوئے لاہور پہنچے اور بقیہ نسخے وہاں سے بھیج دیے۔

پولیس نے تفتیش کی تو انھیں معلوم ہو گیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ غرض یہ دو ہفتے بعد گرفتار کر لیے گئے۔ اب ایک لطیفہ ہوا۔ جس دن پولیس نے انھیں پکڑا،

اتفاق سے اس دن اتوار تھا۔ تھانے والوں نے انھیں ہتکڑی لگا کر انگریز ڈپٹی کمشنر کے
بنگلے پر بھیجا کہ ان سے ریمانڈ پر دستخط کرائے جائیں۔ مقدمہ تحقیقات مکمل ہونے پر بعد کو دائر
رہیگا۔ ان کی خوش قسمتی کہ جب تھانیدار انھیں ہتکڑی لگائے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے
پہنچا تو صاحب بہادر نشے میں چُور تھے۔ تھانیدار نے ان سے کو الف بیان کر کے
ریمانڈ پر دستخط کرنے کی درخواست کی، تو خدا معلوم، وہ پوری بات سمجھے بھی یا نہیں،
انھوں نے دیوان سنگھ سے پوچھا: ویل، تم کل ہماری عدالت میں حاضر ہوگا؟ دیوان
نے کہا: اگر آپ کہتے ہیں، تو میں ضرور آؤنگا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے تھانیدار کو حکم د
کہ ملزم کی ہتکڑی کھول دو اور اسے رہا کر دو۔ یہ کل عدالت میں حاضر ہو جائیگا۔ وہ
یہ کہ کر واپس بنگلے میں چلے گئے، ادھر تھانیدار غریب حیران، پریشان کہ ڈیفنس
آف انڈیا کا مقدمہ، دو ہفتے کی دن رات کی تگ و دو کے بعد ملزم گرفتار ہوا، اور صا
نے یوں اس کی رہائی کا حکم دے دیا! لیکن حکم حاکم، مرگ مفاجات، کرتا تو کیا کرتا؛
نے انھیں رہا کر دیا۔

اگلے دن پیر تھا، یہ حسب قرارداد عدالت میں حاضر ہو گئے۔ اب صاحب کا نشہ اُتر
تھا اور وہ اپنی پہلے دن کی کارگزاری پر کچھ متعجب اور پریشان بھی تھا۔ لیکن جو تیر کم
سے نکل چکا تھا، وہ اب واپس کیونکر آ سکتا تھا! اس نے دیوان سنگھ سے کہا کہ اگر تم م
چاہو، اور وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی ایسا پمفلٹ نہیں لکھو گے، تو ہم تم کو چھوڑ دیتا ہے
انھوں نے جوانی کی ترنگ میں جواب دیا کہ میں نہ معذرت کرتا ہوں، نہ کوئی وعدہ؛ اگر
مقدمہ چلانا ہے، تو خوشی سے چلائیے۔ صاحب اس پر کھسیانے ہوئے۔ چپراسی کو حکم
دیا کہ اس لڑکے کو عدالت سے نکال دو۔ یہ نہیں جانتا، مقدمہ کیا ہوتا ہے۔ دہاں
دیر تھی! چپراسی نے انھیں گردن پکڑ کر باہر ڈھکیل دیا۔ جان بچی، لاکھوں پائے۔ صا
نے مسل پر لکھ دیا: ملزم ناتجربہ کار نوجوان چھوکرا ہے، اسے تنبیہہ کر دی گئی ہے۔ مسل
داخل دفتر کر دی جائے
یہ ان کی زندگی کی پہلی تصنیف تھی؛ اور پہلی گرفتاری بھی

اب یہ پھر بیکار تھے ۔ لسبا اوقات کے لیے چندے لاہور کے مختلف پرچوں (گورو گھنٹال، سندر، اکالی وغیرہ) میں جز وقتی کام کرتے رہے ۔ لیکن کب تک ؟ آخر ۱۹۲۰ء میں دلی پہنچے ۔ ان دنوں یہاں اخباری دنیا میں خواجہ حسن نظامی مرحوم (ف جولائی ۱۹۵۵ء) کا سکہ چلتا تھا ۔ انھیں نئے نئے اخبار جاری کرنے کی گویا دھن تھی ۔ دیوان سنگھ ان سے ملے اور طے پایا کہ ایک روزنامہ "رعیت" کے نام سے جاری کیا جائے ۔ اس میں دیوان سنگھ نے ۵۰ روپے لگائے ، بقیہ سرمایہ خواجہ صاحب مرحوم کا تھا ۔ شرط یہ تھی کہ دیوان سنگھ صرف تیس روپے ماہانہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے لیں گے ، روزانہ خواجہ صاحب کی کتابوں کا ایک صفحے کا اشتہار اخبار میں مفت شائع ہوگا ۔ اگر اخبار میں منافع ہوا ، تو دونوں شریک برابر کے حصے دار ، اگر نقصان ہوا ، تو اسے خواجہ صاحب پورا کریں گے ۔ لیکن پوری کوشش کے باوجود اخبار گھاٹے میں رہا ۔ چند مہینے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ بھائی اب زیادہ نقصان برداشت نہیں کیا جاسکتا ، ہمیں اخبار بند کردینا چاہیے ۔ قدرتاً دیوان سنگھ کو اس فیصلے سے بہت افسوس ہوا ، ابتدائی ڈھائی سو تو ڈوبے ہی تھے ۔ اب پھر مستقبل کا سوال سامنے آگیا ۔

خواجہ صاحب موصوف کے عزیزوں میں ملا واحدی بہت مشہور شخصیت تھی ۔ یہاں دلی میں ان کی بڑی ساکھ تھی ، وہ میونسپل کمیٹی کے رکن بھی تھے ۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں اور اس کبر سنی کے باوجود اب تک کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں ۔ سلمہ اللہ تعالیٰ ! وہ اس زمانے میں ماہنامہ نظام المشائخ نکالتے تھے ۔ انھوں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ "رعیت" مجھے دے دیجیے ، میں اسے چلاؤں گا ۔ غرض ، رعیت کا دفتر واحدی صاحب کے مکان کوچہ چیلان میں اٹھ گیا ۔ بھوپال سے نیاز فتحپوری اس کی ادارت کے لیے بلائے گئے ۔ حکومت کو اخبار کی پالیسی پسند نہ آئی ، وہ اس کی متواتر نکتہ چینیوں سے چیں بجبیں تھی کہ اتنے میں نیاز کے مصر سے متعلق ، مواد اداریے گویا اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوئے ۔ حکومت نے ملا واحدی سے ضمانت طلب کرلی اور مطبع ضبط کرلیا ۔ پرچے نے دم توڑ دیا ۔ سچ یہ ہے کہ آج تک بھی یہ ملا واحدی کی ضد سے چل رہا تھا ، ورنہ اس میں منافع کی صورت تو کبھی ایک دن بھی پیدا نہیں ہوئی تھی

اب یہ پھر بیکار ہو گئے، اور حسب معمول جیب بالکل خالی! دعیت‌اباد میں کام کرنے کے زمانے میں ان سے دیوبند کے ایک تاجر لالہ اوگرسین کی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ دیوان سنگھ کی محنت کی عادت اور فرض شناسی سے بہت متاثر تھے۔ لالہ جی نے انھیں پیشکش کی کہ آیئے، بمبئی چل کر آڑھت کا کاروبار کریں۔ مرتا کیا نہ کرتا، اس پر دیوان سنگھ نے ۱۵۰ روپے مشاہرے پر ان کی ملازمت قبول کر لی اور بمبئی چلے گئے۔ لیکن تجارت ان کے بس کی بات نہیں تھی، نہ کوئی اس کا تجربہ ہی تھا۔ مشکل سے انھوں نے چار مہینے سیٹھ صاحب کے ساتھ کاٹے اور بھاگ نکلے۔ اس کے بعد مہاراجا رپودمن سنگھ والیٔ نابھہ کے جن سے سردار سردول سنگھ کویشر کے ذریعے پہلے تعارف ہو چکا تھا، ملازم ہو کر نابھہ چلے گئے۔ وہ نابھہ میں کوئی ڈھائی تین سال رہے۔ یہاں وہ دو سو روپے ماہانہ پاتے تھے۔

مہاراجا رپودمن سنگھ اپنی قوم پرستی اور انگریز دشمنی کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے حکومت ہند کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ ان کے خلاف ہو گیا اور حکومت انھیں گدی سے اُتارنے کے لیے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ بالآخر حکومت نے ۱۹۲۳ء میں مہاراجا کو اختیارات سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا، جس کے بعد وہ ڈیرہ دون میں مقیم ہو گئے۔ لیکن حکومت ان کی سرگرمیوں سے مطمئن نہیں تھی۔ مہاراجا نے بھی کچھ بے احتیاطی سے کام لیا۔ آخرکار ۱۹۲۸ء میں انھیں الٰہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر کے کتال میں نظربند کر دیا گیا۔ وہیں ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔

جب مہاراجا نابھہ کو گدی سے اُتارا گیا، تو دیوان سنگھ نے بھی وہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کی کہ اب وہاں ان کا کون تھا جس کے بھروسے پر یہ رہ سکتے تھے! انھوں نے انگریز منتظم اعلیٰ (ایڈمنسٹریٹر) مسٹر اوگلوی کی خدمت میں اپنا استعفا پیش کر دیا۔ اوگلوی نے اول تو ان سے استعفا واپس لینے کو کہا اور ملازمت جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ان کے اصرار کرنے پر اتنی رعایت کی کہ اچھا پندرہ دن تک میں اسے منظور نہیں کرتا؛ یہ وقفہ آپ کی رخصت میں محسوب کر لیا جائیگا۔ اس دوران میں غور کر لیجیے

اگر اس کے بعد بھی آپ اس فیصلے پر مصر رہے، تو استعفیٰ منظور کر لیا جائیگا لیکن ہوا اس کے بالعکس یہ نابھہ سے فوراً مہاراجا سے ملاقات کے لیے ڈیرہ دون پہنچے، وہاں مہاراجا نے انھیں ایک نجی خط دے کر حیدرآباد بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ حکومت ہند کی خفیہ پولیس ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہی تھی۔ اور انھیں معلوم تھا کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں، چنانچہ جب وہ حیدرآباد سے واپس نابھہ پہنچے کہ اپنا سامان وغیرہ لے کر اس شہر کو خیرباد کہہ دیں، تو پولیس نے انھیں گرفتار کر کے نظربند کر دیا۔ قصور یا الزام کچھ نہیں بتایا، بس نظربند کر دیا۔

ان کے دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ خود مہاراجا نے مجلس واضع قوانین کے اراکین دوستوں کو لکھا۔ خدا خدا کر کے معاملہ لارڈ ریڈنگ والیسرائے ہند کے سامنے پیش ہوا اور انھوں نے ان کی رہائی کا حکم صادر فرمادیا۔ وہ تین مہینے نظربند رہے تھے۔

نابھہ کی ملازمت کے دوران میں انھوں نے وہاں ظلم و ستم کے کئی واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ قرب و جوار کی دوسری ریاستوں کے حالات بھی کچھ بہتر نہیں تھے، وہاں کی بدعنوانیوں کی کہانیاں بھی آنے والے سناتے رہتے تھے۔ دیوان سنگھ جب یہ باتیں سنتے، تو ان کا خون کھولتا اور چاہتے کہ کسی طرح ان مظلوموں کی روداد حکومت ہند اور عوام تک پہنچائی جائے، تاکہ ان کی دادرسی ہو سکے۔ اسی زمانے میں انھوں نے دیر سویر ایک اخبار جاری کرنے کا عزم کر لیا جس کے ذریعے سے والیانِ ریاست کے مظالم طشت از بام کیے جائیں اور ان کی مصیبت زدہ رعایا کی دردناک کہانی ملک و قوم کو سنائی جائے۔

جب یہ نابھہ کی نظربندی سے چھوٹے، تو سیدھے دلّی پہنچے۔ اب انھوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا اقدام کیا۔ دوستوں سے مشورہ ہوا کسی نے حوصلہ افزائی کی، کسی نے اس خارزار سے دامن بچانے کی صلاح دی۔ روپے کا سوال الگ تھا۔ وہ ہمیشہ فضول خرچ رہے۔ نابھہ کی پوری ملازمت کے دوران میں کچھ پس انداز تو کیا نہیں تھا کہ اب اخبار شروع کرتے وقت کام آتا۔ کافی سوچ بچار کے بعد

فیصلہ ہوا کہ ایک ہفتہ وار جاری کیا جائے اور موضوع کی مناسبت سے اس کا نام "ریاست" ہو۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ ایک بنیے سے قرض لیا اور دیوں ۱۹۲۴ء میں اس کا آغاز ہوا۔

"ریاست" کا اجرا کئی پہلوؤں سے عہد آفریں تھا۔ یہ پہلا پرچہ ہے جس میں خاص طور پر دیسی ریاستوں کے حالات اور معاملات پر بے خوفی اور صراحت سے تنقید کی گئی۔ اس سے پہلے اگر کوئی ریاستوں کے بارے میں کچھ لکھتا بھی تھا، تو صرف والی ریاست کی مدح میں قصیدہ، تاکہ اس سے کوئی فتوح حاصل ہو سکے؛ لکھنے والے کو ریاست کی رعایا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ پھر یہ پرچہ جس آب و تاب سے چھپنا شروع ہوا، وہ بھی اردو صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے صرف مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (ف فروری ۱۹۵۸ء) کا الہلال اس شان سے نکلا تھا، لیکن وہ خوش درخشید، ولے دولت مستعجل بود کا مصداق ثابت ہوا اور صرف چار برس زندہ رہ کر بند ہو گیا۔ ریاست کے سلسلے میں اس کے مدیر اعلیٰ (دیوان سنگھ) کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ چونکہ اس پرچے میں مختلف ریاستوں کی بے زبان اور مظلوم رعایا کی حمایت میں، وہاں کے حکمرانوں کے کرتوتوں کا کچا چٹھا چھپتا تھا، اس لیے تمام والیان ریاست نے گویا دیوان سنگھ کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا۔ کئی مقدمے دائر ہوئے، جن میں فریقین کون تھے: ایک طرف راجا مہاراجا یا نواب کی بے پایاں دولت اور اثر و رسوخ اور دوسری طرف ایک ہفتہ وار اخبار کا یکہ و تنہا ایڈیٹر اور اس کے محدود وسائل۔ لیکن آفریں ہے دیوان سنگھ کو کہ انھوں نے جو قدم پہلے دن اٹھایا تھا، اس سے ذرہ برابر پسپائی قبول نہیں کی اور میدان میں ڈٹے رہے۔ ان پر بعض اوقات مختلف ریاستوں کی طرف سے بیک وقت چار چار مقدمے چلائے گئے، ایک شمال میں، دوسرا جنوب میں، تیسرا مغرب میں، چوتھا یہاں دلی میں۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس سے کتنی جسمانی تکلیف اور ذہنی کوفت ہوئی ہوگی، پھر مالی زیر باری اپنی جگہ۔ ان پر اپنی عمر میں بندرہ مقدمے چلے۔

ان میں سب سے مشہور نواب صاحب بھوپال کا مقدمہ ہے، جو ہوشنگ آباد میں چھ برس تک جاری رہا اور جس میں آخر کار دیوان سنگھ کو تین مہینے قید کی سزا ہوئی۔ مرحوم کہتے تھے کہ اس میں پورا اسی ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اس کے باوجود کبھی نہیں ہوا کہ ان مادی اور معنوی تکالیف سے پریشان ہو کر ناانصافی یا ظلم و ستم سے سمجھوتا کر لینے کا خیال بھی ان کے دماغ میں آیا ہو۔

ریاست کی ایک اور خدمت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

ہماری سیاسی جنگ کا اصلی محاذ تو انگریزی حکومت کے خلاف تھا جس نے ہماری آزادی سلب کر کے پوری قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ لیکن ایک ذیلی محاذ اور بھی تھا اور اس پر بہت کم توجہ ہوئی تھی۔ ہندوستان میں کوئی ۶۰۰ دیسی ریاستیں تھیں۔ ان کے حکمران مطلق العنان تھے، ان کا فرمودہ ریاست کا قانون تھا جس کے خلاف کوئی داد تھی نہ فریاد۔ ان ریاستوں کی ہستی اور بقا انگریز کے رحم و کرم پر تھی۔ اس لیے یہ والیان ریاست ہمیشہ انگریز کی حمایت کرتے اور جب بس چلتا، رہنمایان قوم اور سیاسی لیڈروں کے خلاف اقدام کرتے رہتے، تاکہ اس طرح ولی نعمت انگریزی حکومت کی نظروں میں اپنی خیر خواہی اور فرمانبرداری کا نقش اور گہرا کر سکیں۔ غرض کہ یہ ریاستیں ہماری آزادی کے حصول میں ہمیشہ سدِ راہ ثابت ہوئیں۔ "ریاست" نے انھیں بے نقاب کر کے بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔ اس سے جہاں ریاستوں کی رعایا میں بیداری اور اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا، وہیں اس سے انگریز کا وقار بھی ملیامیٹ ہو گیا۔ جو ان ناکارہ اور ننگِ ملت و قوم راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کا پشت پناہ اور حامی تھا۔

ریاست ۱۹۶۰ء تک جاری رہا۔ ملک آزاد ہوا، تو ریاستوں کی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ جلد ہی نہ ریاستیں رہیں، نہ ان کے حکمران، نہ ریاستوں کے مسائل، اس لیے حقیقت میں اب اس پرچے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ انھوں نے ایک مقامی دوست کے ساتھ اس کے جاری رکھنے کے لیے کچھ معاملہ کیا تھا، لیکن وہ بھی دیرپا ثابت نہ ہوا۔

دیوان سنگھ جنم کے فضول خرچ تھے۔ لاکھوں کمائے اور خرچ کر دیے، کبھی کل کی فکر نہ کی۔ ان کے ہاتھ میں چھید تھا، بڑا سا چھید، روپیہ اس میں ٹکتا نہیں تھا، ایسے میں کچھ پس انداز کرنے یا آڑے وقت کے لیے بچا رکھنے کا امکان ہی کیا تھا۔ ساری عمر صحافت کا کاروبار کرنے سے وہ کسی اور گُن کے رہے بھی نہیں تھے۔ اس پر کبر سنی اور اعتدالِ قوا کا فقدان۔ واقعی پریشانی کا عالم تھا۔ بارے مولانا ابوالکلام آزاد کی وساطت سے حکومت ہند نے ڈھائی سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، اور پھر انھیں کے ایما پر حکومت پنجاب نے بھی غالباً پانسو ماہانہ دینا منظور کیے، اور اس طرح جان و تن کا رشتہ قائم رکھنے کا سامان ہو گیا۔

ریاست بند کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں وہ دلی سے ہجرت کر کے راجپورہ (ڈیرہ دون) چلے گئے تھے۔ وہاں اکیلے رہتے تھے بیوی بچے یہاں دلی ہی میں رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو غسلخانے سے نکلتے ہوئے پاؤں رپٹ گیا اور گر گئے۔ سر میں چوٹ آئی، جس سے بہت خون خارج ہوا۔ علاج کے لیے وہاں اسپتال میں داخل ہو گئے تھے، لیکن دلی میں گھر والوں کو اطلاع ہوئی، تو جا کر انھیں یہاں لائے۔ لیکن وقت آخر آ لگا تھا، ساری دوا دوش کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ اتوار ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء آدھی رات سے کچھ پہلے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یوں وہ مرد میدان بھی جس نے ساری عمر لڑتے جھگڑتے اور مخالفوں کا مقابلہ کرتے گزاری تھی، فرشتۂ موت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے!

تین بیٹے ان کی جسمانی یادگار ہیں: مہندر سنگھ، اونکار سنگھ۔ نند کمار سنگھ۔ یہیں دلی میں کاروبار کرتے ہیں۔

ان سے دو کتابیں یادگار ہیں: ناقابلِ فراموش اور جذباتِ مشرق۔ ناقابلِ فراموش انھوں نے جیل میں لکھنا شروع کی تھی۔ ۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں وہ بھی قید کر دیے گئے تھے۔ وہ ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہوئے اور تقریباً سال بھر

بعد ستمبر ۱۹۴۳ء میں رہا کر دیئے گئے۔ جیل خانے میں انھوں نے اپنی زندگی کے ۵۵ واقعات قلمبند کرنا شروع کیے، جو ان کی نظر میں اہم اور سبق آموز تھے۔ ان کی غیر حاضری کے زمانے میں ریاست بند رہا تھا۔ رہائی کے بعد جب یہ ۳ اپریل ۱۹۴۴ء کو دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا، تو پہلے ہی شمارے میں یہ یادداشتیں "ناقابلِ فراموش" کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوئیں۔ بعد کو ان کا ایک مختصر مجموعہ کتابی شکل میں چھپا، تو بہت مقبول ہوا۔ اس سلسلے کی ہر دلعزیزی سے انھیں خیال پیدا ہوا کہ اسے مفصل کر دیا جائے۔ چنانچہ دوسری بار یہ کتاب نومبر ۱۹۵۷ء میں بڑے سائز کے ۶۱۵ صفحات پر شائع ہوئی۔ راجپورہ کے قیام کے زمانے میں انھوں نے اس کا دوسرا حصہ "سیف و قلم" کے نام سے لکھا تھا۔ اور اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی۔ یہ بھی خاصی ضخیم کتاب ہے، چھپ جائے تو اس سے ہمارے سوانحی ادب میں مفید اور دلچسپ اضافہ ہوگا۔

تعلیم کی کمی کے باوجود، انھوں نے ساری عمر کی مشق سے اُردو سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ ان کی زبان اغلاط سے بری نہیں۔ لیکن ان کی تحریر میں بلا کی کشش ہے۔ "ناقابلِ فراموش" میں تسلسل مفقود ہے، جستہ جستہ واقعات ہیں۔ ہر ایک واقعہ کے آخر میں کوئی اخلاقی سبق دینے کی کوشش بھی موجود ہے، جو طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ ان سب نقائص کے باوجود اس کی دلچسپی اور کشش کا یہ عالم ہے کہ انسان اس سے اکتاتا نہیں اور چاہتا ہے کہ اسے آخر تک پڑھ جائے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ بھی "تمر و نی" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ میں جب ۱۹۶۶ء میں افغانستان سے واپس آیا، اور انھیں معلوم ہوا، تو خواہش ظاہر کی کہ اس کا فارسی ترجمہ چھاپنے میں ان کی مدد کروں۔ میں نے عرض کیا کہ اصلی مسئلہ اس کے فارسی ترجمہ کرنے کا ہے۔ جب تک یہ نہ ہو، طباعت و اشاعت کے مرحلے کا کیونکر سوچا جا سکتا ہے! بہرحال وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

ان کی دوسری کتاب "جذباتِ مشرق" بھی جیل کی دین ہے۔ مقدمۂ بھوپال کے بعد

ین مہینے ناگپور جیل میں رہے تھے۔ یہیں انھوں نے ہندی، پنجابی، فارسی وغیرہ کے
نب اشعار کا منظوم ترجمہ شروع کیا۔ رہائی کے بعد مدتوں یہ تراجم بھی "ریاست"
ں چھپتے رہے۔ انھیں کا مجموعہ بالآخر ۱۹۶۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔
ن کے نام کے ساتھ مفتون کا جزو تخلص نہیں تھا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم اپنے دوست
باب کو مختلف لقب اور خطاب دیا کرتے تھے جس زمانے میں سردار دیوان سنگھ کے
لقات ان سے خوشگوار تھے، انھوں نے انھیں "مفتون" کا لقب عطا کیا۔ اور یہ
ڈرا ایسا ان کے نام کے ساتھ لگا کہ جب تک آپ پورا نام "دیوان سنگھ مفتون" نہ کہیں
ن کی طرف کسی کا خیال جا ہی نہیں سکتا۔

وم کی پوری زندگی سبق آموز ہے۔ مادی وسائل یکسر نادار، تعلیم نہ ہونے کے برابر
طرح کے ہنر یا فن سے کورے، حوصلہ افزائی کرنے والے یا بڑھاوا دینے والے
مفقود۔ لیکن ان کی محنت و مشقت سے جی نہ چرانے کی عادت، اور بے پایاں خود اعتمادی
یہ ثمرہ تھا کہ انھوں نے بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکر لی، اور انھیں اپنی جگہ سے ہلا دیا۔
ہ آزادانہ جیے اور آزادانہ مرے۔

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے
یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

مسیح الزماں، ڈاکٹر سید

ن کا خاندان جائس (ضلع رائے بریلی، یوپی) کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد سید
ہدی الزماں پیشے کے لحاظ سے بہت کامیاب وکیل اور سماجی پہلو سے عمائد شہر میں
سے تھے۔

مسیح الزماں ۱۸ مارچ ۱۹۲۵ء کو جائس ہی میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔
۱۹۴۸ء میں ان کے امتحان میں الہ آباد یونیورسٹی کے تمام اردو کے امیدواروں میں اوّل
ائے، تو چنتامنی گھوش کا یادگاری سونے کا تمغا انعام میں ملا۔ دو برس بعد وہیں سے

ایم اے (اردو) کی سند پائی جس میں پھر تمام طلبا میں اوّل رہنے پر وکٹوریہ جوبلی تمغا عطا ہوا۔ اس کے بعد چاہتے تھے کہ وہیں سے ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل کریں، لیکن اس وقت صدر شعبۂ اُردو سیّد ضامن علی صاحب تھے۔ اور وہی ان کے تحقیقی کام کے نگران بھی تھے۔ ان سے موضوع کے مسئلے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات ٹلتی رہی اور بہت دن بعد کہیں ۱۹۶۸ء میں وہ ڈی لٹ کے مرتبے تک پہنچے صرف ۱۸ برس کی عمر تھی کہ ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں وہیں اپنی یونیورسٹی میں اُردو کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے؛ پہلے کچھ دن عارضی جگہوں پر رہے، بعد کو مستقل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ۱۹۷۲ء میں ریڈر کا مقام ملا۔ اس دوران میں دو برس کے لیے انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو، فارسی و عربی کے صدر کی حیثیت سے بھی کام کیا (نومبر ۱۹۶۹ء تا نومبر ۱۹۷۱ء)۔ چونکہ وہاں توسیع نہ ملی، اس لیے واپس الٰہ آباد چلے آئے۔

اگرچہ جسم کے لاغر اور قویٰ کے کمزور تھے، لیکن عام صحت کم و بیش ہمیشہ ٹھیک رہی۔ آخر وقت بہت دبے پاؤں آیا۔ ۹ فروری کو اچانک دل کا دورہ پڑا، اور جاں بحق ہو گئے۔ خدا مغفرت فرمائے۔ کربلا، الٰہ آباد (رہمت گنج) میں دفن ہوئے۔

جائس کے سادات امام دہم حضرت علی نقی علیہ السّلام کی اولاد ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ شعر و ادب بھی اُن کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ سیّد مسیح الزّماں کے خاندان میں بھی پرانے مسلمان گھرانوں کی طرح عربی، فارسی کا بہت چرچا تھا۔ ان کے والد سیّد مہدی الزّماں صاحب علمی ذوق اور شاعرانہ مزاج کے آدمی تھے۔ انھیں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا؛ بلکہ عروض پر چند رسالے بھی ان سے یادگار ہیں۔ مسیح الزّماں مرحوم نے بھی فارسی انھیں کی نگرانی میں پڑھی اور اس میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔

ان کی دلچسپی کے دو خاص موضوع تھے۔ ڈراما اور مرثیہ۔ ڈرامے کے فن کے مالہٗ اور ماعلیہ سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی میں ڈرامٹیک ایسوسی ایشن قائم

کی تھی، جس کی سرپرستی خود مسیح الزماں صاحب کی نگرانی میں ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ یہ امر واقع ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی، بلکہ باہر شہر کے حلقوں میں بھی ڈرامے کو جو فروغ ہوا، اس میں مسیح الزماں مرحوم کی مساعی کو بہت دخل ہے۔
جس ماحول میں اُن کی تربیت ہوئی تھی، اس میں تصنیف و تالیف کی چاٹ لگ جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ اس پر پیشہ اُردو پڑھانے کا۔ اعتقاداً چونکہ شیعی تھے، اس لیے مرثیے سے شغف بھی فطری بات تھی۔ اُن کی پہلی کتاب "مرثیۂ میر" تھی، جو ۱۹۵۲ء میں چھپی۔ عام خیال تھا کہ میر تقی میر کے مراثی مفقود ہو چکے ہیں، مرحوم نے انھیں کو ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقیہ کتابیں یہ ہیں: (۲) اُردو تنقید کی تاریخ: جلد اول (۱۹۵۴ء)؛ (۳) تعبیر، تشریح، تنقید (۱۹۵۵ء): یہ بعض مضامین اور متفرق تقریروں کا مجموعہ ہے؛ (۴) "حرف غزل" (۱۹۵۷ء): اس میں اُردو غزل کا تنقیدی مطالعہ اور انیسویں صدی کے مشہور غزل گویوں کا جائزہ لیا ہے؛ (۵) "امانت کی اندر سبھا" (۱۹۶۶ء): متن کی تصحیح کی گئی ہے اور ایک مبسوط مقدمے میں، ابتدائی اسٹیج، رہس اور سبھا کی تدوین اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کی ہے؛ (۶) معیار و میزان (۱۹۶۸ء): اُردو کے نثری اسالیب پر تبصرہ ہے؛ (۷) اُردو مرثیہ کا ارتقا (۱۹۶۸ء): ڈی لٹ کی سند کا مقالہ؛ (۸) اُردو مرثیے کی روایت (۱۹۶۹ء) یہ گویا اُردو مرثیہ کی تین صدیوں کی تاریخ ہے؛ (۹) موازنۂ انیس و دبیر از شبلی (۱۹۷۰ء): مقدمہ اور حواشی کا اضافہ کیا ہے؛ (۱۰) کلیاتِ مومن (۱۹۷۰ء): مقدمہ اور مومن کے مقام کے تعین کی کوشش؛ (۱۱) کلیاتِ میر: جلد دوم (۱۹۷۱ء): غزلیات کے علاوہ میر کے کلام کی تدوین۔ اس کے مقدمے میں میر کی شاعری اور اسلوب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے؛ (۱۲) داغ کی شاعری (ہندی)؛ (۱۳) خورشید (۱۹۷۳ء): پارسی تھیٹر، بمبئی کا پہلا اُردو ڈراما جو کسی زمانے میں گجراتی میں چھپا تھا: اسی کو حیاتِ نو بخشی ہے۔ انھوں نے دو کتابیں انگریزی سے ترجمہ بھی کی تھیں (۱۴) ٹیلیفون کی کہانی (۱۹۶۰ء)؛ (۱۵) ریاستہائے متحدہ کی

مختصر تاریخ (۱۹۶۳ء) کچھ چیزیں غیر مطبوعہ بھی رہ گئیں۔ مختلف مجلات میں مطبوعہ مضامین بھی خاصی تعداد میں ہیں۔
ان کی شادی پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑے۔

حیرت بدایونی، سید حسن

یوپی کے مردم خیز خطے بدایوں میں پیر کے دن ۲۴ اگست ۱۸۹۶ء (۱۵ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ) کو پیدا ہوئے۔ دادھیال اور ننھیال دونوں طرف سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں تھے۔ پشتوں سے ان کے بزرگ حکومتِ وقت کی ملازمت کرتے آئے تھے اور گھر میں علم و فضل کا بھی دور دورہ تھا۔
ان کے جدِ اعلیٰ قاضی محمد جلیس، عہدِ اورنگ زیب میں فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تدوین میں شریک رہے تھے۔ ان کے بعد یہ خاندان ہی "قاضی زادے" کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ اسی لیے بدایوں کے جس محلے میں یہ لوگ مقیم تھے۔ وہ آج تک "قاضی ٹولہ" کہلاتا ہے۔
ان کے دادا قاضی عظمت علی منصف اور صدر اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھے، زمینداری بھی تھی۔ غرض دنیوی عزت اور آرام و آسائش کے تمام وسائل مہیا تھے۔ لیکن یہ خوشحالی ان کے والد قاضی محمد حسن کے ساتھ ختم ہو گئی۔ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا انھیں کوئی معقول ملازمت ملی نہیں، اور معمولی اور چھوٹی نوکری انھوں نے اپنے شایانِ شان نہ خیال کی۔ بیکاری اور مزاج میں ریاست کی ہوا! رفتہ رفتہ ساری املاک بک گئیں، جہاں عیش کے نقارے بجتے تھے، وہاں افلاس نے چھاؤنی چھا لی۔
بدایوں کا ماحول کچھ عجیب دین و دنیا اور شعر و حکمت کے امتزاج کا نام تھا۔ سید حسن کچھ حالات سے مجبور، کچھ اپنی افتادِ طبع کا تقاضا، غرض ان کی تعلیم کا آغاز عربی اور دینیات

سے ہوا۔ اور بالآخر مدرسۂ قادریہ اور مدرسہ شمس العلوم سے عربی اور علوم قرآنی میں سند فراغ حاصل کی۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی سے منشی فاضل (فارسی) اور مولوی فاضل (عربی) کے اعلیٰ امتحانات امتیاز سے پاس کیے۔

تعلیم جس نہج پر ہوئی تھی، اس میں معلمی کے پیشے کے علاوہ اور کوئی سبیل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ چنانچہ اوائل میں چندے انبالہ، بدایوں، کانپور کے بانی اسکولوں میں مدرّس رہے۔

۱۹۲۲ء میں ہماری سیاسی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ پوری فضا کانگریس اور خلافت کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ نوجوان طبیعتوں میں جوش اور ہیجان تھا۔ جوان سید حسن بھی اس لپیٹ میں آگئے۔ چنانچہ میدان عمل میں کود پڑے اور جلسوں میں تقریریں کرنے لگے۔ لیکن جب گرفتاری کا وارنٹ کٹ گیا، تو اب عافیت اسی میں دیکھی کہ انگریزی علاقے سے ہجرت کر جائیں۔ لہٰذا روپوش ہو کر دسمبر ۱۹۲۲ء میں ریاست حیدرآباد دکن پہنچے۔ جو اس وقت شمالی ہند کے شرفا کا واحد ملجا و ماوا تھی۔ یہاں بھی معلمی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ اولاً چندے مدرسۂ آصفیہ میں پڑھاتے رہے، بعد کو شاہی خاندان کے نونہالوں کی درسگاہ "مدرسۂ اعزہ" میں تبادلہ ہو گیا۔ یہیں تھے کہ نوجوان نواب کلیانی کے اتالیق مقرر ہو کر پائیگاہ پر چلے گئے۔ دو تین برس بعد مہاراجا سرکشن پرشاد یمین السلطنت سے ملاقات ہوئی، تو ان کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ مہاراجا مرحوم کی مردم شناسی اور اپنے وابستگان کی ترقی پر توجہ ضرب المثل ہے۔ انھوں نے جاگیرداری کالج میں ان کی ملازمت کا انتظام کر دیا۔ یہی زمانہ ہے، جب حیدرآباد میں ملکی اور غیر ملکی کی تحریک چلی تھی۔ جب تک مہاراجا ان کی پشت پر تھے، سید حسن کی ملازمت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے استعفا دے دیا، تاکہ کسی کا احسان نہ رہے۔ اس کے بعد پھر مہاراجا ہی کی وساطت سے انھیں محکمۂ اوقاف میں جگہ مل گئی۔ ۲۶ برس کی طویل ملازمت کے بعد اسی محکمے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ عمر بھر کے قیام نے

حیدرآباد کو ان کا وطنِ ثانی بنا دیا تھا۔ اس لیے اب وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے، اور بدایوں واپس نہیں گئے۔

ان کا گھر بھر شاعر تھا۔ دادا عظمت علی ضیا، والد محمد حسن اثر، چچا محمد حسین سحر، بڑے بھائی محمد محسن محسن تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی سلطان حسن کا تخلص ابر تھا۔ ایسی شعر زدہ فضا سے یہ کیونکر بچ سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بھی بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ پہلے حسن تخلص کیا، بعد کو اسے حیرت سے بدل لیا۔ شعر پر کسی سے اصلاح نہیں لی، جو کہا، خود ہی دیکھ لیا اور حسبِ ضرورت اس میں ترمیم کر لی۔ اُردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے، اُردو میں آئینہ (۱۹۷۳ء) اور فارسی میں ابریق (۱۹۷۴ء) مجموعے طبع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے لیے بھی کچھ چیزیں لکھی تھیں، یہ بھی شائع ہو چکی ہیں۔

۱۵ فروری ۱۹۷۵ء جمعے کے دن نمازِ مغرب کے بعد سوا سات بجے راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ اگلے دن (۱۶ فروری) جنازے میں شہر کے تمام طبقات کے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ درگاہِ یوسفین (نام پلی) کے احاطے میں پائینتی کی طرف سپردِ خاک ہوئے۔ امیر مینائی اور داغ بھی اسی درگاہ میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

۱۹۲۵ء میں اُن کی شادی جناب اعجاز حسین فرشوری کی صاحبزادی شکیلہ خاتون سے ہوئی تھی۔ وہ بحمدہٖ تعالیٰ حیات ہیں، وہ اُردو فارسی کی اچھی لیاقت کی مالک ہیں اور شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتی ہیں۔

اولادِ جسمانی میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑے۔ بیٹوں میں سب سے بڑے مؤید حسن ایم۔ کام ریجنل ریسرچ لیباریٹری میں ایکس رے کے شعبے کے مدیر ہیں۔ ان سے چھوٹے ڈاکٹر افضل محمد عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ جغرافیا میں ریڈر ہیں۔ اور منجھلے احمد جلیس ایم، اے انوار العلوم کالج میں اُردو کے لیکچرر۔ سب سے چھوٹے محی الدین حسن حکومتِ سندھ میں ہیں۔ مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو ان کی بیٹی ہیں۔

اعجاز حسین، ڈاکٹر سیّد

ان کے والد کا نام سیّد محمد شفیع تھا۔ وہ پولیس میں ملازم تھے۔ آدمی شریف اور مسکین طبع تھے، لیکن تعلیم زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے کوئی ترقی نہ کر سکے۔ ان کے خسر سیّد حسین امیر اور رئیس آدمی تھے۔ الہ آباد کے مضافات کے محلے راجاپور میں خاصی جائداد کے مالک تھے۔ ان کے صرف چار بیٹیاں تھیں؛ نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اسی لیے انھوں نے بیٹیوں کی شادی شریف، لیکن غریب نوجوانوں سے کی، اور سب کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ سید اعجاز حسین کی اپنے ننھیال میں ولادت ہوئی۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ سال کا یقین نہیں، ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء تھا، لیکن مہینا یقیناً اگست کا تھا، اور جمعے کا دن، وقت صبح صادق تھا۔ بعد کو انھوں نے یوم آزادی کی مناسبت سے اسے ۱۵ اگست بنا لیا تھا؛ ظاہر ہے، کہ یہ فرضی تاریخ تھی۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ نہ ۱۵ اگست ۱۸۹۸ء کو جمعہ تھا، نہ ۱۵ اگست ۱۸۹۹ء کو۔

سیّد حسین اپنے زمانے کے رئیسوں کی جملہ خوبیوں اور خامیوں سے متصف تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ فارسی، عربی کے دلدادہ تھے؛ اور انگریزی کے مخالف۔ کسی قسم کے کام کاج کو دون مرتبہ سمجھتے تھے۔ آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا، اندوختے سے سب شوق پورے ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تو قارون کا خزانہ بھی ساتھ نہیں دے سکتا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کی کوئی بھی عقلمند پیشگوئی کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ حالت اتنی کمزور ہو گئی کہ گھر کا اعلا خرچ تک چلانا دوبھر ہو گیا۔

سیّد اعجاز حسین کی تعلیمی رفتار بہت سست رہی۔ گھر کے ماحول کے باعث انھیں اردو اور فارسی شعر سے تو ضرور دلچسپی پیدا ہو گئی، بلکہ جلد ہی خود بھی تک بندی کرنے لگے۔ لیکن ریاضی اور اقلیدس سے ان کی جان خشک ہوتی تھی؛ اور دسویں درجے کی سند کے امتحان کے لیے یہ لازمی مضمون تھے۔ چنانچہ دو مرتبہ ناکامی کے بعد

انھوں نے کلکتے کی راہ لی، جہاں یونیورسٹی میں ریاضیات کا معیار نسبتاً کم تھا اور اسی لیے یہاں سے وہ ۱۹۱۹ء میں دسویں درجے کی سند لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت عمر عزیز ۲۰ برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔
اس کے بعد انھوں نے میور سنٹرل کالج، الہ آباد میں داخلہ لیا۔ انٹر میں بھی ایک مرتبہ فیل ہوئے، لیکن لگے رہے۔ آخر کار مسلم یونیورسٹی سے انٹر اور ۱۹۲۴ء میں میور کالج سے بی اے کی سند لی۔ اسی دوران میں انگریزوں کو اردو پڑھاتے اور اپنے خرچ کی کفالت کرتے رہے۔ چونکہ اب سرکاری ملازمت کے لیے عمر زیادہ ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۲۸ء میں اس شان سے یہ امتحان پاس کیا کہ اوّل درجے میں یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے۔ اور جب ۱۹۲۹ء میں وہیں اردو کے مدرّس (لیکچرر) کی جگہ نکلی، تو اس پر ان کا تقرر ہو گیا۔ کسی دوست نے تاریخ کہی: شد حضرت اعجاز مقرّر

للہ الحمد کہ حائزہ منزل رسید

اب یہ ہر طرح مطمئن اور پُرسکون زندگی گزارنے کی شاہراہ پر کھڑے تھے۔ اس میں اگر افسوس کا کوئی پہلو تھا، تو یہ کہ ان کے وہ نانا (سید حسین) جنھوں نے انھیں پالا پوسا، پروان چڑھایا، پڑھایا لکھایا؛ ان کے آرام کی خاطر خود ہر طرح کی تکلیفیں جھیلیں، ان کے ملازم ہونے (۷ اگست ۱۹۲۹ء) سے پانچ مہینے پہلے (۲۱ اگست ۱۹۲۹ء؟) رحلت فرما چکے تھے۔ انھیں اپنے چہیتے نواسے کی کامیابی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔
اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون

سیّد سجاد ظہیر مرحوم (ف ستمبر ۱۹۷۳ء) نے اپنے بعض ہمخیال احباب کے تعاون سے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی بنیاد رکھی تھی۔ انھوں نے اس کے قیام اور استحکام کے لیے ملک کا دورہ کیا اور جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کیں۔ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں ان کے بعض اور ادیب دوست بھی یہیں مقیم تھے؛ ان میں ڈاکٹر زیڈ، اے احمد (زین العابدین احمد) موجودہ رکن

راجہ سبھا، کنور محمد اشرف اور پروفیسر احمد علی کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ اس اجتماع کا نتیجہ یہ نکلا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ الہ آباد میں بھی کھل گئی۔ جلسے ہونے لگے، بحث مباحثے ہونے لگے اور شہر کے ادبی حلقوں میں گویا زندگی کی تازہ لہر دوڑ گئی۔ سید اعجاز حسین بھی اس کھنور میں پہنچ گئے، بلکہ انجمن کے سکریٹری بنا دیے گئے۔ ان کی کتاب "نئے ادبی رجحانات" اسی ماحول میں لکھی گئی تھی۔

۱۹۲۸ء میں ایم اے کی سند لینے کے بعد انھوں نے پی ایچ ڈی کے لیے ریسرچ میں داخلہ لے لیا تھا۔ موضوع مقالہ تھا: "اردو شاعری پر تصوف کا اثر"۔ لیکن خدا معلوم کیوں مقالہ پیش نہیں کیا۔ بہرحال وہ ڈاکٹریٹ کی سند کے بغیر ہی کام کرتے رہے۔ دس بارہ برس بعد انھوں نے ڈی لٹ کی سند لینے کی ٹھانی اور مقالہ بعنوان "مذہب و شاعری" تیار کیا۔ ہندستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو موضوع پر ڈی لٹ کی سند لینے والے وہ پہلے شخص تھے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرر ۱۹۲۹ء میں آئے تھے۔ وہ مدتوں اسی عہدے پر قائم رہے، پھر ریڈر مقرر ہوئے اور بالآخر پانچ چھ برس پروفیسر رہنے کے بعد یکم مئی ۱۹۶۱ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے انھیں پانسو روپیہ مہینا کا تحقیقی وظیفہ عطا ہوا۔ "اردو شاعری کا سماجی پس منظر" اسی وظیفے کا قیمتی نتیجہ ہے۔

اگرچہ صحت عام طور پر اچھی رہی، لیکن عمر کے ساتھ ضعف قوا ء قدرتی عمل تھا جس سے مفر ممکن نہیں۔ ۱۸ فروری ۱۹۷۵ء کو ایک طالب علم کے پی، ایچ، ڈی کے امتحان کے سلسلے میں مظفر پور (بہار) گئے تھے، وہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ علاج معالجہ ہوا، لیکن بےسود۔ یوں اپنے اعزہ اور خاندان سے دور، پردیس میں اتوار ۲۳ فروری ۱۹۷۵ء کو جان بحق ہو گئے۔ لاش الہ آباد آئی اور اشوک نگر کے نواح میں سرکنڈہ گھاٹ کے قریب اپنے ننھیالی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

(۱) آئینۂ معرفت؛ (۲) مختصر تاریخ ادب اردو؛ (۳) نئے ادبی رجحانات؛

(۱۹۴۲ء)؛ (۴) مذہب و شاعری؛ (۵) ملکِ ادب کے شاہزادے؛ (۶) اُردو ادب آزادی کے بعد؛ (۷) ادب و ادیب؛ (۸) حیاتِ سیدنا (حضرت طاہر سیف الدین مرحوم)؛ (۹) ادبی ڈرامے؛ (۱۰) میری دنیا (۱۹۶۵ء)؛ (۱۱) اُردو شاعری کا پس منظر وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ کتابیں ہندی میں لکھی ہیں۔

وہ ابھی طالب علم تھے، جب ان کے نانا نے انھیں روز افزوں آوارگی اور تماش بینی سے بچانے کی خاطر ۱۹۳۲ء میں ان کی شادی کر دی تھی۔ ان سے آٹھ بچے ہوئے: پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں۔ بحمدہٖ تعالیٰ سب خوش و خرم ہیں۔

شمیم کرہانی، شمس الدین حیدر

اگرچہ اعظم گڑھ (یوپی) کا قصبۂ کرہان آبائی وطن تھا، لیکن ان کی ولادت ۸ جون ۱۹۱۳ء (۲ رجب ۱۳۳۱ھ) کو اپنی نانیہال پارہ (ضلع غازی پور) میں ہوئی۔ کرہان کے سادات حضرت میر شمس الدین عرف میر شمسی (ف ۱۰۶۰ھ) کے نام لیوا ہیں۔ میر شمسی اپنے زمانے کے مشہور صوفیہ اور اہل اللہ میں شمار ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں سات حج پیادہ پا کیے۔ اس علاقے میں ان کی کرامات کے بیسیوں قصے زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اسی لیے جب یہ پیدا ہوئے، تو ان کے والد سید محمد اختر نے بطور تفاؤل ان کا نام شمس الدین حیدر رکھا؛ گھر میں پیار کا نام شمسو تھا۔ ان سے تین بڑے بھائی تھے: علی بخش غضنفر، اعظم حسین، حسام الدین حیدر۔ ایک بھائی علی حیدر، اور ایک بہن نرجس خاتون ان سے چھوٹے تھے۔

جب تعلیم کی عمر کو پہنچے، تو اس زمانے کے دستور کے مطابق بسم اللہ گھر پر ہوئی۔ جب یہ مرحلہ طے ہو گیا، تو انھیں بڑے بھائی سید علی بخش غضنفر کے پاس گورکھپور بھیج دیا گیا، جو وہاں ملازم تھے۔ وہاں کچھ پڑھا لکھا ہو گا۔ لیکن گورکھپور کا قیام بہت مختصر رہا؛ جلد ہی وہاں سے واپس آ گئے۔ انھوں نے وثیقہ عربی اسکول فیض آباد میں داخلہ لیا۔ اس مدرسے میں دینیات کی رسمی تعلیم کے علاوہ عربی اور فارسی

پڑھانے کا خاص انتظام تھا۔ چنانچہ یہاں انھوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم پائی اور اسی سے یونیورسٹی کے "مولوی" اور "کامل" کے امتحان بھی پاس کیے۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریزی نہیں پڑھی۔ یہ کمی انھوں نے بہت دن بعد پوری کی۔ پہلے دسویں کی سند حاصل کی اور پھر انٹر کی۔ اپنی منصبی مصروفیتوں کے باعث بی اے کے امتحان کی تیاری نہ کر سکے؛ اور اس کمی کا احساس انھیں آخر تک رہا۔

دتیقہ عربی اسکول سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے ڈی، اے وی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں وہ فارسی اور اُردو پڑھاتے تھے؛ مقررہ تنخواہ قلیل تھی اور جو کچھ واقعی ملتا تھا وہ قلیل تر تھا؛ اور ستم یہ کہ اس کی بھی وقت پر ادائی ہمیشہ غیر یقینی رہتی۔ یہ صورت حال کسی عنوان اطمینان بخش نہیں تھی۔ بالآخر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مدرّسی کو خیر باد کہ کر کوئی اور پیشہ اختیار کیا جائے۔ یہ زمانہ وہ ہے جب ہندستان کی صنعت فلم سازی روز افزوں ترقی کر رہی تھی اور ہمارے بیشتر شاعر اور ادیب اس سے منسلک ہو گئے تھے۔ اعظم گڑھ کے قیام کے زمانے میں ان کا تعارف ماسٹر سید منوّر حسین رضوی سے ہو گیا، جو وہاں کے سماجی حلقوں میں خاصی معروف اور ذی اثر شخصیت تھے۔ سید منوّر حسین کے ایک بھائی سید شوکت حسین رضوی فلمیں بناتے تھے؛ مشہور ملکۂ ترنّم نور جہاں ان کی بیوی تھیں۔ سید شوکت حسین نے شمیم کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے ساتھ لاہور چلیں، اور پنچولی پکچرز کی فلموں کے لیے گانے لکھیں۔ یہ مدرّسی سے اور اپنی قلیل آمدنی سے تنگ تو آ ہی چکے تھے؛ کچھ ان ادیبوں کی اچھی اوقات ان کے سامنے تھی، جنھوں نے فلم کی راہ اختیار کی تھی، کچھ سید شوکت حسین نے بھی سبز باغ دکھائے؛ انھوں نے لاہور جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

وہ لاہور پہنچے؛ چند فلموں کے لیے گانے لکھے۔ اپنے مخصوص خاندانی ماحول کے

زیر اثر وہ موسیقی پہلے سے جانتے تھے اور اس کے بنیادی اصولوں سے انھیں اچھی واقفیت تھی۔ فلموں کے زمانے میں یہ علم بہت مفید ثابت ہوا۔ بلکہ اس میں اور گہرائی پیدا ہوگئی، آواز بھی بہت اچھی تھی۔ یہ سب باتیں بعد کو مشاعرہ بازی کے دور میں بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔ لیکن انھیں فلم کا خالص کاروباری ماحول راس نہ آیا۔ انھوں نے گھر کی زمینداری دیکھی تھی، اگرچہ ان تک آتے آتے وہ دنیا ٹھاٹ باٹ ختم ہوگیا تھا، تاہم ابھی رستی کا بل نہیں گیا تھا... غرض کہ جلد ہی اُن کا دل اُچاٹ ہوگیا اور وہ واپس اعظم گڑھ چلے آئے۔

اعظم گڑھ میں اب ڈی اے وی اسکول کی وہ پہلی نوکری اُن کی دسترس سے باہر تھی کیونکہ ان کی غیر حاضری میں اور انتظام ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اب ان پر دلّی کی کشش غالب آنے لگی، جو اُردو، فارسی علوم کا بہتر مرکز تھا۔ انھوں نے بعض دوستوں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور کوشش کرنے سے انھیں ۱۹۵۰ء میں اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول میں فارسی کے مدرس کی جگہ مل گئی۔ وہ اپنی وفات کے وقت اسی عہدے پر متمکن تھے۔

انھیں اختلاج قلب کا عارضہ بہت دن سے تھا، تو ہم کے بھی شکار تھے۔ اسی لیے اکیلے سفر کرنے سے بالعموم اجتناب کرتے، کوئی نہ کوئی دوست یا ان کا اپنا بچہ ان کے ہمراہ جاتا۔ اس کے باوجود اس کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ انجام اتنا قریب ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۵ء شام کے وقت وہ ایک مقامی مشاعرے میں شریک ہوئے۔ وہیں طبیعت بگڑ گئی اور بیہوش ہو گئے۔ فوراً قریب کے ارون اسپتال میں پہنچا دیے گئے۔ معائنے پر تشخیص ہوئی کہ دماغ کی نس پھٹ گئی ہے۔ اگلے دن (۱۹ مارچ) صبح ساڑھے سات بجے بیہوشی کے عالم ہی میں جاں بحق ہوگئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا اور ان کی خواہش کے مطابق جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

ان کا نکاح ۳۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو نگرام کے میر حسن عسکری صاحب کی بڑی صاحبزادی کاظمی بیگم سے ہوا تھا ۔ پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم (ف ۱۹۷۲ء) ان کے ہم زلف تھے ۔ ۔ دونوں بہنیں ایک ہی دن گھی تھیں ۔ بڑی بہن شمیم کے عقد نکاح میں آئیں اور چھوٹی ہاشمی بانو، سید احتشام حسین کے ۔ شمیم نے تین صاحبزادے اپنی یادگار چھوڑے ہیں : سید حسین اختر (عرف مراد)، سید عابد اختر (عرف عماد) اور سید باقر اختر (عرف سلمان) ۔ ان ناموں میں اختر کا لاحقہ شمیم مرحوم کے والد سید محمد اختر کی نسبت سے ہے ۔

ان کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا ۔ والد شاعر تھے ؛ اختر تخلص تھا ۔ بڑے منجھلے بھائی اعظم حسین کا تخلص اعظم تھا۔ حکیم زکی حسین اور ان کے دونوں چھوٹے بھائی، سید محمد علی احمد اور سید محمد علی رسا سب شاعر اور رشتے میں ان کے چچا ہوتے تھے ۔

غرض ان کے بچپن میں ان کے اردگرد شاعری کا چرچا تھا ۔ اس کا اثر ہونا ہی چاہیے تھا، یہ بھی کمسنی میں تک بندی کرنے لگے ۔ خاندان کی مذہبی روایت کے باعث شروع میں سوز خوانی پر توجہ رہی اور خود بھی سلام اور نوحے لکھتے رہے ۔ بعد کو غزل اور نظم کو ترجیح دینے لگے ۔ چندے آرزو لکھنوی (ف : اپریل ۱۹۵۱ء) سے اصلاح لی ۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں ان کا رجحان نظم کی طرف زیادہ تھا، اس لیے آرزو سے استفادہ بہت محدود رہا ۔

ان کی شاعری کا آغاز ہماری سیاسی تحریک کے متوازی رہا ۔ اس دور میں ان پر جوش ملیح آبادی کا بہت اثر تھا ۔ انھوں نے بھی سیاسی نظمیں لکھیں، جن کا مجموعہ بعد کو "روشن اندھیرا" کے عنوان سے چھپا ۔ (۱۹۴۳ء) اس کا سارا خرچ رفیع احمد قدوائی مرحوم (ف اکتوبر ۱۹۵۴ء) نے اپنی جیب سے دیا تھا ۔ ان کے بعض دوسرے شعری مجموعے یہ ہیں : برق و باراں (منظومات)، عکس گل (لکھنؤ: ۱۹۶۴ء)، حرف نیم شب (دلی ۱۹۷۲ء) جان برادر (دلی، ۱۹۷۳ء) پروفیسر احتشام حسین کا مرثیہ؛ طلیع ناراں (دلی: ۱۹۷۴ء) ۔ انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو مرحوم

(ف مئی ۱۹۶۴ء) کی فرمائش پر جنگِ آزادی کی منظوم تاریخ "تلاشِ سحر" کے عنوان سے لکھنا شروع کی تھی۔ اس کے متعدد ابواب موقت الشیوع جرائد میں شائع ہوتے تھے، لیکن افسوس کہ یہ نظم مکمّل نہ ہو سکی۔ اور بھی بہت سا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

ان کا کلام بھی پختہ اور بلیغ ہے، اس لیے بجا طور پر ان کا اس دور کے صفِ اوّل کے شعرا میں شمار ہوتا تھا۔

قومی بچتوں میں سرمایہ لگانے والوں کے لیے
خوش خبری

• نئے ۱۰ سالہ اینوئٹی سرٹیفکٹ

جن پر کھاتے دار کو ۸۴ مہینوں کے لیے سود کی رقم ہر مہینے ملتی رہیگی جس سے اسے اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم وغیرہ کے اخراجات پورے کرنے میں مدد ملیگی۔
میعاد پوری ہونے پر خاصے پریمیم کے ساتھ سرمایے کی واپسی (10.25٪ سود مرکب ملیگا)۔

• ٹیکس سے مستثنیٰ انیشنل سیونگز سرٹیفکٹ خریدنے کی حد بڑھا دی گئی ہے:

	پہلی حد	موجودہ حد
ایک بالغ کے لیے	50,000 روپے	75000 روپے
دو بالغوں کے لیے (مشترکہ)	1,00,000 روپے	1,50,000 روپے

(ان سرٹیفکٹوں پر 6٪ سالانہ ٹیکس سے مستثنیٰ سود ملتا ہے)

• 5 سالہ ریکرنگ ڈپازٹ کھاتوں کے لیے مزید فائدے:

پانچ سال کے بعد بھی رقم جمع کرانے کا سلسلہ جاری رکھا جا سکتا ہے یا میعاد پوری ہونے پر ملنے والی رقم مزید عرصے کے لیے سرکار کے پاس جمع رکھی جا سکتی ہے (ایسی حالتوں میں ہر پورے سال کے لیے 9.25٪ سود مرکب دیا جائیگا)۔
بچتوں کے تحفظ کی اسکیم کا فائدہ اب 20 روپے کے کھاتوں پر بھی دیا جائیگا۔
مزید تفصیلات کے لیے براہِ مہربانی اس پتے پر لکھیں:

نیشنل سیونگز کمشنر
پوسٹ بکس نمبر 96 — ناگپور

DAVP 75/82

مطبوعاتِ علمی مجلس

۱۔ تذکرۂ گلشنِ ہند، از حیدر بخش حیدری (مرتبہ پروفیسر مختار الدین) ‎-/۵

۲۔ کلیاتِ میر (میر کے مکمل چھ دیوانِ غزلیات) مرتبہ ظلِ عباس عباسی ‎-/۲۵

۳۔ کلیاتِ مصحفی (دیوانِ اول) مرتبہ نثار احمد فاروقی ‎۸/۷۵

۴۔ کلیاتِ مصحفی (دیوانِ دوم) مرتبہ نثار احمد فاروقی ‎۷/۷۵

۵۔ تذکرۂ مقالات الشعراء، از قیام الدین حیرت (مرتبہ نثار احمد فاروقی) ‎-/۵

۶۔ تذکرۂ بہارِ بیخزاں، از احمد حسین سحر لکھنوی (مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد) ‎-/۵

۷۔ ہندستانی، انگریزی لغت، مؤلفہ ڈنکن فوربس (بذریعہ فوٹو آفسیٹ) ‎-/۵۰

۸۔ عیارِ غالب، مرتبہ مالک رام (غالب سے متعلق مشاہیر کے ۱۳ مضامین کا مجموعہ) ‎-/۷

۹۔ گلِ رعنا از غالب مرتبہ مالک رام (غالب کا اولین انتخاب از فارسی) ‎۷/۵۰

۱۰۔ اعلان الحق، مولانا ابوالکلام آزاد (مع مقدمہ از مالک رام) ‎-/۲

ملنے کا پتا

علمی مجلس

۱۴۲۹، چھتہ نواب فراشخانہ، دلّی ۶

۱۱۲



Spare your vehicle off-work time. Get the spare parts you need. Fast!

Come to
Jullundur Motor Agency (Delhi) Pvt. Ltd.
for the biggest names in
auto parts. All under one roof.



JULLUNDUR MOTOR AGENCY (DELHI) PVT. LTD.
6, Sehgal Colony, Court Lane, Delhi-6
Branches: Delhi, New Delhi, Amritsar, Jullundur, Indore, Jaipur, Kanpur.

تحریر

علمی مجلس دلّی کا تماہی رسالہ:





مرتب:
مالک رام

Rs. 5

Printed by Z. A Abbasi at Kohinoor Press, Lal Kuan DELHI-6
and Published from "ILMI MAJLIS" OFFICE,
1429, Chhatta Nawab Saheb, Farrash Khana, DELHI-6.

تحریر

علمی مجلس دلی کا سہ ماہی رسالہ

(۳۳)

مرتّب: مالک رام

جلد ۹ — جولائی / ستمبر ۱۹۷۵ء — شمارہ ۳

چندہ سالانہ: ۱۵ روپے — اس شمارے کی قیمت ۵ روپے

غیر ممالک سے: ۲/۱ ۲ پونڈ (انگریزی) / ۷ ڈالر (امریکی)

پرنٹر و پبلشر ظلّ عباس عباسی نے کوہ نور پریس، دلّی میں چھپوا کر دفتر علمی مجلس ۱۴۲۹ چھتّہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلّی سے شائع کیا۔

ملاحظات

تحریر کا یہ شمارہ بعض ناگہانی مجبوریوں کے باعث قدرے تاخیر سے شائع ہو رہا ہے، اور اپنی معمولی ضخامت سے کچھ کم بھی ہے۔ تاخیر کے لیے معذرت قبول فرمائیے۔ صفحات کی کمی ان شاء اللہ آیندہ شمارے میں پوری کر دی جائیگی۔

اس شمارے سے تحریر میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہا ہوں؛ یہ کتابوں پر تبصرہ ہے۔ کام کا بار پہلے بھی کم نہیں تھا، اور میری گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر یہ نیا اقدام، جو نئی ذمہ داریوں کا پیش خیمہ ہے، شاید پسندیدہ بھی نہ ہو۔ لیکن چارہ کار بھی کیا ہے! میں بہت دن سے یہ کمی محسوس کر رہا تھا؛ احباب نے بھی وقتاً فوقتاً توجہ دلائی۔ اس کے باوجود میں آج تک اس سے کتراتا رہا۔ آخر ایک اکیلا شخص کیا کیا کرے! آپ دن رات کو ۲۴ گھنٹوں کی جگہ ۳۶ کا تو نہیں بنا سکتے۔ اب دعا کیجیے کہ خدا اس ذمہ داری کو نباہنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ وَمَا تَوْفِیْقُنَا اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْم۔

اس شمارے میں علامہ اقبال کی تاریخ ولادت کے بارے میں ان کے بھتیجے داماد ڈاکٹر نظیر صوفی کا مضمون شامل ہو رہا ہے۔ اگر کوئی صاحب، جذبات سے ہٹ کر، سنجیدگی اور دلیل سے اس موضوع پر کچھ لکھنا چاہیں، تو ہم بخوشی ان کا مضمون شائع کریںگے۔ موضوع کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ افسوس کی بات ہے کہ یہ معاملہ الجھ گیا ہے۔ اگر ہم اس کے حل کرنے میں مدد دے سکیں، تو یہ واقعی سعادت اور فخر کا مقام ہوگا۔

مالک رام

ل احمد اکبرآبادی

شاعرِ آذربائیجان، نسیمی اور اُس کا عہد

اکیڈمی ممبر میرزا ابراہیموف کا ایک مقالہ بعنوان بالا سوویٹ [illegible] ستمبر ۱۹۷۳ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ ذیل کا مضمون بحذف و اضافہ اسی مقالے سے ماخوذ ہے۔

یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ اس مقالے میں نسیمی کے بعض اشعار بھی شامل ہیں جو اغلباً آذربائیجانی سے روسی میں اور پھر روسی سے انگریزی میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ در ترجمہ اور پھر اس کا بھی ترجمہ، بالخصوص شعر کے ساتھ تو شعری محاسن و اوصاف باقی نہیں رہ سکتے۔

اس مضمون میں بعض مقامات کے نام بھی آئے ہیں۔ جیسے شیروان، تبریز، ہرات، استرآباد، گنجہ اور طفلس وغیرہ۔ [illegible]

[illegible] ممکن

ہے کہ یہ نام میرے حافظے سے محو ہو گئے ہوں۔ نیز اس مقالے میں حروفیت کی تحریک کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس کے متعلق میں حتمی طور سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات نہ میں نے کہیں پڑھی اور نہ سنی تھی۔

ل۔ احمد

سید علی عمادالدین نسیمی (سوویٹ آذربائیجان میں) چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک ممتاز شاعر و مفکر گزرا ہے۔ جیسے مادری آذربائیجان میں السابقون الاوّلون کا رتبہ حاصل ہے نسیمی کے کلام کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق، اس کی تعلیم اعلیٰ پیمانے پر اور آخری مرحلے تک ہوئی تھی۔ وہ علم نجوم، ریاضی، جغرافیہ، فلسفہ و منطق کا فاضل تھا؛ عربی و فارسی زبانوں پر اسے کامل عبور تھا؛ اور یونانی ادب القدما میں بھی اُسے دستگاہ حاصل تھی۔ اس کے علاوہ مذہب اسلام اور عیسویت پر بھی وہ گہری نظر رکھتا تھا۔ فی الجملہ وہ ایک عالم متبحر تھا۔

وہ اپنی مادری زبان آذربائیجانی کا تو مالک تھا: اس کے محاورے اور ضرب الامثال و اقوال، استعارہ و تشبیہ، اشارہ و کنایہ کے استعمال کا ماہر تھا۔ یہ ساری خوبیاں اس کے کلام میں تابدار موتیوں کی طرح بکھری ملتی ہیں۔

نسیمی کی شاعری میں تصوراتی (IDEOLOGICAL) رجحان اور ترقی پسندانہ تصورات نے باعتبار زمانہ حیرت انگیز صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ فی الواقع اپنے عہد کا فرزند رشید اور قوم و معاشرہ کا باعمل و صدوف شہری تھا۔ اس کی شاعرانہ بصیرت اس زمانے کی سماجی اور مذہبی توہمات پرستی کی حد بندیوں کو مسترد کر دیا؛ اور وہ بعد میں آنے والی نسلوں کی برابر رہنمائی کرتی رہی؛ ہر نئی نسل کو اعلیٰ تصورات و محسوسات سے مالا مال کرتی اور اس کے اندر یہ جذبہ ابھارتی اور یہ آرزو پیدا کرتی رہی ہے کہ وہ مہربات

ا۔ قفقاز کا بحر خزر والا ساحلی علاقہ آذربائیجان کہا جاتا ہے۔ آج کل آذربائیجان کا ایک حصہ سوویٹ روس میں شامل ہے اور دوسرا ایران میں۔ ۱۴۰۰ء میں کیا حالت تھی، یہ میرے علم سے باہر ہے۔ ل۔ احمد۔

کو عقل و دلیل کی کسوٹی پر کس کر دیکھے اور سمجھے

نسیمی کا شاعرانہ انہاک حدود سے نا آشنا تھا؛ وہ سماجی اور سیاسی تحریکات و مسائل میں منہمک رہتے ہوئے بھی شعری تصورات میں ڈوبا ہوا رہتا تھا۔ کوئی مصروفیت اس کے جذبۂ شعری کو دھیما نہیں کر سکتی تھی۔ جو بھی موضوع یا مسئلہ اس کے سامنے ہوتا، خواہ مذہبی ہو یا فلسفیانہ، سماجی ہو یا سیاسی، اخلاقی ہو یا روزمرہ کی زندگی سے متعلق ہو، نسیمی کا دل و دماغ ہر بات کو اور ہر صورتِ حال کو استعاروں اور شعری تصورات میں دیکھتا سمجھتا تھا۔ بلا ریب کہ وہ ایک تخلیقی صناعِ ادب تھا!

عماد الدین نسیمی ۱۳۷۰ء میں شہر شماخہ میں پیدا ہوا، جو خان شیروان کا پایۂ تخت تھا، اور تقریباً تین سو سال تک آذربائیجان کا سیاسی، اقتصادی، تہذیبی اور ثقافتی مرکز بنا رہا۔ اور اپنی علمی و ادبی روایات کے لیے نہ صرف مشہور بلکہ مستند بھی تھا، ہر چند کہ یہی شہر شماخہ آج سوویت آذربائیجان جمہوریہ کا ایک چھوٹا سا شہر بن کر رہ گیا ہے۔

اس زمانے کے شماخہ میں شعر و ادب کے مختلف مکاتیبِ خیال کے مرکز قائم تھے۔ متعدد انجمنیں اور ادارے تھے، جن کے ذریعے سے ماہرینِ فن و صناعت حرکت و عمل میں مصروف رہتے تھے، علم و ادب کی مجلسیں اور نغمہ و موسیقی کی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ جن میں مملکتِ آذربائیجان کے علاوہ دوسرے ہمسایہ ملکوں کے شائقین بھی شرکت کرنے آتے تھے۔

ماسوا اس کے آذربائیجانی شعراء و ادباء و فضلاء دیگر ممالک کے تہذیبی و ثقافتی اور علمی و ادبی مرکزوں سے بھی رابطہ رکھتے تھے۔ مثلاً گنجہ، طفلس، بغداد، سمرقند اور دہلی وغیرہ؛ اور ان ممالک کے سفر بھی اختیار کیے جاتے تھے۔ بالفاظِ دیگر آذربائیجانی علمی و ادبی افکار و تصورات کا دوسرے ملکوں سے تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اور اس طرح فریقین ایک دوسرے سے مستفیض ہوتے رہتے۔

نسیمی کے کلام میں جا بجا آذربائیجانی اور دیگر ممالک کے رجالِ عظیم کے نام ملتے ہیں، جیسے علی ابن سینا، خاقانی، شیخ محمد شبستری، اور اوحدی مراغینی وغیرہ

نسیمی کا عہد وہ زمانہ تھا، جب مشرقِ قریب و وسطیٰ میں فارسی زبان کو ادبی زبان تسلیم کر لیا گیا تھا اور صرف فارسی گو شعرا کا کلام ہی قابلِ اعتنا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود نسیمی نے اپنی مادری زبان میں فصاحت کے دریا بہائے۔ حال آنکہ اس کا عربی اور فارسی کلام اس پر شاہد ہے کہ وہ ان دونوں زبانوں پر بھی پوری قدرت رکھتا تھا۔ اس کے آذربائیجانی دیوان میں پندرہ ہزار اشعار ہیں، اور فارسی دیوان بھی پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، البتہ عربی کلام کی تعداد بہت کم ہے۔[1]

اپنے اظہارِ خیال کے لیے نسیمی نے صرف صنفِ غزل اور رباعی کو منتخب کر لیا تھا۔ رباعی کو آذربائیجانی میں ہیت کہا جاتا ہے۔ وہ آذربائیجانی زبان کا پہلا شاعر، اور شاعر بھی عظیم المرتبت تھا۔ اپنی مادری زبان میں شاعری کر کے اُس نے بلاشبہ اپنی قوم اور قومی ادب کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ آذربائیجانی زبان میں اس سے پہلے کوئی شاعر نہیں ملتا۔ یہ فخر تنہا نسیمی کا مقدر تھا کہ وہ ایک بولی کو ادبی زبان کے درجے تک پہنچا سکا۔ اور فی الواقع یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے کہ ایک فردِ واحد کی کوشش سے ایک بولی ادبی زبان کا رتبہ پالے۔

ایک صنّاعِ ادب ہونے کے اعتبار سے نسیمی اپنے عہد کے آذربائیجان اور مشرقِ قریب کی اعلا ادبی خدمات پر کاربند رہا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے فن و صناعت سے نئے افکار و اقدار بھی پیدا کیے۔ اس کی فنی عظمت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس نے خالصتاً شعری زبان میں اپنی اور زمانے کی موضوعات کو جسم و لباس عطا کر کے اسے متموّل بنایا۔

نسیمی کی زندگی بھر آذربائیجان اور مشرقِ قریب کے علاقے میں سخت بلا انگیزی اور دہشت و قتل کا زمانہ رہا۔ اس کا وطنِ عزیز چھوٹے چھوٹے خان حکمرانوں کی باہمی آویزشوں میں پارہ پارہ ہوتا اور بیرونی حملہ آوروں کی یلغاروں میں پستا رہتا تھا۔ جنوب سے تیموری فوجوں کے طوفان اٹھتے اور شمال سے تختمش منگول (Golden HORDE) کی یلغاریں طوفانی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ ایک طرف تو یہ صورتِ حال تھی اور دوسری طرف جس سماج میں پیدا ہوا۔ اس کے اندر انسانی انفرادیت کچلی جاتی اور ظلم و اہانت کا مورد

بنی ہوتی تھی، بالفاظ دیگر انسانی فرد کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ گئی تھی۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں نسیمی نے آنکھیں کھولیں، اور یہ تھے وہ حالات جن میں اس کی جوانی پروان چڑھی۔ ایسے نامساعد حالات اور معاشرے میں بھی نسیمی نے اکتساب علم کیا اور اس کا فن بار آور ہوا۔ اس کو ایک معجزہ ہی سمجھنا چاہیے۔ اور یہ حقیقت بجائے خود اس کی عقل و دانش اور کردار کی بلندی کو ثابت کرتی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ نسیمی کی زندگی کے تفصیلی حالات معلوم کرنے کے ذرائع محدود ہیں ورنہ اس کے علو کردار کا مطالعہ یقیناً بہت دلچسپ اور خرد افروز ثابت ہوتا۔ بہرحال اتنا تو واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے مخالف ماحول میں رہ کر بھی نسیمی نے ایک بلند پایہ شاعری کا ورثہ چھوڑا جس کی دائم و قائم قوت نے انسان کا رتبہ بلند کیا، اور اس کے حق آزادی کو استوار کر کے اسے عزت نفس کا سبق سکھایا۔ اس اعتبار سے نسیمی کی شاعری کو انسانیت کا قصیدہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

مذہبی رجعت پرستی اور "دنیا ہیچ است" قسم کی ذہنیت اور عقیدے کے خلاف اس نے نعرہ بلند کیا کہ "انسان خلقت کائنات کا قلب ہے؟" "انسان جوہر موجودات ہے!"

نسیمی کی اس نوع شاعری کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے!

میری پرکار ہر دو عالم کا احاطہ کر سکتی ہے، مگر یہ دنیا میرا استحصار[1] نہیں کر سکتی!

میں دائم موجود ایک گوہر ہوں، مگر یہ دونوں جہان میرا استحصار نہیں کر سکتے!

ارض و سما یعنی خلقت کائنات کا قیکون میری ذات ہے۔ اس لیے خموش ہو جا، کوئی استدلال میرا استحصار نہیں کر سکتا!

یہ دونوں عالم میرے ۔ ۔ انتہا ہیں، میرے تو سر ہیں: میرا آغاز ہے، مگر تو مجھے اس علامت سے پہچاننے کی کوشش نہ کر، کیونکہ کوئی علامت میرا استحصار نہیں کر سکتی۔

۱۔ انگریزی ترجمے میں COMPASS کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ن۔ احمد

ظنّ تخمین میں مبتلا شخص صداقت کو نہیں پا سکتا، خدا کا احترام کرنے والا ہی
جان سکتا ہے کہ ظنّ و تخمین میرا استحصاء نہیں کر سکتے!
پیکر کا احترام کر، پیکر میں جوہر ہے۔ اس کا اعتراف کر، اس لیے کہ میں جسم بھی
ہوں اور روح بھی، لیکن جسم و روح بھی میرا استحصاء نہیں کر سکتے۔
میں صدف ہوں اور مروارید بھی، میں روزِ حشر کی میزانِ عدل ہوں، اور پل
صراط بھی، لیکن ما ناؤں سے بھری یہ دکان بھی میرا استحصاء نہیں کر سکتی!
میں کنزِ مخفی یعنی خدا ہوں، میں چشم دا ہوں، میں کان کے اندر کا ہیرا ہوں،
لیکن کوئی کان اور سمندر بھی میرا استحصاء نہیں کر سکتے!
میں ناپیدا کنار سمندر ہوں مگر میرا نام آدم ہے! میں انسان ہوں، میں دنیا ہوں،
زمان ہوں، مگر یاد رکھ، دنیا او رزمان بھی میرا استحصاء نہیں کر سکتے!
میں آسمان ہوں، ستارے ہوں، ملائک ہوں، خدا کا الہام ہوں؛ مگر
چپ رہ، کوئی ایسی زبان نہیں جو میرا استحصاء کر سکے!
میں ذرّہ ہوں، آفتاب ہوں، چہار عناصر ہوں، پنجتن پاک[2] ہوں شیشِ ابعاد
ہوں، شبِ موعود[3] ہوں۔ شام ہوں، مگر خموش لب بھی میرا استحصاء نہیں
کر سکتے!
میں جلتی جھاڑی[4] ہوں، آسمان بوس قلّۂ کوہ ہوں، مگر کوئی زبانِ شعلہ بھی میرا
استحصاء نہیں کر سکتی!

۲۔ انگریزی میں FIVE SAINTS کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مگر پانچ اولیاء کی تلمیح
میرے علم سے باہر ہے اس لیے میں نے پنجتن پاک سے کام لیا ہے۔
۳۔ انگریزی میں ASSIGNMENT NIGHT کا جملہ استعمال ہوا ہے جس کا
مفہوم سمجھنے میں مجھے اعتراف عجز ہے، محض لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔
۴۔ جلتی جھاڑی، شاید اشارہ ہے اس طرف کہ جب موسیٰ نے جنگل میں آگ دیکھی تو خوفزدہ
ہو گئے تھے۔

میں قند و انگبیں ہوں، ہمہ راہ ہوں، میں ذی حیات روح عطا کرتا ہوں، مگر
زندہ روح بھی میرا احصار نہیں کر سکتی!

میں تیر اور تفنگ ہوں؛ میں نوعمر ہوں اور ضعیف بھی؛ میں پایندہ مسرت
ہوں، مگر آیینے کا چوکھٹا بھی میرا احصار نہیں کر سکتا۔

نسیمی، گو میں آج قریشی یا ہاشمی ہوں، مگر میرے اوصاف بے شمار ہیں؛ لیکن
کوئی توصیف و توقیر بھی میرا احصار نہیں کر سکتی[5]!

۵۔ اس نوع کی شاعری، جس میں انسان کی سراپا راز ہستی کی عظمت اور اس کی امکانی قدرت
کی طرف بصیغۂ واحد اور متکلم اشارے کیے جاتے ہیں، دوسرے فارسی اور بعض اردو شعرا کے یہاں
بھی ملتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نسیمی برملا کہتا ہے، دوسرے احتیاط برتتے ہیں۔ کہتے سب ایک
ہی بات ہیں۔ مجھے نعتیہ غزل کا ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ "کتاب شریعت کا نہیں کہہ دوں، خدا
تم ہو!" ایک بات البتہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ نسیمی اس قسم کے اظہار خیال کا شاید موجد
بھی ہے۔ اس قسم کی شاعری کی بنیاد میرے خیال میں صوفیا کے اس عقیدے پر ہے کہ آخری منزل
فنا فی اللہ اور پھر بقا باللہ کی ہے۔
کرمی میکش اکبرآبادی کی عنایت سے حضرت نیاز بریلوی کی ایک غزل دستیاب ہوگئی، وہ قارئین
کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ تقابل کرنے میں سہولت ہو:

عاشق بتحیر منم، من نہ منم نہ من منم — عارف باسر منم، من نہ منم نہ من منم
سوز دل و جگر منم، وحشت پردہ در منم — در ہمہ بادہ گر منم، من نہ منم نہ من منم
شام منم، سحر منم، شمس منم، قمر منم — در ہمہ جلوہ گر منم، من نہ منم نہ من منم
ایں ہمہ بحر و بر منم، ویں ہمہ خشک و تر منم — قطرہ منم، گہر منم، من نہ منم نہ من منم
حسن و جمال حق منم، عزّ و جلال حق منم — حشمت و جاہ و فر منم، من نہ منم نہ من منم
آدم و شیث و نوح و ہود غیر حقیقتم نبود — صاحب ہر عصر منم، من نہ منم نہ من منم
موسیٰ و جلوہ بیں منم، قبلۂ فلسطیں منم — نور منم، شرر منم، من نہ منم نہ من منم
عیسیٰ مریمی منم، احمد ہاشمی منم — حیدر شیر نر منم، من نہ منم نہ من منم
راز و نیاز خود منم، سوز و گداز خود منم — ۶ کردہ قدم ز سر منم، من نہ منم نہ من منم

نسیمی اور اس کا عہد

ٹھیک اسی تاریخی دور اور حالات میں آذربائیجان کے اندر "حروفیت" کی ایک معاشرتی و فلسفیانہ تحریک شروع ہوئی جس کا موسس شاعر و مفکر فضل اللہ نعیمی تھا، جسے بعد کو کفر و انکار کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد تحریک کی قیادت عماد الدین نسیمی کو تفویض ہوئی۔ "حروفیت" کی یہ تحریک بنیادی طور پر جاگیردارانہ نظام اور تیموری حکمرانوں کے خلاف تھی جو اسلام میں رجعت پرستی کے اذعانی اصول (DOGMA) کی پوری حمایت کرتے تھے۔

"حروفیت" کا مخرج حروف ہجا ہیں۔ اس عقیدے کے مطابق اٹھائیس عربی حروف ہجا کو صفات الٰہی کا حامل مانا جاتا تھا، اس لیے کہ حروف ہجا کے بغیر نہ تو خدا کو پہچانا جا سکتا ہے نہ انسان کو نہ اشیائے عالم ہی کو جانا جا سکتا ہے۔ مگر "حروفیت" کی یہ تشریح بالکل ناکافی ہے۔ اس کا سماجی اور فلسفیانہ جوہر یہ ہے کہ اصل مقصد و مدعا ناقابل اندازہ حد تک وسیع اور اہم تھا۔ مجموعی اعتبار سے وہ آدمی جمہوریت قسم کا وحدت الوجود یعنی ہمہ اوست کا عقیدہ تھا۔

بانی مسلک نعیمی نے اس فلسفے یا عقیدے کی شرح و تفسیر میں چار تصانیف چھوڑی ہیں جن کے نام ہیں: جاوید نامہ، عرش نامہ، محبت نامہ اور نوم نامہ۔ یہ چاروں کتابیں نہایت دلچسپ ہیں اور ان کا اسلوب نہایت پرزور ہے۔ ان میں خدا اور انسان اور فطرت ثانیہ کو شاعرانہ جملۂ معترضہ کے ساتھ، حکایتوں اور تمثیلی اقوال کی شکل میں، جو مذہبی اساتیر سے اخذ کیے گئے ہیں، بیان کیا گیا ہے۔ مسلک "حروفیت" کو ان کتابوں کے مطالعے کے بغیر سمجھنا دشوار ہے، اس لیے کہ ان کے اندر اس عقیدے کی تفسیر بڑی شرح و بسط کے ساتھ کی گئی ہے۔

"حروفیت" کے رنگ میں خدا، انسان اور اجرام فلکی کے متعلق انداز فکر نسیمی کی شاعری میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ "حروفیت" کے بنیادی اصول سمجھے بغیر نسیمی کی فلسفیانہ نظموں اور ان کے اشعار کو سمجھنا بھی آسان نہیں ہے۔

نسیمی اپنے رفیق فضل اللہ نعیمی کا ایک وفادار شاگرد اور اس کی تعلیمات کا معتقد تھا۔

"حروفیت" کے ماننے والے اپنے مسلک اور عقیدے کی تبلیغ و اشاعت میں نہایت سرگرم اور مستعد تھے۔ مملکت آذربائیجان کے بڑے شہروں میں اُن کی تبلیغی شاخیں قائم تھیں اور مشرقِ قریب و وسطیٰ میں بھی ان کے داعی و مبلغ گشت کرتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کا مسلک مقبول ہو کر وسیع تر ہوتا رہا۔

اس تحریک کے سربراہوں نے ان ملکوں سے خفیہ رابطہ قائم کر رکھا تھا، جو اپنے اور بیرونی حکمرانوں کے ظلم و ستم کے خلاف تھے۔ اس بنا پر سمجھا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کا اصل مقصد سیاسی تھا۔

فضل اللہ کو گرفتار کر کے پہلے شیروان کے قلعے میں قید رکھا گیا تھا۔ پھر تیمور کے بیٹے میران شاہ نے باپ کے اشارے پر زنجیر ڈال لا کر ۱۳۹۴ء میں قتل کرا دیا۔

فضل اللہ اس طرف سے غافل نہیں تھا کہ اس کے قتل کے بعد اس تحریک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کوئی بات اٹھا نہ رکھی جائیگی، اور تحریک کے حامیوں پر زبردست تشدد کیا جائیگا۔ اس لیے اس نے بہت پہلے سے تحریک کے ممتاز کارکنوں کو ترکِ وطن کر کے دوسرے ملکوں میں چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس مشورے پر عمل کرنے والوں میں ایک نسیمی بھی تھا۔ وہ پہلے ترکی گیا اور وہاں کے مختلف شہروں میں گھومتا پھرا۔ پھر وہاں سے وہ عراق، شام اور دوسرے عرب ملکوں میں چلا گیا اور وہاں متوطن رہا۔ مگر وہ جہاں بھی رہا، اس کی شاعری ہر جگہ قبولِ عام کا درجہ پاتی رہی۔

نسیمی کی وفات کے متعلق مختلف روایتیں مشہور ہو گئیں۔ ذیل کی روایت زیادہ مستند سمجھی جاتی ہے:-

ایک نوجوان "حروفی" جو نسیمی کا شاگرد اور قریبی دوست تھا، ایک دن شہر حلب کے بھرے بازار میں نسیمی کی ایک غزل گا کر سنا رہا تھا، جس میں انسان کی عظمت و فضیلت کا بیان اس حد تک تھا کہ انسان ہی کو خدا کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ محکمۂ قضا کو خبر ہوئی تو وہ نوجوان کفر و انکار کے جرم میں ماخوذ کیا گیا۔ اس نے یہ اقرار کیا کہ وہ غزل اسی کی تصنیف ہے۔ اس پر اس کے قتل کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

اس حادثے کی اطلاع نسیمی کو جب ملی ہے، اُس وقت وہ ایک موچی کی دکان پر بیٹھا اپنا جوتا مرمت کرا رہا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی نسیمی دوڑا ہوا قاضی کی عدالت میں پہنچا اور کہا کہ اس نوجوان نے غلط اقرار کیا ہے۔ وہ غزل خود اس کی تصنیف ہے۔ چنانچہ وہ نوجوان تو رہا کر دیا گیا اور نسیمی کو سزاے موت دی گئی۔

ایک عرب مورّخ نے یہ واقعہ بالکل دوسری طرح سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب نسیمی کے مقدمے کی روبکاری ہوئی تو سلطان مؤید نے حکم دیا کہ اس کی زندہ کھال اتاری جائے اور اس کی لاش سات روز تک لٹکی رہے، تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔

غرض نسیمی ۱۴۱۷ء میں حلب میں جان سے مار دیا گیا۔ اس کے باوجود عوام کی محبّت اُسے حاصل رہی، ہر متنفس اس کی معجز بیانی کا ثناخوان تھا۔ اس وقت کے کٹر بنیتی مورّخ بھی اس حقیقت کے معترف ہیں۔ کہ وہ ایک نغز گو شاعر تھا اور اس لیے عوام کا محبوب جتنا نسیمی اپنے وطن میں تھا، اتنا ہی ازبکستان، ترکی، ایران اور آرمینیا میں بھی تھا۔ اس کی عام مقبولیت کا راز یہی تھا کہ وہ انسانیت پرست انسان تھا۔ انسان کو برترین مقام دیتا تھا۔ انسان کے ضمیر، استدلال پر، اس کے استقلال و استحکام کو اس کے ہمعصر بلند پایہ شعرا و مفکّرین نے سراہا ہے۔

یہ مسلم ہے کہ نسیمی ایک مفکّر شاعر تھا۔ مگر اس کا متغزّلانہ کلام بھی کسی صورت میں کم درجہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ نازک ترین جذبات انسانی کو نہایت شگفتہ اور مترنّم اظہار و بیان کا لباس عطا کر سکتا تھا۔ اس کا تغزّل بدرجۂ کمال رومانی فضا کا پروردہ ہے۔ مندرجۂ ذیل چند اشعار سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے:

تیرے عقیق لب آبِ حیات کا سرچشمہ ہیں۔ تیرے جواہر خانۂ دہن میں دانتوں کی سنگ گہر اور زبان کی شاخ مرجان مستور ہیں!

تیرا دہنِ شیریں تیرے لبوں کے اسرار بیان کرتا ہے۔ مگر وہ اسرار تو اسرار ہی رہتے ہیں!

۶۔ یونانی: دیومالا میں پرومیتھیوز ایک کردار ہے، جس نے دیوتاؤں سے نبرد آزما ہو کر انسان کو آگ لا دی تھی (مترجم)

اے جانِ جاں! میں تیری محبت میں مغموم ہوں۔ لیکن میری روح مسرور رہتی ہے؛
اس لیے کہ میری روح تو تیری روح کا مسکن ہے، میرے محبوب!
تیری چشمانِ سیاہ میری روح پر دراز پلکوں کے تیر برساتی ہیں، اور میرے دل
سے خون ٹپکتا رہتا ہے۔ مگر وہ زخم تو نظر ہی نہیں آتا۔
تیرا چہرۂ انور گیسوؤں کی گھٹا میں چھپ گیا ہے۔ یہ تعجب کی بات بھی نہیں، ماہتاب
بھی تو رات کی نقاب میں روپوش ہو جاتا ہے!
اے طبیبِ ناداں! میرے علاج سے درگزر، کہ عاشق کے دل میں آزارِ محبت تو
دوا ہی ہوتا ہے!

نسیمی کے سماجی اور فلسفیانہ معتقدات کی مخصوص نوعیت کے باوجود اس کا نظریۂ انسان کسی طرح بھی "حروفیت" کے چوکھٹے میں نہیں سماتا، بلکہ وہ بہت زیادہ وسیع اور متموّل تھا۔ اس کی شاعری میں انسانی فرد کی ذہنی فعلیت کئی دوسرے پہلوؤں پر بھی حاوی تھی۔ اس کی اساساً باغیانہ شاعری اپنے پیکر اور جوہر کے اعتبار سے انسانیت پرستی پر مبنی تھی اور اسی لیے مقبول بھی۔ وہ نوعِ انسان کا قصیدہ گو تھا۔ اس نے انسان کو "دن اور رات کا الہام اور دونوں عالم کا آغاز و انجام" کہا ہے۔ وہ کائنات میں انسان کی تجرید یا مطلقیت کا قائل تھا۔ اس کے اشعار میں انسان فخر یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ "میں ہی خدا ہوں!" "میں ہی خالق ہوں!" اس کی پوری شاعری میں انسان کے صحیح و قطعی معیار کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اور وہ معیار ہے صداقت! اور جب صداقت کو مافوقِ کل مان کر وہ اس کی تلاش کرتا ہے تو انسان "خدائے کامل" اور خدا کا ہمسر بن جاتا ہے! کہتا ہے:

شرق و غرب، سب خدا کا پیغام سنتے ہیں۔ مگر وہ عاشقِ صادق کہاں ہے جو خود
خدا بن جانا چاہتا ہے! خدا کی صداقت سے شیطان ہی آنکھیں بند کر سکتا ہے۔
اور وہ بھی جو انسان کو خدا نہیں سمجھتا!

نسیمی کی زندگی اور اس کا فن چونکہ سخت دشوار منازل سے گزرا ہے اور اس کی ذہانت و فراست اور شاعرانہ آگاہی کا ارتقاء ازمنۂ متوسط کے بہت دشوار حالات میں ہوا، آخر

اس کی زندگی اور حقیقت میں واقعی زندگی اور دنیا کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔

ایک قابلِ لحاظ بات یہی ہے کہ نسیمی کی "قدرِ انسانیت" کے اندر قومی، نسلی یا مذہبی تعصب کے لیے مطلق کوئی جگہ نہ تھی۔ اس قسم کے اختلافات اس دورِ استبداد میں حکمران طبقوں نے بالغرض اور بالقصد پیدا کر دیے تھے۔ نسیمی کی شاعری میں انسانی محسوسات اور روحانی اقدار کے سامنے ان تعصبات و اختلافات کی اہمیت و اصلیت بھی معدوم ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے:

> دنیا کی روحِ رواں آدم ہے! جو انسان کا احترام نہیں کرتا، وہ قبل ہو جانے کو ہے! کائنات کے بندھن اسی وقت تقطیع سے گر گئے، جب خدا نے آدم کی پیشانی پر اپنی مہر ثبت کر دی۔

دنیائے ادب میں بہت سے لافانی نام پیے جا سکتے ہیں، لیکن نوعِ بشر کی ثقافت کے اساطیر میں نسیمی جس کی ششش صد سالہ یوم ولادت کی تقریب آج منائی جا رہی ہے، بلا شبہ ان ہستیوں کی صف میں کھڑا ہے جنھوں نے عقل و دلیل سے سیاسی اور سماجی اذہانی اصولوں کی بیڑیاں کاٹ دینے میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔

کالیداس گپتا رضا

منشی گوبند رام

عربی فارسی کا مستند فاضل ہم سے جدا ہو گیا۔

شانتی دھرم سبھا نابھہ کے سرگرم سکریٹری منشی گوبند رام صاحب جو عربی فارسی کے ایک مسلّمہ فاضل اور ہندی زبان کے مشہور علّامہ تھے نرجلا ایکادشی کے دن نابھہ میں سرگباش ہو گئے

مدت ہوئی اخبارِ عام، لاہور کا ۹ جون ۱۹۱۷ء کا شمارہ نظر سے گزرا تھا اور اس میں مندرجہ بالا[1] خبر پڑھ کر حیرت ہوئی تھی کہ عربی فارسی کا ایسا جیّد عالم کون تھا جو صرف ۵۰ سال پہلے تک موجود تھا، مگر اس کی وفات کے فوراً بعد اس کی زندگی اور کارگزاریوں پر ایسے دبیز پردے پڑ گئے کہ اس کا کوئی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ رسالہ یا ان کا کوئی حوالہ نظر سے نہیں گزرا۔

۱۔ اخبارِ عام یکم جنوری ۱۸۷۱ء کو لاہور محلہ ہیرا منڈی متّصل کوتوالی حصہ حویلی راجہ دھیان سنگھ سے شائع ہونا شروع ہوا۔ پہلے ہفتہ وار پھر تین بار آٹھ صفحات خورد پر شنبہ، سہ شنبہ اور پنج شنبہ کو نکلتا تھا۔ مالک پنڈت مکند رام (۱۸۳۱ء تا ۱۸۹۷ء) اور اڈیٹر ان کے بیٹے گوپی ناتھ (۱۸۶۰ء تا ؟) تھے۔ پتہ پنڈت گوبند سہائے کا نام بھی بطور اڈیٹر آیا ہے۔ یہ صاحب پنڈت گوپی ناتھ کے بھائی تھے۔۔۔ صاحبِ تاریخِ صحافتِ اردو نے پنڈت گوپی ناتھ کے انتقال کا سال ۱۹۱۳ء دیا ہے۔ مگر میرے پاس اخبار کے ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۳ء کے چند پرچے ہیں ان سب پر بطور اڈیٹر پنڈت گوپی ناتھ ہی کا نام ہے۔ ۱۹۲۵ء کے ایک شمارے میں بھی ایک مضمون "از بندہ گوپی ناتھ حال وارد کشمیر" ہے۔

ایک دن کسی سلسلے میں ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ (از ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۴۲ء
انجمن ترقی اُردو (ہند، دہلی) کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ص ۲۱۷ پر فنون و علوم طبیعہ کی ذیل میں
مشہور کتابوں کے ساتھ ۲ کے سامنے یہ الفاظ نظر پڑے :

شرح گل کشتی (انیسویں صدی عیسوی) گوبند رام ۔ میر نجات کی گل کشتی کی شرح ہے ۔

پھر اسی کتاب کے ص ۲۲۲ پر "لغت و صرف" کے تحت کامتا پرشاد ناداآں ، میٹڈ لال نادر ،
ہیرالال ضمیر ، جیسے مشاہیرِ فارسی ادب کی تصانیف کے ساتھ تصنیف نمبر ۲ کے طور پر یہ لکھا
ہوا ملا :-

نصابِ مثلث (قبل ۱۲۹۷ھ) گوبند رام (یونیورسٹی لائبریری)

اس سے دلچسپی اور بڑھی اور رفتہ رفتہ منشی گوبند رام کی تقریباً دو درجن تصانیف میں سے چند
دستیاب ہوگئیں ۔ ایک رسالہ "گوبند پرکاش" بھی مل گیا جس میں مرحوم کی زندگی سے متعلق
ضروری سنین درج ہیں ۔ پھر پوچھ گچھ سے ان کے خاندان کے چند افراد سے ذاتی ملاقات کا
شرف بھی حاصل ہوگیا ۔

رسالہ گوبند پرکاش کے مرتب منشی گوبند رام کے پوتے جناب حکیم ہری داس صابر ہیں ۔ یہ
پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں منشی رام سہائے تمنا کے تمنائی پریس ، محلہ نوبستہ لکھنؤ میں چھپا تھا ۔
منشی صاحب مرحوم کے خاندانی حالات اسی رسالے کی زبانی سنیے :

> ریاستِ نابھہ کے مشہور و معروف خاندان دیوانان میں لالہ جے گوپال صاحب ایک
> صاحبِ اقتدار شخص گزرے ہیں ، جن کے اولادِ نرینہ کے علاوہ دو دختر نیک اختر
> بھی تھیں ، جن میں سے دخترِ کلاں لالہ نیا مل صاحب ساہوکار کے خاندان میں
> لالہ گوکل چند صاحب مقیم بدھ پٹیالہ سے کتخدا تھیں ۔
>
> لالہ نیا مل صاحب قصبہ بالانوالی علاقہ سنگرور میں بڑے نامی گرامی رئیس
> تھے ۔ اُن کے نام پر علاقہ مذکور میں اب تک یہ ضرب المثل زبان زدِ خاص و عام
> چلی آتی ہے کہ کیا یہ شخص اپنی بساط سے بڑھ کر فلاں کام کرنے سے نیتے " (یعنی

نیتال ہو جائیگا۔ یہ صاحب مع اپنے ایک فرزند لالہ کرم چند صاحب کے پٹیالہ آکر آباد ہو گئے۔ ان کے فرزند لالہ گوکل چند صاحب پٹیالہ میں دکان داری کیا کرتے تھے۔ آپ کا انتقال کاتک بدی اشٹمی سمبت ۱۹۱۱ (۱۸۵۴-۵۵ء) میں نہری جوالا جی پر ہوا۔ آپ کے دو فرزند تھے: لالہ تلسی رام صاحب و لالہ گوبند رام صاحب۔ آخر الذکر کا جنم پوہ بدی ۱۵ سمبت ۱۹۰۶ (۱۴ دسمبر ۱۸۴۹ء) کو ہوا۔

گوبند رام صرف پانچ برس کے تھے جب اُن کے والد محترم کا انتقال ہو گیا اور یہ یتیم بے سہارا ہو کر رہ گئے۔ جیسا کہ انھوں نے خود شرح گل کشتی کے دیباچے میں لکھا ہے، ان کی پرورش بڑے بھائی تلسی رام کے زیرِ سایہ ہوئی جو ضلع پاول (ریاست نابھ) میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز رہے۔

منشی صاحب کا خاندان کوئی علمی ادبی گھرانا نہیں تھا۔ بنج بیوپار کو اعلیٰ لکھائی پڑھائی سے کیا سروکار! اتنی ہی شُد بُد کافی سمجھی جاتی تھی جو حساب کتاب اور ساہوکارے کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے پٹیالہ ہی میں ہندی پڑھنی شروع کی اور بارہ سال کی عمر تک اس قابل ہو گئے کہ اپنے ایک دُور کے چچا لالہ اندرسین ساہوکار کی دکان کا کام بطریقِ احسن انجام دینے لگے۔ لالہ اندرسین ان کی لیاقت اور کارگزاری سے خوش تھے اور ان سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔ مگر قضائے الٰہی سے ان کی سمبت ۱۹۲۰ (۱۸۶۳-۱۸۶۴ء) میں وفات ہو گئی۔ منشی گوبند رام نے اس کے بعد بزازی اور صرافے کی دکان کھول لی، لیکن اس میں طبیعت نہ لگی۔ آخر عمر ہی کیا تھی، مزید تعلیم کا شوق دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ بالآخر سمبت ۱۹۲۳ (۱۸۶۶-۱۸۶۷ء) میں وہ جگادھری کے ایک گاؤں کے رہنے والے لچھمن شاستری صاحب سے سنسکرت پڑھنے لگے۔ ان سے شریمد بھگوت گیتا اور وشنو سہسر نام کی تعلیم پائی اور دیوبانی کی تکمیل کے لیے سنسکرت ویاکرن یعنی لگھو کومدی وغیرہ حفظ کر ڈالے۔ دھرم شاستر کی رُو سے یگیوپویت (جنیو) پہنا اور سندھیا بھی پڑھی۔

منشی صاحب سنسکرت میں بڑے خوشنویس تھے۔ ان کی سنسکرت کی خوشنویسی کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ ان کی کتاب وشنو سہسر نام کے کئی ورق پھٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک

برہمن گوسوامی سے درخواست کی کہ وہ چھپنے ہوئے اوراق اپنی کتاب سے دیکھ کر خوشخط لکھ دے۔ وہ برہمن بہت دنوں تک لیت و لعل کرتا رہا۔ ایک دن خیال آیا کہ خوشنویسی کی مشق کر کے میں خود ہی کیوں نہ لکھ لوں۔ تاکہ کم از کم اس باب میں دوسروں کا منہ نہ تکنا پڑے۔ دھن کے پکے تو تھے ہی سنسکرت خوشنویسی سیکھنے پر جُٹ گئے اور مشق کے بعد اپنی کتاب خود مکمل کی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب آہستہ آہستہ اُردو کا بول بالا ہو رہا تھا اور فارسی کی قدر و قیمت کم ہونے لگی تھی۔ تاہم ہنوز فارسی کے بغیر آگے بڑھنے کے مواقع کم تھے۔ ہندوؤں میں حفاظ کے لیے برہمنک سنسکرت علوم کا جاننا ضروری خیال کیا جاتا ہے، مگر معاش کے لیے فارسی پڑھے بغیر کسی اعلیٰ مرتبے پر پہنچنا مشکل تھا۔ ابھی تک نہ شمالی ہندوستان کے مسلمان اُردو اور فارسی کو صرف اپنی زبانیں سمجھتے تھے۔ نہ ہندو انھیں پرائی بھاشائیں کہتے تھے۔ انگریزی کی طرح جو بھی یہ زبانیں سیکھ گیا، اس کی تعلیم مکمل خیال کی جاتی تھی۔ گوبند رام کے محلے کے چند ساتھی لڑکوں نے، جو مدرسے میں فارسی پڑھتے تھے، انھیں بھی فارسی پڑھنے کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ سمت ۱۹۲۵ (۱۸۶۸ء - ۱۸۶۹ء) میں فارسی کی بسم اللہ ہوئی۔ اس کے چھ ہی مہینے بعد انھیں نابھا جانا پڑا۔ یہاں بعض کج فہموں نے انھیں اس عمر میں فارسی پڑھنے سے باز رکھنے کی کوشش میں کچھ طعنہ زنی بھی کی، مگر علم کی پیاس طعنوں کے زہر سے نہیں، محنت کے پسینے سے بجھتی ہے۔ منشی صاحب نے اپنی عرق ریزی اور جانگدازی سے تین ہی سال میں متداول کتابیں ابوالفضل اور سکندر نامہ وغیرہ سے فراغت حاصل کر لی اور پھر تین چار ماہ پٹیالہ میں مشہور خوشنویس مرزا عباد اللہ دہلوی[2] کی خدمت میں رہ کر خوشنویسی کی مشق کی اور ان کے بہترین

2۔ مرزا عباد اللہ (یا عبید اللہ) ابن میرزا عبد اللہ بیگ، امیر پنجہ کش (۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء / ۱۳۳۵ء) کے شاگردوں میں ممتاز تھے۔ ان کا خط غالب مرزا (متوفی ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء - ۱۸۵۸ء) کے خط کے برابر تھا۔ دربار شاہی سے "زمرد رقم" خطاب ملا تھا۔ غدر کے ہنگامے سے متاثر ہو کر پٹیالہ میں ملازم ہو گئے تھے، وہاں بہت عزت و شہرت حاصل کی۔ پچھلی صدی میں وہیں انتقال ہوا۔ ان کو "اعجاز رقم" کا خطاب بھی ملا تھا۔ ان کی ایک وصلی میوزیم میں محفوظ ہے (صحیفۂ خوشنویساں ۲۲۰)۔ ایک اور صاحب کے شاگرد بہاری لال مشتاق خوشنویسی میں مرزا عباد اللہ بیگ ہی کے شاگرد تھے۔ مشتاق کا ۱۹۰۳ء میں دلی میں انتقال ہوا۔

نابھ چلے آئے۔

یہاں آکر خیال آیا کہ فارسی بغیر عربی کے طعام بے نمک معلوم دیتی ہے۔ چنانچہ
سمت ۱۹۳۰ (۱۸۷۳ء - ۱۸۷۴ء) میں عربی شروع کر دی۔ سوا سال میں کافیہ تک
تعلیم پائی اور کافیہ ازبر کیا۔ پھر شرح ملا بحث حروف تک پڑھی۔ پھر کتب منطق
شروع کر کے تصنیف قطبی و میر قطبی تک پڑھا۔

اب منشی صاحب کی عمر ۲۰ سال کی ہو چکی تھی۔ معاش کی فکر دامنگیر ہوئی۔ وہ سمت ۱۹۳۲
(۱۸۷۵ - ۱۸۷۶ء) میں محکمۂ بندوبست میں ملازم ہو گئے اور یوں چندے علمی مصروفیات
سے دستکش ہونا پڑا۔

کسے دید در آفاق بیک شہر دو سلطان

مگر یک بیک اس شوق نے پھر سر اٹھایا اور مثنوی "گل کشتی" کی شرح کی بنیاد پڑ گئی، جس کی تکمیل
پر طباعت کے لیے مہاراجا ہیرا سنگھ والیِ نابھ نے ازراہِ قدردانی ۲۰۰ روپیہ مرحمت
فرمایا۔

سمت ۱۹۳۶ میں خزانہ نابھ کی محرری ملی۔ یہاں بھی کثرتِ کار سے دل تنگ رہا۔
شروع سمت ۱۹۳۷ میں محکمہ گردہ کپتانی میں تبدیلی ہو گئی۔ اس کے بعد ماہ
کاتک سمت ۱۹۳۸ میں ڈیوڑھی معلی پر محرری پر مشرف ہوئے۔ ایک سال بعد
پھر بدستور سابق پر واپس آ گئے۔ یہاں پر قصائد عرفی کی شرح تیار کی اور رسالہ
اگربنش پرکاش لکھا اور طبع کرایا۔ سمت ۱۹۴۲ میں صیغۂ عمارت یعنی پبلک ورکس
ڈپارٹمنٹ میں ہیڈ مقرر ہو گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اردو، عربی فارسی کے فاضل ہونے کے باوجود ان کی سنسکرت سے دلچسپی کم نہیں تھی۔
چنانچہ انھوں نے چند سال میں کھوڑ... انبالہ کے فاضل سنسکرت اور شری دھری ٹیکا د شرح
شری بھاگوت کے مصنف پنڈت جسی دھر سے سارسوت، رگھو دوت، ترک سنگرہ، بدرکرت،
چندرودے، منو سمرتی وغیرہ گزشتہ پڑھے۔ بعد ازاں سمت ۱۹۶۹ (۱۹۱۲-۱۹۱۳ء) تک
متعدد مضامین کے علاوہ انھوں نے ہندی اور سنسکرت میں یہ کتابیں تصنیف کیں:

تیتہ شوچ بدھی ۔ سندھیا بدھی ، اسنان بدھی ۔ گنگا نہان بدھی یسنکلپ بدھی وغیرہ ۔

وہ سمبت ۱۹۷۰ (۱۹۱۳ ۔ ۱۹۱۴ء) میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے ۔ اس کے بعد کلی ہمہ وقت شغل تصنیف و تالیف میں معروف رہے اسی زمانے میں آئین اکبری کے ایک فقرے پر مجدد السنۂ شرقیہ سید احمد حسن شوکت میرٹھی سے ایک علمی مناظرہ ہوا ۔ اس بحث کا آغاز شوکت میرٹھی کے ایک مضمون سے ہوا جو انھوں نے اخبار عام لاہور کے ۲۰ اگست کے شمارے میں بعنوان آئین اکبری کا ایک فقرہ لکھا تھا ۔ مضمون کا پہلا ہی فقرہ تھا ۔

سلاطین مغلیہ کے بے بہا گوہر شہنشاہ اکبر کا یہ فقرہ کتاب آئین اکبری میں درج ہے :

در ہندوستان کسے بدعوی پیغمبری برنخاست ۔

زیرا کہ خدائی پیش می رود ۔

یعنی ہندوستان میں کسی نے اٹھ کر پیغمبری کا دعویٰ نہیں کیا ۔ کیونکہ یہاں تو خدائی آگے جاری ہے ۔ یعنی پیغمبر تو انسان ہوتا ہے ۔ ہندوستان میں تو تمام اوتار اور دیوتا خدا گزرے ہیں ۔ پس خدائی چھوڑ کر پیغمبری کا دعویٰ کر کے کون اپنی ہنسی کرتا کیا انسان کیا خدا ۔

منشی صاحب ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو اسی اخبار میں ضروری تمہید کے بعد جواباً لکھتے ہیں :

..... بلا واقفیت دوسرے مذہب میں خواہ مخواہ دخل دینا بعید از دانش ہو ۔

جونکہ وہ (شوکت میرٹھی) خامہ فرسائی کر چکے ، لہذا کچھ ادھر سے بھی ہدیۂ ناظرین ہوتا ہو ۔

نگفتہ ندارد کسے با تو کار

ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

..... آئین اکبری کے احوال ہندوستان میں .... ۲۲۸ اقوال "ادبی فرمودند" کے نام سے درج ہیں ۔ ان میں سے یہ ۱۲۷ واں ہی فرمودند ہے (شوکت صاحب کی) اور تو عبارت درست ہے مگر بجائے از آنست ، زیرا کہ درج ہوا ہے ۔ شاید ابوالفضل کو اصلاح دی گئی ہے ۔ کیونکہ شوکت صاحب

مجذوالسنہ ہیں۔ لہٰذا اصلاح مناسب ہے۔

منشی صاحب کا یہ مضمون بہت طویل ہے، اختصار کے مدِ نظر بعد کی بحث حذف کی جاتی ہے۔ نام شمارے بھی ہمارے پاس موجود نہیں۔ قصّہ کوتاہ اس بحث نے طول کھینچا اور گھمسان کا رَن پڑا۔ جمہور کی رائے یہی تھی کہ میدان منشی صاحب کے ہاتھ رہا۔ سمبت ۱۹۷۲ (۱۹۱۵ - ۱۹۱۶ء) میں ان کی دھرم پتنی نے رحلت کی۔ اس کے سال بھر بعد سمبت ۱۹۷۳ (۱۹۱۶ - ۱۹۱۷ء) میں ان کا رسالہ رسوم اگروالاں طبع ہوا۔ اب وقت آخر آپہنچا تھا۔

سمبت ۱۹۷۴ جیٹھ سُدی (جون ۱۹۱۷ء) نرجلا ایکادشی کے روز شکل پکش اُترائین بیتی پات یوگ میں عین دوپہر کے ۱۲ بجے دھرم چرچا کرتے ہوئے اڑسٹھ برس کی عمر میں سرگباش ہو گئے۔ جب ارتھی شمشان بھومی میں جانے لگی اس وقت آسمان سے کڑاکڑاتی دھوپ کے اوپر بادلوں کا سایہ آگیا۔ لوگ دنگ ہو گئے۔ ارتھی کے ساتھ جم غفیر تھا۔ شہر بھر میں لوگوں نے افسوس کیا۔ داہ کرم وغیرہ سب شاستر انوسار ہوا...... اخبارات نے حسرت آیات مضامین لکھے....

رام سہائے تمنا لکھنوی نے انتیس شعر کا تاریخی قطعہ کہا، جو منشی صاحب کے اوصاف و اطوار پر بہت روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے چند جستہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ہے جو نابھ کی مبارک سرزمیں	اس میں تھے اک منشی گوبند رام
عالم ذی ہوش و با اعزاز تھے	فکر کا رِ خیر تھی دل میں مدام
اہلِ تصنیفات تھے یہ نکتہ سنج	ہے مفید و خوب ان کا ہر کلام
میں نے بھی دیکھیں کتابیں آپ کی	ہیں جو مقبول و پسندِ خاص عام
دھرم کے پابند تھے یہ اہلِ دیں	یادِ حق سے ان کو تھا ہر وقت کام
آپ کے در پر پئے تحصیل علم	رہتے تھے شاگرد حاضر صبح و شام
تھے ہمیشہ عادی اشغال نیک	فعلِ ناقص کو سمجھتے تھے حرام
عمر اڑسٹھ سال کی جب ہو گئی	بہرِ رخصت موت کا پہنچا پیام
یک ہزار و نہ صد و ہفتاد و چار	ہے یہ سالِ رحلتِ عالی مقام

شان سے اٹھا جنازہ آپ کا | تھا بہت مجمع، بہت تھا اژدہام
اے تمنّا سالِ رحلت کے لیے | پیشِ ہاتف سر جھکا کر، کر سلام

مصرعۂ تاریخ یہ دو بار پڑھ
"رام ہی میں رم ہیں اب گو بند رام"

(۹۸۷ × ۲ = ۱۹۷۴ سمبت)

منشی صاحب جتنے بڑے عالم تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے۔ ایک کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ بہتیرے شائقینِ علم ان کے زیرِ تعلیم رہے اور فیضیاب ہو کر برسرِ روزگار ہوئے۔ بیکس و مجبور کی دل و جان سے مدد کرتے اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے تھے قرب و جوار میں کونسا ایسا رفاہِ عام کا کام ہو جس میں انھوں نے حصّہ نہ لیا ہو۔ اہلِ علم کی ملاقات کو باعثِ فخر تصوّر کرتے منشی اندرمن مراد آبادی، منشی دوارکا پرشاد افق، رام سہائے تمنّا لکھنوی، للتا پرشاد ورما شاد میرٹھی، پنڈت گوپی ناتھ (ایڈیٹر اخبارِ عام) اور بیسیوں دوسرے ہندو اور مسلمان علما و فضلاء سے قریبی تعلقات تھے۔ خود پکے سناتن دھرمی اور دھرم کرم کے نہایت پابند تھے، اس کے باوجود غیر مذہب والوں کو ہمیشہ اپنے اپنے مسلک پر چلنے کی تلقین کیا کرتے۔ ۲۲ سال تک وہ سناتن دھرم سبھا ملتان کے سکریٹری رہے۔ رہنا سہنا نہایت سادہ تھا۔ تصویر سے اندازہ ہوتا ہے کہ چھریرا بدن اور درمیانہ قد ہوگا۔ داڑھی رکھتے تھے اور سر پر بڑا سا عمامہ باندھتے تھے۔ سلامت روی، خوش خلقی اور متانت اُن کے خمیر میں تھی۔ اتنا بلند مرتبہ انسان ہوتے ہوئے بھی دماغ میں رعونت کی بو تک نہ تھی۔ ارادہ اتنا پختہ تھا کہ جب کسی کام کا عزم کر لیا، اُسے کر کے چھوڑا۔

انھوں نے اُردو فارسی و عربی کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا ایسا ذخیرہ اکٹھا کر لیا تھا کہ بعد شاید انتقال کے دس بارہ سال بعد ان کے لائق پوتے لالہ ہری داس صابر نے اس خیال سے کہ یہ نادر کتابیں محفوظ ہو جائیں، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کی کئی لائبریریوں میں تقسیم کر دیں۔ ان کتابوں کی ایک نامکمل سی فہرست ہمارے پیشِ نظر ہے جس میں ۲۰۸ کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ اس میں سے چند قلمی نسخوں کے نام ملاحظہ کیجیے، تاکہ آپ کو

ان کے کتب خانے کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے :

شرح سکندر نامہ ؛ شرح جواہر الحروف (امام بخش صہبائی) ؛ قران السعدین ؛ شرح مخزن اسرار ؛ شرح گلستان (محمد اکرم ملتانی) ؛ شرح ہر سہ دفتر ابوالفضل (مولوی محمد غیاث الدین) ؛ شاہنامہ فردوسی ؛ شرح قصائد بدر چاچ ؛ خاقانی ؛ ہشت بہشت (خسرو) ؛ مخزن اسرار ؛ رسالہ مفردات ؛ عروض سیفی ؛ شرح مایۃ عبد الرسول ؛ شرح کافیہ ؛ شرح مایۃ عامل ؛ شرح ملا جامی ؛ میر قطبی ؛ قرآن مجید ؛ مفتاح القرآن ؛ لغات القرآن ۔ سراج الساق وغیرہ ۔

باقی ماندہ سب کتابیں بھی بہت اہم ہیں ۔ مندرجہ بالا کتابوں کی تقسیم کے متعلق ۱۹ دسمبر ۱۹۲۶ء کا اخبار "جاگرت" (لائل پور ۔ پاکستان) یہ خبر دیتا ہے :

ناظرین یہ سن کر خوش ہوں گے کہ حکیم ہری داس جی صاحب نابھوی نے عربی ، فارسی اور اردو کی بہت سی نادر کتب ناتن دھرم یووک سبھا لپتکالیہ ، کوئٹہ ، (بلوچستان) کو دان دی ہیں ۔ ان کتب میں بہت سارے قلمی نسخہ جات بھی شامل ہیں ۔ ایک عربی فارسی قدر شناس علم دوست کی نظر میں اس علمی خزانے کی قیمت دو ہزار سے کسی صورت بھی کم نہ ہوگی ہم . . . . . حکیم صاحب کو . . . . . . اس امر کے لیے مبارکباد دیتے ہیں ۔ آپ کے بزرگ بڑے عالم اور علم دوست تھے ۔

وقت کی آندھیاں بڑے سے بڑے تناور درخت کو اکھاڑ پھینکتی ہے ۔ خدا کرے کہ کتابوں کا یہ بیش بہا ذخیرہ اپنے اپنے مقام پر آج بھی محفوظ ہو اور منشی صاحب کے جمع کیے ہوئے علمی خزانے سے طالبان ادب آج بھی مستفید ہو رہے ہوں !

منشی صاحب بطور شاعر مشہور نہیں ، ہمیں ان کا کوئی کلام منظوم دستیاب نہیں ہوا ۔ شرح گل کشتی کے منشی صاحب کے لکھے ہوئے دیباچے میں "ابیات شاعرے" کے عنوان سے جو اہم اشعار کی فارسی مثنوی شامل ہے ، وہ منشی صاحب ہی کے زور قلم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے[۳] ۔ اگر یہ کسی دوسرے

۳ ۔ جناب ہری داس صاحب نبیرہ منشی گوبندرام مرحوم نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ یہ اشعار ان کے دادا مرحوم ہی کے ہیں ۔

شاعر کا نتیجۂ فکر ہوتی تو اس کے نام یا تخلص کے چھپانے کی کوئی معقول وجہ بھی ضرور ہوتی، ورنہ ابیات شاعر کے "بوستان" کے مصنف کی پردہ پوشی نہ کی جاتی۔ دوسرے مثنوی کا رنگ سرتاپا مقامی ہے، یعنی پہلے سکھوں کے دس گوروؤں کی مدح اور آخر میں مہاراجا ہیرا سنگھ والیٔ نابھ کی شان میں چند ابیات۔ ادھر اُدھر سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مرا شوق مدحت نوذ ز است — پے حمد و وصف شری نانک است
دوم بادشاہ انگد برحق است — کہ دارد کلید ہدایت بدست
سوم بادشہ شد گرو امرداس — کہ دارد صفات برون از قیاس
چہارم گورو رام داس آمدہ — کہ ذاتش ہدایت اساس آمدہ

اسی طرح دسوں بادشاہوں (گوروؤں) کے نام اور اوصاف گنائے ہیں۔ پھر دسویں گورو شری گوبند سنگھ جی مہاراج کی اس پوشاک کا ذکر ہے جو نابھ کے قلعے کے اندر ایک بڑے بُرج میں خاص و عام کی زیارت کے لیے "از غایت عزّ و شان" محفوظ ہے:

نہاد است ملبوس آں نام دار — بہ بُرجے معظّم درون حصار

آخر میں مہاراجا ہیرا سنگھ والیٔ نابھ کی شان کا بیان ہے:

چہ راجا مہاراج عالی جناب — کہ شد خسرو خسر دانش خطاب

اس دیباچے میں مثنوی کے علاوہ چھ شعر شہر نابھ کی تعریف میں بھی ہیں۔ ان میں سے تین شعر یہ ہیں:

چہ نابھ کہ آبش مے ناب ہست — غبار رہش مشک نایاب ہست
گدایش ز دارا و جم بہتر است — ثنا ایش ز مدح صنم خوشتر است
بسے روز و شب گشت چرخ بریں — ندید است در ہر دو عالم چنیں

منشی صاحب کی فن شعر سے واقفیت مُسلّم ہے۔ ان کے اشعار میں بحر و وزن کی کوئی لغزش نہیں پائی جاتی۔ "عروض سیفی" کے علاوہ جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، علم عروض سے متعلق دوسری کئی کتابوں کے نام بھی ان کے کتاب خانے کی فہرست میں ملتے ہیں۔ دیباچے کے خاتمے

یں" مثنوی کے بحر و وزن کے تعین کے بعد انھوں نے قاری کے لیے آغاز کے شعر کی تقطیع بھی کی ہے:

درگپ عشق مرا آں نامہ کر دلخواہ بود
زینتش نام خوش حضرت اللہ بود

تقطیع اینکہ، درگپ عش فاعلاتن تمرا نا فعلاتن
مکر دلخا فعلاتن ہبود فعلن + زینتش نا فاعلاتن
محنش حض فعلاتن رت اللہ فعلاتن ہبود فعلن

منشی صاحب تمام عمر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ اس عہد میں آریہ سماج نیا نیا میدان میں اترا تھا اور احمدی فرقہ بھی حال ہی میں معرض وجود میں آیا تھا؛ دونوں نے خاص و عام کے فکر و نظر کو اپنے اپنے ڈھنگ سے متاثر کیا تھا۔ مذہبی مناظرے اور مباحثے عام طور پر ہونے لگے۔ منشی صاحب بھی سناتن دھرم کے دفاع کے لیے اس کارزار میں کود پڑے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے علم و فضل کا بیشتر حصہ اسی لڑائی کی نذر ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں مناظرانہ رنگ بہت ملتا ہے۔ تاہم اُن کی بہت سی کتابوں میں سے ذیل کی تصانیف علمی/ادبی طور پر بھی ان کے نام نامی کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں:

۱۔ نصاب مثلث (قلمی) ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) علم لغت و صرف سے متعلق ہے۔
۲۔ شرح قصائد عرفی
۳۔ شرح گل کشتی
۴۔ بستان سعدی
۵۔ رسالہ تحقیقات الفاظ متداولہ

۴۔ اس مثنوی کا وزن فاعلاتن، فعلاتن فعلاتن فعلن ہے جو مثنوی کی سات مخصوص بحروں میں نہ آتا، البتہ فاعلاتن فعلاتن فعلن کا وزن مثنوی کے مقررہ اوزان میں ہے۔ ظاہر ہے کہ گل کشتی منظوم اس بنا پر مثنوی کہا گیا ہے کہ یہ ایک مسلسل نظم ہے اور اس کے ہر دو مصرعوں میں قافیے کی قید ہے مثنوی کی ایسی مثالیں ہر عہد میں ملتی ہیں

ان میں پہلی دو کے سوائے بقیہ کتابیں ہمارے سامنے ہیں، جن کا مختصر تعارف بمحل ہوگا:

شرحِ گل کشتی: ایران کے پہلوانوں میں یہ رسم تھی کہ جب کوئی پہلوان اپنے کسی حریف سے کشتی لڑنا چاہتا، تو وہ اس کے پاس پھول یعنی گل کشتی بھیج دیتا، یہ گویا مقابلے کی دعوت ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ میر نجات نے اپنی یہ مثنوی سید مہدی کی تعریف میں کہی تھی جو کشتی کے فن میں اکمی بتقدری تھا اور شکست کے ڈر سے مقابلے میں نہیں اترتا تھا اور گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر بیٹھ رہا تھا۔ یہ نظم مہدی کی صلاحیتوں کو ابھارتی ہے تاکہ وہ اپنے احساسِ کمتری کے خول سے نکل کر حریف سے کشتی لڑے اور اُسے پچھاڑ دے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ نوجوان یعنی سید مہدی اصفہانی شاہزدگانِ صفویہ میں سے تھا جو دنگل ہار کر ندامت سے خانہ نشین ہو گیا تھا۔ میر نجات نے اس کی شرمندگی دور کرنے کے لیے یہ مثنوی لکھی، جو بظاہر کشتی کے فن پر ہے مگر "بر محاورۂ رنداں" تصنیف کی گئی ہے۔ اس کے پڑھنے سے سید مہدی کی ندامت دور ہوئی اور وہ از سرِ نو ہمنشینوں سے ملنے جلنے لگا۔ اس قسم کی اور بھی کئی روایتیں ہیں جنھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

شرحِ گل کشتی مصنفہ منشی گوبند رام ساکن ریاست نابھہ "۸ × ۱۰" کی بڑی تقطیع پر مطبع سودرشن، مراد آباد سے سمبت ۱۹۳۹ (۱۸۸۲ء) میں چھپی تھی۔ سرورق بہت خوبصورت ہے جسے مولوی الٰہی بخش خوشنویس رام پوری شاگردِ میر عوض علی (ف، ۲ محرم ۱۲۹۸ھ) نے تیار کیا تھا۔ شرح کے متن کا آخری جملہ یہ ہے:

تمام شد شرحِ مثنوی گل کشتی منتخب از شروحاتِ اساتذہ و فوائدِ متفرق زبانیِ بعض بلغا۔

قطعۂ تاریخ منشی سکھن لال نائب ہیڈ ماسٹر اسکول نابھہ نے کہا۔ مادۂ تاریخ اور قافیہ دونوں داد کے قابل ہیں:

این کہ گوبند رام کرد رقم | خوب بے مثل شرحِ گل کشتی ست
بہرِ تاریخ حرفِ معجم گیر | خوب بے مثل شرحِ گل کشتی ست

(۱۹۳۹ سمبت)

کتاب ۹۰ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں ۱۲۹۱ اشعار ہیں۔ ہر صفحے پر کم سے کم تین اور زیادہ سے
زیادہ نو اشعار دے کر اس کے چاروں طرف شعر بشعر فارسی اشعار کی فارسی میں شرح کی گئی ہے۔
کتاب کی اشاعت کے وقت ہر چند منشی صاحب کی عمر ۳۲ برس کی تھی مگر اس شرح سے معلوم
ہوتا ہے کہ اس وقت بھی ان کی فارسی استعداد غیر معمولی تھی۔

بہتانِ سعدی: بوستان کے باب ہشتم در فضیلت شکر میں شیخ سعدی نے ایک حکایت
ہندوؤں کے مشہور مندر سومناتھ سے متعلق تحریر کی ہے۔ قصّے کے
پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ان کی اپنی سرگزشت ہو اور سب واقعات چشم دید
ہوں۔ منشی صاحب نے دلائل سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ محض ایک
حکایت ہے سرگزشت نہیں ہے۔ چونکہ اس میں سعدی نے ہندوؤں اور ان کی مورتیوں
کو برا بھلا کہا ہے اور جو واقعہ چشم دید کے طور پر دیا ہے، وہ واقعی نادرست ہے اس لیے
اس رسالے کا نام بہتانِ سعدی رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی عبارت مناظرانہ ہے۔
منشی صاحب کی تحقیق مکمل تو نہیں کہی جا سکتی۔ تاہم آپ نے ایک ایسے نکتے کی طرف
توجہ دلائی ہے، جو سعدی کے بیان کی تغلیط کے لیے کافی ہے اور بلا شک و شبہہ اس نکتے
کا کریڈٹ صرف منشی صاحب ہی کو جاتا ہے۔ سعدی کے قصّے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ
مورتی ہاتھی دانت کی بنی ہوئی انسانی شکل کی تھی، اور یہ سونے کی ایک کرسی پر رکھی تھی۔
جب صبح کے وقت لوگ مورتی (سومناتھ) کے درشن کو آتے، تو مورتی ہاتھ اٹھا کر ان
سب کے لیے خدا کے آگے فریاد کرتی تھی۔ سعدی نے اس کا راز اس طرح طشت از بام
کیا کہ پسِ پردہ ایک فرتوت "آذر پرست" کو جا پکڑا، جو رسّی کھینچ کر مورتی کا ہاتھ بلند کرتا
تھا اور یوں لوگوں کو فریب دیتا تھا۔
منشی صاحب کہتے ہیں (۱) ہاتھی دانت کی مورتی مندروں میں ازروئے ہندو مذہب ستھاپت

۵۔ پرانے مندر کی حالیہ کھدائی نے سومناتھ کی مورتی اور رتہ خانوں سے متعلق مورخین اور
شیخ سعدی کے بیانات قطعاً غلط ثابت کر دیے تھے۔ اس کی روشنی میں سعدی کی سیاحت ہندوستان
بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔

نہیں کی جاسکتی اور وہ رام ناتھ شو جی کا مندر ہے، وہاں مورتی ہو ہی نہیں سکتی؛ صرف جوتی لنگ ہوتا ہے، جس کے ہاتھ پاؤں تو کجا کوئی شکل ہی نہیں ہوتی۔ اب یہ بات قطعی ثابت ہوگئی ہے کہ وہاں صرف پتھر کا ٹھوس جوتی لنگ تھا، کوئی کھوکھلی مورتی نہ تھی، نہ مورتی کے نیچے کبھی کوئی تہ خانہ تھا)

یہ کتاب ۲۰×۲۹ سائز کے ۲۴۰ صفحوں کو محیط ہے۔ یہ منشی صاحب کی زندگی میں لکھی گئی تھی، مگر ان کی وفات کے بعد رسالہ دیش ہتکاری، میرٹھ میں نومبر ۱۹۱۷ء سے ستمبر ۱۹۱۸ء تک شائع ہوتی رہی۔ بعد میں رام پریس، میرٹھ میں کتابی شکل میں طبع ہو کر ۱۹۷۵ بکرمی (۱۹۱۸ء) میں شائع ہوئی۔ کتاب کے مخطوطے کی تکمیل کی تاریخ اور تقریظ منشی للتا پرشاد؎ شاد میرٹھی نے کہی:

تعریف بیاں ہو نہیں سکتی ہرگز — ہے نسخہ یہ بے نظیر ماشاء اللہ
تاریخ کی فکر ہے اگر کچھ، اے شاد! — لکھ دو کہ "ہے تحریر خجستہ واللہ"

۱۹۷۳ بکرمی ۱۹۱۶-۱۹۱۷ء

تحقیقاتِ الفاظِ متداولہ: یہ چھوٹا سا رسالہ ہے جو ۱۹۷۲ بکرمی (۱۹۱۵-۱۹۱۶ء) میں مطبع تمنائی لکھنؤ میں چھپا۔ اس میں تین الفاظ مَل، بقّال اور دلالہ کی تحقیق کی گئی ہے۔

؎ منشی للتا پرشاد شاد خلف لالہ جنگ بہادر جنگ میرٹھی۔ سالِ ولادت تقریباً ۱۸۸۵ء۔ ریلوے کی ملازمت بعہدۂ خزانچی سے ۱۹۴۵ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں بعمر ۷۲ سال زندہ اور کوٹہ راجستھان میں قیام فرما تھے۔ جب ۱۹۱۲ء میں ان کا قیام اجمیر میں تھا، تو وہاں ایک انجمن اردو کی ترقی و توسیع کے لیے قائم کی تھی۔

ان کے جدِ اعلیٰ رائے صاحب رام یاد بھی بڑے پائے کے شاعر تھے۔ شاہانِ دہلی کی طرف سے محاسبِ خزانہ تھے۔ شروع میں صوبۂ بہار میں تعیناتی رہی پھر پایۂ تخت دہلی کو تبدیل کر دیے گئے۔ ضلع مظفر نگر میں دو گاؤں بطورِ جاگیر بھی ملے تھے۔

شاد عقیدے کے لحاظ سے رادھا سوامی تھے۔ شاعری میں آپ کا پایہ بلند ہے۔ زبان صاف اور خیالات عالی ہیں۔ اسلامی عقاید پر بھی نظمیں اور مراثی ملتے ہیں۔ کلامِ شاد، جذباتِ شاد، بقائے سخن، پنجۂ پنجتن اور نالۂ دلخراش چھپ کر شائع ہو چکے ہیں ۲۸

سے تامّل کہا جا سکتا ہے کہ منشی صاحب کی جستجو قابلِ داد ہے۔ بقّال کے معانی سے چند جملے ملاحظہ کیجیے:

. . . . بقّال بہ تشدیدِ قاف بمعنی سبزی فروش، کیونکہ بقل سبزی کو کہتے ہیں۔ اس کا فروشندہ بقّال ہے، ہندی میں جس کو کنجڑا یا کنجڑا بولتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں غلّہ فروش کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ فارسیوں کے محاورہ میں میوہ فروش آتا ہے۔ مولوی معنوی کے اس شعر سے

بود بقّالے و ازدا طوطیے
خوشنوا و سبز گویا طوطیے

بمعنی عطّار معلوم ہوتا ہے۔

اور گلستان کے اس فقرہ سے "بقّالے را درمے چند بر صوفیان گرد آمدہ بود" بمعنی آرد فروش وغیرہ ظاہر ہوتا ہے اور بوستان کے اس مصرع سے "کہ دیگر مخر نان ز بقّال کوے" بمعنی نانبائی مفہوم ہوتا ہے اور چراغِ ہدایت میں لکھا ہے کہ اہلِ کشمیر اس کو کہتے ہیں جو سُود لیتا ہووے اور سوداگر پیشہ ہووے۔ حاصل یہ ہے کہ سوداگری و خرید و فروخت کرنے والے کو اہلِ فارس بقّال کہتے ہیں۔

منشی صاحب کی دیگر تصانیف میں سے صرف ذیل کی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں:

شجاعت ہیمو، رسومِ اگروالان، اگروالی شادی، اگر بنش پرکاش، دستور العمل خیلا بوجن، قسم نامہ، ہندو لفظ کی اصلیت، آریہ ورت کی فضیلت، نیتہ شریح بدھی (ہندی) شرادھ سنکلپ بدھی (ہندی)

منشی گوبند رام صاحب کی دو اولادیں ہوئیں: ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ لڑکی درگا دیوی،

۷۔ اس کے علاوہ بقّال پر اور بھی بہت سی بحث ہے۔ مگر طوالت کے باعث باقی عبارت نہیں دی گئی۔

۸۔ ہیمو کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: بھارتیہ ودّیا بھون بمبئی کی شائع کردہ ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل: دی مغل ایمپائر (جلد ۷)۔

لالہ ٹلک رام[9]، بی اے، ایل ایل، بی، پلیڈر رانا بالہ شہر سے بیاہی گئی تھیں۔ بیٹے کا نام جگت رام تھا۔ ان کی پیدائش سمبت ۱۹۲۹ (۷۲-۱۸۷۲ء) میں ہوئی۔ انھیں کسی قسم کا علمی ادبی شوق نہ تھا۔ تمام عمر محکمۂ انہار میں ملازم رہے۔ نہایت سادگی سے زندگی بسر کی۔ ان کی ۷ مئی ۱۹۴۱ء کو بعمر ۷۰ سال رحلت ہوئی۔ لالہ جگت رام کے فرزند لالہ ہری داس خدا کے فضل سے ابھی تک حیات ہیں۔ فارسی پر عبور حاصل ہے۔ بہت اچھے شاعر ہیں اور صابر تخلص کرتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ ہے۔ منشی رام سہائے تمنا لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ۱۲ ساڑھ ۱۹۵۳ بکرمی (۲۷ جون ۱۸۹۶ء) کو پیدا ہوئے اور ابھی تک باقاعدہ علمی، ادبی کارناموں میں سرگرم ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

آرام کہاں، عشق میں آرام نہیں ہے	جز نالہ و فریاد یہاں کام نہیں ہے
پہلو میں جو محبوب گل اندام نہیں ہے	فرقت میں تڑپنے کے سوا کام نہیں ہے
ادکار و حوادث سے جو دائم رہے غمگیں	دنیا میں اُسے خاک بھی آرام نہیں ہے
وابستہ بزنجیر تعلق ہے زمانہ	وہ کون ہے جو بندۂ بے دام نہیں ہے
یاروں میں مروت نہیں باقی نظر آتی	الفت کا زمانے میں کہیں نام نہیں ہے

صابر صاحب کے تین صاحبزادوں میں ایک صاحبزادے رام لعل ہیں، جو مشہور مزاح نگار رام لال نابھوی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اپنے اور دوسروں کے خاکے اڑانے میں کمال حاصل ہے۔ میرے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

.... چالیس سال سے فلمیں دیکھ رہا ہوں۔ کوئی فلم آئے اور مجھ سے بچ کر نکل جائے، یہ ناممکن ہے ...... شادی کی، عشق نہیں کیا کسی کوٹھے پر جانا بھی نصیب نہیں ہوا کہ ان لوگوں کی زندگی کو سمجھ سکتا۔ گھر کا تن دھری

۹۔ لالہ ٹلک رام کے والد لالہ کھیتو مل گورنمنٹ کے عمارتی ٹھیکیدار تھے ریلوے گھگھر کا پل انھیں کا بنوایا ہوا ہے۔ لالہ ٹلک رام کے بھائی لالہ منا لال کسی زمانے میں لاہور ہائی کورٹ میں ٹریبونل کے جج رہے تھے۔

۱۰۔ لالہ جگت رام کی دو بیویاں تھیں۔ دوسری بیوی سے اولاد نرینہ لالہ لوک راج ہیں۔ آج کل حکومت پنجاب کے محکمۂ زراعت میں ملازم ہیں۔

ماحول یہ تھا کہ پیاز تک کھانے کی مخالفت۔ مجھا ٹھاکے اور افسانے گھر بیٹھ کر
نہیں سوجھتے .... میرے پاس عقل کی کمی ہی سہی مگر باتوں کی کمی نہیں....

اس وقت ہریانہ سرکار میں گزیٹیڈ عہدے پر مامور ہیں۔ عمر ۶۵ سال (سال ولادت ۱۹۱۷ء) ہے۔ دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔ سب اپنی اپنی جگہ خوش ہیں۔ رام لال نابھوی اُردو کی کسمپرسی کے اس دور میں بھی منشی گوبند رام مرحوم کے نام کی بزم سجائے ہوئے ہیں۔ اُن کی لے وہ نہ سہی جو منشی صاحب مرحوم کی تھی، مگر ساز و نغمہ وہی ہے یعنی سازِ علم و ادب اور نغمۂ اُردو۔

قیمتیں گر رہی ہیں

اس بات کا یقین کر لیجئے
کہ جو کچھ آپ خرید رہے ہیں
اس کا صحیح وزن/ناپ کیا گیا ہے

بہت سی اشیائے ضروریہ ڈبّہ بند شکل میں آتی ہیں۔
ہر ایک ڈبّے یا پیکٹ پر اس کی قیمت کے اندراج کے
ساتھ ساتھ اس کے وزن یا ناپ کا لیبل بھی ہوتا ہے۔
اس لیبل کو تلاش کیجئے ..... وہ لیبل جو آپ کی
ادا کردہ قیمت کے لیے صحیح مقدار بتاتا ہے۔
ڈبّے کو مندرجہ مقدار سے کم بھرنا یا ڈبّے/پیکٹ پر غلط وزن/
ناپ لکھنا، ناپ تول ایکٹ کے تحت قابلِ سزا جرم ہیں۔

میٹرک وزن اور ناپ تول سے متعلق قوانین
خریدار کے مفاد کی حفاظت کرتے ہیں۔

davp/185

محمد منصور عالم

اُردو تذکرہ، تنقید اور نقّاد

شعرائے ریختہ کے چند تذکروں میں شاعران رنگین نوا کے کردار و کلام پر سخت اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان میں بعض کی مدح سرائی بھی ملتی ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اپنی رائیں غور و فکر کے بعد ظاہر کی ہونگی؛ وہ اپنے مطالعہ و مشاہدے ہی کی بنا پر کسی نتیجے پر پہنچے ہونگے، اور اپنے عصر کے تنقیدی رجحانات سے بھی اثر لیا ہوگا؛ ہمیں اس سے انکار نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان کی رایوں میں ادبی تنقید کے کیسے اور کتنے نمونے موجود ہیں؛ نیز کیا کسی تذکرے میں ادبی تنقید کا ہونا لازمی بھی ہے؟

فرمان فتحپوری[1] لکھتے ہیں:

> افسوس ہے کہ کلیم الدین احمد تذکروں کی تنقید کو سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے تنقیدی معیار کی بجائے بیسویں صدی عیسوی، بلکہ اپنے ذاتی معیار کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ ورنہ ان تذکروں میں تنقیدی شعور کی اتنی کمی نہیں ہے جتنی کہ انھیں نظر آتی ہے۔۔۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی کا تنقیدی معیار یہ تھا[2]:

۱۔ نگار، پاکستان۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر (۱۹۶۴ء): ۳۴

۲۔ کتاب العمدہ، بحوالہ نگار پاکستان، تذکروں کا تذکرہ نمبر (۱۹۶۴ء): ۳۳

بہترین مذہب غلو و مبالغہ ہے۔ اور یہی وہ طریقہ ہے، جس کی طرف سخن شناس
اور با فہم شعرا کا میلان رہا۔ اور بعض کا خیال تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کا قول یہ
ہے کہ سب سے بہتر وہ شعر ہے، جس میں سب سے زیادہ کذب ہو۔ . . . مبالغہ کرنا
حدِ اوسط پر اکتفا کرنے کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہوتا ہے . . . .
طرزِ بیان شعر کا اصلی جزو ہے مضمون تخیّل کا بجائے خود فاحش ہونا شعر کی خوبی
کو زائل نہیں کرتا۔ شاعر ایک بڑھئی ہے۔ لکڑی کی اچھائی برائی اس کے فن
پر اثر انداز نہیں ہوتی . . . .''

"بہترین مذہب غلو و مبالغہ ہے" اور "سب سے بہتر وہ شعر ہے، جس میں سب سے زیادہ
کذب ہو" قدامہ کے اس انتہا پسندانہ خیال کو اگر صائب مانا جائے، تو طلسم ہوشربا کتب الٰہیہ
سے زیادہ محترم المقام ہو جائیگی اور سب سے اعلیٰ اور عمدہ یہ شعر ہوگا۔

آتشِ غم میں دل بُھنا شاید
دیر سے بو کباب کی سی ہے

"شاعر اگر بڑھئی ہے تو لکڑی کی اچھائی برائی ضرور اس کے فن پر اثر انداز ہوگی۔ کمزور، بدہیئت اور کرم خوردہ "لکڑی" سے وہ اپنے اعلا اور باریک فن کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ ذرا یہ شعر دیکھیے:

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے رہے

جسے شاعری کی فہم ہے اور جو اعلا اور پاکیزہ شعری ذوق رکھتا ہے وہ ایسے اشعار سے مکدر اور مایوس ہو جاتا ہے۔ ادب و شعر میں اس قسم کی فحش کلامی ہرگز مطبوع نہیں ہو سکتی۔

اس تفصیل سے غرض یہ وضاحت کرنا ہے کہ دراصل قدیم تنقیدی اصول ہمارے رہنما نہیں ہو سکتے۔ نئے علوم اور نئی آگہی ہمیں نئے اُفق کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اب فکر و فہم کی سمتیں بدل چکی ہیں۔ ہم بیسویں صدی میں سانس لیتے ہیں۔ اس لیے عہدِ حاضر کے تنقیدی اصول ہی ہماری رہبری کر سکتے ہیں۔ اس بات سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ سلسلۂ روز و شب ہر

زمانہ کو نئے اور الگ رجحانات عطا کرتا ہے۔ پھر ایک ہی عصر کے مختلف انسان بھی اپنی انفرادی
بصیرت رکھتے ہیں۔ عام زندگی میں اقدار کے ردّ و بدل کے لیے وہی "بصیرت" مہمیز ہو، جس میں
بلاشبہ اردگرد کے خیالات و نظریات کارفرما ہوتے ہیں۔

بدوِ آفرینش کا انسان جنگلوں میں رہتا تھا، گھاس اور پتے کھاتا تھا، چشموں سے پانی پیتا تھا،
اُسے عقل اور سمجھ نہ تھی، بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک سے ڈر جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی عقل
جِلا پاتی گئی، وہ فطرت کے رموز سمجھنے لگا، مختلف علوم و فنون سے بہرہ ور ہوا اور آج
اس کی نسل چاند تاروں پر کمند پھینکنے لگی ہے۔ اس نے اپنے عروج و ارتقا کے پیشِ نظر اپنے
آباؤ اجداد کو وحشی، غیر مہذب اور ناشائستہ کہا۔ ہم اپنے معاشرے کے مفلوک الحال، پسماندہ
اور تعلیم و تہذیب سے بے بہرہ انسانوں کو آج بھی اسی لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے
حالات، وسائل، ماحول اور مواقع کا خیال کریں، تو انھیں غیر مہذب کہنا قطعاً نامناسب
ہوگا۔ مگر ہم ایسا نہیں سوچتے اور کیوں سوچیں؟ ہمارے سامنے علم و فن کے بیشمار راستے
ہیں جنھیں پیشِ نظر رکھ کر زندگی کو عروس کی طرح سنوار سکتے ہیں۔ ہم نے آداب و اخلاق اور کردار و گفتار
کے ایسے ڈھب سیکھے ہیں، جو حیاتِ انسانی کی تزئین میں بدرجۂ غایت ممد و معاون ہوتے
ہیں۔ ان نعمتوں سے جو لوگ محروم ہیں، یا جانے انجانے ان کا مناسب استعمال نہیں کرتے،
انھیں ناشائستہ کہنے میں ہر بااخلاق انسان حق بجانب ہوگا۔ البتہ اس کی ناشائستگی کے
اسباب کے پیشِ نظر پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے کا انداز بدل سکتا ہے۔

شعرائے ریختہ کے تذکروں میں جو تنقید نظر آتی ہے، وہ الفاظ کے استعمال و ترتیب سے آگے
نہیں جاتی۔ اگر اس لفظ کے بجائے یہ لفظ ہوتا، تو شعر میں خوبی آجاتی۔ بلاشبہ یہ بھی
ایک اندازِ نقد ہے، مگر بہت معمولی۔ پھر یہ بھی صرف ایک دو تذکروں میں ہے۔ اکثر و بیشتر
تذکرہ نگاروں کے یہاں الفاظ کی مناسبت و موزونی اور ان کے حسن و قبح کی شناخت کا
شعور بھی مفقود ہے۔ ان تذکروں میں جو تنقید ملتی ہے، وہ "تنقید" سے کوسوں دور ہے۔
میر تقی میر کے "نکات الشعرا" میں شاعروں کے کلام پر جو اصلاحیں دی گئی ہیں، وہ اہم ہیں۔
ان سے میر کی قادرالکلامی، طبّاعی اور ذہانت بوجہ احسن ہویدا ہے۔ یہ قرینِ قیاس ہے کہ

میر نے اپنے عصر کے تنقیدی رجحانات سے اثر لیا ہو۔ تاہم، یہ کہنا مشکل ہے کہ میر تقی میر اپنے تذکرے میں ابن قدامہ کی طرح ایک نقادِ فن کی حیثیت سے نمایاں ہیں۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں تنقیدی رائیں ظاہر کرتے ہوئے جن امور پر بار بار زور ڈالا ہے، ان میں (۱) ربطِ کلام، (۲) خوش فکری، (۳) تلاشِ لفظِ تازہ، (۴) صفائی گفتگو (۵) ایجادِ مضامین (۶) تہ داری، (۷) دردمندی)، اور (۸) طرزِ خاص شامل ہیں۔ یہ نکات دراصل سخن سنجی کے ہیں، نقدِ سخن اللہ سے یکسر مختلف شے ہے۔[3]

شعرائے ریختہ کی تنقید کو وقیع ثابت کرنے کے لیے، درج ذیل پہلو نمایاں کیے جاتے ہیں:

(۱) کلام پر رائیں، (۲) فارسی شاعروں سے مقابلہ (۳) کلام پر اصلاح، اور (۴) اپنے عصر کی ادبی تحریکوں کے اشارے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> شاعروں کے کلام پر رائے عموماً ذوقی اور وجدانی ہوتی ہے۔ ان میں زمانے کے رواج کے مطابق لفاظی کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ (اردو تنقید کا ارتقا)

تنقیدی رائیں ذوقی اور وجدانی ہونا کچھ زیادہ برا نہیں۔ برا تو سبب ہے کہ لفاظی اور مبالغے کو تنقید میں راہ دی جائے۔ میر، سودا کے متعلق کہتے ہیں:[5]

> غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، مخمس، رباعی، ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمدِ شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش فکر، خوشگو است۔ ہر شعرش طرفِ لطف، دستہ دستہ گلچین بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرع برجستہ اش، سرو آزاد بندہ، پیشِ فکرِ عالیش طبعِ عالی شرمندہ۔

جملہ خط کشیدہ تک تو حرج نہیں۔ اس کے بعد میر بہک گئے ہیں، جس میں صرف لفاظی کو

۳۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، "معیارِ شعر و سخن" (مطبوعہ نگار لکھنؤ ۱۹۴۶ء) بحوالہ نگار پاکستان تذکروں کا تذکرہ نمبر ۱۹۶۴ء) ص ۲۵

۴۔ اردو تنقید کا ارتقا۔ از ڈاکٹر عبادت بریلوی ۵۔ میر تقی، نکات الشعرا: ۴۸ (ترجمہ محمود الٰہی)

دخل ہے۔ اس لیے کہ ان جملوں کی تنقیدی اہمیت گم ہو گئی ہے۔ پھر غور کیجیے، جب زمانے کے رواج کے مطابق شعرائے ریختہ کے تذکروں میں لفاظی کو زیادہ دخل ہوتا ہے، تو اسے ہم تنقید کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

تذکروں میں جابجا فارسی شاعروں سے بھی مقابلہ کیا گیا ہے۔ وہ اس قسم کا ہے:[۶] "اگرچہ کلیم دونا ایسا گزشتہ۔ امّا کلیم ریختہ بیش ازیں است۔ دوسری جگہ ہے:[۷] غزلش چوں غزل نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چوں قصیدۂ عرفی دل پذیر۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ گلشن بیخار کا تقابلی پہلو زیادہ اہم ہے، کیونکہ اس میں نسبتہً تفصیل اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گلشن بیخار میں تذکرۂ میر یا تذکرۂ میر حسن سے زیادہ تقابلی پہلو موجود ہیں، لیکن ان میں تفصیل اور گہرائی مطلق نہیں ہے۔ شیفتہ میں تنقیدی صلاحیت تو تھی، مگر تنقید کے اصولوں سے وہ ناواقف تھے۔ صرف "بطرز بیدل سخن می گفت"، یا "غزلش چوں غزل نظیری بےنظیر و قصیدہ اش چوں قصیدۂ عرفی دلپذیر" کہہ دینے سے تقابلی پہلو نمایاں نہیں ہو جاتا اور نہ فرض نقد پورا ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ عرفی اور نظیری کی شاعری کے امتیاز و مماثلت کو تفصیل سے پیش کرتے۔ جس نے ان شعرا کا نمونہ کلام نہیں دیکھا، نہ ان کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے، وہ بھلا شیفتہ کے اس جملے سے کیا سمجھے گا۔

[۸] تذکرہ نگاروں نے شعرا کے کلام میں جو اصلاحیں دی ہیں، وہ اپنی جگہ بڑا اہم اور دلچسپ ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ عمل کسی تنقیدی نقطۂ نظر کا نتیجہ نہیں ہے۔ ہمارے بیشتر تذکرہ نویس، یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ مسلم الثبوت استاد اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ لہذا شعر میں بحر و وزن کی غلطی یا الفاظ و تراکیب کی لغزش پر ان کا چونکنا لازمی تھا۔ لیکن یہ بات ان کے ناقد ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ پھر ایسی اصلاحوں کے نمونے بھی زیادہ نہیں ملتے۔ یہ محض ایک دو تذکروں ہی میں ملتے ہیں، وہ بھی صرف الفاظ و تراکیب کی

۶۔ میر تقی، نکات الشعرا: ۴۸۔ ترجمہ محمود الٰہی زخمی۔ ۱۹۷۲ء۔ ایضاً (ترجمہ محمد حسین کلیم)

۷۔ شیفتہ: گلشن بیخار: ۱۳۹ (ترجمہ غالب)

اصلاح کے نمونے! شاعری میں خیال کی اہمیت پر انہوں نے بہت کم زور دیا ہے۔ حالانکہ ان دنوں بھی اس امر پر توجہ دینے کی آج سے کم ضرورت نہیں تھی۔ خیال کی کئی قسمیں ہیں، اچھے برے۔ ہر قسم کے خیال ہوتے ہیں۔ وہ سب کے سب شاعروں کا موضوع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ جس طرح ناموزوں الفاظ سے شعر قبیح ہو جاتا ہے، اسی طرح فحش اور رکیک خیال جس شعر کو زائل کر دیتے ہیں۔ وہ شاعری جو ہمارا سہارا ہوتی ہے اور ہماری نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے، کچھ سطحی، لایعنی اور مبتذل "تخیلات" کی شاعری نہیں ہوتی۔ تم شعر ترک نہیں کر سکتے، البتہ اپنی جیسی مانا چاہتا کر لیا کرو۔" اس احساس کے باوجود خیال کی اہمیت سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔

مصنف "اردو تنقید کا ارتقا" نے پرانے تذکروں میں قدیم ادبی تحریک کی بھی نشاندہی کی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں؛

قدما کی ایک منظم ادبی تحریک ایہام گوئی ہے جس کا ایک زمانے تک چرچا رہا۔
میر حسن ..... شاکر ناجی پر اس تحریک کا اثر ان الفاظ میں دکھلاتے ہیں: "تلاش
صنعت ایہام بسیار داشت کہ رائج الوقت متوسطین بود ..."

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایہام گوئی کوئی ادبی تحریک نہیں تھی۔ یہ ایک صنعت ہے۔ جو شعری حسن میں اضافے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ البتہ شاکر ناجی کے عہد میں اس کا بہت زیادہ رواج تھا، جیسے آج کل علامت نگاری کا طوفان برپا ہے۔ اس لیے ایک لمحے کے لیے اسے "تحریک" ہی مان لیجیے، مگر تذکرہ میر حسن پڑھنے کے بعد، جس کی مثال تذکرہ بالا اقتباس میں دی گئی ہے، کہیں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ میر حسن نے اس "ادبی تحریک" کے ذکر میں تنقیدی رجحان سے کام لیا ہے۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ خود میر حسن ایہام گوئی کے حامی تھے یا مخالف اور اگر کسی ذریعے سے یہ معلوم بھی کر لیا جائے۔ تو یہ پتہ لگانا دشوار ہے کہ ان کے نزدیک ایہام گوئی کی حمایت یا مخالفت کے اسباب کیا تھے۔

المختصر، "تذکرہ" کو تنقیدی کارنامہ کہنا ٹھیک نہیں۔ اسی طرح، "تذکرہ" میں تنقید کے فقدان کے باعث اسے غیر مفید سمجھنا بھی درست نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے، کہ

"تذکرہ" اور "تنقید" ادب کے دو مختلف شعبے ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے جس نوع کی تالیفات کی طرف توجّہ کی، وہ تذکرے تھے۔ اپنے دیباچوں میں انھوں نے اس سلسلے میں واضح بیانات دیے ہیں۔ وہ نقّاد کے منصب سے نا واقف تھے اور تنقید کو محدود معنی میں استعمال کرتے تھے۔ تنقید کا مفہوم ان کے نزدیک غالباً "عیب مردم فاش کردن" تھا جسے وہ بدترین عیب جانتے تھے۔

شروع میں تذکرہ نگاری کا بنیادی مقصد دلپسند شعروں کی بیاض تیار کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ ان شاعروں کے حالات کی فراہمی بھی شامل ہوگئی لیکن کلام کی تنقید نہیں۔ تذکروں میں افراد کا تعارف ہوتا ہے اور وہ آنے والے دور میں حالات کے لیے ماخذ ہی کا کام دیتے ہیں، تنقید کے اصول و معیار متعین نہیں کرتے۔ تنقیدی اصول تو ادبی رجحانات کے بموجب علوم و فنون کی روشنی میں مرتب ہوتے ہیں اور عہد بعہد کے مختلف نظریات کے پیش نظر بدلتے بھی رہتے ہیں، لیکن انسان کی آمد و رفت کے سال اور سفرِ حیات میں جو قدم اس نے اٹھائے ہیں، اس کے نقش یا تو نہیں بدل جاتے۔ لہٰذا کامیاب تذکرہ نگار وہ ہے، جو احوال کی تلاش و فراہمی پر سب سے زیادہ توجّہ دیتا ہے۔

تذکرے میں شاعر کی سیرت یا شاعری سے متعلق جو تبصرہ کیا جاتا ہے اس کی نوعیت ادبی تنقید کی نہیں ہوتی، کیونکہ کلام کی خوبیوں اور خامیوں کے تفصیلی ذکر کے لیے فنِ تنقید موجود ہے۔ اس لیے تذکرے میں ادبی تنقید کی تفصیل یا بلندی پیدا کرنا بےمحل ہے۔ یہاں صرف طائرانہ نگاہ کافی ہوتی ہے۔

تذکرہ تنقید سے نہیں، تاریخِ ادب سے قریب ہے۔ اگر تذکرے نہ لکھے جاتے تو تنقید کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لیکن ادبی تاریخ کی بہت سی اہم کڑیاں ضرور گم ہو جاتیں۔ تاریخِ ادب کا تار و پود یہی تذکرے ہیں۔ انھیں کے وسیلے سے کسی زبان کے ادب کی تاریخ مرتب ہوتی ہے، اور یہی ان کا خاص منصب ہے۔

اس لیے تنقید کو تذکرے سے خلط ملط کرنا۔ ایک کی خوبیاں دوسرے میں ڈھونڈھنا اور خوش ہونا، یا ان خوبیوں کے نہ ملنے پر برافروختہ ہوتا، کسی سیدھی اور صاف بات کو پیچیدہ بنا کر خواہ مخواہ بحث و تکرار کی راہ ہموار کرنا ہے۔ جس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

قومی بچتیں سب کے لئے بچت کرنے کا موقع

کیونکہ ....

قومی بچتوں میں چھوٹی سے چھوٹی بچت کو بھی حقیر نہیں سمجھا جاتا۔ بچوں کے سیونگز بینک (سنچائیکا) کے ذریعہ بچوں میں باقاعدگی سے بچت کرنے کی عادت پختہ کی جاتی ہے تاکہ وہ بڑے ہو کر کبھی اپنی کمائی میں سے زیادہ سے زیادہ بچت کرتے رہیں۔

تنخواہ دار اور محنت مزدوری سے اجرت پانے والے افراد کو ہر مہینے اپنی آمدنی میں سے شروع میں ہی کچھ رقم کٹوا کر باقاعدگی سے بچت کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ آسانی سے بچت کر سکتے ہیں۔

چھوٹی بچتوں کے کھاتوں کے سلسلے میں 4,000 خواتین سماجی کارکن اپنے فالتو وقت میں آس پڑوس کی عورتوں اور اپنے کسی کاروبار کے ذریعہ روزی کمانے والے افراد کی خدمت سرانجام دے رہی ہیں۔

بچت کرنے والے چھوٹے بڑے سبھی افراد کو ان کے گھروں پر متعلقہ سہولتیں مہیا کرنے کیلئے ملک بھر میں 40,000 منظور شدہ ایجنٹ کام کر رہے ہیں۔

ایک لاکھ سے زیادہ سیونگز بینک پوسٹ ماسٹر دیہات میں لوگوں کو بچت کرنے کے طریقوں کے بارے میں ضروری واقفیت بہم پہنچانے اور اس سلسلے میں ان کی حوصلہ افزائی کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ڈاک گھر کا سیونگز بینک ملک میں سب سے بڑا سیونگز بینک ہے۔

مختلف افراد کی مختلف ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سوچ سمجھ کر تیار کی گئی بچت کی ایک درجن اسکیموں پر عمل کیا جا رہا ہے۔

لاکھوں افراد کی چھوٹی چھوٹی بچتیں مل کر ہر سال کروڑوں روپے بن جاتی ہیں۔ پچھلے سال چھوٹی بچتوں کے ذریعہ 474 کروڑ روپے کی رقم فراہم کی گئی جو کہ اس سال کے پلان کیلئے مخصوص رقم کا 10 فیصد حصہ بنتی تھی۔

قومی بچتوں کے ذریعہ اکٹھی کی گئی رقم ملک کی ترقی اور حفاظت پر خرچ کی جاتی ہے۔

قومی بچتوں میں روپیہ لگایئے



نیشنل سیونگز کمشنر

پوسٹ بکس [illegible] - ناگپور

davp 75/26

مالک رام

اقبال کی تاریخِ ولادت

اقبال کے یومِ ولادت کے موقع پر ان کا جشنِ صد سالہ منانے کا فیصلہ ہوا، تو طبعاً ان کی تاریخِ ولادت کا مسئلہ زیرِ غور آگیا۔ اس سلسلے میں کئی متضاد روایتیں سامنے آئیں۔ ان میں سے دو زیادہ متعیّن اور نسبتہً زیادہ قابلِ اعتماد تھیں: اول، سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کا موالید و اموات کا رجسٹر؛ اور دوم اقبال کی اپنی دی ہوئی ہجری تاریخِ ولادت (۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ) جو انھوں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے شروع میں خود نوشت سوانح عمری میں دی تھی۔

اقبال کی وفات کے بعد مولانا عبدالمجید سالک نے بزمِ اقبال، لاہور کی فرمایش پر علامہ مرحوم کی سوانح عمری بعنوان "ذکرِ اقبال" مرتب کی تھی۔ انھوں نے خود سیالکوٹ جاکر وہاں میونسپل کمیٹی کے پرانے رجسٹر نکلوائے اور ان میں سے ایک اندراج کو اقبال کی تاریخِ ولادت قرار دیتے ہوئے اسے درجِ کتاب کر دیا۔ یہ تاریخ تھی: ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء[1]۔ سب نے یہ تاریخ تسلیم کر لی۔ چنانچہ محکمۂ آثارِ قدیمہ پاکستان نے بھی ان کی لاہور اور سیالکوٹ کی قیامگاہوں پر جو کتبے لگوائے، ان میں یہی تاریخ لکھوائی۔ القصہ سب جگہ اسے ان کی صحیح تاریخِ ولادت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

۱۔ ذکرِ اقبال: ۱۰ (لاہور ۱۹۵۵ء)

اس تاریخ کے خلاف سب سے بڑی شہادت خود اقبال کا اپنا بیان تھا۔ انھوں نے ۱۹۰۸ء میں اپنی ڈاکٹری کی سند کے لیے جو مقالہ جرمنی میں پیش کیا تھا، اور جو بعد کو "ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا" کے عنوان سے شائع ہوا، اس میں انھوں نے اپنی ولادت "۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ (مطابق ۱۸۷۶ء)" لکھی تھی۔ خیال ہوتا تھا کہ جب انھوں نے ہجری تاریخ اتنی صراحت سے لکھی ہے، جو یقیناً گھر کے کسی بزرگ نے انھیں بتائی ہوگی، تو یہ غلط نہیں ہو سکتی۔ ۱۸۷۶ء کا شمسی سال البتہ غلط تھا؛ ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ مطابق ہے ۹ دسمبر ۱۸۷۷ء کے۔ خود میں نے اسی تاریخ کو ترجیح دی اور جب میں نے ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی (کلکتہ) کی دوسری جلد کے لیے اپنا مضمون "اقبال" قلمبند کیا، تو اس میں ان کی تاریخ ولادت ۹ دسمبر ۱۸۷۷ء ہی دی۔

لیکن ۱۸۷۳ء کی تاریخ کو صحیح تسلیم کرنے والے بھی خاموش نہیں تھے۔ ان کے پاس سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کا مصدقہ ریکارڈ تھا، اور وہاں ۱۸۷۷ء میں شیخ نور محمد (عرف نتھو) کے ہاں کسی بچے کی پیدائش کا سرے سے کوئی اندراج ہی نہیں تھا۔ ۱۸۷۳ء کی تاریخ کے مخالفین کو ایک اور وجہ سے بھی تکلیف پہنچتی تھی۔ اقبال نے مصدقہ اسناد کے مطابق ۱۸۹۱ء میں مڈل، ۱۸۹۳ء میں دسویں، ۱۸۹۵ء میں انٹر، ۱۸۹۷ء میں بی اے اور ۱۸۹۹ء میں ایم اے کی اسناد حاصل کیں؛ یہ سب اسناد موجود ہیں اور ان کی صحت کے بارے میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ [۲]

> اگر تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء ہو، تو ۵ مئی ۱۸۹۳ء کو جب انٹرنس پاس کرنے کے بعد حضرت اقبال اسکاچ مشن کالج، سیالکوٹ میں داخل ہوئے، ان کی عمر ۲۰ سال سے زائد ہونی چاہیے۔ لیکن کالج رجسٹر میں ان کی عمر بوقت داخلہ ۱۸ سال لکھی ہوئی ہے، جو ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کی تائید نہیں کرتی۔ یہ بات بھی قرین قیاس نہیں کہ علامہ ایسے ذہین اور ہونہار طالبعلم نے ۲۰ سال سے زائد کی عمر میں انٹرنس پاس کیا ہو۔

۲۔ روزگار فقیر (سید وحید الدین)، ۲۳۳ (طبع دوم، لاہور ۱۹۶۳ء)

عبارت محولہ فوق میں دو دلیلیں ہیں؛ ایک واقعاتی، دوسری جذباتی۔ کالج میں داخلے کے وقت ان کی عمر ۱۸ برس بتائی گئی تھی؛ انھوں نے کالج میں ۱۸۹۳ء میں داخلہ لیا تھا۔ اگر اس وقت عمر ۱۸ برس کی تھی، تو سالِ ولادت ۱۸۷۵ء ہونا چاہیے۔ یہ دونوں فریقوں کے مسلّمات کے خلاف ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر ولادت ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کی تسلیم کی جائے، تو گویا انھوں نے انٹرنس کا امتحان بیس برس کی عمر میں پاس کیا اور "یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ علامہ ایسے ذہین اور ہونہار طالب علم نے ۲۰ سال سے زائد کی عمر میں انٹرنس پاس کیا ہو"؛ حالانکہ اگر یہ تاریخ درست ہو، تو اس میں اقبال کا کیا قصور ہے؟ انھیں جب اسکول بھیجا گیا، وہ اس کے بعد ہی تو پڑھ سکتے تھے۔ اگر انھیں اسکول ہی دس گیارہ سال کی عمر میں بھیجا گیا تھا، تو قدرتاً ان کی "ذہانت اور ہونہاری" کا مظاہرہ اس کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ اور اسکول جانے کا فیصلہ انھوں نے نہیں، بلکہ ان کے والد، یا گھر کے اور لوگوں ہی نے کیا ہوگا۔ پس مصنفِ "روزگارِ فقیر" کی یہ دوسری "جذباتی دلیل" بھی غلط ہے۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں جذبات کام نہیں دیتے، بلکہ بسا اوقات ان کا نتیجہ اصلیت سے دوری ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات کا تذکرہ بھی بے محل نہیں ہوگا، بلکہ اس مسئلے کے فیصلے کرنے کے لیے اسے لازماً مدِ نظر رکھنا چاہیے۔

اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد (عرف نتھو) تھا وہ پیشے کے لحاظ سے درزی تھے۔ سالک نے لکھا ہے کہ شروع[۳] میں وہ سیالکوٹ ہی میں ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے ہاں کپڑے سینے پر ملازم ہوئے۔ ڈپٹی صاحب نے انھیں کپڑے سینے کی مشین منگوا دی، جو ان دنوں ایک نادر چیز تھی؛ وہاں سے انھیں تنخواہ ملتی تھی۔ بعد کو انھوں نے یہ ملازمت ترک کر دی۔ میری تحقیق کے مطابق شیخ نور محمد اس کے بعد نذر سجاد حیدر (بیگم سجاد حیدر یلدرم) کے دادا میر مظہر علی کے وہاں بھی یہی کام کرتے رہے[۴]۔ بعد کو شیخ صاحب نے عورتوں کے برقعوں کی ٹوپیاں سینے میں خاص نام پایا۔ انھوں نے ان کی سلائی اور کڑھائی میں ایسی ایسی جدتیں کیں کہ یہ قلیل مدت

۳۔ ذکرِ اقبال: ۹

۴۔ تذکرۂ معاصرین: ۳۰ (طبع اول ۱۹۷۲ء)

کے اندر مقبولِ عام ہوگئیں۔ اور ان کا نام ہی شیخ نتھو ٹوپیوں والے مشہور ہوگیا۔ میرا یہ تفصیل لکھنے سے یہ مقصود ہے کہ گھر کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ شیخ صاحب اپنی اولاد کی تعلیم کا انتظام جیسا اور جب چاہتے جب دلخواہ کر لیتے۔ آمدنی کم اور کنبہ بڑا! لاکھ سستا سماں سہی، گزران تنگی ترشی سے ہوتی ہوگی۔ یہی باعث ہے کہ اقبال بھی بہت دن تک اسکول میں داخلہ نہ لے سکے۔ اس کا انتظام بھی محض حسنِ اتفاق سے ہوگیا۔ اس کا قصہ بھی ہمارے موضوع کی وضاحت کے لیے اہم ہے۔

اس زمانے میں بقول مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی، سیالکوٹ میں ان اصحاب کی زیرِ نگرانی درس و تدریس کے چار مکتب تھے[5]۔ (۱) مولوی غلام مرتضیٰ؛ (۲) مولانا ابوعبداللہ غلام حسین موحد؛ (۳) مولانا سید میر حسن؛ (۴) مولوی مرتضیٰ۔ پہلی، دوسری اور چوتھی درسگاہ میں عربی اور دینیات کے لیے مخصوص تھیں، تیسرے صاحب یعنی مولانا سید میر حسن کے وہاں عربی اور فارسی ادب کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا۔ شیخ نور محمد اگرچہ عرفِ عام میں اَن پڑھ تھے لیکن شروع سے علماء و صلحا کی صحبت میں بیٹھتے آئے تھے اور اس سے ان کے دل میں تصوف اور اسلامیات سے خاص رغبت اور شغف پیدا ہوگیا تھا۔ یہی باعث ہے کہ جب اقبال پڑھنے کی عمر کو پہنچے، تو شیخ صاحب نے انھیں اپنے محلے کی مسجد حسام الدین میں مولانا غلام حسین موحد کے مکتب میں قرآن پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔

اس مسجد میں مولانا سید میر حسن بھی کبھی کبھی مولانا غلام حسین کے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے وہاں اقبال کو دیکھا، تو دریافت کیا کہ یہ کس کا بچہ ہے؟ بتایا گیا کہ شیخ نور محمد کا۔ اس پر میر حسن صاحب نے خود شیخ نور محمد سے کہا کہ اقبال کو اس مدرسے سے اٹھا لیجیے اور میرے پاس بھیج دیجیے، اسے میں پڑھاؤں گا۔ یہاں انھوں نے فارسی اور عربی کے متون پڑھے اور جب ان دونوں زبانوں کا صحیح ذوق پیدا ہوگیا، تو میر صاحب موصوف ہی نے انھیں اسکاچ مشن اسکول، سیالکوٹ میں داخل کرا دیا، جہاں وہ اس دوران میں خود مدرس مقرر ہو چکے تھے[6]۔

۵۔ ذکرِ اقبال: ۱۰-۱۱ ۶۔ ذکرِ اقبال: ۲۷۴

کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے اسکاچ مشن اسکول میں جانے سے پہلے اولاً، مولانا غلام حسین موحد کے مکتب میں اور پھر سید میر حسن کے وہاں پانچ سال سے کم زمانہ صرف کیا ہوگا! وہ خود لکھتے ہیں: "میری تعلیم عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ چند سال بعد ایک مقامی اسکول میں داخل ہو کر میں نے یورپی ستی کیریر (CAREER) شروع کیا" کیا "یہ چند سال" پانچ سال سے کم رہے ہونگے؟ غرض کہ اگر وہ مولانا غلام حسین کے مکتب میں پانچ برس کی عمر میں بھی گئے ہوں، تو اسکول میں داخلے کے وقت ان کی عمر دس برس سے کم نہیں ہوگی۔ اس صورت میں وہ دسویں درجے کی سند بیس برس کی عمر سے پہلے کیونکر حاصل کر سکتے تھے؟ غرض ان کے اس عمر میں انٹرنس پاس کرنے میں نہ کوئی زمانی اشکال ہے، نہ اس سے ان کی "ذہانت اور ہونہاری" پر کوئی حرف آتا ہے۔

لیکن ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کی تاریخ بھی، جو سالک نے سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر سے دیکھ کر لکھی تھی، ٹھیک نہیں۔ صحیح تاریخ ۲۹، دسمبر ۱۸۷۳ء ہے، جو اس کے بعد ہی دوسرے لڑکے کی تاریخ ولادت ہے۔ اس سلسلے میں ناظرین جناب ڈاکٹر نظیر صوفی کا مضمون اسی شمارے میں دیکھیں۔ غالباً یہ لکھنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر نظیر صوفی، گھر کے بھیدی ہیں: وہ علامہ اقبال کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد مرحوم کے داماد ہیں۔

ڈاکٹر نظیر صوفی

علامہ اقبال
کی
صحیح تاریخِ ولادت کیا ہے؟

بدقسمتی سے علامہ کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں پاکستان کے ادبی اور سرکاری حلقوں میں دستاویزی طور پر اس اظہر من الشمس حقیقت پر نامناسب اور ناواجب اختلاف موجود ہے۔ خاندانی شجرہ اور میونسپل ریکارڈ کے مطابق علامہ اقبال اپنی دو بہنوں کی ولادت کے درمیانی وقفے میں یعنی میری دادی مرحومہ طالع بی بی متولدہ ۶ ستمبر ۱۸۷۰ء اور مرحومہ کریم بی بی متولدہ ۱۴ نومبر ۱۸۷۶ء کے درمیان پیدا ہوئے۔ اس بنیادی حقیقت کی روشنی میں ہر صاحب عقل کے نزدیک مفروضہ تاریخِ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی حقیقت ایک فریب خیال کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتی۔

یہ حقیقت ہے کہ محلہ کشمیریاں میں علامہ کے والدِ گرامی کے علاوہ نتھو نامی کوئی اور شخص کسی وقت بھی موجود نہ تھا۔ اس لیے محلہ کشمیریاں اور اس کی ملحقہ گلیوں میں مسمی نتھو نامی بزرگ کے بچوں کی پیدائش کی رپورٹیں فی الواقع علامہ کے والد شیخ نور محمد مرحوم کے بچوں ہی کی ہیں۔ خاندانی شجرہ اور میونسپل ریکارڈ کی رُو سے ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۷ء تک میاں جی نتھو کے ہاں چار بچے بہ ترتیب ذیل پیدا ہوئے۔

میونسپل رجسٹر نمبر	تاریخ	محلہ یا گلی	کوائف	باپ کا نام
۴۳۳	۶ ستمبر ۱۸۷۰ء	چوڑیگراں	لڑکی	نتھو

۱۴۰	۲۲ فروری ۱۸۷۳ء	کشمیریاں	لڑکا	نتھو
۱۰۴۸	۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء	چوڑیگراں	لڑکا	نتھو
۶۹۲	۱۶ نومبر ۱۸۷۶ء	کشمیریاں	لڑکی	نتھو

۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہونے والے لڑکے کے بعد میاں جی نتھو کے ہاں جب کوئی نرینہ اولاد پیدا ہی نہیں ہوئی، تو پھر علامہ کی ولادت ۱۸۷۷ء میں مقرر کرنا چہ معنی؟

یہ اصل حقائق میں نے اجمل کمیٹی کے وفد کو جو معلومات حاصل کرنے کے لیے میرے مکان پر پروفیسر عثمان، سکریٹری بزم اقبال کی سرکردگی میں مجھ سے ستمبر ۱۹۷۳ء میں ملا تھا، بتا دیے تھے لیکن افسوس اپنی بات بنانے کے لیے ان حقائق کو نظر انداز کر دیا۔ اجمل کمیٹی نے ایسے ہی غلط اندیش لوگوں کے زیر اثر مفروضہ تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی بلا تحقیق تصدیق کر دی۔ لیکن اس دیدہ دلیری کی تردید علامہ کے اپنے واضح بیان سے ہو جاتی ہے۔

علامہ کا مکتب سے اسکول تک آنے کا زمانہ

جرمنی والے مقالے میں علامہ نے اپنی ہجری تاریخ ولادت اور عیسوی سال ولادت ۱۸۷۶ء پر ایک تصریحی نوٹ کی صورت میں تحریر فرمایا تھا، کہ۔

> میری تعلیم عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ چند سال بعد ایک مقامی اسکول میں داخل ہو کر میں نے یونیورسٹی CAREER شروع کیا۔ اور پنجاب یونیورسٹی کا پہلا امتحان ۱۸۹۱ء میں پاس کیا۔

پروفیسر حمید احمد خان مرحوم نے ناظم مجلس ترقی ادب کی حیثیت سے اسی نوٹ کی روشنی میں سکریٹری بزم اقبال کو اجمل کمیٹی کی اطلاع کے لیے ۱۰ جنوری ۱۹۷۴ء کو لکھا:

> ذکر مڈل کے امتحان کا ہے۔ لیکن غور کا مقام ہے کہ مکتب سے نکل کر اسکول تک آنے میں جو چند سال صرف ہوئے وہ کم از کم یا زیادہ سے زیادہ کتنے سال ہو سکتے ہیں؟ فقیر صاحب نے اور سید عبدالواحد، صدر اقبال اکیڈمی نے (جو فقیر صاحب کے تتبع میں ۱۸۷۶ء کے بجائے نومبر ۱۸۷۷ء کو ترجیح دیتے ہیں) اپنی

تائید میں یہ حیرت انگیز دلیل دی ہے کہ ہجری ۱۳۰۰ سال تو اقبال نے درست لکھے، مگر یورپ میں بیٹھے ہوئے لکھی! علیسوی ماہ و سال کا صحیح تعین ان سے نہ ہو سکا۔

سید عبدالواحد ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو اقبال کی تاریخِ ولادت قرار دیتے ہیں اور اس ضمن میں فرماتے ہیں:

There is no mention in the Municipal Record of this date (November 9, 1877), or of the birth of Iqbal, if that birth happen to be on any date other than 22nd February, 1873.

سید عبدالواحد کو خالد نظیر صوفی صاحب کی فراہم کردہ یہ اطلاع میسر نہ تھی کہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو محلہ چوڑیگراں کے متمی نتھو (مسلمان خیاط) کے ہاں "ایک لڑکا" تولد ہوا۔ اس لیے یہ فیصلہ کہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کی تاریخ کو رد کرنے کے بعد ہم مجبور ہیں کہ لازماً ۱۸۷۷ء کو اقبال کی تاریخِ ولادت مان لیں، صحیح نہیں ہے۔

چند سال محاورتاً تین چار سال ہوتے ہیں۔ تاریخِ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے مطابق علامہ نے اسکول میں داخلہ اندازاً پانچ سال کی عمر میں لیا، جس کے پیشِ نظر مکتب کے تعلیمی زمان و مکان کا تعین نا ممکن ہے۔ اگر علامہ بقولِ خود چند سال مدرسے میں پڑھتے رہے تھے، تو انھوں نے یہ زمانہ اپنی پیدائش سے پہلے عالمِ لاہوت کے کسی مدرسے میں ہی گزارا ہوگا۔ اقبال قومی کمیٹی کے صدر صاحب خود ہی فیصلہ کریں کہ اس بات میں حضرت علامہ سچے تھے، یا تاریخِ ولادت گھڑنے والے مفروضہ تراش؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ علامہ کے تعلیمی ریکارڈ کے مطابق سالِ ولادت ۱۸۷۶ء ہی ہے۔ انٹرنس ۱۸۹۳ء - ۱۷ سال = ۱۸۷۶ء یہ سال چونکہ اصلی تاریخِ ولادت سے مختلف تھا۔ اس لیے علامہ کو یہ تصریحی نوٹ لکھنا پڑا، تاکہ اگر کبھی کوئی محقق اس سلسلے میں تحقیق کرے، تو انھیں غلط بیانی کا مرتکب نہ سمجھے۔ افسوس صد افسوس کہ اقبال شناسی کے ناعاقبت اندیش ٹھیکیداروں نے علامہ کے تعلیمی سالِ ولادت کو ذکر کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ علامہ کا یورپ میں بیٹھ کر ایک تحقیقی مقالے میں اپنی ولادت کے ہجری سن کا صحیح

عیسوی مترادف متعیّن نہ کر سکنے کا مطلب کیا ہو گا؟ کیا یہ بودی دلیل حدِ ادب سے تجاوز نہیں؟

تعلیمی سالِ ولادت اور اصلی تاریخِ ولادت کا فرق انوکھا نہیں۔ سرکاری ملازمت کے لیے حدِ عمر کے پیشِ نظر اسکول میں داخلے کے وقت ضرورتاً عمر کم لکھوانا عام سی بات ہے۔ ہر کوئی اپنے خاندان کے تعلیمی ریکارڈ میں جھانک کر دیکھ سکتا ہے۔ سندی ضروریات کے تحت شخصی کاغذات میں علامہ اپنا علمی ریکارڈ والا سالِ ولادت ہی لکھتے لکھواتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۳۱ء میں پورے ۶ سال بعد بھی اپنے ۱۹۰۵ء والے پاسپورٹ کے مطابق نئے انٹرنیشنل پاسپورٹ میں سالِ ولادت ۱۸۷۶ء لکھوایا۔ اسی طرح جرمنی والے مقالے میں سالِ ولادت ۱۸۷۶ء دینا بھی تعلیمی ریکارڈ کی مطابقت کی وجہ سے ہی تھا۔

مفروضہ سالِ ولادت ۱۸۷۷ء۔۔ تعلیمی ریکارڈ کی کسوٹی پر

تحقیق میں مفروضات سے کام نہیں چلتا۔ مفروضہ تاریخِ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو اگر علامہ کے تعلیمی ریکارڈ کی کسوٹی پر پرکھیں تو اس کی کھوٹ کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ علامہ نے میٹرک کا امتحان پنجاب گزٹ ۲ مئی ۱۸۹۳ء کے مطابق ۱۷ سال کی عمر میں پاس کیا۔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے حساب سے میٹرک ساڑھے پندرہ سال کی عمر میں پاس کرنا ثابت ہوتا ہے جب کہ پنجاب گزٹ ۲۶ فروری ۱۸۹۱ء کے مطابق علامہ نے مڈل کا امتحان ۱۵ سال کی عمر میں پاس کیا تھا۔ اب تاریخِ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء گھڑنے والے ہی بتائیں کہ مڈل کا امتحان پندرہ سال کی عمر میں کرنے کے بعد علامہ نے میٹرک کا امتحان صرف چھ ماہ بعد کونسی یونیورسٹی میں اور کہاں اور کس طرح پاس کر لیا تھا؟

علاوہ بریں علامہ کی خود نوشتہ داخلہ درخواستوں کے مطابق پنجاب گزٹ میں شائع شدہ کوائف کی رو سے علامہ نے تو مڈل ۱۸۹۱ء میں ۱۵ سال کی عمر اور ۱۸۹۳ء میں میٹرک ۱۷ سال کی عمر میں کیا تھا لیکن یہ امتحان مفروضہ تاریخِ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے مطابق ۱۸۹۳ء اور ۱۸۹۵ء میں پاس کرنا بنتے ہیں۔ یہ بات حقیقتِ حال کے سراسر خلاف ہے۔ ان سیدھے

سارے حسابی حقائق کو نظر انداز کر کے تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کہنا، نہ جانے کونسی محققانہ دریافت اور ادبی خدمت ہے۔ دلائل و براہین کی دنیا میں گھس کر جب کبھی کوئی صحیح دماغ محقق تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کا تجزیہ کریگا، تو اُسے اس کے مجوزین اور موافقین پر حیرت ہوگی۔

علامہ کا ۱۹ سال کی عمر میں میٹرک کرنے کا عملی ثبوت

فرنگی بے دینی کا رنگ ہندی مسلمانوں پر اس وقت ابھی پوری طرح نہ چڑھا تھا۔ اس لیے بچوں کو اسکول میں داخل کرانے سے پہلے مساجد سے ملحق عربی مدرسوں میں چند سال تعلیم دلوانے کا عام رواج تھا۔ اسکول میں داخلہ کے وقت اسی لیے بچے عموماً نو دس سال کے ہو جاتے تھے۔ اس کے ثبوت میں علامہ کے مندرجہ ذیل ہم مکتبوں کا ذکر کافی ہوگا۔

(۱) میں مولوی ایم ڈی بھٹی سابق پرنسپل، ڈوفرسی مرے کالج، سیالکوٹ حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ میں ۱۶ دسمبر ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوا۔ چند سال عربی مدرسے میں پڑھنے کے بعد سکاچ مشن اسکول میں ۱۸۹۲ء میں داخلہ لیا اور علامہ اقبال کی طرح تقریباً سوا انیس برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۲ء میں علامہ نے بھی سکاچ مشن اسکول میں میری طرح چند سال مکتب میں گزار کر داخلہ لیا تھا۔ وہ ۱۸۹۳ء میں میٹرک کے امتحان میں ضلع بھر میں اوّل آئے تھے جس کی خوشی میں ہیڈ ماسٹر ترنجن داس آنجہانی نے اسکول میں ایک دن کی چھٹی کر دی تھی (حلفیہ بیان مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۷۴ء)

(۲) میں عبدالحمید [illegible] ولد خواجہ محمد فاضل مرحوم، ساکن میانہ پورہ۔ حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ میرے والد خواجہ محمد فاضل ولد خواجہ عبدالکریم مرحوم علامہ کے دوست اور ہم جماعت تھے۔ میرے والد ۱۹۱۸ء میں ۴۵ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے تھے اور علامہ سے چند ماہ بڑے تھے۔

وہ پہلے مدرسے میں چند سال رہے، پھر سکاچ مشن اسکول میں داخل ہو کر علامہ کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں مڈل قریباً ساڑھے انیس سال کی عمر میں پاس کیا

(تحریر مؤرخہ ۱۸ مارچ ۱۹۷۴ء)

(۳) میں خواجہ محمد مسیح ولد خواجہ عبدالعزیز مرحوم، صدر برادری کاشمیریاں، سیالکوٹ حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ ستمبر ۱۹۲۹ء میں علامہ کے استاد شمس العلماء مولوی میر حسن مرحوم کو دفنانے کے بعد واپسی پر مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی اور علامہ اقبال کی گفتگو کے دوران ان کی زبانی سنا کہ وہ دونوں اس وقت پچپن چھپن سال کے ہو چکے تھے۔ البتہ مولوی ابراہیم میر مرحوم نے فرمایا کہ وہ علامہ سے کوئی چار ماہ چھوٹے تھے۔ دونوں دوستوں نے ایف اے کا امتحان ۱۸۹۵ء میں اکٹھے پاس کیا تھا۔ مولانا مرحوم اپنی خود نوشتہ سوانح کے مطابق اپریل ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے تھے (تحریر مؤرخہ ۲۴ اپریل ۱۹۷۴ء)

پس ظاہر ہے کہ علامہ کا اس زمانے کے تعلیمی اور معاشرتی حالات کے مطابق سوا انیس برس کی عمر میں میٹرک کرنا کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اسے باور نہ کرنے والے بے وجہ شک کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔

۲۹ دسمبر کی ولادت رپورٹ کا تفصیلی تجزیہ

حقائق پیش کردہ کی روشنی میں ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء والی بابت رپورٹ کے اندراجات پر مفروضہ تراشوں کے بیجا اعتراضات کے جواب میں اب یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ

(۱) ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء والی ولادت رپورٹ فی الحقیقت علامہ اقبال ہی کی ہے۔ کیونکہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہونے والا لڑکا میاں جی نتھو نے پیدا ہوتے ہی اپنی چھوٹی بہن زوجہ شیخ غلام محمد کو جس کی نرینہ اولاد نہ بچتی تھی، دے دیا تھا۔ اور وہ لڑکا شیخ غلام محمد کے بچے کی حیثیت سے کچھ عرصہ بعد فوت ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو علامہ کے والدین کی یہ

فراخ دلی اتنی پسند آئی کہ نعم البدل کے طور پر ۱۰ ماہ بعد اسی سال علامہ جیسا باقبال بیٹا عنایت فرمایا

(۲) ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کی ولادت رپورٹ لکھوانے والے "علی محمد" کا علامہ کے والدِ بزرگوار کا رشتہ دار ہونا ضروری نہیں، لیکن مفروضہ تراشوں کے بطلان کے لیے یہ خدائی انتظام سمجھیے کہ یہ رپورٹ دہندہ شیخ نور محمد کے چچا زاد بھائی شیخ محمد عبداللہ بٹیھیکی والے کے حقیقی پھوپی زاد تھے۔ اس لیے رشتے میں علامہ کے والدِ گرامی کے بھی بھائی ہی تھے۔ وہ کاشمیری محلّے میں آباد تھے۔ ان کے خاندان سے ہمارے اب تک مربیانہ مراسم ہیں

(۳) بابا علی محمد ولد غلام محی الدّین نے اس رپورٹ میں میاں جی نتھو کا پیشہ خیّاطی ٹھیک لکھوایا ہے۔ وہ برقعوں کی ٹوپیاں بناتے اور بنواتے تھے۔ اور اپنے اسی پیشے کی وجہ سے سارے شہر میں "نتھو ٹوپیاں والے" کے عرفی نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔
کوائف پیش کردہ میں کوئی گھپلا گری نہیں۔ یہ سیدھی سادی باتیں میں نے مخالفت برائے مخالفت کے لیے نہیں، بلکہ حقیقت نمائی کے لیے لکھی ہیں، تاکہ اقبال تراشی کے دعویدار حلقۂ علامہ کے نام پر مفروضے گھڑنے کے بجائے حق طرازی کا مسلک اختیار کریں۔ علامہ کا جشن صد سالہ ۱۹۷۷ء میں ہو، یا اس سے پہلے، یا بعد، اہلِ تحقیق کے نزدیک دستاویزی طور پر ثابت شدہ تاریخ ولادت ہی صحیح تاریخ ولادت سمجھی جائیگی۔ اقبال شناسی کے بزعمِ خود غلط ٹھیکیدار مانیں یا نہ مانیں تکمیلِ حجت کے طور پر پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کے ایک غیر مطبوعہ خط میں سے جو انھوں نے مفروضہ تاریخ ولادت کے سرکاری اعلان کے عین بعد سکریٹری وزارتِ تعلیمات، پاکستان کو ۲ فروری ۱۹۷۴ء کو بحیثیت ناظم مجلس ترقیِ ادب لکھا۔ چند فقرے تنظ نواز ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم کا نکتۂ نگاہ

(خط بنام سکریٹری وزارتِ تعلیمات، پاکستان)

وہ نگارِ نفیر کے جن صفحات پر علامہ کی تاریخ ولادت سے بحث ہے، انھیں تحقیقی کاوش قرار دینا، تکلف ہی ممکن نظر آتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ دوسری باتوں سے قطع نظر ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو علامہ کی تاریخ ولادت تسلیم کرنے میں دراصل تامل اس لیے ہوتا ہے کہ اس تاریخ ولادت کا اندراج میونسپل کمیٹی کے کاغذات میں نہیں پایا گیا۔ اس کے برعکس باقی دونوں تاریخیں (۲۲ فروری اور ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء) میونسپل کاغذات میں ملتی ہیں۔ ۔ ۔ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کا اندراج علامہ کے ان معتقدین کو فی الفور قابلِ قبول معلوم ہوا، جو ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کے اعلان سے متاثر ہو چکے تھے۔ اور یہ سن کر کہ اس تاریخ کو پیدا ہونے والا بچہ رحلت کر گیا، نئی تاریخ ولادت کو مان لینے پر بدیں وجہ آمادہ تھے کہ

(الف) اس دوسری تاریخ ولادت کا اندراج بھی میونسپل کمیٹی کے کاغذات سے ثابت ہوتا تھا۔ نیز

(ب) "اقبال درونِ خانہ" وہ پہلی کتاب تھی جو علامہ کے اہلِ خاندان میں سے کسی نے علامہ کے ذاتی معاملات کے متعلق پیش کش کی تھی۔ چونکہ خالد نظیر صوفی صاحب پیشہ ور مصنف نہیں تھے، جو صرف اپنا نام اچھالنے کے لیے خود اپنے خاندان کے افضل ترین بزرگ کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کر تے، ان کی فراہم کردہ معلومات نیک نیت طالبعلم کو اور بھی زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوئیں۔

راقم الحروف بھی ان طلبہ میں سے ہے جنھوں نے اس تاریخ ولادت کو بصورتِ موجودہ درست تسلیم کر لیا ہے۔ اور اس وقت تک درست تسلیم کرینگے، جب تک کسی زیادہ محکم، زیادہ قابلِ اعتماد متبادل تاریخ کا دستاویزی ثبوت میسر نہیں ہوتا۔ اس بارے میں راقم نے بعض بنیادی امور کے متعلق "مصنف "اقبال درونِ خانہ" سے خط و کتابت شروع کی ہے، جو کمیٹی کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔

خ دل اتنی پسند آئی کہ نعم البدل کے طور پر ۱۰ ماہ بعد اسی سال علامہ جیسا اقبال بیٹا
یہ فرمایا

۲) ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کی ولادت رپورٹ لکھوانے والے "علی محمد" کا علامہ کے والد یا دگوار
رشتہ دار ہونا ضروری نہیں، لیکن مفروضہ تراشوں کے بطلان کے لیے یہ خدائی انتظام
ہے کہ یہ رپورٹ دہندہ شیخ نور محمد کے چچا زاد بھائی شیخ محمد عبداللہ ٹھیکی والے
حقیقی پھوپی زاد تھے۔ اس لیے رشتے میں علامہ کے والد گرامی کے بھی بھائی ہی تھے۔ وہ
میری محلے میں آباد تھے۔ ان کے خاندان سے ہمارے اب تک مربیانہ مراسم ہیں

۳) بابا علی محمد ولد غلام محی الدین نے اس رپورٹ میں میاں جی نتھو کا پیشہ خیاطی ٹھیک
لکھوایا ہے۔ وہ بچوں کی ٹوپیاں بناتے اور بنواتے تھے۔ اور اپنے اسی پیشے کی وجہ سے
سارے شہر میں "نتھو ٹوپیاں والے" کے عرفی نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔
دلائل پیش کردہ میں کوئی گھپلا گری نہیں۔ یہ سیدھی سادی باتیں ہیں جو مخالفت برائے
مخالفت کے لیے نہیں، بلکہ حقیقت نمائی کے لیے لکھی ہیں، تاکہ اقبال تراشی کے دعویدار
متعلقہ علامہ کے نام پر مفروضے گھڑنے کے بجائے حق طرازی کا مسلک اختیار کریں۔ علامہ
کا جشن صد سالہ ۱۹۷۷ء میں ہو، یا اس سے پہلے، یا بعد اہل تحقیق کے نزدیک دستاویزی
طور پر ثابت شدہ تاریخ ولادت ہی صحیح تاریخ ولادت سمجھی جائے گی۔ اقبال شناسی
کے ٹھیکیدار خود غلط ٹھیکیدار مانیں یا نہ مانیں۔ تکمیل حجت کے طور پر پروفیسر حمید احمد خان مرحوم
کے ایک غیر مطبوعہ خط میں سے جو انھوں نے مفروضہ تاریخ ولادت کے سرکاری اعلان کے
بعد سیکرٹری وزارت تعلیمات، پاکستان کو ۲ فروری ۱۹۷۴ء کو بحیثیت ناظم مجلس
ترقی ادب لکھا۔ چند فقرے نذر نواز ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کا نکتہ نگاہ

(خط بنام سیکرٹری وزارت تعلیمات، پاکستان)

روزگار فقیر کے جن صفحات پر علامہ کی تاریخ ولادت سے بحث ہے، انھیں تحقیقی کاوش قرار دینا، تکلف ہی ممکن نظر آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ دیگر باتوں سے قطع نظر ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو علامہ کی تاریخ ولادت تسلیم کرنے میں دراصل تامل اس لیے ہوتا ہے کہ اس تاریخ ولادت کا اندراج میونسپل کمیٹی کے کاغذات میں نہیں پایا گیا۔ اس کے برعکس باقی دونوں تاریخیں (۲۲ فروری اور ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء میونسپل کاغذات میں ملتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو اندراج علامہ کے ان معتقدین کو فی الفور قابل قبول معلوم ہوا، جو ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کے اعلان سے متاثر ہو چکے تھے۔ اور یہ سن کر کہ اس تاریخ کو پیدا ہونے والا بچہ رحلت کر گیا، نئی تاریخ ولادت کو مان لینے پر بدیں وجہ آمادہ تھے کہ

(الف) اس دوسری تاریخ ولادت کا اندراج بھی میونسپل کمیٹی کے کاغذات سے ثابت ہوتا تھا۔ نیز

(ب) "اقبال درون خانہ" وہ پہلی کتاب تھی، جو علامہ کے اہل خاندان میں سے کسی نے علامہ کے ذاتی معاملات کے متعلق پیش کش کی تھی۔ چونکہ خالد نظیر صوفی صاحب پیشہ ور مصنف نہیں تھے، جو صرف اپنا نام اچھالنے کے لیے خود اپنے خاندان کے افضل ترین بزرگ کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرتے، ان کی فراہم کردہ معلومات نیک نیت طالبعلم کو اور بھی زیادہ قابل قبول معلوم ہوئیں۔

راقم الحروف بھی ان طلبہ میں سے ہے، جنھوں نے اس تاریخ ولادت کو بصورت موجودہ درست تسلیم کر لیا ہے۔ اور اس وقت تک درست تسلیم کریں گے، جب تک کسی زیادہ محکم، زیادہ قابل اعتماد متبادل تاریخ کا دستاویزی ثبوت میسر نہیں ہوتا۔ اس بارے میں راقم نے بعض بنیادی امور کے متعلق "مصنف "اقبال درون خانہ" سے خط و کتابت شروع کی ہے، جو کمیٹی کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔

تاہم کارروائی کی اس منزل پر بھی مجھے کمیٹی سے یہ گزارش ضرور کرنی ہے کہ محض قیاس یا متفرق زبانی بیانات پر بھروسا کر کے یہ طے نہیں کرنا چاہیے کہ علامہ فلاں دن پیدا ہوئے تھے۔ میرے دوست پروفیسر طاہر فاروقی ہوں، یا پرانگ یونیورسٹی کے پروفیسر جان مارک، یا خود نواب ذوالفقار علی خان مرحوم۔ ان میں سے کوئی صاحب علامہ کی تاریخ ولادت کے بارے میں سند نہیں ہوسکتے۔ اگر ہم سنی سنائی باتوں کو مان کر علامہ کی تاریخ ولادت مقرر کرنے لگے، تو اس دلیل سے یہی ماننا ہوگا کہ میاں محمد شفیع (م ش) جو علامہ کے آخری دو تین برسوں میں ان کے ساتھ اس درجہ وابستہ رہے، جیسے ایک بے لوث خدمتگار اور نستعلیق سیکریٹری۔ انھوں نے اوائل ۱۹۳۸ء میں علامہ کی پینسٹھویں سالگرہ بتائی ہے

(تعارف مقالات یوم اقبال مطبوعہ لاہور ۱۹۳۸ء)

حقائق تاریخ کے سامنے ہیں۔ سیاست گری کی عینک اتار کر حقیقت دیکھ لیں سچ یہی ہے کہ سب کمیٹی کا ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی بنیاد پر دسمبر ۱۹۷۷ء سے جشن صد سالہ اقبال کے طور پر سال ولادت منانے کا پروگرام ہی درست تھا، اس کے بعد بے وقت کی راگنی ہے۔ مجلس ترقی ادب والوں نے اسی لیے پہلی فروری ۱۹۷۴ء کو کیے گئے مفروضہ تاریخ ولادت کے اعلان کو صرف نظر کرتے ہوئے ناموافق حالات کے باوجود ایک سرکاری ادارے کی حیثیت سے یہ تقریب بہ صدارت وزیر تعلیم جناب عبدالحفیظ کاردار ۱۳ فروری ۱۹۷۴ء کو منا دی تھی۔ اگر مصلحت کوشانہ خیرہ چشمی کے سبب افلاطونی محققوں کا مفروضہ تراش کردہ یہ شمس نصف النہار کی طرح روشن حقیقت نہیں دیکھ سکتا، تو اس میں اس امر تحقیق شدہ کا کیا قصور۔ بہ تائیدی ثبوت از قسم بیانات اور علامہ کی درسی کتابیں وغیرہ دیکھنے کے لیے صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔

(بشکریہ اخبار جہاں۔ کراچی)

مالک رام

تبصرے

بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اُردو شعرا

از مشتاق احمد ایم اے

سائز ۲۰ × ۳۰/۱۶ صفحات ۳۸۴ - مجلد، قیمت ۲۰ روپے۔

ناشر: اقبال احمد اینڈ برادرس، ۱۴ سید صالح لین، کلکتہ ۷، (۱۹۷۲)

اردو ہندستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور ملک کے ہر حصے میں اس کے لکھنے والے رہے ہیں، اور آج بھی ہیں۔ اس لیے اُردو زبان کی کوئی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک پورے ملک کی تصنیفی سرگرمیوں کا جائزہ نہ لیا جائے۔ اس کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ اردو کے مشہور مراکز اور پھر مختلف ریاستوں کے کام کا احاطہ کیا جائے۔ یہ کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ قدرتاً وہاں کے اصحابِ قلم اس کے زیادہ اہل ہیں کہ وہ مقامی تاریخ مکمل کر سکیں۔ بعد کو کوئی مرکزی ادارہ یا انجمن اس کی روشنی میں پورے ملک کی تاریخ مکمل کر سکتا ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ بنگال کے اہلِ قلم کو معاملے کی اہمیت کا احساس ہے۔ ابھی چند برس ہوئے، پروفیسر جاوید نہال نے اپنی گراں قدر تصنیف "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب"

یں فورٹ ولیم کالج سے لے کر نواب سید محمد آزاد (ف ۱۹۱۷ء) تک کے مشاہیر کا
تذکرہ اور بنگال کی اردو دنیا کے حالات قلمبند کر دیے۔ اسی طرح اس سے پہلے سید
اقبال عظیم کی کتاب "مشرقی بنگال میں اردو" ڈھاکے سے شائع ہو ئی تھی۔ وفا راشدی
کی کتاب بھی اسی موضوع پر ہے۔ اب زیر نظر تذکرۂ شعراے بنگال مشتاق احمد صاحب
نے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے حتی الوسع خود ان شعرا سے اپنے حالات لکھوائے ہیں، اور
اگر یہ ممکن نہیں ہوا تو ان سے ذاتی ملاقات کر کے ان سے معلومات مہیا کی ہیں۔ ساتھ
میں کلام کا انتخاب دیا ہے۔ کتاب مصوّر ہے اور اسے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔
یہ کام کتنا کٹھن ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنھیں کبھی اس طرح کا کام
کرنا پڑا ہو۔ مشتاق احمد صاحب نے اسے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔
ان کی یہ کتاب مغربی بنگال کے دورِ حاضر کے شعرا کے لیے بنیادی ماخذ کا کام دے گی۔

۱۔ تذکرۂ شعرا از حسرت موہانی

مرتبہ ڈاکٹر احمر لاری۔ صفحات ۲۰۴، قیمت آٹھ روپے (۱۹۷۳ء)

۲۔ حسرت موہانی: حیات اور کارنامے از ڈاکٹر احمر لاری

سائز ۱۸ × ۲۲ / ۸، صفحات ۴۶۴، مجلد قیمت ۴۰ روپے؛

ناشر: ادبستان، نظام پور، گورکھپور (یو پی) (۱۹۷۳)

مولانا حسرت موہانی کی شخصیت ہمہ جہتی تھی۔ وہ بیک وقت شاعر، صحافی، تذکرہ نویس
نقاد، سیاستداں، تاجر، درویش، قلندر اور اپنی تمام انقلابیت کے باوجود حد درجہ
ضعیف الاعتقاد آدمی تھے۔ افسوس کہ لوگ ۲۵ ہی برس میں اس رنگا رنگ شخصیت کو
بھول گئے (ف ۱۹۵۱)

ڈاکٹر احمر لاری نے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے ان کا انتخاب کیا۔ مواد کی فراہمی کے
دوران میں قدرتی طور پر انھیں اردوے معلیٰ کی پرانی جلدوں میں تذکرۂ شعرا ملا، جو
حسرت نے وقتاً فوقتاً شائع کیا تھا۔ حسرت نے اس سلسلے میں ۱۰۸ شاعروں کے حالات

لکھے اور ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا۔ انھیں میں سے ڈاکٹر احمر لاری نے دس شعرا کے تراجم الگ کر کے اس مجلّد میں شائع کیے ہیں۔ یہ ہیں: حاتم، سودا، قائم مصحفی، نصیر، ذوق، مومن، غالب، نسیم، تسلیم۔ (تسلیم ہی حسرت کے استاد تھے) گویا ابھی ۹۸ اور شعرا کا تذکرہ تشنۂ اشاعت ہے۔ کاش کہ وہ اُسے بھی مرتب کر کے شائع کر دیں!

احمر لاری صاحب نے حسرت کے مرتّب کردہ حالات پر اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ حال آنکہ ان پر حواشی لکھے جا سکتے تھے۔ اضافہ بھی ہو سکتا تھا اور بعض اغلاط کی تصحیح بھی۔ لیکن محض متن کا شائع ہونا بھی مفید رہا۔ اس سے کم از کم حسرت کے تذکرے کا اتنا حصّہ تو محفوظ ہو گیا، جو ہماری دسترس سے باہر تھا۔

دوسری کتاب ڈاکٹر احمر لاری کا وہ مقالہ ہے، جس پر انھیں گورکھپور یونیورسٹی سے پی، ایچ ڈی، کی سند ملی تھی۔ اب تک حسرت کے حالات میں صرف تین چیزیں نسبتاً زیادہ اہم ملتی تھیں: (۱) حالاتِ حسرت از عارف ہسوی (یہ انھوں نے حسرت کی گرفتاری اور قید کے بعد انجمن اعانتِ نظر بندانِ اسلام، دلی کے لیے لکھی تھی)؛ (۲) حسرت موہانی از عبدالشکور۔ (یہ عارف ہسوی کی کتاب (رسالے) سے مفصّل تر اور زیادہ موثق ہے۔ حسرت سے مصنّف کے ذاتی حالات تھے، اور انھوں نے حالات کے لیے ضرور حسرت سے رجوع کیا ہوگا۔ (۳) نگار، لکھنؤ کا حسرت نمبر (جو حسرت کی وفات کے بعد جنوری/فروری ۱۹۵۲ء کے مشترکہ شمارے کی جگہ شائع ہوا) ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی مکمل سوانحِ عمری کی جگہ نہیں لے سکتی تھی، پس، ڈاکٹر احمر لاری کی کتاب کی ضرورت سے متعلق کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا؛ اور یہ واقعی خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے یہ موضوع اپنی تحقیق کے لیے منتخب کیا۔

پوری کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ (۱) عہد اور ماحول؛ (۲) سوانحِ حیات؛ (۳) شخصیت اور کردار؛ (۴) شاعری؛ (۵) صحافت؛ (۶) تذکرہ نگاری؛ (۷) تنقید؛ (۸) متفرق کتابیں۔ آخر میں دو ضمیمے ہیں۔ پہلے میں ان شعرا کی فہرست ہے

جن کا تذکرہ حسرت نے لکھا تھا؛ اور دوسرے میں ان شعرائی فہرست ہے، جن کے حالات بعض دوسرے حضرات نے لکھے اور یہ حسرت کے رسائل میں شائع ہوئے۔ آخر میں حسرت کی دو نظمیں دی ہیں، جو مطبوعہ "کلیات حسرت" میں شامل نہیں۔

اس مختصر بیان سے معلوم ہوگا کہ حسرت کی زندگی کا کوئی گوشہ اس کتاب سے باہر نہیں رہ گیا۔ احمد لاری صاحب نے شگفتہ زبان میں تمام حالات بیان کر دیے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حسرت کے حالات میں اب اس سے بہتر کتاب لکھنا ممکن نہ ہوگا۔ مصنف نے ان تمام لوگوں سے یا تو ذاتی رابطہ قائم کیا؛ یا مراسلت کی، جن سے حالات ملنے کی توقع ہوسکتی تھی۔ اب یہ مآخذ کسی اور کو مہیا نہیں ہوسکتے۔

تنقید کا حصہ بھی بہت متوازن ہے۔ انھوں نے تفضیل کل کے صیغے استعمال کرنے سے اجتناب کیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مغربی نقادوں کی رائے کو اردو شاعری کے حسن و قبح جانچنے کے لیے معیار قرار نہیں دیا۔

ہر پہلو سے یہ کامیاب کتاب کہی جاسکتی ہے۔

میر حسن: حیات اور ادبی خدمات از ڈاکٹر فضل الحق

سائز ۲۰×۳۰/۱۶؛ صفحات ۴۷۲۔ مجلد؛ قیمت: ۱۵ روپے۔

ناشر: ادارہ تصنیف، ایف ۹/۱۱ ماڈل ٹاؤن: دلی ۹ (۱۹۷۳ء)

میر حسن کا نام اردو دنیا میں دو حیثیت سے مشہور رہے: اول، ان کی شہرۂ آفاق مثنوی سحرالبیان کے باعث؛ اور دوسرے، ان کے تذکرۂ شعرائے اردو سے۔ ایک اضافی سبب یہ بھی ہے کہ وہ میر انیس کے دادا تھے۔

میر حسن کے حالات اور کلام پر ابھی تک کوئی وقیع کام نہیں ہوا۔ اور تو اور، ان کا کلیات بھی آج تک شائع نہیں ہوسکا۔ ڈاکٹر فضل الحق (شعبۂ اردو، دلی یونیورسٹی) نے یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کے لیے تیار کیا تھا، جس پر انھیں گورکھپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند عطا ہوئی۔

انھوں نے اس کے سات ابواب (خاندانی حالات، اُردو مثنوی کا ارتقا، مثنوی سحر البیان، غزل گوئی، قصائد، مراثی اور رباعیات وغیرہ، تذکرہ گوئی) میں میر حسن کی سوانح عمری اور ان کے کاموں کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے بھی مثنوی سحر البیان اور ان کی دوسری مثنویوں سے زیادہ اعتنا کیا ہے؛ اور پورے دو باب ان کے لیے وقف کر دیے ہیں (باب دوم و سوم، صفحات ۱۲۹ تا ۲۷۷) اور غزلیات کے دیوان پر صرف ایک مختصر باب (۲۷۹ تا ۳۰۳)۔ نہ دیوان کے نسخے اب اتنے کمیاب ہیں، نہ حسن غزل گو کی حیثیت سے اتنے کم اہم کہ وہ چاہتے تو ان کا اس پہلو سے مکمل جائزہ نہ لے سکتے۔

بہر حال جتنا کام ہو گیا، یہ بھی غنیمت ہے۔ اس وقت تک حسن کے بارے میں جو کچھ لکھا جا چکا تھا، انھوں نے یکجا کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ دیوانِ حسن کو ایڈٹ کر کے شائع کر دیں تاکہ ادبِ اردو کی یہ متاع گراں قیمت منظرِ عام پر آ جائے۔

جگر بریلوی : ایک تعارف از ڈاکٹر سیّد لطیف حسین ادیب

سائز ۱۸ + ۲۲/۸؛ صفحات ۱۴۴۔ قیمت چار روپے پچاس پیسے
انجمن ترقی اردو ہند، نئی دلی (۱۹۷۳ء)

حضرت شیام موہن لال جگر بریلوی ہماری زبان کے مشہور اور برگزیدہ شاعر ہیں۔ وہ ہماری کلاسیکی شاعری کے ان بقیۃ السیف چند نمایندوں میں سے ہیں، جن کے دم قدم سے فن کے رکھ رکھاؤ، زبان کی صحت، ذوقِ سخن کی شایستگی، ادبِ عالیہ کی عظمت اور خیالات کی پاکیزگی کا بھرم قائم ہے۔ جگر صاحب عمر کی ۸۵ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ دعا ہے کہ ربِّ کریم انھیں تادیر زندہ و سلامت رکھے۔ آمین!

ڈاکٹر سیّد لطیف حسین ادیب نے اس کتاب میں جگر کے فن کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ شروع میں شاعر کے مختصر سوانح حیات ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ منہ میں روایتی چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے، لیکن ان تک دورِ جام آتے آتے خم خالی ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی تعلیم حسبِ منشا مکمل نہ کر سکے۔ بی اے کی سند لی تھی کہ روزگار

کی تلاش شروع ہو گئی۔ ان کے والد رائے کنھیا لال متخلص بہ دل کے زمانے تک خاندان کی مالی حالت بہت اچھی تھی اور ان کا بریلی شہر کے عمائد میں شمار تھا۔ جگر کے دادا رائے بہادر منشی درگا پرشاد مدتوں محکمۂ تعلیم میں ملازم رہے۔ اور انسپکٹر مدارس کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ غرض خاندانی رسوخ کے باعث جگر کا نائب تحصیلداری کے لیے انتخاب ہو گیا۔ لیکن اس زمانے میں سرکاری ملازموں، خصوصاً انتظامیہ کے نچلے افسروں کو جس طرح کے جوڑ توڑ کرنا پڑتے تھے اور حکام بالا کو خوش رکھنے کے لیے اخلاقی جذبات کی جیسی قربانیاں دینا پڑتی تھیں، وہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ انجام بھی غیر متوقع نہ رہا۔ ترقی کے تمام دروازے بند کے بند رہے، بلکہ اگر کوئی سخت گیر قسم کا حاکم ضلع آ گیا، تو جان و ناموس کے لالے پڑ گئے۔ خدا خدا کر کے، ۱۹۴۳ء میں اس مصیبت سے گلو خلاصی ہوئی اور انھوں نے سکھ کی سانس لی۔ آج کل میرٹھ میں قیام ہے۔

جناب ڈاکٹر ادیب نے جگر کی مطبوعہ تصنیفات پر بسیط تبصرہ کیا ہے بدقسمتی سے جگر کا دیوان آج تک شائع نہیں ہو سکا۔ غنیمت ہے کہ انجمن ترقی اُردو نے اپنے انتخابات کے سلسلے میں ان کا (۸۰۰) اشعار کا ایک انتخاب شائع کر دیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جگر کس پایے کے غزل گو ہیں۔ افسوس کہ ڈاکٹر ادیب نے ان کی غزل پر تنقیدی نظر ڈالنے سے اجتناب کیا ہے۔

جگر کی چھوٹی بڑی متعدد مثنویاں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں 'پیام ساوتری' نے بجا طور پر بہت شہرت حاصل کی۔ اس میں ۱۴۰۰ اشعار ہیں۔ اگرچہ اس کا قصہ ہندو دیومالا سے ماخوذ ہے، لیکن اس کا مقصد اخلاقی ہے اور ہندی تہذیب کے اس دور کی یاد تازہ کرنا، جب عورت 'دیوی' سمجھی جاتی تھی، جب اس کی حیثیت 'شمع انجمن' سے زیادہ 'چراغ خانہ' کی تھی۔ ڈاکٹر لطیف حسین نے اس مثنوی کے فنی اور مقصدی پہلو پر تفصیلی بحث کی ہے، اور اسے بجا طور پر "نادر تخلیق" قرار دیا ہے۔ جگر کی دوسری قابل قدر شعری تخلیق ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ سب نقاد متفق ہیں، رباعی

بڑی مشکل صنفِ سخن ہے۔ اس کے لیے گہری فنی واقفیت اور وسیع تجربۂ حیات درکار ہے۔ اور یہ دونوں باتیں ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں شاعر خاص کر غزل کے شاعر تو ہزاروں ہوئے، لیکن کامیاب رباعی نگاروں کے نام ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ جگر بھی اسی زمرے میں گنے جائینگے، ان کی رباعیاں خاصے کی چیز ہیں۔ 'رس' میں تین سو سے زیادہ رباعیاں ہیں۔ ان میں اخلاق، حیات، حسن و عشق، فطرت، جمالیات ۔ غرض مختلف موضوعات پر فن کے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ بڑی چابکدستی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے مصنّف نے ان رباعیوں پر سرسری نظر ڈالی ہے، حالانکہ وہ اس سے زیادہ توجّہ کی مستحق تھیں۔

جگر صاحب جتنے بلند پایہ شاعر ہیں، اتنے ہی شگفتہ اور ذہین نثر نگار بھی ہیں۔ ان کا نثری سرمایہ بھی خاصا وقیع اور قابلِ قدر ہے۔ افسوس کہ ان کی تمام نثری چیزیں بھی منظرِ عام پر نہیں آسکیں اور اب تو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ ان میں سے بہت سی ضائع ہو گئیں، یا ہو جائینگی۔ ڈاکٹر ادیب نے ان کی نثری تصنیفات کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے۔ بدقسمتی سے عام طور پر ہمارے ہاں تنقید یک رُخی ہوتی ہے۔ یعنی یا سراسر مدح یا قدح قاری کو اس سے نہ روشنی ملتی ہے کہ وہ اس کی مدد سے خود کسی نتیجے پر پہنچ سکے، نہ اس کے دل میں صاحبِ تصنیف یا نقّاد کی کوئی واضح تصویر ابھرتی ہے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ڈاکٹر ادیب نے جگر کی نثری تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے توازن کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔۔۔ انھوں نے ان کے "عیب" اور "ہنر" دونوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے اب جگر صاحب کو تو کیا فائدہ ہوگا، لیکن آئندہ لکھنے والے ضرور اس سے بصیرت حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ مختصر کتاب جگر صاحب کے فکر و فن کے بارے میں اچھے دیباچے اور تعارف کا کام دے سکتی ہے۔ جگر صاحب واقعی خوش قسمت ہیں کہ وہ اپنی تمام تصنیفات کی عدم اشاعت کے باوجود اپنی زندگی میں شہرت کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں، جو کئی لوگوں کو مدتیں

گزر جانے پر بھی نصیب نہیں ہوتی

(نوٹ: ص ص ۱۱۲ - ۱۱۳ پر نواب محبت خان محبت کا ذکر آیا ہے۔ اس کی مثنوی اسرار محبت واقعی میر حسن کی مثنوی سے دو سال پہلے مکمل ہوئی۔ جگر صاحب کے ہاں دو سو سال کاتب کی کرم فرمائی ہے، اس نے "سو" کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔

محبت نے سر چارلس بابلو کی فرمائش پر پشتو کی صرف و نحو (اور لغات) میں ایک کتاب بزبان فارسی "ریاض المحبت" بھی لکھی تھی۔ اس کے اردو اور پشتو کے دیوان ملتے ہیں۔ اردو دیوان کے دو خطی نسخے انڈیا آفس لائبریری، لندن میں بھی ہیں)

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ: حیات اور کارنامے

از ڈاکٹر حسینی شاہد

سائز ۱۸ × ۲۲/۸ صفحات ۲۲۴: مجلد، قیمت ۳۰ روپے

ناشر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش، حمایت نگر، حیدرآباد (۱۹۷۳ء)

تاریخ ادب اردو اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک دکن کا پورا سرمایہ منظر عام پر نہیں آجاتا۔ اور اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ یہ کام خود اہل دکن ہی بوجہ احسن کر سکتے ہیں۔ شکر کا مقام ہے کہ دکنی اہل علم اور صاحب قلم حضرات کو بھی اس کام کی اہمیت کا پورا احساس ہے۔ پچھلے ۳۰ - ۴۰ برس میں ان کی کوششوں سے بیسیوں دکنی متن شائع ہوئے ہیں، جن سے اس دور کی کھوئی گمشدہ کڑیاں سامنے آگئی ہیں اور ہم اردو کے اس ابتدائی دور کی تاریخ سے واقف ہو سکے ہیں۔

زیر نظر کتاب دکنی کے ایک اہم اور صف اول کے مصنف کے حالات اور ان کی تصنیفات کے تفصیلی بیان پر مشتمل ہے۔ اردو کا کون سا طالب علم میراں جی شمس العشاق اور ان کے بیٹے سید برہان الدین جانم کے ناموں سے ناواقف ہو گا۔ ان دونوں کی تصوف و روحانیت اور رشد و ہدایت کے پہلو سے جو خدمات ہیں، ان سے قطع نظر اگر ہم ان کے وہ کارنامے ہی دیکھیں، جو انھوں نے شعر و ادب کے میدان میں سرانجام دیے،

تو ان کی اہمیت اور عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ انھیں سید برہان الدین جانم کے فرزند رشید تھے۔ وہ اپنے والد (جانم) کی وفات کے چند ماہ بعد ۲۳ رمضان ۱۰۰۰ھ (۹ اپریل ۱۵۹۹ء) کو پیدا ہوئے۔ اور ۸۷ برس کی عمر گزار کر ۲۳ جمادی الاول ۱۰۸۵ھ (۱۵ اگست ۱۶۷۴ء) کو رحلت کی۔ ان کی درگاہ آج تک بیجاپور کے باہر (شاہ پور میں) موجود ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے ان کے مادۂ تاریخ وفات میں یہ شعر لکھا ہے (ص ۱۴۹):

وہ ہے سرمست مدہوش از مے اسرار یزدانی
ہمیں گفتا: امین الدین علی معشوق ربانی (۱۰۸۵ھ)

انھیں غلط فہمی ہوئی! یہ دو مختلف شعروں کے آخری مصرعے ہیں، جیسا کہ ان کے دیے ہوئے عکس سے عیاں ہے۔

ڈاکٹر حسینی شاہد نے شاہ امین الدین علی کی تصنیفات پر بحث کرتے ہوئے انھیں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) قطعا نیقت: یہ واقعی ان کی کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان خطی نسخوں کی تفصیل بھی دی ہے، جو اب دستیاب ہوتے ہیں، یا جن تک ان کی دسترس ہو سکی۔ (۲) مشتبہات: اس کے ذیل میں ان رسائل کا ذکر ہے، جن کے بارے میں قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شاہ امین الدین علی ہی کی تصنیف ہیں؛ ہو سکتا ہے کہ ان کے ہوں اور ممکن ہے کہ کسی اور شخص کے ہوں۔ (۳) منسوبات: اس حصے میں ان رسائل کو لیا ہے، جو ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یقیناً شاہ امین الدین علی کے نہیں، لیکن غلطی سے ان سے منسوب ہو گئے ہیں۔

کتاب کے باب ششم میں مطالعۂ زبان کے تحت، گہری سے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پھر دکنی کے صرف و نحو پر بحث کر کے مادوں، محاوروں اور روزمرہ اور اصطلاحات کی الگ الگ فہرستیں ہیں۔ سب سے آخر میں خاندانی اور خلفا کے شجرے دیے گئے ہیں۔

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب دکنیات میں بیش بہا اضافہ ہے اور یہ آیندہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کو چاہیے کہ وہ کتاب کا دوسرا حصہ بھی جلد منظرِ عام پر لے آئیں۔ اس کے علاوہ میراں جی، جانم اور امین کی تمام تصنیفات کو بھی مرتب کر کے شائع کر دیں۔

مثنوی مولانا روم (دفترِ اوّل) مع نثر ترجمہ اردو از قاضی سجاد حسین

سائز ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۴۰۸۔ قیمت: بیس روپے
ناشر: سب رنگ کتاب گھر، دلی (۱۹۷۴ء)

مثنوی مولوی دنیا کی مشہور ترین کتابوں میں سے ہے۔ مولانا روم نے اس کے ذریعے اسلامی تعلیم کو فارسی خوانوں کے لیے منظوم کیا تھا۔ وہ قرآن کی آیات اور احادیث متعلقہ کی تفسیر مختلف حکایتوں اور داستانوں کی مدد سے ایسے دلنشین طریقے پر کرتے ہیں کہ کتاب خواص و عوام کے حلقوں میں یکساں مقبول رہی ہے۔ اردو میں بھی اس کے کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر ترجمے کے مترجم جناب قاضی سجاد حسین مدرسہ عالیہ فتحپوری، دلی کے پرنسپل اور علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس سے قبل وہ کلامِ حافظ و سعدی اور بعض دوسرے فارسی متون کا ترجمہ شائع کر چکے ہیں اور اس میدان میں بھی سب ان کی قابلیت اور ثقاہت کے قائل ہیں۔

یہ کتاب بہت اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ حوض میں جلی قلم سے اشعار لکھے گئے ہیں اور ہر شعر کے نیچے اس کا ترجمہ اردو نثر میں ہے۔ حاشیے میں مشکل الفاظ اور عربی آیات و احادیث کا متن اور ان کے معانی درج ہیں۔ ترجمہ سلیس اور عام فہم زبان میں ہے، اور لفظی ہونے کے باوجود محاورے اور روزمرے کے لحاظ سے بھی قابلِ لحاظ ہے۔ کتاب کے شروع میں ۳۰ صفحات کا مترجم کا لکھا ہوا مبسوط مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے مولانا روم کے بعض بنیادی خیالات کی تشریح کی ہے۔

جن اصحاب کو تصوف اور اخلاق کے مسائل سے دلچسپی ہے، ان کے لیے یہ ترجمہ مفید اور دلچسپ ثابت ہوگا۔

سلکِ کلک (پروفیسر سید حسن کے مضامین کا مجموعہ)

مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف عالم

سائز ۲۰×۳۰/۱۶؛ صفحات ۴۸ + ۱۳۵۔ قیمت ۱۵ روپے۔

ناشر: ڈاکٹر محمد شرف عالم، شعبۂ فارسی، بی این کالج، پٹنہ (۱۹۷۴ء)

پروفیسر سید حسن ہمارے ملک کے ممتاز معلم فارسی ہیں۔ اور ان کا ایران شناسوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے آخر میں پٹنہ یونیورسٹی سے صدر شعبۂ فارسی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے، تو ان کے سعادتمند اور قدردان شاگردوں نے ان کے اعزاز و اکرام کی یہ شکل نکالی کہ ان کے وہ مضامین یکجا کر دیے جائیں جو زبان و ادب فارسی کے بارے میں ہیں اور ہندوستان اور ایران کے مجلات میں منتشر پڑے ہیں۔ یقیناً یہ بہت مبارک اور مناسب اقدام ہے اور اس طرح ان لوگوں کو بھی موصوف کے خیالات اور علمی سفر سے مستفید ہونے کا موقع مل گیا، جو ان جرائد و رسائل کو دیکھنے سے معذور تھے۔

اس مجموعے میں یہ مضمون ہیں: (۱) کچھ منظر کے بارے میں؛ (۲) حافظ کا معشوق؛ (۳) فارسی کی ایک قدیم فرہنگ (زفان گویا و جہان پویا)؛ (۴) ایران کی جدید شاعری اور امن و صلح کا موضوع؛ (۵) ایران جدید کا ایک عوامی شاعر؛ (۶) جگر کا فارسی کلام؛ (۷) قدیم ترین مقدمۂ فارسی بر سفرنامۂ ناصر خسرو؛ (۸) کتابخانہ خدابخش اس سے ان مضامین کے تنوع اور پروفیسر سید حسن کے فکر کی جولانی کا کچھ اندازہ ہوگا۔ جن اصحاب کو فارسی علم و ادب سے شغف ہے، ہم ان سے اس کتاب کے مطالعے کی سفارش کرتے ہیں۔

شروع میں پروفیسر سید حسن نے "شیرازۂ وجود" کے عنوان سے اپنی سوانحعمری قلمبند کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کیسے مخالف حالات میں تعلیم پائی اور اپنی محنت اور ہنرمندی اور مستقل مزاجی سے قابلِ رشک مقام حاصل کیا۔ یہ خود نوشت

حالات نوجوانوں کے لیے سبق آموز ہیں ۔

۱۔ شعر اور شاعر (تذکرۂ شعرائے حاضرہ) مرتبہ ضیا فتح آبادی

سائز ۲۰ × ۳۰ / ۱۶؛ صفحات ۱۶۰ ۔ قیمت پانچ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد۔ دلی (۱۹۷۴)

۲۔ سازِ دلنوا مرتبہ، حلقۂ تشنگانِ ادب

سائز ۲۰ × ۳۰ / ۱۶؛ صفحات ۲۵۶ قیمت سات روپے ۔ سکریٹری
حلقۂ تشنگانِ ادب ۱۰۴، ایکسٹر ۱/۱۱ راما کرشنا پورم نئی دلی ۲۲ (۱۹۷۵ء)

یہ دونوں شعرا کے تذکرے ہیں ۔ چند برس سے جناب مہر لال سونی ضیا فتح آبادی نے اپنے استاد حضرت سیماب اکبر آبادی مرحوم کی یاد میں بزم سیماب قائم کی ہے ۔ جس کے وہ خود ہی صدر ہیں ۔ اس بزم کا مقصد اردو شعر و ادب کو فروغ دینا ہے اور اس کے لیے وہ ادبی اجتماع کرتے رہتے ہیں ۔ انھوں نے اپنے بعض اراکین کے تعاون سے "شعر اور شاعر" کے عنوان سے یہ تذکرہ مرتب کیا ہے ۔ اس میں ۲۰ شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب ہے ۔ چونکہ حالات شعرا نے خود لکھے ہیں، اس لیے ان کے مستند ہونے میں کلام ہی نہیں ہوسکتا، اگرچہ ان میں تشنگی کا احساس ضرور ہوتا ہے ۔ ادیبوں کے حالات تاریخ ادب کا حصہ ہیں ۔ اگر ہمارے ادیب توجہ کریں اور اپنے حالات خود قلمبند کر دیں، تو کم از کم آیندہ آنے والے مؤرخ کا اس حد تک تو ہاتھ بٹا ہی سکتے ہیں اس مجموعے میں بعض شعرا ایسے ہیں، جنھوں نے اردو ادب میں اپنا مستقل مقام بنا لیا ہے اور تاریخ ادب اردو ان کے حالات اور کلام کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی، کلام کا انتخاب جناب ضیا فتح آبادی کا کیا ہوا ہے، جس سے ان کی سخن سنجی اور ذوق صحیح کا اندازہ ہوتا ہے ۔ بہت قابل قدر مجموعہ ہے ۔

دوسرا تذکرہ حلقۂ تشنگانِ ادب، نئی دلی کی طرف سے شائع ہوا ہے ۔ اس کا اسلوب ترتیب

بھی پہلے تذکرے کے مطابق ہے اور دونوں تذکروں میں کم از کم چھ شاعر مشترک ہیں۔
اس میں حالات خود نوشت نہیں۔ البتہ کلام کا انتخاب زیادہ ہے، یہ مفید ہے کیونکہ
معلوم نہیں ان حضرات کے دیوان شائع ہو سکیں یا نہیں۔ اس طرح کلام کا معتدبہ حصہ
ہی محفوظ ہو گیا۔

میری رائے میں اس طرح کے تذکرے بہت ضروری ہیں۔ تصور کیجیے کہ اگر پرانے تذکرے
نہ ہوتے، تو ہماری تاریخ ادب کی تکمیل کی آج کیا سبیل تھی؟ یہ لازم نہیں کہ تمام شعرا
بلند پایہ ہوں۔ زمانہ خود اچھے برے کا انتخاب کر لیگا! آپ کا فرض بس اتنا ہے کہ
خدام ادب کی کوئی کوشش رائیگاں نہ جانے دیں، اور اسے ضائع ہونے سے بچالیں۔ اس
کی خود بھی قدر کریں، اور آنے والی نسلوں کو بھی اس سے محفوظ و مستفید ہونے کا موقع مہیا کریں

مصر الجدید — از محمد ابراہیم

سائز ۱۸×۲۲/۸؛ صفحات ۲۴۰۔ قیمت ۱۵ روپے۔
ناشر: مصنف، پتا: تھرڈ کراس، آر ٹی روڈ، ماولی۔ بنگلور ۴ (۱۹۷۴ء)

مصر کا دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہاں کے آثار قدیمہ اپنی عظمت اور
قدامت کے لحاظ سے اتنے اہم ہیں کہ علوم دنیا میں مصریات، کا مستقل شعبہ بن گیا ہے
اور ان آثار میں سے بیشتر پر الگ الگ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ قاہرہ کے اہرام اور ابوالہول
اسکندریہ کے عمود السواری اور زیر زمین مقابر، مصر الصعید میں الاقصر اور اسوان میں
وادی الملوک اور وادی الامرا، معبد وغیرہ ایسے مقامات ہیں، جنھیں دیکھنے کو دنیا
کے گوشے گوشے سے ہزاروں سیاح ہر سال جاتے ہیں اور ان کی سیری نہیں ہوتی، اور
وہ اگلے برس پھر آتے ہیں۔

سیاسی پہلو سے بھی مصر کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ یہ دنیا کے تین بڑے براعظموں (ایشیا
افریقہ، یورپ) کے گویا محل اتصال پر واقع ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے تاریخ کے
بیشمار تاریخی دور اور انقلاب دیکھے۔ فراعنہ، ہکسس، اسیریا، رومن، از قبل مسیح

کے حکمران تھے ۔ اسلام کے بعد عثمانیوں نے اور عثمانی عہد کے آخر میں محمد علی پاشا نے ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھ دی، جس کا خاتمہ جولائی ۱۹۵۲ء میں جرنیل محمد نجیب اور کرنیل جمال عبدالناصر اور ان کے رفقا کے ہاتھوں ہوا۔

مذہبی لحاظ سے دیکھا جائے، تو بھی حیرت ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم کے پوتے حضرت یوسف کا مصر میں جانا عہدنامۂ قدیم کی تاریخی روایت سے ثابت ہے۔ پھر حضرت موسیٰ کی مصر میں پیدائش اور پرورش اور یہود کا یہاں سے خروج بھی عہدنامۂ قدیم میں پوری تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ عیسائیت اگرچہ شروع بیت المقدس میں ہوئی لیکن قبطی گروہ، جو اس کے اوّلین پیرو ہیں، آج صرف مصر میں پایا جاتا ہے۔ اسلام کا ظہور جزیرۃ العرب میں ہوا۔ اور اسلام کا مرکز بھی مکّہ اور مدینہ کے محلّ وقوع کے باعث وہیں رہا۔ لیکن خلافت ثانیہ کے زمانے میں مصر فتح ہوا، تو اپنی خصوصیّات کے باعث بقول جمال الدین افغانی اسے بھی دنیائے اسلام میں مقاماتِ مقدّسہ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جامعہ الازہر نہ صرف اسلام کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے، بلکہ بجا طور پر اس کا دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹیوں میں شمار ہوتا ہے۔

تحریک عروبہ اگرچہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کے بعد شروع ہوئی، لیکن دراصل دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء - ۱۹۴۵ء) کے بعد پروان چڑھی؛ اس کی کامیابی کا سہرا بھی بہت حد تک مصر کے سر ہے۔ عرب لیگ (الدول العربیہ) کا صدر دفتر قاہرہ ہی میں ہے؛ اور آج دنیائے عرب کی کوئی تحریک مصر کی شمولیت اور تعاون کے بغیر کامیاب ہی نہیں ہو سکتی۔

اور اس پر اضافہ کر لیجیے کہ ہماری تحریک آزادی کے دوران میں مصر اور ہندوستان کے تعلقات نہایت گہرے اور مخلصانہ تھے۔ گاندھی جی اور جواہرلال نہرو کانگریس کی طرف سے اور سعد زغلول پاشا اور مصطفیٰ نحاس پاشا مصری وفد پارٹی کی طرف سے ان تعلقات کے مظہر تھے۔ ان حالات میں یہ بہت افسوس کا مقام ہے کہ اردو میں مصر سے متعلق کوئی معتبر اور قابلِ اعتماد تو ایک طرف رہا، غیر معتبر اور ناقابلِ اعتماد

کتاب بھی موجود نہیں۔ کتاب زیر نظر بھی یہ خلا پُر نہیں کرتی، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ یہ جدید مصر سے متعلق ہے یعنی وہ مصر جو جولائی ۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد وجود میں آیا۔

تمام پرانے نظاموں کی طرح مصری نظام حکومت اور معاشرتی تانا بانا بھی بہت فرسودہ ہو گیا تھا، اور اس میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ انقلاب نے اصلاح کے کام کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی۔ گزشتہ ۲۳ برس میں مصری زندگی کے تمام شعبوں میں اتنی تبدیلی ہوئی ہے کہ مثلاً اگر کسی نے دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ - ۱۹۴۵ء) سے قبل کا مصر کا دیکھا ہو، اور وہ آج پھر وہاں کی سیاحت کرے، تو محسوس کرے گا، گویا وہ کسی اور ملک میں آ گیا ہے۔

محمد ابراہیم صاحب نے آج کے مصر کا نقشا کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے پندرہ ابواب میں اوّل مختصراً وہاں کے جغرافیے اور پیداوار کا ذکر کیا ہے۔ پھر الگ الگ سرکاری اداروں (انتظامیہ، عدلیہ، دستور) کا بیان ہے۔ صنعت و حرفت اور صنعتی مراکز، تعلیم و تربیت اور یونیورسٹیوں، ادب اور بعض مشہور ادیب، صحافت، فنون لطیفہ ــــ

ان سب کے لیے ایک ایک باب وقف ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موضوع ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے، اور اس کا چند صفحات کی فصل میں احاطہ کر لینا محال ہو۔

بہر حال یہ کتاب موجودہ مصر اور وہاں کے نظام کے بارے میں ایک اچھے تعارف کا کام دے سکتی ہے۔ میں فاضل مصنّف کو مشورہ دوں گا کہ وہ مصری زندگی کے مختلف شعبوں پر مفصّل کتابیں لکھیں اور اپنے موضوع کے مآخذ میں محض مغربی مصنّفوں اور انگریزی کتب ہی پر انحصار نہ کریں، بلکہ عربی کتب، خاص کر مصری اہل قلم کی مصنفات سے بھی استفادہ کریں۔ اس سے ان کی تحریر میں نہ صرف وسعت پیدا ہو گی، بلکہ گہرائی بھی۔ اور ان کے نتائج بھی زیادہ وقیع بن سکیں گے۔

ان کے انگریزی مآخذ کی تقلید کرنے سے ایک اور نقص بھی پیدا ہوا ہے۔ شہروں کے نام

بہت جگہ غلط لکھے گئے ہیں۔ اگر عربی مآخذ زیرِ نظر ہوتے، یا کم از کم مصر کا عربی نقشا ہی دیکھ لیا ہوتا، تو یہ نقص نہ پیدا ہوتا۔
ان معمولی نقائص سے قطعِ نظر، یہ کتاب اس لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے کہ اردو میں اس موضوع پر اتنی معلومات بھی اس سے پہلے کبھی یکجا نہیں ہوئی تھیں۔

۱۔ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں   از خواجہ غلام السیدین
۲ ذکرِ جمیل   از صالحہ عابد حسین

سائز ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۵۲۸۔ قیمت ۳۰ روپے
سیدین میموریل ٹرسٹ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ (۱۹۷۴ء)

ہندستان کے تعلیمی حلقوں میں خواجہ غلام السیدین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے جاننے والے انھیں سیدین (صاحب) کے نام سے جانتے تھے۔ ان کا خاندان پشتوں سے علم و فضل کی روایات کا حامل رہا تھا۔ ان کے والد خواجہ غلام الثقلین تھے، جن کی اصلاحی اور تعلیمی اور سیاسی مساعی اور خدمات، خاص کر اسلامیانِ ہند کے سلسلے میں، ہماری تاریخ کا زرّین باب ہیں۔ سیدین کے نانا مولانا حالی کے بڑے صاحبزادے خواجہ اخلاق حسین تھے۔ سیدین نے دادھیال اور ننھیال کی ان روایات کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا اور اپنے خلوصِ نیت اور طریقِ کار اور کامیابی سے ان میں چار چاند لگا دیے۔
سیدین نے اپنی سوانحِ عمری لکھنا شروع کی تھی، لیکن افسوس کہ یہ خود نوشت مکمل نہ کر سکے۔ وہ اس میں ۱۹۴۵ء تک کے حالات قلمبند کر چکے تھے کہ خود ان کی کتابِ زندگی کا ورق الٹ دیا گیا۔ انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔ اس کے بعد کے حالات ان کی چھوٹی ہمشیر صالحہ عابد حسین نے "ذکرِ جمیل" کے عنوان سے لکھے ہیں۔ اب یہ دونوں کتابیں ایک مجلد میں شائع ہوئی ہیں۔
سیدین بمشکل گیارہ برس کے تھے، جب ان کے والد کا ۱۹۱۵ء میں انتقال ہو گیا۔ کھاتا پیتا، خوشحال گھر یک لخت مالی مشکلات میں پھنس گیا۔ لیکن ان کے چچا کی عقلمندی

اور خاص طور پر ان کی والدہ کی حوصلہ مندی اور دور اندیشی کے باعث ان کی تعلیم
میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ انھوں نے مطالعے کا شوق اور ذہانت گویا ورثے
میں پائی تھی۔ تعلیمی دور بہت کامیاب رہا۔ ہر ایک امتحان امتیاز سے پاس کیا، اور
وظائف حاصل کیے۔ اور یوں گھر سے جو مختصر رقم انھیں ہر مہینے پہنچتی تھی، اس کے ساتھ
اگر اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ انھیں تعلیمی فتوحات کے نتیجے میں حکومت نے انھیں ایم اے
کے بعد لیڈز یونیورسٹی میں تدریسی تربیت حاصل کرنے کے لیے وظیفہ دیا۔ وہ ۱۹۲۵ء
میں وہاں سے ایم ایڈ کی سند لے کر وطن واپس آئے اور آتے ہی علی گڑھ یونیورسٹی
ٹریننگ کالج میں پہلے ریڈر اور پھر پروفیسر اور پرنسپل مقرر ہو گئے۔ میرا خیال ہے
شاید ہی ہمارے ملک میں کسی اور کو اتنی کم عمری میں پروفیسری اور پرنسپلی ملی ہو۔
وہ علی گڑھ میں بارہ برس رہے۔ ۱۹۳۸ء میں حکومت کشمیر نے علی گڑھ یونیورسٹی سے
ان کی خدمات مستعار لے لیں۔ وہ صرف دو برس کے لیے سری نگر گئے تھے، لیکن سات
برس وہاں رہے۔ یہاں سے نکلے تو ۱۹۴۵ء میں ریاست رامپور نے انھیں "ناظم
تعلیم" مقرر کر دیا اور اس کے دو برس بعد وہ اسی عہدے پر ریاست بمبئی میں چلے
گئے۔ ان تینوں مرکزوں میں ان کا کام اتنا وقیع اور قابل تعریف رہا کہ حکومت
ہند نے انھیں مرکزی وزارت تعلیم میں بلا لیا۔ وہ یہاں گیارہ برس رہے۔ وہ جب
۱۹۶۱ء میں یہاں سے سبکدوش ہوئے ہیں، تو مشیر تعلیم کے عہدے پر متمکن تھے۔ اس
کے بعد وہ کئی ملکی اور غیر ملکی اداروں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ان کا
۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بعارضۂ قلب نئی دلی میں انتقال ہوا۔
سیدین کی سی بھرپور اور کامیاب زندگی بہت کم لوگوں کے حصّے میں آئی ہے۔ وہ
بنیادی طور پر معلّم تھے۔ تعلیم محض اسی کا نام نہیں کہ آپ چند کتابیں کسی کو پڑھا دیں؛
بلکہ اس کا تعلق "قول" سے زیادہ "فعل" سے ہے۔ آپ اگر اپنے "عمل" سے اپنے
طلبہ کے سامنے قابل تقلید مثال نہیں پیش کرتے تو لاکھ وعظ کرتے رہیں، اور
متبرک اور غیر متبرک کتابوں کی اخلاقی تعلیم دہراتے رہیں، ان پر کوئی اثر نہیں ہونے کا۔
۱۷۱

تبصرے

سیدین کسی عہدے پر بھی رہے ہوں، ان کا اساسی مقصد اپنے ہموطنوں کو اچھا شہری، اچھا انسان بنانا رہا۔ تقریر اور تصنیف و تالیف کا مادّہ بھی ان میں خداداد تھا۔

سیدین کی زبان سادہ ہے، اور اسلوبِ تحریر صریح، غیر مبہم اور موضوع کے مطابق۔ وہ الفاظ اور وقت کی قدر و قیمت جانتے ہیں؛ نہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں، نہ قاری کا۔ انھیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے، کسی ایچ پیچ یا لگی لپٹی بغیر کم از کم لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں پھیلاؤ کی جگہ گہرائی زیادہ ہے۔ انھوں نے زندگی اور اس کے مسائل پر جتنا زیادہ پڑھا تھا، اس سے کہیں زیادہ خود غور و فکر کیا تھا۔ مذہب اور اس کی اقدار نے سونے میں سہاگے کا کام دیا۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ تحریر ہو یا تقریر، اس سے ان کے خلوص اور دلسوزی کی آنچ پھوٹ پھوٹ کر نکلی پڑتی تھی۔ ان کی اس خود نوشت کا بھی یہی طرۂ امتیاز ہے۔

افسوس کہ وہ اسے مکمل نہ کر سکے۔ اس کا تتمہ صالحہ عابد حسین نے لکھا ہے۔ چونکہ وہ بھی اسی درخت کی شاخ ہیں، جس نے سیدین کو پیدا تھا، اس لیے وہ بھی انھیں خوبیوں کی وارث ہیں جو ان کے مرحوم بھائی سیدین کا مابہ الامتیاز تھا۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اب ان کا ہماری زبان کے ممتاز مصنفوں میں شمار ہوتا ہے۔ چونکہ وہ سیدین سے ہمیشہ بہت قریب رہی ہیں، اس لیے مرحوم کی نامکمل سوانحعمری کو پورا کرنے کا ان سے زیادہ نہ کوئی اور مستحق تھا، نہ اہل۔ اور چونکہ وہ اپنے بھائی کی "عاشق" تھیں، اس لیے مرحوم کی خوبیاں جس دل نشین اور سلیس زبان میں انھوں نے بیان کر دی ہیں، اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

یہ کتاب پڑھنے سے ایک بلند شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے — نیک دل، دردمند، خادمِ خلق، بےغرض شخصیت۔ کتنے کم ہیں ایسے لوگ!

اللّٰھم کثّر اَمثالہٗ فینا۔

تبصرے

پدما بھوشن پروفیسر ہارون خان شروانی کی اردو خدمات

(ایک جائزہ)

از صادق نوید ایم، اے

سائز: ۲۰ × ۳۰ / ۱۶؛ صفحات ۱۹۶۔ مجلد، قیمت پانچ روپے

ملنے کا پتہ: مصنف مکان ۲-۸۴۹-۱۲-۱۲، آصف نگر، حیدرآباد ۲۸ (۱۹۷۵ء)

پروفیسر ہارون خان شروانی ان بزرگوں میں سے ہیں، جن کی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں گزری ہے۔ وہ بنیادی طور پر تاریخ کے آدمی ہیں اور مدتوں عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ اور سیاسیات پڑھاتے رہے ہیں۔ دکن سے متعلق ان کی تاریخی تصنیفات اتنی وقیع ہیں کہ آج تک ان پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ ان کے احباب نے ان کی خصوصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی سال کے شروع میں ان کی خدمت میں ایک مجموعۂ مضامین (بزبان انگریزی) پیش کیا تھا، جس کا عنوان ہے: ہندستان کے تعلقات خارجیہ کا مطالعہ (عہد قدیم سے ۱۹۴۷ء تک) اس میں ۳۹ مختلف اکابر کی نگارشات ملتی ہیں۔

لیکن ان کی اردو زبان و ادب کی خدمات بھی کچھ کم اہم نہیں اور ان کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ زیر نظر کتاب اسی طرف ایک قدم ہے۔ یہ دراصل جناب صادق نوید ایم، اے کا وہ مقالہ ہے، جو انھوں نے رفیعہ سلطانہ (صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی) کی زیر نگرانی اور رہنمائی میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم، اے کی سند لینے کے لیے قلمبند کیا تھا۔

پہلے باب میں پروفیسر شروانی کی سوانحِ عمری بیان کی گئی ہے۔ شروانیوں کے حالات میں حاجی عباس خان شروانی کی مفصل کتاب "شروانی نامہ" موجود ہے۔ اس لیے اسلاف کے کوائف جمع کرنے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی ہوگی۔ اور جہاں تک خود شروانی صاحب کی سوانح حیات کا تعلق ہے، وہ بفضلہٖ تعالیٰ حیدرآباد میں موجود ہی ہیں۔ اس لیے

مصنّف نے ان سے ذاتی ملاقاتوں میں سارا مواد جمع کر لیا۔ اس طرح سے اس مقالے میں ان کے مستند اور مصدّقہ حالات جمع ہو گئے ہیں۔

دوسرے باب میں، پروفیسر صاحب موصوف کی تصانیف اور مضامین کی فہرست دے کر ان پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ جائزہ بہت سرسری ہے، غالباً انھیں اپنے امتحان کے لیے اس سے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی نہ رہی ہو۔ بہر حال، یہ حصّہ تشنہ رہ گیا ہے اور اس سے زیادہ توجہ اور تفصیل کا مستحق ہے کسی اور صاحب کو اس موضوع پر غور و فکر کے بعد پوری شرح و بسط سے لکھنا چاہیے۔

اسی باب کے دوسرے حصّے میں جناب شروانی صاحب کے مضامین کا ذکر ہے، جو مختلف رسائل و جرائد میں منتشر ہیں۔ یہ بڑھتی دولت ہے۔ مقالے میں ۱۹۷۲ء تک کے ۴۶ مضامین کی فہرست دی گئی ہے۔ گزشتہ تین برس میں بھی کچھ مضامین ضرور شائع ہوئے ہونگے۔ خدا کرے، پروفیسر شروانی تا دیر سلامت رہیں اور اپنے رشحاتِ قلم سے تشنگانِ علم و ادب کو مستفید فرماتے رہیں!

کتاب کے تیسرے باب میں موصوف کی عملی خدمات کا ذکر ہے۔ اس میں بیشتر ان کی ان تقاریر و تجاویز کے اقتباسات اور ان پر ہلکا سا تبصرہ ہے، جو انھوں نے اپنی چھ سالہ مجلس وضع قوانین کی رکنیت کے زمانے میں پیش کی تھیں اور ان پر ہلکا سا تبصرہ ہے جو انھوں بہر حال، یہ مقالہ اپنے موضوع سے متعلق بہت مفید اور مصدّقہ معلومات مہیا کرتا ہے اور آئندہ کام کرنے والوں کے لیے اچھی تمہید کا کام دیگا۔

اُردو مصدر نامہ از حفیظ الرحمٰن واصف

سائز: ۲۰×۲۶/۸، صفحات: ۴۲۸، قیمت: پندرہ روپے۔
ملنے کا پتہ: مولانا حفیظ الرحمٰن واصف اردو بازار، جامع مسجد دلی۔ ۶ (۱۹۷۵ء)

فارسی میں مبتدی طلبہ کو زبان سکھانے کے لیے صفوۃ المصادر، مصدر فیوض، وغیرہ سے

بسم اللہ ہوا کرتی تھی۔ ان کتابوں (کتابچوں) میں فارسی مصادر اور صرف کے اصول درج ہیں اور طالب علم انھیں رٹ لیا کرتے تھے۔ یہ طریقۂ تعلیم درست تھا یا نادرست، اس سے بحث نہیں، لیکن تھا کامیاب اور نتیجہ خیز۔ اگر طالب علم اسے پوری توجہ سے سمجھ کر پڑھ لیتا، تو کم از کم افعال وغیرہ کی غلطی نہیں کرتا تھا۔

اردو میں اس طرح کا کوئی مصدر نامہ موجود نہیں تھا۔ مولوی حفیظ الرحمٰن واصف نے اس کمی کو محسوس کیا اور اسی کا نتیجہ زیرِ نظر کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے تقریباً تیرہ سو مصادر اور ان سے کم و بیش انیس سو مشتقات کا احاطہ کیا ہے۔ مصنف خود اہلِ زبان ہیں، ان کی ساری عمر اہلِ زبان اور نقادرِ الکلام اساتذہ کی صحبت میں گزری ہے (شعر میں وہ نواب سائل دہلوی مرحوم کے شاگرد ہیں، اور حضرت مفتی محمد کفایت اللہؒ کے صاحبزادے)۔ وہ زبان کے مزاج داں ہیں، انھیں خود الفاظ کی بناوٹ اور ان کے محلِ استعمال پر محاکمہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، مستند ہے؛ تاہم اپنی تائید میں ہر جگہ اساتذہ کے، جس میں ان کے دادا استاد داغ دہلوی شریک غالب ہیں، کلام سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

کتاب کے شروع میں ایک بصیرت افروز دیباچہ ہے، جس میں پرانے اردو بازار اور اس کے گرد و نواح کی تحقیق کی گئی ہے۔

یہ کتاب ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور کامیاب ہے۔

یہ تھی دلّی — از طالب دہلوی

سائز: ۲۰×۳۰/۱۶؛ صفحات ۳۴۶؛ قیمت دس روپے

ناشر: انجمن ترقی اردو، کوچۂ پنڈت، دلّی ۶ (۱۹۷۵ء)

یہ کتاب جناب شیش چند طالب دہلوی کی ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دلّی کے اردو بازار کے حالات پر مشتمل یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ طالب صاحب منشی مہاراج بہادر برق کے شاگرد رشید اور ان کے جانشین ہیں۔ کسی زمانے میں انھوں نے اپنے استاد کی

یادگار میں ایک سالانہ مشاعرہ کی نبیاد ڈالی تھی۔ اس میں ہر سال حضرت برق کی شاعری اور شخصیت سے متعلق ایک نثری مضمون کسی ادیب سے لکھوایا جاتا، اور پھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔

طالب خود ایک کھاتے پیتے گھرانے کے نام لیوا، اس پر شعر و سخن کے رسیا، کیونکہ ممکن تھا کہ وہ دلّی کے ادبی حلقوں میں نہ پہنچتے۔ انھوں نے ۱۹۲۷ء میں شعر گوئی شروع کی۔ ملک ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہوا اور وہ بھی جمائی ہوئی بساط الٹ گئی۔ طالب نے اس کتاب میں ان ادبا اور شعرا، سخن سنج اور سخن فہم حضرات سے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں، جو گویا اس عہد میں دلّی کی ادبی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز اور ہماری گنگا جمنی تہذیب و تمدّن کی جان تھے۔ چونکہ طالب خود اس ڈرامے کے سرگرم کردار رہے ہیں، اس لیے جہاں تک واقعات کی درستی اور ثقاہت کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا۔

یہ کتاب کسی حد تک تذکرے کی شکل اختیار کر گئی ہے اور ماخذ کا کام دے سکتی ہے۔ طالب چونکہ پرانے لکھنے والے ہیں اور انھیں زبان پر قدرت حاصل ہے، اس لیے کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ قابلِ قدر کتاب ہے۔

مسالک و منازل از ضیاء احمد بدایونی

سائز: ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۳۸۲، مجلّد۔ قیمت ۲۲ روپے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلّی ۲۵ (۱۹۷۵ء)

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی مرحوم ہمارے ان دانشوروں میں سے تھے، جن کا اوڑھنا بچھونا علم اور خدمتِ علم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنی عمر دیروں تک وہ علم پہنچانے میں صرف کر دی، جو انھوں نے خود اپنے اساتذہ سے کس محنت سے حاصل کیا تھا۔ وہ عربی اور فارسی دونوں کے فاضل تھے، لیکن چونکہ ساری عمر فارسی کی تدریس میں صرف ہوئی، اس لیے لوگوں کو ان کے وسیع عربی مطالعے کا پورا علم نہیں ہوا۔ اس کی

ایک جھلک سی ان کی کتاب "قولِ سدید" میں ملتی ہے، جو انھوں نے محمود احمد عباسی امروہوی کی تصنیف "خلافتِ معاویہ و یزید" کے جواب میں لکھی تھی۔

زیرِ نظر کتاب ان کے مضامین کا مجموعہ ہے، جو فارسی علم و ادب سے متعلق ہیں۔ ان کے عنوان ہیں: (۱) ارتقائے ادب فارسی عہدِ اکبری میں؛ (۲) فارسی شاعری اور ہجویات؛ (۳) جدید فارسی شاعری کے رجحانات؛ (۴) عہدِ خاقانی کی جھلکیاں؛ (۵) مخطوطات شناسی؛ (۶) منوچہری؛ (۷) خاقانی شروانی؛ (۸) معلمِ اخلاق۔ نظامی؛ (۹) فیضی اور اس کی مثنوی؛ (۱۰) ظہور اللہ خان نوا بدایونی؛ (۱۱) مومن کا فارسی کلام؛ (۱۲) مولانا صہبائی۔

ان عنوانوں سے ظاہر ہوگا کہ کتاب کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اور ہر ایک مضمون میں انھوں نے جس نکتہ رسی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ افسوس، کہ اس ملک سے فارسی کا علم روز بروز ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ فارسی کا رواج نہ رہنے سے ہم ایک عظیم خزانۂ ادب سے محروم ہو گئے ہیں، اور ستم یہ ہے کہ ہمیں اس نقصان کا احساس بھی نہیں ہے۔ بہرحال جو لوگ فارسی ادب کے بارے میں ایک اہلِ علم و نظر کے خیالات سے واقف ہونا چاہتے ہیں، انھیں اس کتاب میں غور و فکر کا بہت سامان ملیگا۔

کتاب مکتبۂ جامعہ کے روایتی معیارِ طباعت کی حامل ہے۔ لیکن پروف پڑھنے پر اس سے زیادہ توجہ کی ضرورت تھی۔

نذرِ علی جواد زیدی (ضبط شدہ نظمیں) مرتبین خلیق انجم و مجتبیٰ حسین

سائز: ۱۸×۲۲/۸، صفحات ۲۸۰۔ مجلّد، قیمت ۲۱ روپے۔
ناشر: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵ (۱۹۷۵ء)

ہماری تحریکِ آزادی کے دوران میں اردو شاعروں اور نثر نگاروں نے جو بے بہا قلمی خدمات سرانجام دی تھیں، افسوس کہ ابھی تک اس کا صحیح جائزہ نہیں لیا گیا۔ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اگر اس کام کی طرف جلد توجہ نہ دی گئی، تو عنقریب وہ نسل ختم ہو جائیگی، جو خود اس

تبصرے

ڈرامے کے صفِ اوّل کے کردار تھے، یا جو اس عہد کے علمی شاہد اور اسی لیے مصدّقہ
معلومات کا ذریعہ تھے۔ کسی ادارے کو فوراً یہ کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔
اس زمانے میں بیشتر ایسی نظمیں لکھی گئیں، جو بدیسی حکمرانوں کی نظر میں قابلِ اعتراض
ٹھہریں اور اسی لیے وہ ضبط کر لی گئیں، اور ان کی اشاعت خلافِ قانون قرار دے
دی گئی۔ یہ منظومات ادبی معیار سے بلند پایہ نہ ہوں، لیکن ان کی اہمیت دراصل
اس میں ہے کہ وہ محکوم عوام کے دلی جذبات کا مظہر ہیں۔ نالہ پابندِ نے نہیں ہے۔ ہمیں
انھیں اسی نظریے سے دیکھنا چاہیے کہ وہ محکوم و مقید زندانی کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہیں۔
حکومت نے یہ نظمیں ضبط کر لی تھیں اور وہ سرکاری دفترخانے کی مسلوں میں مدفون تھیں اور کسی کا خیال
ادھر نہ گیا کہ انھیں منظرِ عام پر لے آئے۔ سید علی جوّاد زیدی جو آج کل مرکزی حکومت میں ایک ذمہ دار
عہدے پر فائز ہیں، ہماری زبان کے مسلّمہ شاعر، نقّاد، محقق، تذکرہ نگار ہیں۔ لیکن کسی زمانے میں سیاسی رہنما
بھی رہے ہیں، بالخصوص طلبہ کی تنظیم میں ان کا نمایاں حصّہ رہا ہے۔ ان کے پرانے احباب اور رفیقوں
نے فیصلہ کیا کہ ایک تہنیتی مجموعۂ مضامین مرتّب کرکے ان کی خدمت میں پیش کیا جائے، جو گویا ان کی
دیرینہ خدمات کا اعتراف ہو۔ جب اس کا ذکر زیدی صاحب سے کیا گیا تو انھوں نے تجویز پیش
کی کہ مختلف حضرات سے مضامین لکھوانے کی بجائے وہ نظمیں جمع کرکے انھیں پیش کر دی جائیں،
جو انگریزی حکومت نے ضبط کر لی تھیں؛ ان محبّینِ وطن شعرا کی نگارشات محفوظ ہو جانے سے
انھیں اتنی ہی مسرّت ہوگی، جو اعزازی مجلّد پانے پر۔
ان کی اسی خواہش کی تکمیل کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ اس میں ۱۱۷ نظمیں شامل ہیں، شروع میں صدرِ مجلس
جشنِ علی جوّاد زیدی (درگا پرشاد) اور شری سی بھوشن ممبر پارلیمنٹ کے تعارفی مضمونوں کے علاوہ تین
مضمون ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر خلیق انجم اور مجتبیٰ حسین کے قلم سے ہیں: "زیدی کا شعری مزاج" اور
"دارورسن اور گفتار کا مردِ میدان" اور "علی جوّاد زیدی کی ادبی خدمات"۔ ان تینوں مضامین میں زیدی صاحب
کی شاعری اور ان کی تصنیفی زندگی کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔
اب بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ ایک کمی محسوس ہوتی ہے کہ کاش ان شعرا کا مختصر تذکرہ
بھی شاملِ اشاعت ہوتا، جن کی منظومات جمع کی گئی ہیں۔

مالک رام

وفیات

شفقت کاظمی، سیّد فضل الحسن

یہ خاندان اہلِ تشیع کے امام ثامن حضرت امام رضا علیہ السّلام کا نام لیوا تھا۔ جب ۲۰۳ھ ۸۱۸ء میں امام رضا کا انتقال ہو گیا، تو ان کے اخلاف عراق سے نکل کھڑے ہوئے۔ جسے جہاں جگہ ملی، اس نے وہاں پناہ لی۔ شفقت کے اسلاف کابل، غزنی سے ہوتے ہوئے شمالِ مغربی سرحدی صوبے میں بس گئے۔ یہاں ان کا قیام مدّتوں مختلف مقامات پر رہا۔ ایک زمانہ بعد پھر ایک شاخ نے وہاں سے بھی نقلِ مکان کیا، اور آ کر ڈیرہ غازی خان (قدیم) میں رختِ سفر کھول دیا۔

جناب فضل الحسن شفقت نے اپنے نام کے ساتھ کاظمی کی نسبت حضرت امام رضا کے والد حضرت موسیٰ کاظم (امام ہفتم) کے باعث اضافہ کی تھی۔ بلکہ وہ کاظمی کبھی کبھی بطورِ تخلص بھی استعمال کرتے رہے۔ وہ ۱۴ فروری ۱۹۱۴ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سیّد علی تھا ("سیّد" جزوِ علم تھا)۔ وہ پولیس میں ملازم تھے اور آخر تک اسی محکمے سے منسلک رہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ پولیس میں ہیں۔

؎ قدیم اس لیے کہ موجودہ شہر نیا ہے۔ پرانا شہر دریائے سندھ کے ۱۹۰۸ء کے سیلابِ عظیم کی نذر ہو گیا۔ یہ شہر اس کے بعد وجود میں آیا۔ پرانے شہر کی نشانی چھاؤنی رہ گئی تھی، دریا کے رخ سے یہ اندیشہ ہے کہ یہ چھاؤنی بھی اب کچھ دن کی مہمان ہے!

گھر سے اپنے روز مرّہ کے معمولی کپڑوں میں تھانے جاتے اور وہاں پہنچ کر وردی پہن لیتے ۔ کام کے بعد اسے وہیں چھوڑ آتے اور اپنے ذاتی لباس میں واپس مکان پر آجاتے نفیر منش اور مرنجاں مرنج آدمی تھے ۔ محرّم کی مجلسوں میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے ، اور بعض اوقات اس کے لیے خاصی لمبی مسافت طے کر کے جاتے ۔ ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا اور کربلائے (قبرستان ۲ مالھی والا) ڈیرہ غازی خان میں دفن ہوئے ۔
شفقت صاحب نے دسویں درجے تک تعلیم پائی ۔ اسکول میں جو کچھ پڑھا ، وہ اپنی جگہ ، لیکن اس کے علاوہ انھوں نے ذاتی طور پر اردو اور فارسی ادب کا اور اس میں بھی شعرا کا مطالعہ خاص طور پر کیا ۔ انھیں بےشمار شعر یاد تھے ، جس سے نہ صرف شعر گوئی میں مدد ملی ، بلکہ وہ علمی اور ادبی مجلسوں کی بھی گویا جان بن گئے ۔
اتنی تعلیم پر کیسی اچھی ملازمت کی کیا توقع ہو سکتی تھی ۔ بارے گھر میں قناعت اور توکل کا ماحول تھا ۔ والد کی پنشن ۱۲ - ۱۳ روپے مہینا تھی ۔ ان کی والدہ کڑھائی کا کام بہت اچھا جانتی تھیں ۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں انھیں کپڑے کڑھائی کے لیے دے دیتی تھیں ۔ اس طرح بسر اوقات ہو جاتی تھی ۔ بہرحال تنگدستی کا زمانہ تھا ۔ اب شفقت نے مقامی انڈسٹریل اسکول میں داخلہ لے لیا اور وہاں بڑھئی کا کام ، خاص کر فرنیچر بنانا سیکھ لیا اور اس طرح مہینے میں پندرہ بیس روپے کی یافت کا سامان ہو گیا ۔
اسی زمانے میں وہ مرگی کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے ۔ مدتوں اس کے دورے پڑتے رہے اور دوا دوش سے کوئی بارہ برس بعد اس سے چھٹکارا ملا ۔ لیکن اس کا اثر زبان کی خفیف سی لکنت کی شکل میں آخر تک رہا ؛ وہ 'ر' اور 'ڑ' ٹھیک طرح سے نہیں ادا کر سکتے تھے ۔
اب وہ مقامی میونسپل کمیٹی میں چپراسی مقرر ہو گئے ۔ سب افسران کے کام سے بہت مطمئن تھے ۔ چونکہ یہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ، اس لیے انھیں ترقی دے کر محرّر چنگی بنا دیا گیا ۔ جب ملک تقسیم ہوا ہے ، تو اس کے بعد وہ ریکارڈ کیپر مقرر ہو گئے اور اسی جگہ سے سبکدوش ہوئے ۔ اپنی معمولی تنخواہ کے علاوہ انھیں تمام جلسوں کی کارروائی قلمبند کرنے کا خاص

وظیفہ تیس روپے مہینا الگ ملتا تھا۔ تنخواہ کے ساتھ اسے ملا کر تنگی ترشی سے بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ آخری ایام میں انھیں ایک افسوسناک تجربہ ہوا۔ کمیٹی کے منتظم ایک ایسے شخص مقرر ہو کر آ گئے، جو ان سے کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ انھوں نے جا و بیجا انھیں دق کرنا شروع کیا۔ بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکی ان کا معمولی وطیرہ ہو گیا، اور بالآخر اس شخص نے ان کی تنخواہ میں سالانہ اضافہ بند کر دیا۔ شفقت نے محسوس کر لیا کہ اب خودداری کا خون کیے بغیر یہاں رہنا ممکن نہیں۔ اس پر انھوں نے مقررہ مدت سے تین سال قبل پنشن کی درخواست دے دی اور نوکری سے الگ ہو گئے۔

شفقت نے شعر گوئی بعمر ۸ سال ۱۹۳۳ء میں شروع کی۔ ابتدائی مشق کے بعد انھوں نے مولانا حسرت موہانی (ف مئی ۱۹۵۱ء) سے درخواست کی کہ انھیں شاگردی میں قبول کر لیں۔ نجانے، انھوں نے کیوں یہ درخواست منظور نہ کی۔ اس پر انھوں نے پہلے فیض احمد ندیم جعفری سے رجوع کیا۔ ندیم ڈیرہ غازی خان ہی کے رہنے والے ہیں؛ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ عمر بھر کوآپریٹو محکمے میں ملازم رہے۔ افسر صدیقی امروہوی کے شاگرد ہیں۔ ایک مجموعۂ کلام "نمازِ زنجیر" شائع ہو چکا ہے۔ بفضلہ بقید حیات ہیں۔

شفقت نے ندیم کے علاوہ صادق ادیبی (حاجی محمد) سے بھی مشورہ کیا تھا۔ صادق ۱۹۰۸ء میں ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے۔ شعر خاصا کہہ لیتے تھے، لیکن ان کا اصلی کام افسانے کے میدان میں ہے۔ انھوں نے انگریزی سے یورپ کے مختلف ملکوں کے بلا مبالغہ بیسیوں افسانوں کا ترجمہ کیا۔ میاں بشیر احمد (مدیر ہمایوں) ان کے بڑے قدر دان تھے، چنانچہ صادق کے درجنوں افسانے ہمایوں میں شائع ہوئے۔ معلوم نہیں کیوں، انھوں نے ۱۹۳۲ء میں ادبی میدان ترک کر دیا، اور عرائض نویسی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ قانون کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اس پیشے میں بہت کمایا اور خوشحال زندگی بسر کی۔ ۱۹۷۴ء میں انتقال ہوا۔

شفقت نے چار برس کی مشق کے بعد ۱۹۴۰ء میں دوبارہ حسرت سے اصلاح کی خواہش

ظاہر کی۔ اب کے انھیں کامیابی حاصل ہوئی، اور حسرت نے ان کی درخواست منظور کرلی۔ حسرت کی وفات تک وہ ان سے مشورہ کرتے رہے۔ ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ "خاک پائے حسرت موہانی" لکھتے تھے۔

شفقت شروع میں نظم اور غزل دونوں کہتے تھے۔ لیکن حسرت کی شاگردی کے بعد غزل کے لیے وقف ہوکر رہ گئے تھے۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ بالکل ابتدائی کلام ان کے دوستوں نے "نغمۂ ناہید" کے نام سے چھاپا تھا۔ یہ تو دیکھنے کو نہیں ملا۔ بعد کے مجموعے، حسرتکدہ (مظفر گڑھ ۱۹۵۸ء)، نغمۂ حسرت (مظفر گڑھ ۱۹۵۹ء)، بوائے حسرت (۱۹۷۰ء) زخم حسرت ملتے ہیں۔ بہت پختہ کلام ہے۔ غزل کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں بدرجۂ وافر ملتی ہیں۔

ابتدائی عسرالحالی کے باعث صحت ہمیشہ خراب رہی۔ (۱۹۶۱ء) ۱۹۶۲ء میں ذیابیطس کا گھلا دینے والا عارضہ لاحق ہوگیا اور آخر تک وبال جان رہا۔ جون ۱۹۶۳ء میں دل کے مرض میں مبتلا ہوگئے۔ جیسے یہ تمام عوارض کافی نہیں تھے، اواخر ۱۹۶۴ء میں جسم کے بائیں حصے کو فالج نے بیکار کردیا اور وہ مستقلاً صاحب فراش ہوگئے۔ حکومت نے توجہ کی اور انھیں علاج کے لیے مقامی اسپتال میں لے گئے۔ وہیں ۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو اب کے فالج کا داہنی طرف حملہ ہوا، جس سے بیہوش ہوگئے۔ اسی حالت غشی میں ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء کو ظہر کے وقت روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ چونکہ یہ ۲۸ رجب تھی۔ اس بنے اسے مبارک خیال کرتے ہوئے اسی شام انھیں اپنے والد کے جوار میں (کربلائے ٹانگی والا میں) سپرد خاک کردیا گیا۔

کئی اصحاب نے قطعات تاریخ کہے۔ سیّد فدا بخاری نے "مرگ دلخراش" سے تاریخ نکالی (۱۳۹۵ھ)۔ عیسوی تاریخ میں سیّد چراغ علی شاہ آزاد نے یہ قطعہ لکھا:۔

توڑی گردوں نے ہم پہ یہ کیا جفا ہائے	سینہ اپنا ہے، اور ترکش قضا ہائے
اٹھ گئی رسم اخلاص دل زمانے سے	بجھ گئی شمع عمخانۂ وفا ہائے
شاعر بے بدل، تاو را لکلام ادیبا	نغز گو، نکتہ سنج و سخن سرا ہائے

تاجدارِ غزل تھا بشیوۂ حسرت   پر سدا خود کو سمجھا وہ خاکِ پا ہائے

فکرِ تاریخ پر آئی یہ ندا، آزاد!

"سیدِ شفقت کاظمی چلا، ہائے" (۱۹۷۵ء)

شفقت کی شادی اپنے چچا سید جنید وشاہ کی بیٹی سکینہ بی بی سے ہوئی تھی۔ سید جنید وشاہ
نسٹر تھے۔ مدتوں حکومت کی ملازمت کی۔ اس سے سبکدوش ہوئے، تو اپنا مطلب جاری
رلیا۔ اس سے اچھی خاصی آمدنی تھی۔ آرام و آسائش کی زندگی گزاری۔ شفقت کی جسمانی
لاد صرف ایک لڑکا نجیب الحسن رضوی ان سے یادگار ہے۔ انھوں نے بی اے تک
علیم پائی ہے۔

انی ناگپوری، بشیر خان

ن کا خاندان دراصل بھوپال کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جدِ مرحوم امیر خان ۱۸۵۷ء
ی شورش کے زمانے میں ترکِ وطن کر کے ناگپور چلے آئے، اور پھر یہیں کے ہو کے رہ
گئے۔

امیر خان کے چار بیٹے تھے۔ کریم خان، منیر خان، نظیر خان، نصیر خان۔ سب سے بڑے
ریم خان ہی بشیر بانی کے والد تھے۔ کریم خان کی شادی ناگپور کے مشہور پٹھان گل میر خان
ی دختر امتیاز بی سے ہوئی تھی۔ امتیاز بی اپنی ننھیال کی طرف سے ایک نومسلم گوند خاندان
سے تھیں، جو گونڈ حکمرانوں کے ہاں ملازم تھے۔ بشیر خان سے بڑی ایک بہن حور خانم تھیں۔
جن کا عنفوانِ شباب میں انتقال ہو گیا۔ گویا اس کے بعد بشیر خان اپنے والدین کی اکلوتی
اولاد رہ گئے۔

بشیر خان اپنی ننھیال میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد کریم خان
خانہ داماد تھے۔ اپنے زمانے کی فارسی، عربی، اردو تعلیم کے علاوہ دسویں درجے تک انگریزی
بھی پڑھی۔ والد کا انتقال ۱۹۲۶ء میں ہو گیا، جب یہ آٹھ برس کے تھے۔ والدہ ۱۹۳۸ء
میں جنت سدھاریں۔ ان کی ساری تعلیم و تربیت نانا کی نگرانی میں ہوئی۔ انکا ۱۹۵۹ء

یں انتقال ہوا، کہتے ہیں کہ اس وقت ان کی عمر ۱۲۰ سال کی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔
بشیر خان شروع سے منحنی اور کمزور قوام کے تھے، اس لیے کسی محنت کے کام کے گوں نہیں تھے۔ اسی لیے عمر بھر کہیں مستقل ملازمت نہیں کر سکے۔ چندے ایک قریب کی مینگانیز کی کان میں کلرکی کی، معلمی کی؛ اور کچھ جگہوں پر بھی عارضی کام کرتے رہے۔ لیکن آخر تک کم و بیش پریشان حال ہی رہے۔

ضعف معدہ کے دائمی مریض تھے۔ پھر کچھ اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ انھیں میں مبتلا ہو کر میو جنرل اسپتال، ناگپور علاج کی خاطر داخل ہوئے۔ وہیں ہفتے کے دن ۳ مئی ۱۹۷۵ء شام کو خالق حقیقی کا بلاوا آ گیا۔ اور اگلے دن (۴ مئی) دوپہر بعد مومن پورہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

ان کی شادی اپنے چچا منیر خان کی صاحبزادی انوری خانم سے ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ ڈیڑھ دو سال بعد بیوی کا زچگی کے ایام میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا نکاح مرحومہ ہی کی چھوٹی بہن طاہرہ خانم سے ہوا۔ اس بیگم کے بطن سے آٹھ بچے ہوئے، چار بیٹے اور چار بیٹیاں۔ ماشاء اللہ سب زندہ و سلامت موجود ہیں۔

نامی ابھی اسکول کے آخری درجوں میں تھے کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں پروفیسر منظور حسین شور اور محمد حبیب اللہ خان غضنفر تلمیذ شفق امروہوی (ف ۱۹۲۲ء) وہیں انجمن ہائی اسکول، ناگپور میں فارسی اور اردو پڑھاتے تھے۔ شہر میں بھی مولانا ناطق گلاؤٹھوی (ف ۲۶/۲۷ مئی ۱۹۶۹ء) اور ان کے تلامذہ کی موجودگی کے باعث شعر کے لیے فضا سازگار تھی۔ نامی بھی شعر کہنے لگے۔ انھوں نے کوشش کی کہ اقبال احمد خان سہیل اعظم گڑھی (ف نومبر ۱۹۵۵ء) انھیں اپنی شاگردی میں قبول کر لیں۔ لیکن مرحوم نے کسی وجہ سے معذرت کر دی۔ اس کے بعد نامی نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ طبیعت بھی عزلت پسند اور نام و نمود سے متنفر تھی۔ اس لیے کسی کے در پر نہیں گئے۔

افسوس کہ مجموعۂ کلام زندگی میں شائع نہیں ہوا، اگرچہ اسے خود ہی "صحیفۂ صنم" کے نام سے مرتب کر لیا تھا۔ اس کا مسودہ ان کے خاندان میں موجود ہے۔

منظر لکھنوی، سید منظر حسن[۵]

نجیب الطرفین یعنی ددھیالی اور ننھیالی دونوں سلسلے امام حضرت علی نقی علیہ السّلام سے جا ملتے ہیں۔ ان کے بزرگوں میں ایک صاحب نجم الدین سب سے پہلے سبزوار سے ہندستان آئے۔ یہی لکھنؤ کے مشہور خاندان اجتہاد کے بھی مورثِ اعلیٰ ہیں۔ یہاں ان کی مناسبت آور بھگت ہوئی اور نصیر آباد کا علاقہ بطور جاگیر عطا ہوا۔ غرض ایک زمانے تک خاندان نے خوشحالی کا دور دیکھا لیکن کسی چیز کو دوام نہیں، رفتہ رفتہ حالات بگڑتے گئے، یہاں تک کہ ان کے جدّ امجد سید وارث حسین عرف رئیس "روضہ"، نصیر آباد (ضلع رائے بریلی، یو، پی) ہو کے رہ گئے۔ منظر کے والدِ بزرگوار شمس العلما مولانا سید سبطِ حسن کسی تعارف کے محتاج نہیں، بلحاظ خطیب ان کا ملک بھر میں شہرہ تھا۔ ان کا پنجشنبہ ۲۸ محرم ۱۳۵۴ھ (مئی ۱۹۳۵ء) کو لکھنؤ میں انتقال ہوا اور وہیں امام باڑہ غفران مآب میں دفن ہوئے۔

منظر کی ٹھیک تاریخِ ولادت تو معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اندازہ ہے کہ وہ ۱۹۱۴ء کے شروع میں اپنے آبائی مکان (بنجاری ٹولہ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم گھر ہی پر مولانا آغا جون صاحب کی نگرانی میں ہوئی، جو خاندان اجتہاد کے فرد تھے۔ اس کے بعد سلطان المدارس لکھنؤ میں داخلہ لیا، لیکن بدقسمتی سے اسی دوران میں ان کے والد مولانا سبطِ حسن کا انتقال ہو گیا؛ مجبوراً اس کے بعد انھیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

تعلیم نامکمّل رہ جانے سے قدرتاً دنیوی ترقی کی سب راہیں بند ہو گئیں۔ اس سے لازماً عمر بھر قلیل بلکہ ناکافی آمدنی میں گزارا کرنا پڑا اور مختلف پریشانیوں کی آماجگاہ بنے رہے۔ صحت ہمیشہ متوسط درجے کی رہی ۔ نہ بہت اچھی، نہ بُری ۔ لیکن آرام و آسایش کے مسلسل فقدان نے رفتہ رفتہ اثر پیدا کیا اور ۱۹۷۰ء میں تپ دق میں مبتلا ہو گئے۔ وسائل نہ ہونے کے باعث مناسب علاج بھی نہ ہو سکا۔ تپِ دق کا مرض اب مہلک نہیں رہا اور قابلِ علاج ہے۔ لیکن اس کا صرفہ نو خاصا گراں ہے؛ اور اسی کا سامان ان کے پاس نہیں تھا۔

---

۵ یہ حالات جناب کاظم علیخاں، شیعہ کالج لکھنؤ نے منظر مرحوم کے چھوٹے بھائی سید باسط حسن ماہر لکھنوی اور دوست مرزا محمد اشفاق صاحب، شعبۂ فارسی شیعہ کالج لکھنؤ سے دریافت کر کے مہیا کیے ہیں۔ تینوں صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

وفیات

بالآخر اسی مرض سے ۲۲/۲۳ جون ۱۹۷۵ء کی شب میں تقریباً ڈیڑھ بجے (یعنی ۲۳ جون ابتدائی حصے میں) اپنے گھر پر جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔ ۲۳ جون دوپہر کے وقت امام باڑہ غفران مآب (لکھنؤ) کے اندرونی صحن میں (شمالی پھاٹک کے مقابل) سپرد خاک ہوئے۔

بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے، اور یہ اثر تھا خاندانی ماحول کا۔ والد کا میدان علم و فضل میں ڈنکا بجتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے، خاطر تخلص تھا منظر کے ایک چچا مولانا ناظر مہدی ماہنامہ سہیل یمن (لکھنؤ) کے مدیر تھے؛ دوسرے مولانا سید کاظم حسین کاظم (سکتر پرنس جعفر علی خاں اثر رامپوری) شعر کہتے تھے اور مختلف علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ خود منظر کے بڑے بھائی سید محمد حسن سالک تخلص اور چھوٹے بھائی سید باسط حسن ماہر بھی شعر کہتے تھے (تیسرے بھائی سید محمد وارث حسن آج کل انگلستان میں مقیم ہیں) غرض یہ بھی شعر کہنے لگے۔ ساری عمر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

ان کے قطعات کا مجموعہ "ہفت رنگ" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ ان کے برادر خورد ماہر صاحب ان کے قصائد "منظر و نظارہ" کے نام سے مرتب کرکے چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کا بہت غیر مطبوعہ کلام (سلام، غزل وغیرہ) ان کے خاندان میں موجود ہے۔

منظر مرحوم ساری عمر مجرد رہے، تاہل کے جنجال میں پڑے ہی نہیں۔ بڑی بذلہ سنج، شگفتہ اور باغ و بہار طبیعت پائی تھی۔ صاف دل اور مرنجاں مرنج، کسی کے برے میں نہیں تھے۔ اپنے قریبی حلقۂ احباب میں سب انھیں "منظر بھیا" کہہ کر پکارتے، اور وہ اس سے خوش ہوتے تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مضطر حیدری، دلاور حسین

ان کا خاندان آگرے کا رہنے والا تھا، جہاں سے یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے فوجی ہنگامے کے بعد ہجرت کرکے پہلے دلی، پھر لکھنؤ اور پٹنے کے مختصر قیام کے بعد کلکتے پہنچے۔ یہیں دلاور حسین ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔

تعلیم کا آغاز مدرسۂ عالیہ سے ہوا، جہاں پانچویں درجے تک رہے۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو سان جیمز اسکول میں پہنچے۔ لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کچھ طبیعت کے لاابالی پن کے باعث تعلیم میں کوئی ترقی نہ کر سکے؛ دسویں درجہ کے امتحان سے پہلے ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ گویا ڈور کٹا پتنگ بن گئے، جس کا کوئی مرکز نہ رہا ہو۔

روزگار کی طرف سے ہمیشہ پریشان رہے۔ جب کلکتے میں کوئی اطمینان کی صورت نہ نکلی تو بمبئی سدھارے کہ شاید وہاں کسی فلمی کمپنی میں گیت یا نظمیں لکھنے کی خدمت مل جائے۔ وہاں بعض احباب کے سہارے کچھ کام ملا بھی اور انھوں نے ایک دو فلموں کے گانے لکھے، لیکن کوئی مستقل انتظام نہ ہو سکا اور معاوضہ بھی اتنا کم تھا کہ جلد ہی یہ بیدل ہو کر کلکتے واپس چلے گئے۔

ان کا بچپن اپنے نانا جان کی سرپرستی میں گزرا تھا؛ وہ شعر اور موسیقی کے رسیا تھے۔ ولاور حسین بھی انھیں کے رنگ میں رنگے گئے۔ تعلیم کے دوران ہی میں ان کے بعض دوست شعر کہنے لگے تھے؛ ان سے بھی متاثر ہوئے۔ ادھر نانا جان اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب گویا سر پر کوئی نہ رہا۔ انھوں نے نانا کے مختصر ذخیرۂ کتب سے استفادہ کیا اور ان کا ہارمونیم لے کر موسیقی کی دھنیں بجانے لگے۔ رفتہ رفتہ خود شعر کہنے کی تحریک ہوئی، اور انھوں نے ۱۹۴۴ء سے اس میدان میں قدم رکھ دیا۔

شعر پر باقاعدہ اصلاح کسی سے نہیں لی۔ جو کچھ کہا، اُسے اپنے مطالعے اور ذوقِ سلیم کے بھروسے پر مشاعروں میں سناتے رہے۔ البتہ کلکتے کے بیشتر بزرگ اساتذہ سے راہ و رسم تھی اور ان کے مشوروں سے مستفید ہوتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ایک مختصر مجموعہ "جامِ حرم" کے عنوان سے اردو سبھا، کلکتہ کی طرف سے چھپا تھا۔ اس میں رباعیاں، غزلیات اور نظمیں ہیں۔

ان کے کلام میں ہمعصر سیاسی حالات پر تنقید بہت نمایاں ہے، ترقی پسند تحریک کے اثر سے بھی یہ خالی نہیں۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور وہ پچاس برس کی عمر میں کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو گئے۔ جس سے صحتیابی کی کوئی امید نہ تھی۔ اس سے گھبرا کر انھوں نے

۱۳ مئی ۱۹۷۵ء کی رات میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ اگلے دن لاش حاجی محمد حسن اسکوبیر (کلکتہ) کے تالاب سے ملی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے جسمانی یادگار چھوڑے۔

ذوالفقار علی بخاری، سید

ان کے خاندان کا مسقط الراس وسطی ایشیا کا مشہور مرکز علوم اسلامیہ شہر بخارا تھا جہاں سے ان کے اجداد اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہجرت کر کے کشمیر جنت نظیر میں آ بسے تھے ایک زمانہ بعد ذوالفقار علی بخاری سے تین چار پشت اوپر یہ لوگ کشمیر سے نکلے، اور صوبۂ سرحد کے دارالحکومت پشاور میں آ گئے۔ ان کے والد سید اسد اللہ شاہ بخاری کا شہر کے علما اور برگزیدہ اشخاص میں شمار ہوتا تھا۔ شاہ صاحب مرحوم پیر کی حیثیت سے بھی معروف تھے، اور ان کے مریدوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔

سید اسد اللہ شاہ بخاری کے تین صاحبزادے تھے۔ جن میں سے دو نے خاصی شہرت حاصل کی۔ سب سے بڑے پیر سید محمد شاہ تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے، رفعت تخلص تھا۔ منجھلے سید احمد شاہ بخاری تھے، جنھیں اُردو دنیا پطرس کے نام سے جانتی ہے اور اگر چاہے بھی، تو انھیں نہیں بھلا سکتی۔ ان کا ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو نیو یارک میں انتقال ہوا۔ اردو والوں کی ...ی اور بےتوفیقی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ آج تک ان کی سوانحعمری نہیں شائع ہوئی۔

سب سے چھوٹے یہی سید ذوالفقار علی بخاری تھے، جن کے بارے میں یہ چند سطریں قلمبند کر رہا ہوں۔

ذوالفقار علی ۴۔ ۱۹۰۴ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں گورنمنٹ ہائی اسکول میں پائی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ ان دونوں بھائیوں نے "پیر" کے سابقے سے کس طرح چھٹکارا پایا، اس کا قصہ ذوالفقار علی نے اپنی کتاب "سرگزشت" میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہو کہ بھائی جان کا پورا نام پیر سید احمد شاہ بخاری تھا، اور میرا پیر سید ذوالفقار علی شاہ بخاری ـــ چونکہ والد مرحوم کے بعد ہم دونوں کسی سے بیعت

لینے کے اہل نہیں تھے، لہٰذا ہم نے خیال کیا کہ ہمارا کوئی حق نہیں کہ پیر کا لفظ اپنے نام کا جزو بنائے رکھیں۔ چنانچہ بھائی جان "پیر احمد شاہ" سے احمد شاہ رہ گئے۔ اور میں پیر سید ذوالفقار علی شاہ سے ذوالفقار علی بخاری بن گیا۔ پشاور میں ان کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر واٹکنز تھے۔ وہ احمد شاہ کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر اور خاص کر ان کی انگریزی میں قابلیت کے باعث ان سے بہت محبت کرتے تھے، اور انھیں صرف "پیر" کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن لفظ "پیر" کا تلفظ اس طرح کرتے، جس طرح یہ فرانسیسی میں بولا جاتا ہے، یعنی پیئر (بالکل اسی طرح جیسا کہ پیئر سوپ میں ہے) فرانسیسی پیئر، انگریزی میں پیٹر ہے اور یونانی میں پطرس آپ نے حضرت عیسیٰ کے حواری سینٹ پیٹر کا نام سنا ہوگا، انھیں بھی یونانی میں (اور اسی سے عربی میں بھی) پطرس کہتے ہیں۔ غرض جب احمد شاہ نے لاہور کالج میں پہنچنے کے بعد انگریزی میں مضمون لکھنا شروع کیے، تو ان پر وہ اپنے نام کی جگہ پیٹر لکھنے لگے، بلکہ انھوں نے اپنے استاد سے اپنی عقیدت اور ارادت کا اظہار یوں کیا کہ ان مضامین کے ساتھ اپنا پورا نام پیٹر واٹکنز لکھتے رہے۔ چنانچہ اس زمانے میں ان کے جو مضامین لاہور کے انگریزی روزنامے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں چھپے تھے، ان کے ساتھ نام پیٹر واٹکنز ہی تھا۔

اب یہ قصہ ختم ہی کروں:

سید امتیاز علی تاج (ف اپریل ۱۹۷۰ء) نے ۱۹۱۸ء میں ماہانہ رسالہ "کہکشاں" جاری کیا، بڑے ٹھاٹ کا پرچہ تھا یہ۔ چونکہ اس وقت کے مشاہیر صفِ اوّل کے ادیبوں سے تاج کے ذاتی مراسم تھے، وہ تاج کی فرمائش پر اس میں مضمون لکھنے لگے۔ انھیں میں احمد شاہ بخاری بھی تھے، یہ تاج کے کالج کے ہم جماعت بھی تھے۔ بخاری نے "کہکشاں" کے لیے ایک سلسلۂ مضامین لکھا: یونانی حکما اور ان کے خیالات۔ اور موضوع کی مناسبت سے ان پر اپنے اصلی نام کی جگہ "پطرس" کا قلمی نام استعمال کیا۔ ان کی ہدایت تھی کہ میرا نام نہ چھپے اور نہ کسی کو بتایا جائے کہ یہ مضامین میرے لکھے ہوئے ہیں۔ پہلی دو تین قسطوں میں تو ان کی ہدایت پر عمل ہوا، لیکن اس کے بعد ایک قسط پر کاتب نے سہواً "پطرس" کے ساتھ ان کا پورا نام

"احمد شاہ بخاری" بھی لکھ دیا۔ اور یوں سب کو معلوم ہو گیا کہ کون "معشوق ہے اس پردۂ زنگار میں"۔ اس کے بعد خود احمد شاہ بخاری نے بھی یہ قلمی نام اختیار کر لیا، اور اسے اپنی تحریروں میں استعمال کرنے لگے۔

تو اسی موقع پر یہ چھوٹے بھائی "ذوالفقار علی بخاری" ہو گئے اور بعد کو انگریزیت نے ترقی کی، تو اس میں تخفیف کر کے زیڈ۔ اے بخاری بن گئے۔

ان کے سرکاری ملازمت میں شامل ہونے کا واقعہ اتفاقاتِ زمانہ کی حیرتناک مثال ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دن پشاور میں ان کے کسی دوست نے انھیں بتایا کہ اخبار میں بینام کا اشتہار چھپا ہے کہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے، جو انگریزی، اردو، فارسی، عربی، پشتو، پنجابی زبانوں سے واقف ہو۔ اس دوست نے مذاق سے کہا کہ بھلا بتاؤ، اتنی ساری زبانیں جاننے والا اس شخص کو کہاں سے ملیگا؟ وہ دوست تو صرف اتنا کہہ کر چلے گئے، ذوالفقار علی بخاری نے "ٹربیون" اخبار کا وہ پرچہ تلاش کیا، جس میں اشتہار چھپا تھا اور چونکہ وہ کم وبیش یہ سب زبانیں جانتے تھے، لطف لینے کو مندرجۂ اشتہار پتے پر درخواست بھیج دی اور اس میں مشورہ طلبی کے لیے علامہ اقبال (ف اپریل ۱۹۳۸ء) اور پروفیسر محمد سعید کے نام لکھ دیئے کہ اگر میرے بارے میں کچھ مزید پوچھ گچھ کرنا منظور ہو، تو ان اصحاب سے دریافت کر لیا جائے۔ قصّہ کوتاہ، وہ ان اصحاب کی سفارش پر ملازم ہو گئے۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے، جب ان کی عمر صرف ۲۱ برس کی تھی۔

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ختم ہونے پر حکومت ہند کے فوجی دفتر کے جنرل اسٹاف نے ایک "ممتحنین کا بورڈ" قائم کیا تھا، تاکہ اس کی مدد سے انگریز افسروں کی قابلیت اور اہلیت کی جانچ کی جا سکے۔ اس محکمے کا صدر دفتر شملے میں تھا۔ وہ اشتہار اسی دفتر کی طرف سے شائع ہوا تھا، اور اسی بورڈ کے رکن ذوالفقار علی بخاری مقرر ہوئے تھے۔

یہ بہت ذمہ داری کا عہدہ تھا۔ ان سے پہلے شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد یوسف رنجور اس بورڈ کے رکن تھے۔ جس جگہ پر ذوالفقار علی بخاری کا تقرر ہوا تھا، یہ غالباً خالی بھی رنجور کے ملازمت سے سبکدوش ہونے پر ہوئی تھی۔ بخاری اس عہدے پر دس ساڑھے

دس برس متمکن رہے۔
اگرچہ بمبئی اور کلکتے میں بعض لوگوں نے پہلے سے معمولی صلاحیت کے ریڈیو ٹرانسمیٹر لگا رکھے تھے، لیکن سرکاری محکمے کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو قائم ہوا۔ اس کی تنظیم و ترویج کے لیے بی بی سی لندن نے حکومت ہند کی درخواست پر مسٹر لائنیل فیلڈن (ف: لندن، ۳ جون ۱۹۷۴ء) کو ہندستان بھیجا۔ ظاہر ہے کہ فیلڈن کو موزوں لوگوں کی ضرورت تھی، جو اس نئے محکمے کی تنصیب و ترقی میں ان کے کامیاب معاون ثابت ہو سکیں۔ ذوالفقار علی بخاری کے ایک انگریز دوست نے فیلڈن سے ان کا ذکر کیا؛ بخاری نے بھی درخواست بھیج دی، اور بالآخر انتخابی بورڈ نے ان کا دلّی اسٹیشن میں پروگرام ڈائرکٹر کے عہدے پر تقرر منظور کر لیا۔
فیلڈن آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر جنرل تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ عہدے کا نام کچھ لکھ لیجیے، وہ محکمے کے سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ لارڈ ولنگڈن وائسراے سے ان کی ذاتی ملاقات ہی نہیں، گہری دوستی تھی۔ اس لیے جب بھی کوئی محکمانہ یا دفتری قسم کی دشواری پیش آتی جس سے فیلڈن کو اپنی من مانی کرنے میں رکاوٹ محسوس ہوتی، وہ سیدھے ولنگڈن کے پاس چلے جاتے، اور ان سے، جو حکم چاہتے، جاری کرا لیتے۔
ذوالفقار علی بخاری کی فیلڈن سے پہلی ہی ملاقات میں دوستی ہو گئی تھی۔ اور دوستی بھی ایسی کہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ تھوڑے دن بعد فیلڈن کی خواہش پر پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) بھی دلّی آ گئے، اور یہاں دلّی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے۔ اس پر ذوالفقار علی بخاری کو ترقی ملی اور یہ ان کے نائب (اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر) ہو گئے۔ ذرا خیال فرمائیے: بڑا بھائی اسٹیشن ڈائرکٹر؛ چھوٹا بھائی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر؛ اور کنٹرولر جنرل، فیلڈن، ان دونوں کا یارِ غار، گویا ان کی جیب میں۔ اس پر سردار دیوان سنگھ مفتون (ف: فروری ۱۹۷۵ء) نے پھبتی کسی کہ ایک بی بی سی لندن میں ہے، اور ایک بی بی سی دلّی میں، یعنی بخاری برادرس کارپوریشن، جو آل انڈیا ریڈیو کی کرتا دھرتا ہے۔
تھوڑے دن بعد جب ڈپٹی کنٹرولر کاؤس جی بہرام جی سیٹھنا کا بمبئی تبادلہ ہو گیا، تو ان کی جگہ پطرس

ڈپٹی کنٹرولر بن گئے، اور ذوالفقار علی اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے کا ایک لطیفہ یاد آیا:

کسی نے پوچھا: حضرت! یہاں ریڈیو اسٹیشن پر دو بخاری ہیں۔ بات چیت میں جب تک پورا نام نہ لیا جائے، معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ان دونوں میں سے کن صاحب کا ذکر کر رہے ہیں، محض بخاری کہہ دینے سے التباس کا اندیشہ ہے۔ کوئی ایسا نشان مقرر ہونا چاہیے کہ پورا نام بھی نہ لینا پڑے، اور تعیّن بھی ہو جائے۔ سامع نے کہا کہ اس میں کیا مشکل ہے، بڑے بھائی (احمد شاہ بخاری) 'صحیح بخاری' اور چھوٹے (ذوالفقار علی بخاری) غلط بخاری۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ لیکن یہ لطیفہ کچھ ایسا چپک کے رہ گیا کہ اس کے بعد بے تکلف دوستوں کی مجلسوں میں ان دونوں بھائیوں کی طرف واقعی صحیح بخاری اور غلط بخاری کے ناموں ہی سے اشارہ ہوتا رہا۔

۱۹۳۷ء کے شروع میں حکومت ہند نے (یا کہیے فیلڈن نے) فیصلہ کیا کہ ہندستان میں ریڈیو اور براڈکاسٹنگ کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ بعض لوگوں کو انگلستان بھیجا جائے، جو وہاں بی بی سی میں کچھ دن رہ کر اپنے کام کی تعلیم و تربیت حاصل کریں۔ اس پر دو آدمیوں کا انتخاب ہوا۔ ایک فیلڈن کے پرائیوٹ سکرٹری (مسٹر آجاریہ) کا اور دوسرے ذوالفقار علی بخاری کا۔ غرض سال بھر سے کچھ کم بی بی سی، لندن میں تربیت حاصل کرنے کے بعد بخاری وطن واپس آئے۔ لیکن دلّی پہنچنے پر انھیں معلوم ہوا کہ اب ان کا دلّی میں قیام نہیں رہیگا۔ چنانچہ یہ اسی عہدے پر بمبئی ریڈیو اسٹیشن بھیج دیے گئے۔ بمبئی ریڈیو کا موجودہ اسٹوڈیو اور دفتر انھیں کے زمانے میں تیار ہوا۔ قیامِ بمبئی کے دوران میں انھوں نے روزمرہ کے کام کے لیے گجراتی اور مراٹھی دونوں زبانیں اچھی خاصی سیکھ لی تھیں؛ اگرچہ خود اٹک اٹک کے بات کرتے تھے، لیکن سمجھتے خوب تھے۔

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ عہدِ حاضر میں جنگ صرف فوجوں یا میدانِ جنگ ہی تک محدود نہیں رہ گئی ہے، بلکہ فریقین کی پوری پوری آبادی اس کے نرغے میں آجاتی ہے۔ حکومت جب تک اپنے لوگوں کو اس بات کا یقین نہ دلادے کہ

جنگ محاذ عالمیہ کے تحفظ کے لیے لڑی جا رہی ہے، اور سرکار کا موقف صداقت اور انصاف پہ مبنی ہے، اسے عوام کی ہمدردی اور اعانت حاصل نہیں ہوسکتی۔ نہ صرف یہ، بلکہ فریقین غیر جانبدار ممالک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بھی پوری سعی کرتے ہیں۔ صورت حال کی اس تبدیلی کا یہ اثر ہوا ہے کہ فوج تو لڑنے کو میدان جنگ میں جاتی ہے، اور حکومت کے تمام ذرائع نشر و اشاعت حرکت میں آجاتے ہیں، لوگوں پر یہ واضح کرنے اور انھیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ حکومت جنگ کرنے پر اس لیے مجبور ہوئی ہے کہ ملک کی آزادی بلکہ ہستی اور وہ تمام اقدار جن کی لوگ قدر کرتے ہیں، دشمن کی وجہ سے خطرے میں ہیں۔ پس، عوام کا فرض ہے کہ وہ حکومت کے اقدام کی تائید کریں اور جنگ جیتنے کے لیے اس سے پورا تعاون کریں۔ چنانچہ جب جنگ شروع ہوئی، تو حکومت برطانیہ کی پراپیگنڈے کی مشین پورے زور شور سے حرکت میں آگئی۔ بی بی سی لندن نے بھی اپنی سرگرمیاں تیز سے تیز تر کر دیں۔ اس کے سامعین میں اردو بولنے والے دو محاذوں پہ تھے، ایک خود ہندستان میں؛ دوسرے ہندستانی فوجی جو یورپ اور ایشیا اور افریقا کے مختلف ملکوں میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ اس لیے بی بی سی نے اپنے عملے میں کئی اردو دان حضرات کا اضافہ کیا، جو نہ صرف اس کے نشریات کو بہتر بنانے کے لیے مشورہ دیتے، بلکہ حسب ضرورت مختلف محاذوں پر جا کر ہندستانی فوجیوں سے ملتے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، اور ان کی حالت کی بہتری کے لیے منصوبے بناتے اور اپنی سفارشیں پیش کرتے تھے۔

اسی سلسلے میں ذوالفقار علی بخاری بھی لندن بلا لیے گئے۔ حکومت برطانیہ کی وزارت اطلاعات نے ایک اتحادی ادارۂ نشر و اشاعت قائم کیا تھا، بخاری صاحب اسی کے ہندستانی رکن کی حیثیت سے گئے تھے۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا، اس ادارے کے فرائض میں یہ بھی تھا کہ مختلف ممالک کے اصحاب مجاز کو برطانوی اور اتحادی پراپیگنڈے کی تائید پہ آمادہ کرے۔ بخاری صاحب اس دوران میں یورپ کے کئی محاذوں پہ بھی دورے کو گئے۔ اس زمانے میں انھیں عارضی طور پہ "میجر" کا عہدہ بھی دے دیا گیا تھا۔

لندن سے واپسی کے تھوڑے دن بعد ہی ان کا تبادلہ کلکتہ ہو گیا۔ یہاں انھوں نے بنگالی

سیکھی۔ ان کا بنگالی کا علم اور معیار گجراتی اور مراٹھی سے کہیں بہتر تھا۔ اس میں بے تکلف تقریر کر سکتے تھے۔ کلکتے سے انھیں پھر بمبئی جانا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک کو آزادی ملی ہے، تو وہ بمبئی ہی میں تھے۔

لیکن درمیان میں ایک بات رہ گئی۔ وہ بمبئی میں تھے کہ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں انھیں امریکا کی مشہور فلم ساز کمپنی میٹرو گالڈون میئر نے فلمیں تیار کرنے کے لیے امریکا بلایا۔ انھوں نے حکومت سے رخصت لی اور امریکا سدھارے۔ وہاں کوئی چھ مہینے قیام رہا۔ واپس آئے تو تقسیم ملک کی تیاریاں ہو رہی تھیں، ۱۹۴۸ء میں یہ بھی پاکستان آ گئے اور وہاں ریڈیو پاکستان کے (یہ نام بھی انھیں کا رکھا ہوا ہے؛ اس سے پہلے نام پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن تھا) ڈائرکٹر جنرل مقرر ہو گئے۔ وہ اس عہدے سے ۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں سبکدوش ہوئے اگرچہ اس کے بعد بھی وہ اپنی وفات تک ریڈیو پاکستان سے بحیثیت مشیر وابستہ رہے۔

وہ آخری تین چار سال دل کے عارضے میں مبتلا رہے۔ ۱۹۷۴ء میں وہ علاج کے لیے لندن گئے تھے، علاج سے مرض میں کچھ افاقہ ہو گیا، اور وطن واپس آ گئے۔ آغاز جولائی ۱۹۷۵ء میں وہ گر گئے اور ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آپریشن ہوا۔ اتنے میں ان کے دل کی تکلیف بڑھ گئی۔ اس پر اسپتال میں داخل ہوئے، جہاں ان کا ہفتے کے دن ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء (یکم رجب ۱۳۹۵ھ) کو انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن اتوار کو اٹھا، اور پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اولاد میں تین بیٹیاں ان کی یادگار ہیں۔

بہت لوگوں نے ان کی تاریخ وفات کہی۔ نیساں اکبر آبادی کا قطعۂ تاریخ ہے:

خبر مرگ زیڈ اے بخاری کی سن کر — مری آنکھ سے ہو گئے اشک جاری
یہ تاریخ فکر رسا سے ملی ہے — جہاں سے "اٹھے آج زیڈ اے بخاری"

(۱۳۹۵)

رئیس امروہوی کے قطعے میں "ذوالفقار حقائق پناہ" سے ۱۳۹۵ برآمد ہوتے ہیں۔

اس برصغیر ہندوستان اور پاکستان میں ریڈیو اور براڈکاسٹنگ کے فروغ اور ترقی میں

ذوالفقار نے جو نمایاں خدمات انجام دیں، ان کا انکار ممکن نہیں۔ ان کی ذہانت اور طباعی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ میں انھیں ۱۹۳۶ء سے جانتا تھا۔ اس میں شمہ بھر مبالغہ نہیں کہ ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، معاملہ فہمی کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان سے کچھ کہا جائے، تو انھیں مشکل سے اعتبار آئیگا۔
ڈراما اور موسیقی ان کے مرغوب موضوع تھے، علماً اور عملاً دونوں طرح۔ اور انھیں ان میں ایسی گہری بصیرت حاصل تھی کہ بڑے بڑے جغادری ان کا لوہا مانتے تھے۔ غالب نے ایک جگہ عیش کی تعریف یہ کی ہے کہ کسی کو اپنا دلپسند مشغلہ بطور پیشہ اختیار کرنے کا موقع مل جائے۔ یہی ذوالفقار علی کے ساتھ ہوا؛ اور وہ زندگی بھر عیش کرتے رہے۔
انھیں نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ افسوس کہ ان کا دیوان آج تک شائع نہیں ہوا، وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہے۔ خدا کرے اب شائع ہو جائے!
انھوں نے "حریت" کراچی کے لیے اپنی یادداشتیں قلمبند کی تھیں۔ یہ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۴ء میں ہفتہ وار اس پرچے میں چھپتی رہیں۔ بعد کو ان کا مجموعہ "سرگزشت" کے عنوان ہی سے کتابی شکل میں شائع ہوا (کراچی ۱۹۶۶ء)۔ معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے اس کا دوسرا حصہ بھی مرتب کر لیا تھا؛ یہ بھی چھپ جانا چاہیے۔

نشتر جالندھری، محمد عبدالحکیم خان

ضلع جالندھر (پنجاب) میں ایک چھوٹا سا گاؤں میاں والی مولویاں (تحصیل نکودر) ہے؛ محمد عبدالحکیم خان وہیں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ ضلع کی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ جالندھری لکھتے تھے۔ یہ بستی بڑی مردم خیز رہی ہے۔ عہدِ مغلیہ کے بعض مشہور علما یہاں کی خاک سے اٹھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے مرشد حضرت بدرالدین اولیا جب کابل سے ہجرت کر کے ہندستان آئے، تو انھوں نے بھی یہاں قیام کیا تھا۔
نشتر کے والد ضلع اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ نشتر کا تعلیمی دور بہت ممتاز رہا؛ اپنے درجے میں ہمیشہ اوّل آئے۔ دسویں کا امتحان انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول، کوئٹہ سے پاس کیا تھا،

جہاں اس وقت ان کے والد تعینات تھے۔ اس امتحان میں بھی اول آئے، اور اس طرح لالہ جمعیت رام گولڈ میڈل کے مستحق ٹھہرے، جو وہاں کے ایک رئیس لالہ جمعیت رائے نے اپنے مرحوم اکلوتے بیٹے کی یاد میں جاری کیا تھا۔ اس کے بعد وہیں اسلامیہ اسکول میں ملازم ہو گئے۔
شاعری بہت کمسنی میں شروع کی۔ جب ایک مرتبہ گرمی کے موسم میں امساک باراں سے خلق خدا بہت پریشان تھی۔ ان کے استاد نے درجے کو بارش پر مضمون لکھنے کو کہا۔ نشتر نے مضمون تو نثر میں لکھا لیکن اس کے آخر میں اس شعر کا اضافہ کر دیا:

الٰہی! قبول اس کی کر لے دعائیں   کہ مینہ کو ترستی ہے ساری خدائی

اس وقت ان کی عمر بمشکل دس برس کی ہو گی۔ کوئٹہ میں فوجی ملازمت کے امیدواروں کے لیے کیڈٹ کالج قائم تھا۔ اس میں اردو کے استاد کی جگہ خالی ہوئی، تو نشتر نے بھی درخواست کی اور مقابلے کے امتحان میں یہاں بھی اوّل آئے۔ اس پر کالج کے پرنسپل نے انھیں ڈیڑھ سو روپے کے مشاہرے پر رکھ لیا۔ یہاں بعض اوقات اساتذہ کو فیلڈ سروس یعنی باہر میدان میں بھی جانا پڑتا تھا۔ نشتر نے "فیلڈ" میں جانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی کے تمام راستے بند ہو گئے اور عمر بھر ڈیڑھ سو سے آگے بڑھنے کی امید نہ رہی۔ اس پر انھوں نے کچھ مدت بعد ملازمت سے استعفا دے دیا۔
اس کے بعد ساری عمر مختلف ناشروں کے ہاں کام کرنے میں گزار دی۔ بیسیوں کتابیں معمولی اجرت پر لکھ کر دوسروں کے حوالے کر دیں، جو ان اصحاب کے نام سے شائع ہوئیں۔ غرض ناشروں کے وارے نیارے ہوتے رہے لیکن نشتر غریب تھے زندگی بھر کبھی فارغ البالی کا منہ نہ دیکھا۔ مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ سیماب اکبرآبادی (ف جنوری ۱۹۵۱ء) نے کیا تھا۔ اس کے لیے مشہور ناشر مولوی فیروزالدین (لاہور) (ف اپریل ۱۹۴۹ء) نے انھیں دو پیسے فی شعر معاوضہ دیا تھا۔ سیماب بیچارے بھی کیا کرتے انھیں روپے کی ضرورت تھی۔ بیماری کی حالت میں بھی انھوں نے اس کے پانچ دفتر کا ترجمہ مکمل کر دیا! اس کے بعد کام چھوڑ دیا۔ نشتر نے نہ صرف اس ترجمے پر نظرِ ثانی کی، بلکہ خود چھٹے دفتر کا ترجمہ اضافہ کر کے کتاب مکمل کر دی۔ یہی ترجمہ بعد کو الہام منظوم کے عنوان سے مولوی صاحب موصوف کے نام سے فیروز الدین اینڈ سنز کی طرف سے شائع ہوا۔
نشتر کے اپنے نام سے جو کتابیں شائع ہوئیں، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: نشتر ادب؛ شرح اور شرح بالِ جبریل وغیرہ۔
اتوار ۲۲ جون ۱۹۷۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

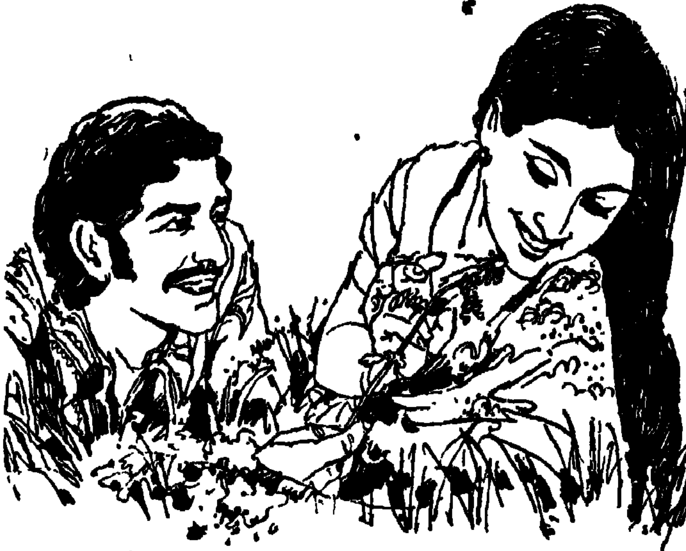
تحریر

علمی مجلس دِلّی کا تماہی رسالہ

۳۴

مرتب
مالک رام

Rs.15/-



Printed by Z. A. Abbasi at Kohinoor Press, Lal Kuan DELHI-6
and Published from "ILMI MAJLIS" OFFICE,
1429, Chhatta Nawab Saheb, Farash Khana, DELHI-6.

تحریر

علمی مجلس دہلی کا سہ ماہی رسالہ

(۳۴)

مرتّب مالک رام

جلد ۹ اکتوبر / دسمبر ۱۹۷۵ء شمارہ ۴

رشید احمد صدیقی نمبر

ندہ سالانہ : ۱۵ روپے اس شمارے کی قیمت

ر ممالک سے: ۲/۱ ۲ پونڈ (انگریزی) / ۷ ڈالر (امریکی) چودہ روپے

پرنٹر و پبلشر ظلِ عباس عبّاسی نے جمال پرنٹنگ پریس، دلّی میں چھپوا کر دفتر علمی مجلس ۱۴۲۹ چھتہ نواب صاحب، فرّاشخانہ، دلّی سے شائع کیا۔

ملاحظات

یہ ہماری نویں جلد کا آخری شمارہ ہے؛ اور ہم اسے ادیب شہیر جناب رشید احمد صدیقی سے منسوب کر رہے ہیں؛ یہ ہمارے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو ہم نے چند برس پہلے زندہ ادیبوں کے لیے شروع کیا تھا۔ فالحمدللہ۔

ہمیں اندیشہ ہے کہ شاید قبلہ رشید صاحب اپنے روایتی استغنا کے باعث ہمارے اس اقدام کو پسند نہ کریں۔ لیکن اُردو زبان کا ہر ایک طالبعلم جانتا ہے کہ رشید صاحب تاریخ ادب اردو کا حصّہ بن چکے ہیں۔ اب وہ لاکھ راہِ فرار اختیار کرنا چاہیں، یہ اُن کے بس کی بات نہیں رہی۔ لہٰذا ہم پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ اپنی بساط بھر اس تاریخ کی تکمیل میں مدد دیں۔ یہ خاص نمبر اسی مقصد کو سامنے رکھ کر پیش کیا جا رہا ہے۔

اس مجموعے میں آپ کو ہر طرح کے مضامین ملینگے۔ ہم نے دانستہ ان سے تعرّض نہیں کیا اور انھیں جوں کا توں شائع کر رہے ہیں۔ ہر ایک کا مطالعہ کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا اپنا معیار ہو؛ اسی لیے بعض مضامین سے عدمِ اتفاق کے باوجود ہم نے ان میں کتر بیونت نہیں کی۔

افسوس ہو کہ ہمارے بار بار توجہ دلانے کے باوجود بعض اصحاب نے اپنا چندے کا حساب بیباق نہیں کیا۔ تعجب ہے کہ وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ اس طرح وہ اپنے فرض کی ادائی میں کوتاہی کے مرتکب ہو رہے ہیں؛ اور یوں ہماری مشکلات میں بھی اضافہ کر رہے ہیں۔ انھیں ایک مرتبہ پھر یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ وہ جلد اپنی ذمّے داری کو محسوس کرینگے۔

مالک رام



رشید احمد صدیقی
۱۹۷۲

سلسلۂ مطبوعات علمی مجلس، ۲۶

رشید احمد صدیقی

کردار، افکار، گفتار

مرتّبہ

مالک رام

علمی مجلس، دلّی

۱۹۷۵ء

رشید احمد صدیقی : کردار، افکار، گفتار

مرتب: مالک رام
مطبع: جمال پرنٹنگ پریس دلّی
اشاعت: دسمبر ۱۹۷۵ء
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دلّی، بمبئی، علی گڑھ
قیمت: ۱۴ چودہ روپے

پیش لفظ

اردو دنیا کی مشہور زبانوں میں غالباً سب سے کم عمر ہے، لیکن مختصر زمانۂ حیات کے باوجود اپنی ادبی فتوحات کے لحاظ سے ان میں سے بیشتر کی ہم پلہ اور بعض پر فوقیت رکھتی ہے۔ جہاں تک نظم و شعر کا تعلق ہے، کمیت کے پہلو سے یہ کسی سے پیچھے نہیں۔ کیفیت میں بیشک تعداد میں زیادہ شاعر ہم دنیا کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہیں، لیکن جو اس عالمی معیار پر پورے اُترتے ہیں، وہ کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کم مرتبہ نہیں کہے جا سکتے۔ آپ کسی اصول یا ناپ تول سے بھی پرکھیے، آپ میر، غالب، انیس، اقبال کو کسی سے ہیٹا نہیں پائینگے۔

نثر میں ادب تک تو ٹھیک ہے لیکن علم کی مختلف شاخوں میں ہم ابھی تک کئی زبانوں کے برابر نہیں پہنچ سکے۔ اس کے اسباب و علل پر بحث کرنے کا نہ یہ محل ہے نہ اس مختصر تحریر کا مقصد۔ میں یہاں اُردو میں صرف طنز و مزاح کے سرمایے کے بارے میں مختصراً کچھ اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات کا آغازِ گفتگو ہی میں اعتراف کر لینا چاہیے کہ اُردو میں اس صنف کا بلند پایہ منظوم یا نثری سرمایہ کچھ زیادہ نہیں۔ ہمارے ہاں تصنیف و تالیف کی ابتدا مذہبی حلقوں کی مرہونِ منت رہی۔ ان اصحاب کا مقصود یا تو لوگوں کو دین کی باتیں سکھانا اور سمجھانا

تھا، یا اخلاق کے مسائل کی تعلیم دینا۔ اور بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اساساً یہ دونوں باتیں ایک ہی اصل کی فرع ہیں؛ ان میں نہ تضاد ہے نہ تفاوت۔ ظاہر ہے کہ ان موضوعات میں ہنسی مذاق کی کوئی گنجائش نہیں تھی، بلکہ بعض متقشف بزرگ تو عین ممکن ہو اسے موضوع کی ثقاہت کے منافی سمجھتے۔ بھلا ایسے ماحول میں طنز و مزاح کا کیا دخل تھا! یہ صورت حال تا دیر قائم رہی۔

اس راہ سے انحراف سودا نے کیا۔ اور تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اس میں حیرت ناک حد تک کامیاب رہے۔ لیکن ان کا خاص میدان ہجو تھا۔ ان کے سامنے فارسی کے متعدد ہجو گو شعرا کا کلام موجود تھا، لیکن محض نمونے سے کوئی شخص قابلِ لحاظ یا کامیاب اور کارآمد چیز پیدا نہیں کر سکتا۔ تاوقتیکہ خود اس کے اپنے اندر تخلیقی صلاحیت اور نمونے سے بہتر چیز پیش کرنے کی لیاقت موجود نہ ہو۔ سودا میں علم و عقل کی کمی نہیں تھی۔ اس پر ان کے مزاج کی جھلاہٹ اور زود گوئی اور زود حسی مستزاد۔ ان کی ہجویں اُردو کے شعری سرمایے میں آج تک منفرد ہیں۔ لیکن ہجو نہ مزاح ہو نہ طنز۔ ان کی بعض نظموں (مثلاً شہر آشوب) میں طنز کے نمونے تو ضرور ملتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی مزاح کا عنصر ان کے ہاں بہت کم ہے۔

ان کے بعد رنگین اور انشا کی بدولت ہمارے ہاں ریختی کا رواج ہوا لیکن یہ صنفِ سخن ضلع جگت سے آگے نہ بڑھ سکی، اور کہیں کہیں تو اس سے بدنما حد تک عریانی اور ابتذال کو فروغ ہوا۔ میرے نزدیک ریختی کا مثبت پہلو صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے عورتوں کی بولی ٹھولی اور مخصوص محاورے محفوظ ہو گئے۔

لیکن انشا کے ہاں مزاح کے نمونے بھی ملتے ہیں، اگرچہ نہ ان کی تعداد زیادہ ہے، نہ معیار بلند۔ تاہم جو کچھ ہے غنیمت ہے۔

اس کے بعد اودھ پنچ اور اکبر کا دور ہمارے سامنے آتا ہے۔ اکبر کبھی کبھی پنچ میں بھی لکھا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جہاں تک خالص مزاح اور ظرافت کا تعلق ہے، اُردو کے پورے شعری سرمایے میں اکبر کا جواب نہیں۔ ہاں البتہ طنز میں شبلی ان کے مدِمقابل ہیں، اگرچہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ شبلی نے بہت کم کہا؛ ان کے طنز کے موضوع زیادہ تر سیاسی ہیں۔

القصہ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ہمارے کلاسیکی شعری ذخیرے میں طنز و مزاح کے میدان میں صرف

چار نام قابلِ ذکر ہیں: سودا، انشا، اکبر، شبلی؛ اور ان میں بھی معتدبہ کلام صرف اکبر کا ہے۔
لیکن جب ہم زمانۂ حال تک پہنچتے ہیں تو یہ عالم ہی دوسرا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب مغربی
اثرات کے تحت ہمارے مزاح نگار محض لفاظی سے کام نکالنے کی جگہ اپنی منظومات میں خوش دلی
اور مسرت کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جس سے قاری کے احساساتِ لطیفہ میں گدگدی بھی
پیدا ہوتی ہے اور انھیں سکون بھی ملتا ہے۔ زمانۂ قریب کے شعرا میں مقبول حسین ظریف لکھنوی، ہری چند
اختر، مجید لاہوری، راجہ مہدی علی خاں، سید محمد جعفری، غلام احمد فرقت کاکوروی خاص طور پر
کامیاب رہے ہیں۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ نظم کے مقابلے میں ہماری نثر طنز و مزاح کی صنف میں کہیں زیادہ کامیاب
ہے؛ اور بلحاظِ کمیت بھی اس میں کہیں وافر نمونے ملتے ہیں۔

نثرِ اردو میں مزاح داخل کرنے کا سہرا غالب کے سر ہے۔ انھوں نے خط کیا لکھے، صفحۂ قرطاس پر زعفران
کی کشت کاری کر دی۔ ان خطوں کو لکھے سو برس سے زیادہ ہو گئے، بلکہ ان میں سے بعض تو سوا سو برس
سے بھی زیادہ کے ہیں؛ لیکن ان کی تازگی اور شگفتگی اور مسرت آفرینی اور نتیجۃً مقبولیت میں آج تک
کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ رقعات بالکل نجی قسم کے ہیں۔ مکتوب الیہ وہ اصحاب ہیں، جو غالب کے عزیز دوست
یا شاگرد تھے۔ لامحالہ ان خطوں میں جو باتیں لکھی گئی ہیں، وہ فریقین کی شخصی دلچسپی سے تجاوز نہیں
کر سکتی تھیں۔ ہم آج نہ مکتوب الیہ کو جانتے ہیں، نہ ان مسائل کو، جو غالب اور مکتوب الیہ کے
سامنے تھے، نہ ان تعلقات کی گہرائی کا ہمیں اندازہ اور علم ہے، جو فریقین کے درمیان تھے۔ لیکن
تحریر کا کمال یہ ہے کہ پس منظر سے بالکل نابلد ہوتے ہوئے بھی، نہ صرف ہم ان سے لطف اندوز ہوتے
ہیں، بلکہ ان میں کسی طرح کی اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔

غالب کے مزاح کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ بیساختہ ہے؛ اس میں سراسر آمد ہے، جس میں آورد کا کہیں
کوئی شائبہ نہیں۔ حالی نے اسی لیے انھیں "حیوانِ ظریف" کہا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ظرافت
ان کی فطرت کا جزو تھی، یعنی یہ وہبی تھی، اس کا اکتساب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تمہید نہیں
ڈھالتے، پینترے نہیں بدلتے، بلکہ ان کی تحریر کی پوری فضا سرور آگین ہے۔ اس میں ان کے
اسلوبِ نگارش اور سلاستِ زبان کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ ان کے اسلوب کا کمال تو یہ ہے کہ یوں لگتا

ہے۔ جیسے زیر مطالعہ خط کسی اور کے نہیں، خود آپ کے نام لکھا گیا ہو۔ چونکہ بقول ان کے انھوں نے نامہ نگاری کو مکالمہ بنا دیا ہے کہ اس سے قاری کی دلچسپی شروع ہی سے بیدار ہوجاتی ہے؛ وہ محسوس کرنے لگتا ہے، گویا وہ اسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ زبان چونکہ الا ماشاء اللہ بیحد سلیس ہے، اس سے بات چیت اور یگانگت کا احساس اور بھی قوی ہو جاتا ہے، اور لطف دوبالا۔

غرض کہ غالب کے خطوط ہمارے ادب کے وہ سدا بہار پھول ہیں، جو نہ کبھی باسی ہونگے، نہ کبھی ان کے پڑھنے سے اردو والوں کی سیری ہو گی۔

غالب کی وفات سے کچھ ہی پہلے (۱۸۷۷ء میں) منشی سجاد حسین کاکوروی نے لکھنؤ سے اودھ پنچ جاری کیا۔ اس کا خیال انھیں، یقین ہے کہ، لندن کے مشہور ہفتہ وار پنچ (انگریزی) سے آیا ہوگا۔ لیکن دونوں کے مذاق میں وہی فرق تھا، جو انگریزی اور ہندستانی قوموں میں، یا دوسرے لفظوں میں لندن اور لکھنؤ میں تھا۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے، جب لکھنوی ادب میں ضلع جگت اور محاورہ بازی اور صنائع بدائع کی کارفرمائی تھی۔ اکبر الہ آبادی اور نواب سید محمد آزاد کے سوا سے اودھ پنچ کے بیشتر مضمون نگار بھی لکھنؤ ہی کے ادیب اور شاعر تھے۔ ایسے میں محال تھا کہ اودھ پنچ کے مزاح میں وہ لطافت یا بلندی پیدا ہو سکتی، جو اعلیٰ درجے کی ظرافت کی جان ہے۔ اور جس ماحول میں ان حضرات نے تربیت پائی تھی، اور اس وقت لکھنؤ کا جو مذاقِ سخن تھا، اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان سے زیادہ کی توقع رکھنا بھی توہینِ انصاف نہیں۔

اودھ پنچ کے ہاں طنز اور پھبتی کی بھرمار ہے۔ اسی لیے اس کی تحریروں میں جلی کٹی اور تضحیک اور استہزا کی بھی کمی نہیں۔ ایسی چیزیں وقتی طور پر اپنا کام ضرور کر جاتی ہیں، لیکن ان میں پائداری نہیں ہوتی؛ اور تربیت یافتہ ذہن ان سے جلد ہی اکتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہو کہ اگرچہ اودھ پنچ کا ذکر اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں ناگزیر ہے، لیکن اس کے مضامین کسی انتخاب میں مستقل مقام حاصل نہ کر سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ غالب کے بعد نثر میں جس ادیب نے قابلِ لحاظ پہلو سے کچھ پیش کیا، وہ

رتن ناتھ سرشار ہے۔ "فسانۂ آزاد" سرشار کا وہ کارنامہ ہے، جو اردو کے ساتھ زندہ رہیگا۔ بیشک، کہیں کہیں اس کی زبان ثقیل اور عربی فارسی کے الفاظ سے بوجھل ہو گئی ہے، لیکن عام طور پر اس کی دلچسپی اور دلکشی قائم رہتی ہے۔ اور خوجی کا کردار تو سرشار کی ایسی تخلیق ہے کہ اگر وہ اور کچھ بھی نہ لکھتے (اور انھوں نے بہت کچھ اور لکھا ہے) تو صرف یہی ایک نام انھیں حیاتِ ابدی عطا کرنے کو کافی تھا۔

سرشار کے بعد اہمیت کے لحاظ سے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا ظفر علی خاں کے نام سامنے آتے ہیں۔ یہ سب حضرات طنز کے استاد ہیں۔ البتہ، مولانا محمد علی کے ہاں مزاح و ظرافت کے نمونے بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اسی عہد کے دو اور مزاح نگاروں نے بہت نام پیدا کیا۔ یہ ہیں سید محفوظ علی بدایونی اور ولایت علی بمبوق؛ اور ان دونوں میں بھی محفوظ علی کا مقام بلند تر ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔ افسوس کہ کسی نے آج تک بمبوق کے مضامین جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ظفر علی خاں نے اس باب میں ایک اور طرح سے بھی اُردو کی خدمت کی۔ یہ اُن کا روزنامہ "زمیندار" ہی تھا جس کے ذریعے سب سے پہلے روزانہ فکاہی کالم پیش کرنے کی رسم پڑی۔ عبد المجید سالک اس میں "افکار و حوادث" کے عنوان سے ہر روز فکاہی شذرات لکھتے تھے، اور جب انھوں نے غلام رسول مہر کے ساتھ اپنا اخبار "انقلاب" جاری کیا، تو یہ کالم بھی وہاں منتقل ہو گیا۔ وہ یہ کالم کم و بیش ۳۰ برس تک لکھتے رہے۔ جن لوگوں نے یہ تحریریں نہیں دیکھی ہیں، وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ان کی گل افشانیٔ گفتار کا معیار کیا تھا، اس میں کتنا تنوع تھا۔ کاش کہ کوئی شخص مختلف عنوانوں کے تحت دو تین جلدوں میں ان کا انتخاب شائع کر دیتا! یہ ہمارے ادب کی مستقل خدمت ہوگی۔

سالک کی دیکھا دیکھی، فکاہی کالم ہماری صحافت کا گویا جزوِ لاینفک بن گیا۔ لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ ایک چراغ حسن حسرت کے سوائے کوئی ان کی گرد

کو بھی نہ پہنچ سکا۔ سالک کی کامیابی کا راز ان کی فطری ظرافت کے علاوہ ان کے علم وفضل اور قدرتِ زبان میں مخفی تھا۔ وہ فارسی اور عربی دونوں میں طاق تھے، اور ان کی اردو تحریر میں آپ کو کہیں غلطی نہیں ملیگی۔ یہی حال حسرت کا تھا۔ اسی لیے وہ سالک سے پیچھے نہ رہے۔ ان کے دوسرے مقلدوں کے لیے یہ نہیں کہا جا سکتا۔

اس صحافتی ظرافت کے میدان کے باہر دو اور اصحاب قابلِ ذکر ہیں۔ میری مراد پطرس (احمد شاہ بخاری) اور تاج (امتیاز علی) سے ہے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے بہت کم لکھا۔ لیکن ان کی کتابیں "مضامین پطرس" اور "چچا چھکن" بقامت کہتر، ہونے کے باوجود "بقیمت بہتر" ہی نہیں، بلکہ ان کے بغیر اردو کے مزاحی ادب کی تاریخ مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ نہ صرف یہ بلکہ چچا چھکن بھی سرشار کے خوجی کی طرح ہماری زبان کا ضرب المثل کردار ہے۔

یہی زمانہ رشید احمد صدیقی کے منصۂ شہود پر آنے کا ہے، جن کے بارے میں آپ آیندہ صفحات میں بہت کچھ پڑھینگے۔

رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح کی دو خصوصیات اہم اور قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ ان کی ظرافت تبسم زیرلب کی ظرافت ہے۔ نہ وہ خود کھلکھلا کر ہنستے ہیں (قہقہہ مارنا تو بہت دور کی بات ہے) نہ وہ کسی کو کھلکھلا کر ہنسنے کی دعوت دیتے ہیں۔ سخت گرمی کے موسم میں اگر بالکل ہلکی ہلکی سی ہوا چلنے لگے، تو آپ کا رُواں رُواں فرحت محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت رشید احمد صدیقی کے مزاح کی ہے۔ اس میں شدت نہیں بلکہ انبساط و اہتزاز کی ایک زیریں لہر ہے، جو آپ پر مستولی ہو جاتی ہے۔ اور لطف یہ کہ کوئی آپ سے پوچھے کہ اس کا منبع کیا ہے، تو بتائے نہ بنے؛ اس کا تعلق پوری فضا سے ہے، نہ کہ کسی ایک لفظ یا جملے سے۔ لیکن یہ اتنی لطیف ہے کہ اس سے کما حقہٗ لطف اندوز ہونے کے لیے قاری کا تعلیم یافتہ اور پڑھا لکھا ہونا لازم ہے۔ اور وہ جتنا زیادہ تعلیم یافتہ اور پڑھا لکھا ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہوگا۔ ان کی دوسری خصوصیت، ان کی بھلمنساہت ہے۔ آپ کو ان کی

کسی تحریر میں کوئی مبتذل کلمہ یا اشارہ نہیں ملیگا ۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ وہ ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ ہیں، اور ان کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی، اس میں ادب آداب کی مسلّمہ اقدار کا مذہب اور شریعت کی طرح خیال کیا جاتا تھا، بلکہ ان کے خیالات کی تشکیل میں ان کے پیشے کو بھی بہت دخل دیا ہے ۔ وہ ساری عمر درس و تدریس میں مشغول رہے ہیں ۔ ہمارے نوجوانوں کی کم از کم تین نسلیں ان کی تعلیم و تربیت سے مستفیض ہو کر ملک و ملت کی خدمت کرنے کے لائق ہوئی ہے ۔ سقراط کی طرح رشید احمد صدیقی کو بھی ساری عمر اس بات کا شدید احساس رہا ہے کہ ان کے شاگرد ملک کے مستقبل کے مالک اور خادم ہیں ۔ اور وہ ان دونوں فرائض سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ انھیں نیک اور بد، راستی اور کجی، صداقت اور دروغ کا صحیح صحیح علم ہو ۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دس من پند و نصیحت کے مقابلے میں چھٹانک بھر مثال زیادہ کارگر ہو سکتی ہے ۔ اس صورت میں وہ اپنے شاگردوں کے سامنے قولاً یا فعلاً اپنے مرتبے اور مقام سے فروتر کوئی نمونہ بھلا کیونکر پیش کر سکتے تھے !

ان کے ہمعصروں میں نیاز فتحپوری اور عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں ۔ نیاز فتحپوری نے کچھ زیادہ نہیں لکھا لیکن جو کچھ بھی لکھا، اس کا معیار بہت بلند ہے ۔ ان کے ہاں مزاح اور طنز دونوں کے قابل قدر نمونے ملتے ہیں، اور رکھ رکھاؤ اور اخلاق و آداب میں وہ بھی رشید احمد صدیقی سے کسی طرح کم نہیں ۔ یہ بات عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی ؛ ان دونوں کا قلم کہیں کہیں بیراہ ہو گیا ہے ۔

الغرض ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی نے جس معیار اور پایے کا ذکاہی اور طنزیاتی ادب ہمیں دیا ہے، وہ قدر اوّل کی چیز ہے ؛ اور اس میدان میں بہت کم ان کے حریف ہیں ۔

مالک رام

فہرست

کردار

سید عابد حسین

رشید و مرشد

شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

رسم است کہ مالکانِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

مگر ہمارے "مالکِ تحریر" بندۂ پیر کو بھی نہیں بخشتے۔ چنانچہ مجھے حکم ہوا کہ تحریر کے رشید نمبر (نذر رشید) کے لیے جو وہ ترتیب دے رہے ہیں، کچھ لکھوں اور جلد لکھوں۔ میں ہمیشہ سے سست قلم ہوں۔ اور اب چند سال سے تو میرے لیے کچھ لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں رہا۔ پھر جب جلد لکھنے کی فرمائش ہو، تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور قلم چلانا درکنار، قلم اٹھانا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ ایک عزیز دوست، دوسرے عزیز دوست کی خدمت میں صحیفۂ محبت و عقیدت پیش کر کے وہ فرضِ کفایہ ادا کر رہے ہیں، جو ہر اردو ادیب بلکہ اردو دوست کے لیے فرضِ عین کی حیثیت رکھتا ہے۔ رشید صدیقی صاحب کم و بیش ۶۰ برس سے اردو کو بنانے، سنوارنے، نکھارنے، اس میں خوش طبعی و شوخی اور رنگینی کی دلآویزی اور اسی کے ساتھ ساتھ بصیرت و معنویت کا وزن و وقار پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ "نذرِ رشید" کی تدوین کا کام ایک مدت سے مالک رام صاحب کا حصہ ہو گیا ہے۔ اگر اس سلسلے میں رشید صاحب کا ذکر نہ ہوتا تو بہت بڑی کمی رہ جاتی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے

مالک رام صاحب نے اپنی صحت کی کمزوری کے باوجود، اربابِ اُردو کے لیے یہ ارمغان تازہ پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ایسی صورت میں، یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ میں اس مبارک کام میں تھوڑا بہت ہاتھ نہ بٹاؤں! چنانچہ میر کارواں کے کئی تقاضوں کے بعد میں نے رہی سہی طاقت کو جمع کر کے اپنے واماندۂ راہ قلم کو بھی اس کاروانِ شوق کے ساتھ جادہ پیمائی پر آمادہ کر لیا۔

چل میرے خامے بسم اللہ

پہلے اس مضمون کے عنوان کی توجیہ اور وضاحت۔ ساری اُردو دنیا جانتی ہے کہ رشید صاحب کو ذاکر صاحب مرحوم سے غیر معمولی محبت اور عقیدت تھی اور ہے۔ وہ ان کو مزاح نما خلوص کے ساتھ "مرشد" کہا کرتے تھے اور آج بھی اندوہ و حسرت کے لہجے میں اسی لقب سے یاد کرتے ہیں۔ رشید صاحب ہی کے واسطے سے میری ملاقات ذاکر صاحب سے ہوئی، جنھیں آگے چل کر میں نے بھی طریقِ زندگی میں اپنا رہنما بنا لیا۔ رشید صاحب اور ذاکر صاحب کا باہمی تعلق خاطر مجھے شروع ہی سے ایک طلسم حیرت نظر آیا! اور سالہا سال تک میں اس پہیلی کو نہ بوجھ سکا کہ ان دونوں میں خیالات، مذاق اور مزاج کے اختلاف کے باوجود اس قدر گہری، سچی اور دلی الفت کیوں ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن پہلے مجھ پر یہ بھید کھلا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس موقع پر رشید صاحب کی خدمت میں ہدیۂ نیاز اس طرح پیش کروں کہ ان کی زندگی اور سیرت کا ایک اہم پہلو یعنی ذاکر صاحب کے ساتھ ان کے رُشد و ارشاد کے تعلق کی نوعیت جواب تک میری نظر میں ایک معما تھی اور شاید مجھ جیسے اور کم نگاہوں کی نظر میں اب بھی ہو، حل ہو جائے۔

گر نکتہ دانِ عشقی، خوش بشنو ایں حکایت

جون یا جولائی ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے کہ میرے بی۔ اے کے امتحان کا (جو میں نے میور سنٹرل کالج، الٰہ آباد سے دیا تھا) نتیجہ نکل آیا۔ میں اوّل درجہ میں کل امیدواروں میں دوسرے

منبر پر پاس ہوا تھا۔ نواب زادہ حمید اللہ خان (جو آگے چل کر نواب بھوپال ہوئے) ۱۹۱۵ء سے میرے تعلیمی اخراجات کے کفیل رہے تھے۔ ان کے حکم سے میں نے ایم اے، او کالج، علی گڑھ میں ایم اے (انگریزی ادب) میں داخلے کی درخواست دے دی۔ اس کی منظوری کے بعد غالباً آخر ستمبر یا شروع اکتوبر ۱۹۲۰ء میں، جب کالج تعطیل کلاں کے بعد کھل رہا تھا، مجھے علی گڑھ پہنچنا تھا۔ میں ایک اجنبی مقام پر جہاں میرا کوئی ایک شخص بھی جاننے والا نہیں تھا، جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے، ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء میں ایم، اے، او کالج کے ان طالب علموں میں جو بی اے کا امتحان دینے الہ آباد آئے تھے، او رمسلم ہوسٹل میں ٹھہرے تھے، رشید صاحب بھی تھے۔ میں اس ہوسٹل میں ۱۹۱۶ء سے رہتا تھا اور علی گڑھ سے جو مہمان آتے تھے، ان سے معمولی صاحب سلامت ہوجایا کرتی تھی۔ اسی طرح رشید صاحب سے بھی ہوئی۔ شاید اسی وقت سے ان سے کچھ ربط پنہاں پیدا ہوگیا ہوگا کہ مجھے خیال آیا، ان کو خط لکھوں اور یہ درخواست کروں کہ کالج اور ہوسٹل میں داخلے کے مراحل طے کرنے میں میری مدد کریں۔ چنانچہ میں نے جی کڑا کر کے انھیں خط ڈالا۔ پانچویں چھٹے دن ان کا جواب آگیا جس کے ہر لفظ سے خلوص اور گرمجوشی جھلکتی، بلکہ ٹپکتی تھی۔ علی گڑھ پہنچ کر معلوم ہوا کہ رشید صاحب، سید محمود کو لڑکے اتالیق کی حیثیت سے آدم جی پیر بھائی منزل کے اندرونی حصے میں رہتے ہیں۔ وہاں پہنچا تو اس طرح ملے، جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوئے دوست ملتے ہیں، اور اصرار کر کے اپنے ساتھ ٹھہرایا۔ شاید یہ شگون تھا کہ ایک دن ہم دونوں ایک دوسرے کے پیر بھائی بن جائینگے۔

ان دنوں ملک میں تحریک آزادی اور تحریک خلافت کا زور تھا۔ اور قومی رہنما ہر طبقے اور ہر پیشے کے لوگوں کو جن میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے معلم اور منتظم بھی داخل تھے، انگریزی حکومت کے ساتھ ترک تعاون پر ابھار رہے تھے۔ علی گڑھ میں بھی مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جو کالج کے ٹرسٹیوں میں شامل تھے، دوسرے

ٹرسٹیوں کو اس پر آمادہ کرنے کی ناکام کوشش کر چکے تھے کہ حکومت سے کالج کو جو امداد مل رہی تھی، اس سے دست بردار ہو کر تحریک آزادی کے علمبردار بن جائیں اب یہ خبر گرم تھی کہ علی برادران اور دوسرے قومی رہنما علی گڑھ آکر براہِ راست کالج کے معلموں اور طالب علموں سے اپیل کریں گے کہ ایم، اے او کالج کو چھوڑ دیں اور اس کی حریف بمقابل جامعۂ ملیۂ اسلامیہ میں (جسے علی گڑھ میں قائم کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا) شریک ہو جائیں۔

اس سے سارے کالج میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ جدھر دیکھو، یہی چرچا تھا۔ رشید صاحب کے یہاں سہ پہر سے شام تک ان کے کچھ خاص احباب کی ایک بزم بے تکلف "برپا" ہوتی تھی۔ اس کے بے ضابطہ صدر ذاکر صاحب ہوتے تھے۔ جن کو رشید صاحب اور ان کی آواز بازگشت کے طور پر دوسرے دوست بھی "مرشد" کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے حسنِ صورت و سیرت، جودتِ طبع، تقریر کی لذت اور مجموعی شخصیت کی کشش کا ذکر میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ اور شاید مسلم ہوسٹل الہ آباد میں بی اے، یا ایم اے پریویس کے امیدواروں میں، جو علی گڑھ سے امتحان دینے آئے تھے، ان کی ایک جھلک بھی دور سے دیکھی تھی، مگر ملاقات کا شرف اب تک حاصل نہیں ہوا تھا۔ رشید صاحب کے یہاں اپنے قیام کے پہلے یا دوسرے دن سہ پہر کی بزمِ بے تکلف میں ان کی زیارت ہوئی اور دو ہی ان کی موہنی نے ایک ملاقات میں میرے دلِ وحشی کو موہ لیا۔ ان صحبتوں میں طرزِ کلام عام طور پر گپ شپ، نوک جھونک، قہقہوں، چہچہوں کا ہوتا تھا، مگر موضوعِ کلام اکثر سنجیدہ مسائل ہوتے تھے، خصوصاً ترک تعاون کی تحریک اور ایم، اے او کالج پر اس کے امکانی اثرات۔ شروع میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبھی شرکائے بزم ترک تعاون کے ہنگامے کو ملک کے لیے اور خاص طور پر تعلیمی اداروں کے لیے مضر بلکہ مہلک سمجھتے ہیں۔ مگر جب ہم لوگوں نے یونین ہال میں ملک کے سیاسی رہبروں کی حمیت خیز اور ولولہ انگیز تقریریں سنیں، اور جامعۂ ملیہ

کی تاسیس کے جلسے میں جو کالج کی مسجد میں منعقد ہوا تھا، شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کا بصیرت افروز، ولولہ زا اور جانسوز خطبہ سُنا، تو ہم میں سے بعض کے دل و دماغ میں ردّ و قبول کی کشاکش نے ایک طوفان اور ہیجان برپا کر دیا۔ میں ان دنوں یہ کوشش کر رہا تھا کہ مجھے ریاست بھوپال سے اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جانے کو وظیفہ مل جائے، اور بظاہر اس کوشش میں کامیابی کی قوی اُمید تھی۔ اس لیے ملک کی سیاست کی طرف میری توجہ بہت کم تھی۔ پھر بھی کالج کی عام فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے اپنے تاثر کو غالب کے ایک شعر کی تضمین میں ظاہر کیا۔ جس کے صرف یہ چند شعر اس وقت یاد آ رہے ہیں؛

دنیا میں کچھ عجیب تلاطم ہے ان دنوں اک کشمکش میں دیکھتا ہوں بحر و بر کو میں
دل بھی ہے ایک چھوٹی سی دنیا بجائے خود ہلچل میں یاں بھی پاتا ہوں شر شتِ دروں میں
"چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز رَو کے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، جو بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ رشید و مرشد میں باوجود انتہائی الفت اور یگانگی کے طرزِ فکر اور نظریۂ حیات کے اعتبار سے جو فرق تھا، اس کا کچھ اندازہ میرے تحتِ شعور کو اسی وقت ہو گیا تھا، مگر اب وہ سطحِ شعور پر اُبھر آیا ہے۔ رشید صاحب کی ذہنی حالت اس بحران کے زمانے میں حافظ کے شعر میں صرف ایک لفظ بدل کر یوں بیان کی جا سکتی ہے:

من کجا کشمکشِ رَدّ و قبولم ز کجا
حیف باشد، دلِ مومن کہ مشوش باشد

اور مومن کی تعریف اگر رشید صاحب سے اس وقت پوچھی جاتی، تو وہ حالی کے شعر میں تصرف کر کے یہ کہہ سکتے تھے:

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
سیّد تری اُلفت ترے کالج کی ولا ہے

اسی تلازمے کو جاری رکھتے ہوئے اُس باطنی کشمکش کو جس سے ذاکر صاحب اس وقت

گزر رہے تھے، اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے:

ایماں مجھے روکے ہے، تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

میں تو تھوڑے ہی دن بعد کالج سے، جو اس دوران میں یونیورسٹی بن گیا تھا، رخصت ہو گیا۔ مگر جاتے جاتے میں نے یہ منظر دیکھ لیا کہ رشید صاحب وفاداری اور استواری سے مقامِ ایمان پر قائم رہے اور ذاکر صاحب زبانِ حال سے۔

نازم بہ کفرِ خود کہ بہ ایماں برابر است

کہتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جنگِ آزادی کے تعلیمی محاذ کے سپاہی اور آگے چل کر سپہ سالار بن گئے ہیں۔

اس کے بعد کے پانچ برس کی مدت میں، جس کا بڑا حصہ میں نے آکسفرڈ اور برلن میں گزارا، رشید صاحب سے میرا کوئی رابطہ نہیں رہا، ذاکر صاحب میرے برلن پہنچنے کے چند ہی مہینے بعد ہندستان سے جرمنی آ گئے، اور برلن یونیورسٹی میں جہاں میں کچھ پہلے سے پڑھ رہا تھا، داخل ہو گئے۔ یونیورسٹی میں میرے اور ان کے مضامین اور کلاسیں الگ الگ تھے۔ مگر قیام ہم دونوں کا اور محمد مجیب صاحب کا جو آکسفرڈ میں اپنی تعلیم ختم کر کے فنِ طباعت حاصل کرنے کے لیے برلن آئے تھے، کم و بیش تین سال تک ایک ہی خاندان کے خود کفیل مہمانوں کی حیثیت سے ایک ہی مکان میں رہا۔ اس زمانے میں، میں نے اور مجیب صاحب نے جو ایک سال پہلے سے میرے ساتھ رہتے تھے، ذاکر صاحب کو ہر رنگ میں، خلوت و جلوت میں، کلفت و مسرت میں، تمکین، سکوت و سنجیدگی میں، نشاط، گل افشانی تقریر میں، وجد و وارفتگی کے عالم میں، "چناں کہ افتد و دانی" کی منزل میں دیکھا، پرکھا اور کھرا سونا پایا، جس میں کھوٹ نام کو بھی نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی شخصیت کے جادو نے ہم دونوں کو بیخودی اور بیخبری کی حالت میں نہیں، بلکہ بہ ثباتِ ہوش و حواس مسحور کر لیا؛ اور جرمنی میں تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ہم ان کے ساتھ کچے

ڈھاکے میں بندھے ہندستان آکر جامعہ ملیہ کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔
اس کے کچھ ہی عرصے بعد میں اور ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ ہم دونوں سال میں دو بار علی گڑھ جاتے اور جہاں تک مجھے یاد ہے، معمولاً رشید صاحب ہی کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ چنانچہ جیسے میں پہلے رشید صاحب کے واسطے سے ذاکر صاحب سے ملا تھا اب ذاکر صاحب کی معرفت رشید صاحب سے میری باسی دوستی تازہ ہوگئی۔ اگلے ۱۸۔ ۱۹ سال میں رشید صاحب سے ششماہی ملاقاتوں اور ان کی مہمان نوازیوں کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ بلکہ گاہے ماہے اور ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ اس عرصے میں رشید صاحب کو بہت قریب سے دیکھتا رہا اور ان کی ذہنی اور اخلاقی صفات کا نقش میرے دل پر گہرا ہوتا گیا۔ رشید و مرشد کے ساتھ ان صحبتوں کا مزہ دل ہی جانتا ہے، اُسے زبان و قلم سے بیان کرنا ممکن نہیں۔ ذوق ادب ہم تینوں کا بڑی حد تک یکساں تھا۔ اس لیے شعر و شاعری، ادب و انشا کے موضوعات پر گفتگو چھڑ جائے، تو آپس میں خوب گھٹتی تھی۔ ملکی سیاست کے بارے میں، میں اور ذاکر صاحب، رشید صاحب کے خیالات اور نظریات سے بُعد المشرقین رکھتے تھے۔ اس لیے یہ موضوع بہت کم زیر بحث آتا تھا۔ اور اگر کبھی آ بھی جائے، تو معاملہ نوک جھونک سے آگے نہ بڑھتا۔ اور اس میں بھی کچھ کم لطف نہیں تھا۔
مگر سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی سیاست میں ہم تینوں میں اتفاق رائے تھا۔ ان دنوں اس سیاست کا مرکز ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی ذات شریف تھی۔ میں اور ذاکر صاحب ممبران کورٹ کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جو ڈاکٹر ضیاء الدین کی پالیسیوں کو یونیورسٹی کے حق میں سخت مُضر سمجھتے تھے۔ اور ان کی شخصیت اور اقتدار و کردار کا جو اثر یونیورسٹی کی عام فضا خصوصاً طالبعلموں کی زندگی پر پڑ رہا تھا، اس کی وجہ سے بہت فکرمند تھے۔ رشید صاحب، سرسید، محسن الملک اور وقارالملک کے علیگڑھ کالج کو چشم مجنوں سے دیکھتے تھے اور جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس اندیشے سے کہ یونیورسٹی

بننے کے بعد اس کا جو استحالہ ڈاکٹر ضیاالدین اور ان کے رفقا کے ہاتھوں ہو رہا ہو وہ خدا نخواستہ اس کی صورت و سیرت کو مسخ نہ کردے وہ ہم سے کہیں زیادہ غمگین اور پریشان رہتے تھے۔ اور جہاں تک حالات اجازت دیتے، قول و عمل سے ہماری تائید کرتے تھے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ تقسیم ہند کے اثرات نے مسلم یونیورسٹی کے لیے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دی۔ بہت سے برادرانِ وطن کو جن میں بعض اربابِ حکومت بھی شامل تھے، یہ یقین تھا کہ یونیورسٹی تحریکِ پاکستان کا مرکز رہی ہے اور یہ شبہ تھا کہ اب بھی وہ بھارت کی سرزمین پر پاکستانی اڈے کا کام کر رہی ہے۔ یونیورسٹی کی عام فضا خصوصاً اس کے بہت سے قابل طالبعلموں کا تعلیم سے فارغ ہوتے ہی پاکستان کا رُخ کرنا اور وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے جانا، اس شبہے کو اور تقویت پہنچاتا تھا۔ غرض ملک میں خصوصاً یوپی ریاست میں مسلم یونیورسٹی بہت سی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور بہت سے دلوں میں یہ ارادہ تھا کہ اس کی مرکزی حیثیت کو ختم کر کے اسے الٰہ آباد اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں کی طرح ایک ریاستی ادارہ بنادیں۔ ڈاکٹر صاحب کا مادرِ یونیورسٹی سے قلبی اور روحانی رشتہ تھا۔ اور اب وہ کورٹ اور مجلسِ منتظمہ کے ممبر کی حیثیت سے ایک حد تک اس کو چلانے کی ذمّہ داری میں شریک تھے۔ اسی لیے ظاہر ہے کہ انھیں اس صورت حال سے سخت کوفت اور تشویش تھی۔ مگر جامعۂ ملّیہ کے عام کارکنوں میں بھی بہت سے لوگ جو مسلم یونیورسٹی میں طالبعلم یا معلّم رہ چکے تھے اور غالب کے اس شعر کے مصداق تھے:۔

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

اس خطرناک بحران سے جس سے یونیورسٹی گزر رہی تھی، اس درجہ متاثر تھے کہ وہ اسے دشمنوں کی یلغار سے بچانے کے لیے جو کچھ بھی ہو سکے، کرنے کو تیار تھے۔ انھوں نے سنا تھا کہ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد، ڈاکٹر صاحب کو علی گڑھ بھیجنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ اس نازک وقت میں یونیورسٹی کی پشت پناہی اور رہنمائی کریں، مگر ڈاکٹر صاحب اپنی

رہے ہیں کہ جامعہ کی کشتی کو منجدھار میں چھوڑ کر کیسے جائیں ۔ اہلِ جامعہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ذاکر صاحب کے چلے جانے سے جامعہ کی توسیع اور ترقی کے سارے منصوبے جو انھوں نے تھوڑے ہی دن پہلے اس کی سلور جبلی کے موقعہ پر بنائے تھے، خواب پریشاں ہو کر رہ جائینگے ۔ پھر بھی انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے سب سے بڑے اور سب سے قیمتی تعلیمی سرمایے کی حفاظت کو جامعہ کی ضرورت پر مقدم سمجھا اور اس کی خاطر اپنی زندگی کی سب سے بڑی قربانی دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا ۔ ان کے دو نمایندوں نے مولانا آزاد سے مل کر انھیں یقین دلایا کہ ذاکر صاحب کے بغیر بھی جامعہ کا کام کسی نہ کسی طرح چلتا رہیگا؛ اور اہلِ جامعہ کو ان کے علی گڑھ جانے پر اعتراض نہیں، بلکہ اصرار ہے ۔ غرض ۱۹۴۸ء کے آخر میں ذاکر صاحب نے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا عہدہ سنبھال لیا، اور اب رشید و مرشد ایک دوسرے کے رفیق و ہمدم بھی بن گئے ۔

مجھے ذاکر صاحب نے وائس چانسلری کا چارج لینے کے تھوڑے ہی دن بعد یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ کا ممبر بنوا دیا تھا ۔ چنانچہ اب میں بار بار اور جلد جلد علی گڑھ جانے لگا ۔ میرا قیام تو ذاکر صاحب کے یہاں ہوتا تھا ۔ لیکن دورانِ قیام میں رشید صاحب کی زیارت قریب قریب روز ہی ہو جاتی تھی ۔ اب ان کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں ۔ شعبۂ اردو کی صدارت کے ساتھ ساتھ انھوں نے ذاکر صاحب کی مدد کے لیے کسی ہال کی نگرانی کا وبال بھی اپنے سر لے لیا تھا ۔ اس کے علاوہ ذاکر صاحب کے علانیہ اور خفیہ مخالفوں کی سازشوں کی خبر رکھنے اور ان کا توڑ کرنے کی ذمہ داری بھی زیادہ تر انھیں پر تھی ۔ اس زمانے میں مجھے رشید صاحب کی زندگی اور شخصیت کو ہر رنگ میں دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے انھیں ہر رنگ میں چوکھا پایا ۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہر چند رشید اور مرشد دونوں نے اپنے آپ کو ایک ایسے ادارے کی فلاح و بہبود کی (جو خود اپنی فلاح و بہبود نہیں چاہتا تھا) جد و جہد میں اس طرح کھپا دیا تھا کہ انھیں دم لینے کی بھی فرصت نہیں ملنی چاہیے تھی، مگر وہ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی طرح اتنا وقت نکال لیتے تھے کہ گھڑی بھر کے لیے روزمرہ کی مکروہات کو بھول کر دو چار احبابِ خاص کی بزمِ بے تکلف میں لطائف

ظرائف سے محظوظ ہو لیں ۔
اسی زمانے میں میرے ذہن میں یہ معمہ حل ہوا کہ رشید صاحب اور ذاکر صاحب کے درمیان اکثر نظریات و خیالات میں تخالف کے باوجود نہ صرف قلبی اتحاد، بلکہ عملی تعاون کیسی طرح ممکن ہوا خصوصاً جب کہ رشید صاحب آزادی سے پہلے کے علی گڑھ کو فردوس گمشدہ سمجھتے تھے، اور ذاکر صاحب کی رائے میں وہ جاگیرداری نظام کے ڈھلتے ہوئے سورج کی ۔

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

تو پھر آزادی کے بعد نئے علی گڑھ کی تشکیل و تعمیر میں دونوں مل کر کیسے کام کر سکے۔
مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کا راز یہ ہے کہ رشید صاحب اور ذاکر صاحب میں دو صفات کا اشتراک ان سارے اختلافات پر بھاری تھا جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے ۔ ان مشترک صفات کو ہم "دردِ دل" اور "رجائے مومن" کہہ سکتے ہیں ۔ مگر ان ترکیبوں کی کچھ تھوڑی سی تشریح کرنی پڑیگی ۔

"دردِ دل" عشقیہ شاعری میں اس کرب و الم کی کیفیت کا نام ہے، جو عاشق پر محبوب کے ہجر میں گزرتی ہے ۔ مگر متصوفانہ شاعری میں اس کا مفہوم ہے، وہ رقّتِ قلب، جس کی بدولت اہلِ دل نوعِ انسانی بلکہ کل مخلوقات و موجودات کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد محسوس کرتے ہیں ۔ ہمارے صوفی شعراء نے اس غم دوراں کو شرطِ انسانیت قرار دیا ہے ۔ یہ خیال ان کے کلام میں رچا اور بسا ہوا ہے۔ یہاں صرف دو تین مثالیں پیش کرنا کافی ہوگا:

چیست انسانی، تپیدن از غم ہمسایگاں
از سموم نجد، در باغ عدن پژمان شدن (حالی)

دردِ دل پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی، اور یہی انساں ہونا (چکبست)

اور خواجہ میر درد تو دردِ دل کو نوعِ انسانی کی تخلیق کا واحد مقصد بتاتے ہیں:
دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

اب رہی "رجاے مومن"! سو یہ کوئی مروجہ اصطلاح نہیں ہے، بلکہ ایک ترکیب ہے جو ادائے مطلب کے لیے میں نے گھڑ لی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ سچّے مومن کو بدتر سے بدتر حالات اور تاریک سے تاریک لمحات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ فرمانِ الٰہی ہے، جس پر سب مسلمان ایمان رکھتے ہیں اور ایک حد تک عمل بھی کرتے ہیں مگر کڑے امتحان کا وقت آ جائے، تو بہت کم اس میں پورے اُترتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد جو بات کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ رشید و مرشد میں یہ دونوں صفات بڑی حد تک مشترک تھیں اور ان میں مضبوط رشتۂ اتحاد کا کام دیتی تھیں۔ ذاکر صاحب کی ملک گیر بلکہ عالمگیر، ہمدردی اور غمخواری، حاجت روائی اور فیض رسانی تو چشمۂ آفتاب کی طرح روشن تھی اور سوائے شپّرہ چشم حاسدوں کے سارے زمانے کو نظر آتی تھی۔ مگر علی گڑھ برادری جو سارے برِّصغیر ہند میں اور بہت سے بیرونی ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے، جانتی اور مانتی ہے کہ رشید صاحب میں بھی یہ اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ہرچند ان کا دائرۂ عمل مقابلتاً محدود ہے، مگر امورِ خیر میں کمیّت کے فرق سے کیفیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح "رجاے مومن" کے معاملے میں بھی رشید و مرشد کو ایک دوسرے کا جواب سمجھنا چاہیے۔ کم سے کم میں نے دونوں میں سے کسی کو سخت سے سخت ذاتی ابتلا، یا قومی بحران کے موقع پر بھی مایوسی کے عالم میں نہیں پایا۔

اب یہ بات صاف ہو گئی ہوگی کہ علی گڑھ کے ماضی کے بارے میں شدید اختلاف کے باوجود ذاکر صاحب اور رشید صاحب اس کے حال سے یکساں فکرمند اور دلگیر تھے، مگر مستقبل سے قطعاً مایوس نہ تھے۔ مدعی لاکھ کہے

زمینِ شور سنبل برنیارد
بر و تخمِ عمل ضائع مگرداں

مگر "رجاے مومن" کا جو دونوں کے دلوں میں رچی اور بسی ہوئی تھی، یہ تقاضا تھا کہ خدا پر بھروسا رکھو، فطرتِ انسانی کی بنیادی اچھائی پر بھروسا رکھو، اور نہضت و ترقی کی ان

صلاحیتوں پر بھروسا رکھو، جو علی گڑھ کے اساتذہ اور طلباء میں بلکہ کل ہندستانی مسلمانوں میں بالقوۃ موجود ہیں۔ اور ذہنی سی کوشش کرتے رہو کہ یہ صلاحیتیں قوت سے فعل میں آجائیں۔

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس امر کی شہادت دیتا ہوں جس سے کم لوگ واقف ہیں، کہ ذاکر صاحب اس زمانے میں بھی جب وہ بہت سے مسلمانوں کی طعن و تشنیع کا نشانہ بنے ہوئے تھے، عام طور پر مسلمانوں اور خاص کر اپنے محبوب ادارے مسلم یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کے لیے ہر امکانی کوشش کرتے رہے اور ان کی شخصیت سر سید مرحوم کی طرح حالی کے اس شعر کی پوری مصداق تھی:

جور اخوان دیدن و در عشق اخوان زیستن
زخم پیکاں خوردن و مشتاق پیکاں زیستن

رہے رشید صاحب، تو ہر شخص جو آنکھیں رکھتا ہے، اور ان سے کام بھی لیتا ہے۔ دیکھ رہا ہے کہ وہ ضعف پیری کے باوجود ہمیشہ کی طرح اب بھی زبان و قلم سے علی گڑھ کی حمایت بزرگانہ تنقید اور اصلاح میں سرگرم ہیں اور یقین ہے کہ زندگی بھر رہیں گے۔ خدا ان کی عمر میں برکت دے!

آخر میں یہ بھی کہہ دوں کہ رشید و مرشد دونوں "درد دل" کی بدولت تقسیم ہند کے بعد درون قلب میں ملول و افسردہ رہے۔ مگر "رجائے مومن" کی برکت سے ان کی خلقی زندہ دلی کم و بیش بدستور قائم رہی، اور ان کی تحریر و تقریر میں عام طور پر لوگوں کو شگفتہ دلی اور خوش طبعی نظر آتی رہی۔ صرف معدودے چند جو گہری ادبی اور نفسیاتی بصیرت رکھتے ہیں، اس راز کو پا سکے کہ دونوں درد دل کے "شورش باطن کو" "رجائے مومن" کی قوت سے دباتے رہے ہیں۔ اور ان کا

دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

آلِ احمد سرور

رشید احمد صدّیقی

تاج محل کی شہرت اتنی ہے کہ اکثر پہلی دفعہ دیکھنے پر انسان کو کچھ مایوسی سی ہوتی ہے۔ آدمی جو خواب دیکھتا ہے، وہ حقیقت بن جائے تو اس کی طلسمی فضا کچھ مدّھم سی معلوم ہوتی ہے۔ یہی حال رشید صاحب کا ہے۔ جن لوگوں نے رشید صاحب کے مضامین مزے لے لے کر پڑھے ہیں اور "ارہر کا کھیت"، "گل منزل"، "شیطان کی آنت"، "پاسبان"، "مرشد" یا "مولانا سہیل" پر وجد کر چکے ہیں، ان کے ذہن میں رشید صاحب کی شخصیت کا جو نقش ہوتا ہے، وہ اصل سے بالکل مختلف ہے۔ آپ ایک باغ و بہار آدمی کی تلاش میں ہیں، اور آپ کو دوچار ہونا پڑتا ہے ایک خزاں رسیدہ ہستی سے۔ پطرس بخاری اور رشید صاحب کی شخصیت میں وہی فرق ہے جو ان کے فن میں ہے۔ بخاری ایک شوخ اور زندہ دل انسان ہیں، رشید صاحب ایک ناکام عاشق کی زندہ تصویر ہیں۔ بخاری کی شخصیت ایک پھلجھڑی کی طرح ہے، تھوڑی دیر کے لیے فضا رنگ و نور سے معمور ہو جاتی ہے، اور پھر وہی اندھیرا۔ رشید صاحب کی لو اتنی مدّھم ہے، کہ اس سے اوّل اول اندھیرے کا احساس کچھ بڑھ جاتا ہے، مگر رفتہ رفتہ ہم اندھیرے سے آنکھیں چار کر سکتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے ٹھیک کہا تھا کہ رشید صاحب صورت سے مزاح نگار تو نہیں البتہ مرثیہ گو معلوم ہوتے ہیں، مگر ان کی شخصیت کا

حسن اُن کے فن کی طرح کچھ ریاض چاہتا ہے ۔ وہ اپنی چنگاری کو چھپانے میں کامیاب ہیں ۔

رشید صاحب ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے ۔ وہ جونپور کے ایک قصبے "مریاہو" کے رہنے والے ہیں ۔ پورب دیس کے قصبے بڑے مردم خیز ہیں ۔ ان میں صدیوں تک قدیم علم وادب کی شمع روشن رہی ہے ۔ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی کے دیباچے میں بڑی تفصیل سے مشرقی اضلاع کے مذہبی وعلمی اداروں کا ذکر کیا ہے ، جو ایک محدود پیمانے پر، مگر مسلسل، علم کی لگن اور اخلاق وشرافت کے جوہر عام کرتے رہے۔ رشید صاحب کو اپنے گھریلو ماحول سے یہ سب کچھ ملا ۔ پھر قصباتی زندگی سے انھیں دیہاتی زبان ، وہاں کی فضا انسانیت کا ایک کھردرا ، مگر خاصا پایدار تصور ملا ۔ ہائی اسکول کے بعد وہ علی گڑھ آگئے ، مگر مالی حالات نے انھیں تعطیل میں کچہری کی کلرکی کرنے پر بھی مجبور کیا ۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وہ کالج کی تعلیم کے زمانے میں کبھی ڈیپوٹی سوسائٹی کے وفد کے ساتھ بڑے بڑے آدمیوں سے ملتے ، اور کبھی کچہریوں کی مصروف اور میلی فضا میں بدخط افسروں کے فیصلوں کی نقل کرتے ۔ رشید صاحب اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوئے ہیں ۔ انگریزی میں ایسے آدمی کو SELF MADE کہتے ہیں ۔ انھوں نے ہر قسم کے لوگوں کو دیکھا اور برتا ہے ۔ زندگی کے کتنے ہی نشیب وفراز ، دیوتاؤں کے کتنے ہی مٹی کے پاؤں اور پجاریوں میں دیوتاؤں کی کتنی ہی ادائیں پائی جاتی ہیں ۔ وہ اس زمانے میں علی گڑھ پہنچے ، جب علی گڑھ ایک طرف شائستگی اور علم طلبی کے لیے مشہور تھا ، اور دوسری طرف "بیروفا کی خانقاہ سے مجاہدوں کا لشکر برآمد ہونے والا تھا"۔ ۱۹۱۵ء میں مسٹر ٹول کالج کے پرنسپل تھے ۔ اس زمانے میں ترک، ہندستانی مسلمانوں کے ہیرو تھے اور رشید صاحب کے کئی ساتھیوں نے قومی زندگی میں اسی وقت سے حصّہ لینا شروع کردیا تھا ، مگر رشید صاحب نہ غازی بنے ، نہ شہید ہوئے ، وہ زندگی کے ایک خاموش تماشائی بنے رہے ۔ اور شاید اسی ذوقِ تماشاہی نے اُردو ادب کو

ایک صاحب طرز انشا پرداز، ایک نکتہ سنج ادیب، ایک اعلیٰ درجے کا مزاح نگار
اور طنز نگار دیا۔ زندگی کی بعض محرومیاں، ادب کی کامرانیاں بھی ہوتی ہیں۔
بی، اے کرنے کے بعد رشید صاحب نے علی گڑھ سے فارسی میں ایم، اے کیا۔ طالب علمی
کے دوران میں وہ یونین کے سکریٹری بھی رہے، اور اس زمانے میں انھوں نے مزاحیہ
مضامین بھی لکھنا شروع کیے۔ ان مضامین میں ولایت علی بمبوق کا ہلکا سا
پرتو ہے۔ مگر بہت جلد رشید صاحب نے اپنا ایک علٰحدہ رنگ قائم کر لیا۔ علی گڑھ
منتھلی کا، جو بعد میں علی گڑھ میگزین کہلایا) اس زمانے میں اُردو کے مؤقر رسالوں
میں شمار ہوتا تھا۔ رشید صاحب عرصے تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ انھیں ذاکر صاحب
(ڈاکٹر ذاکر حسین) مولانا سہیل (اقبال احمد) نور اللہ جیسے ممتاز ساتھی ملے، اور
اُردو ادب میں ایسے نثر نگار کم ہیں، جو زمانۂ طالب علمی ہی میں ادبی شہرت حاصل کر
چکے ہوں۔ ان میں رشید صاحب کا نام ممتاز ہے عظمت اللہ خاں اور سجاد
انصاری جو ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے، رشید صاحب کا جوہر پہلے پہچاننے
میں مشترک ہیں۔
۱۹۲۱ء میں علی گڑھ میں ایک بہت بڑا ذہنی سیلاب آیا۔ یہ سیلاب بہت سوں کو بہا
لے گیا اور اس کی موجوں نے ہماری ادبی اور علمی زندگی میں کتنے ہی طوفان پیدا کیے،
مگر رشید صاحب پر بظاہر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے قوم پر
اپنی زندگیاں قربان کر دیں، رشید صاحب نے انھیں بڑے احترام اور عزت کی نظر
سے دیکھا، مگر خود انھوں نے کوئی قربانی یا ایثار اس قسم کا کبھی نہیں کیا۔ وہ کبھی
ہیرو نہ بن سکے، نہ انھوں نے بڑے بڑے اصول اپنی زندگی میں بنائے۔ ایک جگہ
انھوں نے لکھا ہے کہ مخالف چاہے بقراط یا جالینوس ہی کیوں نہ ہو، انھوں نے
ووٹ ہمیشہ اپنے دوست کو دیا۔ انھوں نے اصول پرستی کے خطروں کو دیکھ لیا تھا،
انھیں خیالات یا تصورات سے زیادہ انسانوں سے دلچسپی رہی۔ ہاں انھوں نے ہر
تصور کی آب و تاب، اس کی گرمی اور روشنی، اس کی بلندی یا پستی کو دیکھنے کی کوشش

کی۔ انھیں ادب ایک "پناہ گاہ" کی شکل میں نظر آیا۔ سعدی اور حافظ، غالب اور اقبال، شبلی اور اکبر، گوئٹے اور ملٹن، برناڈشا اور وکٹر ہیوگو کی تصانیف سے انھوں نے انسانوں کے متعلق ایک بصیرت بھی حاصل کی اور انھیں ایک پاکیزہ ادبی ذوق بھی ملا۔ ان کے مضامین اسی وجہ سے مسرت اور بصیرت کے خزانے ہیں۔

رشید صاحب اس زمانے میں علی گڑھ پہنچے تھے، جب وہاں کی اقامتی زندگی بڑی رنگینی اور کشش رکھتی تھی۔ وہ اس کے جادو کا شکار ہو گئے۔ یہ ان کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی، کہ اس کے بعد کوئی اور حسن ان کی نظر میں نہ جچا۔ رشید صاحب نہ مصلح ہیں نہ امیرِ قوم، وہ صرف معلم بھی نہیں ہیں۔ وہ دراصل ایک عاشق ہیں۔ انھوں نے ایک فرد سے نہیں، بلکہ ایک ادارے اور ایک انجمن سے عشق کیا ہے؛ اور اسی انجمن کو خلاصۂ کائنات سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ رشید صاحب علی گڑھ سے باہر نہ گئے ہوں۔ انھوں نے پہاڑوں کی سیر بھی کی ہے، اور ہندستان کے میدانوں کی بھی۔ وہ برما تک ہو آئے ہیں اور میراان کا جنوبی ہند کے ایک سفر میں بھی ساتھ رہا۔ مگر دراصل ہر جگہ وہ اپنی علی گڑھ والی عینک پہنے رہے۔ وہ نہ کسی انسان کے پیچھے چلتے ہیں، نہ کسی تصور کے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص یا خیال کسی نہ کسی طرح ان کے حرم میں داخل ہو ہی جائے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ ایک مضبوط چٹان کی طرح ہیں، جس میں جلال بھی ہے اور جمود بھی۔ ان کے خیالات میں کوئی بڑا انقلاب نہ ملیگا۔ ہاں ایک مدھم سا ارتقا ضرور ہے۔ ان کی شرافت نے انھیں بعض اہلِ غرض کا شکار بھی بنایا۔ انھوں نے دوستی کو ایک فنِ لطیف بنا دیا ہے۔ انھیں دوسرے کی مطلب پرستی سے سروکار نہیں، اپنی دوستی سے غرض ہے۔ وہ اپنی ہر ضرورت کو دوستوں کی معمولی سی مصلحت پر قربان کر سکتے ہیں۔ وہ کسی سے کچھ مانگتے نہیں، اسے بہت کچھ دینے کو تیار رہتے ہیں۔ مشرقیت، شرافت، معقولیت، انسانیت کو انھوں نے جس طرح زندگی میں برت کر دکھایا

ہے، کم کسی نے دکھایا ہوگا۔ گو وہ اس راز سے بےخبر ہیں کہ یہ چیزیں بھی مطلق نہیں، اضافی ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں مشرقیت بعض اوقات قدامت پرستی کی شکل میں، شرافت کمزوری کے روپ میں، معقولیت مصلحت کے قالب میں اور انسانیت سستی روداداری کے لباس میں بھی نظر آتی ہے۔ اسی لیے ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی عزت اور محبت کیے بغیر چارہ نہیں۔

رشید صاحب ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں شروع شروع میں صرف بی، اے میں لازمی اردو تھی۔ رشید صاحب کو طالبعلمی میں ٹینس کا شوق تھا۔ اس شوق کو وہ درد گردہ کی وجہ سے جاری نہ رکھ سکے۔ ان کا کھیل سیلم کی سلامت روی اور مستقل مزاجی کا مظہر تھا۔ لازمی بی، اے کا کورس کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس لیے ایک عرصے تک رشید صاحب آب حیات اور دیوان غالب اور جدید شعرا کے کچھ انتخابات پڑھاتے رہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کو یہ گوارا نہ تھا کہ اردو میں کوئی فیل ہو۔ اردو تو ان کے لیے ایک NECESSARY EVIL سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۳۲ء سے ایف، اے اور بی، اے میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو شروع ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں وہ اردو کے ریڈر ہوئے۔ ان کا انتخاب علامہ اقبال نے کیا تھا۔ پھر وہ پروفیسر بنا دیے گئے۔ علی گڑھ میں اردو کی تدریس کی اہمیت صحیح معنی میں ذاکر صاحب کے دور سے شروع ہوئی۔

رشید صاحب کی جوانی درد گردہ کے پیہم حملوں میں گزری۔ ان کی شادی ۱۹۲۳ء میں ہو گئی تھی۔ ۱۹۳۰ء تک گردہ کی تکلیف نے انھیں بہت پریشان کیا۔ ڈاکٹر بھاٹیا نے بالآخر ایک کامیاب آپریشن کر کے ایک گردے کو بالکل "آں جہانی" کر دیا۔ ان کا مضمون "شیطان کی آنت" اسی ظلمات کا آب حیات ہے۔ رشید صاحب نے عشق کیا یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ ان کے اعصاب پر عورت سوار نہیں ہے، مگر وہ اس معاملے میں میر کے اس مسلک پر عامل رہے ہیں۔

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

رشید صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں ۔ اُردو اور فارسی کے کلاسیکی سرمایے پر ان کی گہری نظر ہے ۔ انھوں نے انگریزی ادب کے شاہکاروں کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے، بلکہ ان سے اثر بھی قبول کیا ہے ۔ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں، اور بڑی جلدی بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں ۔ مگر وہ کتابوں کے کیڑے نہیں ہیں ۔ ان کے پاس ہر سال بہت سی کتابیں آتی ہیں، مگر رہتی نہیں ؛ دوست احباب لے جاتے ہیں ۔ باقاعدہ مطالعے کے وہ عادی نہیں ۔ انھوں نے گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے کہ انھیں مہدی افادی کی "نازنینانِ حرم" سے دل بہلانے کا موقع ہی نہیں ملتا ۔ مگر وہ کسی بھی اہم مضمون یا کتاب کا تذکرہ سنتے ہیں تو اُسے غور سے پڑھتے ہیں ۔ اور پھر ان کی رائے تقلیدی نہیں، بلکہ اوریجنل ہوتی ہے ۔ ان کا ادبی ذوق پاکیزہ ہوتے ہوئے قدرے پرانا ہے ۔ اور گو نئے خیالات سے انھیں خدا واسطے کا بیر تو نہیں، مگر وہ اس نئے پن کو پوری طرح ہضم نہیں کر پاتے ۔ وہ اسالیبِ فن میں رچاؤ اور زبان میں پختگی اور ہمواری ڈھونڈتے ہیں ۔ وہ ادب کے ایک اخلاقی تصور کو مانتے ہیں ۔ اس کی مقصدیت پر بھی انھیں اعتراض نہیں ہے، مگر وہ بے محابا تجلّی کے بجائے حجاب اور جلوے کے بجائے نقاب کے زیادہ قائل ہیں ۔ غزل کو وہ "اُردو شاعری کی آبرو" سمجھتے ہیں ۔ مگر اس میں ہماری بے آبروئی کا جو سامان ہے، اس سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے ۔ وہ اچھی نظم پر وجد بھی کرتے ہیں، مگر جو "ابتہاج و اہتزاز" (یہ انہی کے الفاظ ہیں) انھیں غزل کے اشعار سے ملتا ہے، وہ نظم سے نہیں ۔ غالب کے اشعار سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے ۔ یہ غالب کی عظمت کی دلیل ہو یا نہ ہو، رشید صاحب کے عرفان کا ثبوت ضرور ہے ۔ جدید دور میں اچھے شعر کا برمحل استعمال یا اس کے چراغ سے چراغ جلانا کم ہو گیا ہے ۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی نظر ہمارے کلاسیکی سرمایے پر اتنی گہری نہیں رہی ہے ۔ رشید صاحب ان لوگوں میں سے تو نہیں ہیں، جو شعر پڑھیں اور جان بحق تسلیم ہو جائیں ۔ انھوں

نے بار بار اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ بعض اوقات پڑھنے میں شعر کو نثر بنا دیتے ہیں، اور اچھا خاصا موزوں شعر ناموزوں معلوم ہونے لگتا ہے۔ مگر وہ شعر کے جادو سے واقف ہیں اور اس کا جادو جگانے میں بھی کامیاب ہیں۔ وہ غالب، اقبال، حسرت، اصغر اور جگر کے بڑے قائل ہیں۔

رشید صاحب کے مضامین میں ترتیب و تنظیم کی کمی کا متعدد اشخاص نے ذکر کیا ہے۔ یہ بات ان کی زندگی میں بھی ہے۔ وہ اپنی صبح کا مصرف جانتے ہیں کیونکہ اس وقت وہ اپنے گھر کے باغ کی دیکھ بھال میں مصروف ہوتے ہیں، انھیں گلاب سے عشق ہے۔ مگر ان کی شامیں اکثر دوستوں کے مجمعوں یا برج کی میز کی نذر ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی صلاحیت کو دوستوں کی فرمائشوں پر بھی برباد کیا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے پروپیگنڈے، الیکشن کے لیے مینی فیسٹو، یونیورسٹی کے معزز مہمانوں کے لیے سپاسنامے، سبھی کچھ لکھتے رہے، مگر انھوں نے روزمرہ کی زندگی کو اتنا دلچسپ، اتنا نشہ آور، اتنا پُرسحر اور پُرکیف پایا ہے، کہ ادب کا جادو بھی انھیں پوری طرح اپنا اسیر نہ کرسکا۔ وہ کسی کتاب کو پڑھتے ہیں تو اس کے خیالات سے مستفید ہونے کے لیے اتنا نہیں، جتنا اپنے خیالات کو تب و تاب دینے کے لیے۔ دوسروں کی چنگاری صرف ان کی چنگاری کو ہوا دیتی ہے۔ مگر مضامین میں ترتیب و تنظیم کی بظاہر جو کمی ہے، اس کا ایک جواز بھی ہے۔ اس کی ایک اور تنظیم ہے، جو عام ترتیب سے زیادہ آزاد اور بے پروا، مگر اپنی جگہ پر پُر اثر اور کارآمد ہے۔ یعنی رشید صاحب کی زندگی ایک کتاب سے دوسری کتاب تک نہیں ہے، بلکہ یہ کتابیں ان کی شخصیت کے سمندر کا ایک جھین ہے۔ رشید صاحب کی کوئی کتاب باقاعدہ تحقیق یا تلاش کا نتیجہ نہیں ہے۔ لیکن ان کی ہر کتاب میں بڑے پتے کی باتیں ملتی ہیں۔ "طنزیات و مضحکات" ایک طرح آبِ حیات کی یاد دلاتی ہے۔ آبِ حیات کی ہر بات غلط ثابت ہوسکتی ہے مگر آبِ حیات سے کوئی اردو کا طالب علم بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح طنز و ظرافت کے موضوع پر اس سرسری نظر میں بھی ایسے گہرے

اور بصیرت افروز تاثرات ملتے ہیں کہ ان کی اہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ یہی حال "زبان اُردو پر ایک نظر" کا ہے، جو دراصل ان کے ایک لیکچر کا عنوان ہے۔ اس میں اُردو زبان کی تاریخ نہیں ہے، لیکن اس کے مزاج کا ایک حیرت انگیز احساس ہے۔ وہ بعض چونکانے والے فقرے لکھتے ہیں جن میں حقیقت کچھ سمٹ کر محدود ہو جاتی ہے مثلاً "حالی ماضی کے، اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے شاعر ہیں" یا مثلاً ان کا یہ جملہ کہ "کوئی شاعر بڑا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ معقول آدمی نہ ہو"۔ مگر ان میں حقیقت کی جو کرن ہے، وہ بھی کم نظر فریب نہیں ہے۔

رشید صاحب نے یوں تو تنقیدی مضامین میں بھی بڑی خیال انگیز باتیں کہی ہیں، مگر دراصل وہ ایک مزاح نگار، طنز نگار اور انشا پرداز کی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے غالب، اقبال، اکبر، عبدالرحمٰن بجنوری، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں وزن سے زیادہ وقار ہے۔ مگر یہ وقار یونہی نہیں آیا ہے۔ اس میں زندگی اور ادب کا قدرے پرانا سہی، مگر پھر بھی ایک سنجیدہ اور پاکیزہ شعور ملتا ہے۔ وہ بہت سے اچھے پہلوؤں پر نظر نہیں کر پاتے، مگر جن پہلوؤں پر اُن کی نظر ہے، وہ پہلو سطحی اور سستے نہیں، قابلِ قدر بلکہ قابلِ غور ہیں۔ وہ بہت سے قیمتی تجربات کو نہیں پرکھ پاتے، مگر انھوں نے کسی گھٹیا یا معنوی یا نمائشی پہلو کی کبھی داد نہیں دی۔ ان کی تنقیدیں ڈاکٹر جانسن کی یاد دلاتی ہیں۔ یا تو یہ تاثرات ہیں، یا فیصلے، مگر ان کے پیچھے ایک رچا ہوا اور پختہ شعور ضرور ملتا ہے۔

مگر رشید صاحب کا بڑا کارنامہ مضامینِ رشید، خنداں، گنج ہائے گرانمایہ اور ذاکر صاحب ہم نفسانِ رفتہ ہیں۔ پہلی دو کتابیں ان کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ مؤخر الذکر تینوں کتابوں میں شخصیتوں کے مرقعے ہیں۔ گنج ہائے گرانمایہ اور ہم نفسانِ رفتہ اشخاص کا تذکرہ ہیں، جو اپنی ارتحال کے باوجود زندہ اور روشن ہیں۔ اور ذاکر صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین کی پُرسوز اور دلربا شخصیت کا خاکہ ہے۔ رشید صاحب کے طنز و مزاح پر اظہارِ خیال کا یہ

موقع نہیں، اور نہ چند سطروں میں اس کے ساتھ انصاف ہو سکتا ہے، مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ صرف "خوانِ مسرت" نہیں سامانِ بصیرت بھی ہے۔ یہ ہنسی کا پشتارہ نہیں ہے تبسم کا خزانہ ہے۔ رشید صاحب ہنسی ہنسی میں نہ صرف بہت کچھ کہہ جاتے ہیں، بلکہ سوچنے کے لیے بھی بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ رعایت لفظی سے بڑا کام لیتے ہیں۔ ان کے فقروں میں صوتی حسن بھی ہے اور موسیقی بھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے انسان کی زندگی کے نشیب و فراز پر لطیف تبصرے ہیں۔ ان میں کتنے ہی انسانوں کی کمزوریوں کا حسن، اور کتنے ہی معمولی آدمیوں کی بڑی اور قابلِ قدر باتیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ وہ قصّے بھی سناتے ہیں، قولِ محال سے بھی کام لیتے ہیں، جاندار اور خیال انگیز تشبیہات کے چمن بھی آراستہ کرتے ہیں؛ اور اپنے تخیل کی مدد سے زندگی کے گزرتے ہوئے لمحات کو ایک ابدی روشنی اور ایک سدا بہار رنگینی بخش دیتے ہیں۔ مگر زندگی کی وہ قدریں جن پر ان کا ایمان ہے، گنج ہائے گرانمایہ میں اشاروں کے بجائے داستان بن کر آئی ہیں۔ ان کی اشارہ داری کا حسن جو ظرافت کی چاشنی کی وجہ سے مزاحیہ مضامین میں بعض اوقات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ گنج ہائے گرانمایہ میں اپنے بزرگوں اور دوستوں کی یاد کے سہارے نکھر کر ایک اور آب و تاب سے آیا ہے۔ محمد علی، اقبال اور اصغر پر ان کے جو مضامین ہیں ان کی خوبی میں کلام نہیں، مگر اس مجموعے کی جان مولانا سلیمان اشرف اور آلِ یوب مرحوم ہیں۔ یہاں سرِّ دلبراں حدیثِ دیگراں سے پھوٹ نکلتا ہے۔ مولانا سلیمان اشرف کی شخصیت میں علم کی زیبائی شان ہے۔ مگر آلِ یوب میں خدمت کا حسن ہے۔ رشید صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ جلال و جمال دونوں کو دیکھ سکتے ہیں، اور دکھا سکتے ہیں۔

ذاکر صاحب پر رشید صاحب کی چھوٹی سی کتاب ممدوح کی شخصیت کی جامع تصویر نہیں ہے، مگر پھر بھی بڑی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس میں اقبال کے "مردِ مومن" کا سا جادو ہے اور ان کے ایک شعر

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

کی تفسیر ملتی ہے۔ پھر بھی یہ ایک عاشق کا کارنامہ ہو، ایک عارف کا نہیں۔
رشید صاحب کی باتیں بڑی پُرلطف ہوتی ہیں، مگر ہر ایک کے لیے نہیں ہوتیں۔
میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے، جنھیں اپنی طلاقت لسانی پر بڑا ناز ہے۔ ایسے
لوگوں کے یہاں ایک پوز (POSE) ضرور ہوتا ہے جو رشید صاحب کے یہاں نہیں
ہے۔ وہ شرمیلے آدمی ہیں۔ مجمعوں سے گھبراتے ہیں۔ مداحوں سے دور بھاگتے ہیں۔
دنیاداری سے انھیں نفرت ہے، مگر بے تکلف دوستوں کے مجمعوں میں وہ ایک بلبل
ہزار داستان ہیں۔ اس "پیمانہ و صہبا" کے بغیر وہ گل افشانی گفتار پر آمادہ نہیں
ہوتے۔ مگر ان کی باتوں سے زیادہ ان کے خط دلچسپ ہوتے ہیں۔ اکبر سے وہ بہت
متاثر ہیں، اور اکبر کی طرح انھیں بھی بہت سی مصلحتوں کا خیال رہتا ہے۔ مگر وہ
اپنے دوستوں کو جو خط لکھتے ہیں، ان میں بے تکلف مختلف اشخاص یا واقعات پر
بڑے پُرلطف تبصرے کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کا سب سے
بھرپور اظہار نہ ان کے مزاحیہ مضامین میں ہے، نہ قلمی مرقعوں میں، نہ تنقیدوں
میں، نہ دوسرے مضامین میں، بلکہ ان کے خطوں میں ہے۔ اصغر مرحوم نے ان کے
وہ سب خط محفوظ کر رکھے تھے، جو ان کو لکھے گئے تھے۔ مگر رشید صاحب نے
ان کے مرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہ خط ان کی بیوی سے لے کر جلا دیے۔
وہ ادب کے تقاضوں سے زیادہ زندگی کی مجبوریوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ میرے پاس
ان کے کئی سو خط ہونگے، اور میں ان کو شائع کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں، مگر
ابھی تک سب سے بڑا مرحلہ رشید صاحب کی منظوری کا ہے۔ انھوں نے خود کسی
جگہ لکھا ہے۔ "خطوط سے میں نے بڑے بڑے کام نکالے ہیں، روٹھے ہوئے دوستوں
کو راضی کرنے میں، ڈیولی سوسائٹی کے لیے۔ چندے حاصل کرنے میں، کسی عالم کی
وفات کے بعد اس کے ورثا کے لیے مالی دشواریوں کو دور کرنے میں، اپنا غم غلط
کرنے کے لیے، دوستوں کے رنج و راحت میں شریک ہونے کے لیے اور مذہب،
سیاست، جنس، عورت اور عطریات، ڈاکٹر ضیاالدین اور مولانا عبدالماجد

کانگریس اور مسلم لیگ، ہندستان اور پاکستان، گھریلو زندگی کے قہر و مہر اور احباب کے جلسوں کے لطف و انبساط، ان سب بولتے ہوئے طرح کے مصرعوں پر رشید صاحب نے ایسے ایسے شعر کہے ہیں کہ جب وہ شائع ہونگے، تو غالب کے بعد ہمارے خطوط کے سرمایے میں سب سے بڑا اضافہ ہونگے۔

رشید صاحب کو قابل دید مقامات سے کوئی دلچسپی نہیں، سفر میں وہ ضروری کام کر کے پہلی گاڑی سے گھر واپس آجاتے ہیں۔ وہ نئے واقعات کے ہیجان کے مقابلے میں مانوس واقعتوں کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے دو محبوب مشغلے ہیں: ایک برج کھیلنا، دوسرے خریداری کرنا۔ ان دونوں چیزوں میں وہ فن برائے فن کے قائل ہیں، یعنی خریداری میں چھوٹی موٹی چیزیں خریدنا اور برج میں مسلسل ہارنا، ان کے لیے یکساں نشاط کا باعث ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ نہ اچھا برج کھیلتے ہیں، اور نہ خریداری میں ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کے لیے نفع بخش نہیں، موجب نشاط ہیں۔ وہ دعوتیں کرنے کے بڑے شائق ہیں۔ ان کی بیوی بڑا اچھا کھانا پکاتی ہیں اور وہ بڑے لطف سے دوستوں کو کھلاتے ہیں۔ اپنے لباس کے معاملے میں بہت لاپروا ہیں، مگر جامہ زیب اور خوش پوش اشخاص کو دیکھ کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ کسی اچھے آدمی سے ملتے ہیں یا کوئی خوشی کی بات سنتے ہیں، تو دوستوں کو ضرور اس خوشی میں شریک کر لیتے ہیں، مگر اپنی تکلیف اور دکھ کا بار خود ہی مردانہ وار اٹھا لیتے ہیں، دوسروں کو یہاں تک کہ بیوی بچوں کو بھی اس میں شریک کرنا پسند نہیں کرتے۔ وہ سب کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں، مگر کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتے۔

ایک دفعہ وہ اور میں نواب چھتاری کے مہمان تھے۔ نواب صاحب اس زمانے میں حیدرآباد کے صدر اعظم تھے۔ حیدرآباد میں ایک اردو کانفرنس تھی۔ ہم لوگ شاہ منزل میں ٹھہرائے گئے۔ ہر طرف آداب، تسلیمات، سکریٹری، کلرک، چپراسی ہر اشارے پر موجود۔ نواب صاحب بہت مہربان۔ دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ ایک دن صبح کو ناشتے کے بعد میں کچھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ رشید صاحب بھی چپ تھے۔

کچھ دیر کے بعد پوچھنے لگے "بھئی یہ آج آپ مہاتما بدھ کی طرح سوچ میں کیوں
بیٹھے ہیں؟" میں نے کہا: "سوچ رہا ہوں بڑے پھنسے ہیں۔ ہم لوگ ٹھہرے چھ چھ
پیسے والے آدمی، مگر اب تو شوکیس میں سجا دیے گئے ہیں۔ چھ پیسے والے مال کو
ڈپازٹ والٹ میں رکھ دیا جائے تو کیا ہو؟" رشید صاحب کے چہرے پر جیسے نور دوڑ
گیا۔ کہنے لگے "میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا۔ مگر حبس دم کیے ہوئے تھا۔ دیکھ رہا تھا،
پہلے کون ہار مانتا ہے۔" اور اس کے بعد ہم لوگ جلسے سے جلد وہاں سے بھاگے اور مجھ سے
زیادہ رشید صاحب خوش تھے۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر شوفر کو ٹپ کر کے ہم لوگوں
نے ٹی اسٹال پر دو آنے پیالی والی چائے پی ——۔ مونگ پھلی والے سے مونگ پھلی
خریدی۔ میں نے اخبار لیا۔ رشید صاحب نے اپنا بیگ کھول کر پاندان نکالا۔
پان بنایا اور پیک کو منہ میں تول کر بولے: "سرور صاحب اب جان میں جان آئی
ہے۔ یہ سرکاری درباری لوگ، نہ جانے کیسے اس قدر باقاعدہ اور مہذب زندگی
بسر کر لیتے ہیں؟" میں نے کہا: "رشید صاحب، برنارڈ شا نے کہا ہے؟" بات کاٹ کر
بولے: "دیکھیے حضرت، یہ شکسپیر یا شا کی بات اب علی گڑھ تک نہ ہوگی"
میں نے کہا: "اچھا اقبال کے اشعار پڑھنے کی تو اجازت ہے؟" کہنے لگے "ہاں،
اس میں مضائقہ نہیں۔"

ایک دفعہ ہم دونوں نے جنوبی ہند پر پہلا اور غالباً آخری حملہ کیا، یعنی میسور گئے۔
دہلی سے ساتھ سفر طے ہوا تھا۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ میں نے لکھا کہ یونیورسٹی والے
ہوائی جہاز کا کرایہ دینے پر رضامند ہیں، کیوں نہ ہم لوگ ہوائی جہاز سے چلیں۔ اس
لو میں مرنے سے بچ جائیں گے۔ رشید صاحب کا جواب آیا کہ "ہوائی جہاز سے سفر نہیں
ہوگا۔ سکنڈ کلاس میں چلیں گے۔ ہو سکا تو میسور سے ساڑی اور وہاں کی مصنوعات
خریدیں گے، اور کچھ بچا لائیں گے۔ آج کل فضول خرچی قومی جرم ہے۔" غرض میں لو میں
مرنے کے لیے راضی ہو گیا کہ رشید صاحب ٹھکانے سے دفن کرا دیں گے اور پھر عمر بھر کے لیے
بال بچوں کے خرچ کے کفیل بھی ہو جائیں گے۔ دہلی صبح پہنچا۔ دوپہر کو چلچلاتی دھوپ

میں رشید صاحب آئے۔ شام کو ساڑھے چار بجے جب ٹمپریچر کم از کم ۱۱۵ درجہ ہوگا، ہم لوگ گرینڈ ٹرنک ایکسپریس میں بیٹھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ سکنڈ کلاس کے ٹکٹ نہ مل سکے تھے، اس لیے فرسٹ کلاس کا سفر تھا۔ رشید صاحب کے ساتھ ناشتے کا بہت سا سامان تھا اور پانوں سے بھرا ہوا پاندان تھا۔ میرے ساتھ صرف ایک صراحی تھی۔ راستہ باوجود گرمی کے بڑے لطف سے کٹا۔ میں نے مدراس سے گھر خیریت کا تار دیا۔ رشید صاحب نے بھی میری ضد میں تار دیا۔ بنگلور پہنچے، تو بڑا حسین موسم تھا۔ ہلکی ہلکی بارش، لطیف خنکی اور بڑا ڈھلا منجھا شہر۔ یونیورسٹی پہنچے، اردو کے پروفیسر کے تقرر کا مسئلہ تھا۔ رشید صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ "حضرت! امیدواروں سے سوالات وغیرہ آپ ہی کیجیے گا۔ آپ کے فیصلے کی میں تائید کروں گا۔" بنگلور سے فارغ ہو کر ہم لوگ ایک شاگرد کے ہمراہ میسور گئے۔ مجھے ٹیپو کے مزار اور دریائے کاویری کے دیکھنے کا اشتیاق تھا، وندراون کے باغ کی سیر کا بھی ارمان تھا۔ شاگرد نے ازراہِ عقیدت میسور کے سب سے اچھے ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ وہاں کے ٹھاٹھ دیکھ کر ہم لوگ چوبیس گھنٹے میں گھبرا گئے۔ آخر اپنے شاگرد کے ایک دوست کے یہاں ٹھہرے۔ یہ بڑے اچھے ذوق کے آدمی ہیں اور میسور کے سربرآوردہ مسلمانوں میں سے ہیں۔ انگریزی اور اردو ادب دونوں سے گہرا شغف ہے، رشید صاحب کے اسلوبِ بیان کے دلدادہ اور ان کے غائبانہ عاشق۔ ان کے اصرار پر ہم لوگ اوٹی چلے۔ رشید صاحب بڑی مشکل سے راضی ہوئے تھے۔ حسبِ عادت جلد سے جلد گھر جانا چاہتے تھے۔ طے ہوا کہ اس پروگرام میں صرف دو دن خرچ ہوں گے۔ مگر چار دن لگ گئے، ——— اوٹی پہنچے تو رشید صاحب عورتوں کی طرح خفا ہو گئے۔ اب نہ بات کرتے ہیں، نہ کمرے سے نکلتے ہیں۔ خفگی یہ تھی، کہ میں نے کیوں سیر ڈال دی اور کیوں یہ پروگرام گڑبڑا گیا۔ میں نے کہا "رشید صاحب، اتنی دور آکر بھی جنوبی ہند کے نظارے سے محروم رہ جانا، بدمذاقی ہے، اور ایسے اچھے میزبانوں اور ساتھیوں کی موجودگی میں منہ پھلا کر بیٹھ جانا آپ کو

ہرگز زیب نہیں دیتا"۔ خیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ دوسرے دن ہی واپس ہونگے۔ میسور پہنچے تو خریداری شروع کی۔ واپسی میں مدراس پر حساب لگایا، تو معلوم ہوا، کہ تقریباً پانچ سو روپے کرایے کے ملے تھے۔ رشید صاحب سوا پانچ سو خرچ کر چکے تھے، اور میرے پاس پچاس ساٹھ بچ رہے تھے۔

رشید صاحب لڑنے والے آدمی نہیں ؛ کوئی زیادتی کرے، تو کڑھتے ہیں، جھگڑتے نہیں۔ اصولی بات ہو رہی ہو، تو وہ مصلحت اور عافیت کا سہارا لیتے ہیں۔ علی گڑھ میں ایک چھوٹا سا معرکہ مجھے یاد ہے۔ میری سفارش پر سجاد انصاری کی کتاب "محشرِ خیال" ایم۔ اے کے نصاب میں داخل کی گئی تھی۔ سجاد انصاری کی انشاپردازی کے رشید صاحب بھی قائل تھے۔ نصاب پر اتفاق سے مولانا عبد الماجد دریابادی کی نظر پڑ گئی، جنھیں ہر "رعنائیِ خیال" کو گناہ ٹھہرانے میں ذرا بھی پیش و پس نہیں ہوتا۔ انھوں نے رشید صاحب کو خط لکھا، کہ "یہ کتاب جس میں خدا اور مذہب سے شوخیاں ہیں، ہرگز مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں نہ رکھنی چاہیے"۔ رشید صاحب نے مولانا کا خط مجھے دکھادیا اور خاموش ہو رہے۔ مولانا نے پھر "صدق" میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ ہم لوگ پی گئے۔ آخر انھوں نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا۔ مولانا صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شیروانی دینیات کی فیکلٹی کے ڈین تھے۔ یوں بھی یونیورسٹی میں ان کا بڑا اثر اور رسوخ تھا۔ انھوں نے مولانا عبد الماجد کی تحریک پر وائس چانسلر ابو بکر احمد حلیم صاحب کو ضابطے کا خط لکھا اور اس کتاب کے خارج کیے جانے پر زور دیا۔ حلیم صاحب نے شعبۂ اردو کا جلسہ بلایا اور یہ مشورہ دیا کہ کتاب نصاب سے خارج کر دی جائے، میں نے احتجاج کیا کہ شعبہ صرف ادبی اہمیت کو دیکھتا ہے۔ اگر مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے نصاب کی کوئی کتاب خارج کرنی ہے، تو اکیڈمک کونسل کو کرنا چاہیے۔ نصاب میں اہم اور نمایندہ اسالیب اور پہلو لیے جاتے ہیں ؛ ان کے پڑھانے اور اور ماننے میں فرق ہے۔ فلسفے اور سیاست کے نصاب میں بھی ہم مفکر اور مصنّف

کے نظریات پڑھاتے ہیں۔ یہ آزادیٔ فکر یونیورسٹی کی خصوصیت ہے۔ اس لیے شعبہ اس کتاب کو خارج نہیں کر سکتا۔ خلافِ توقع رشید صاحب نے فوراً سپر ڈال دی۔ کہنے لگے "سرور صاحب! جب کتاب رکھ نہیں سکتے، تو پھر جانے دیجیے!" میں نے کہا: "حضرت! یہ لوگ ہم سے کیوں نکلوانا چاہتے ہیں۔ خود یہ جرأت کیوں نہیں کرتے کہ اپنے مصالح کی بنا پر اگزیکٹو کونسل میں قرارداد پاس کریں"۔ مگر رشید صاحب نہ مانے، مجھے ہی ماننا پڑا۔

رشید صاحب یوں تو اصولوں کے چکّر میں نہیں پڑتے، مگر جہاں شعبے کی عزّت کا سوال آتا ہے، وہاں وہ ضرور سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدّین نے نظام حیدرآباد کو علی گڑھ بلایا۔ ایڈریس لکھنے کی خدمت رشید صاحب کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب نے بڑے چاؤ سے ایڈریس لکھا، اور مجھے بھی سنایا۔ میں نے کہا "دیکھ لیجیے گا پسند نہ آئیگا۔ بولے "کیوں؟" میں نے کہا: "اس میں خوشامد کم ہے، ادبی رنگ زیادہ؛ ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں نہ آئیگا"۔ یہی ہوا ــــ ایڈریس سن کر کہنے لگے: "کچھ جچا نہیں، پھر کوشش کیجیے"۔ رشید صاحب نے نظرِ ثانی کی اور پھر پیش کیا۔ رشید صاحب نے لکھا تھا: "مغلوں کے عہد نے ہندستان کو تین تحفے دیے: تاج محل، غالب اور دولتِ آصفیہ"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "نظام حیدرآباد کے سلسلے میں تاج محل کے ذکر کا کیا موقع ہے؟"۔ غرض کئی دفعہ ایڈریس میں کاٹ چھانٹ ہوئی اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کے حواریوں کی جبین پر شکن سی رہی۔ آخر رشید صاحب نے کہا کہ "مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی اور سے لکھوا لیجیے"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بہت چراغ پا ہوئے، اور رشید صاحب کی غیبت میں کہنے لگے کہ "اگر ایسے شعبے کے لوگ ایک ایڈریس نہیں لکھ سکتے، تو شعبے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" جب رشید صاحب نے یہ سنا، تو کمال کر دیا۔ ایک صاحب کو لے کر ڈاکٹر صاحب سے دریافت کرنے گئے کہ "میں نے یہ الفاظ سنے ہیں، کیا آپ نے کہے تھے؟" ڈاکٹر صاحب نہ معلوم کس عالم میں تھے۔ انھوں نے پھر خفگی ظاہر کی، اور اقرار کیا۔ اس پر رشید صاحب کہنے لگے کہ "آپ

مجھے جو چاہیں، کہ لیں، لیکن شعبے کے متعلق اس قسم کے الفاظ میں نہیں سُن سکتا۔" اس کے بعد سے آخر تک رشید صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو معاف نہ کیا۔ عرصے تک تو بات ہی نہ ہوتی تھی، پھر رسمی مراسم ہو گئے تھے، مگر دل صاف نہ ہوتا تھا نہ ہوا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے بھی ایک دفعہ نہ معلوم، کس ترنگ میں علی گڑھ کے شعبۂ اردو پر سخت اعتراضات کیے۔ رشید صاحب، مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مگر شعبے پر بےموقع اعتراضات سے انھیں بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے مولوی صاحب سے بات چیت ترک کر دی۔ مولوی صاحب کو لوگوں نے بھڑکا یا تھا، وہ خواہ مخواہ رشید صاحب سے بدظن ہو گئے تھے۔ میں نے مولوی صاحب کو بہت سمجھایا، مگر وہ نہ مانے۔ وہ خفا ہو جاتے، تو پھر منتے نہیں تھے۔ رشید صاحب کچھ عرصے تک رنجیدہ رہے، مگر تقسیم کے بعد پھر انھوں نے مولوی صاحب کو لکھا کہ آپ چاہیں، تو انجمن کا دفتر علی گڑھ لے آئیں۔ مولوی صاحب علی گڑھ آئے، جلسہ ہوا۔ نواب اسمٰعیل خاں صاحب خود اس کے حق میں نہ تھے۔ غرض فیصلہ علی گڑھ کے لیے نہ ہوا، مگر رشید صاحب نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ بزرگوں کی عزت اور ان کی خدمت کرنا کوئی رشید صاحب سے سیکھے!

رشید صاحب کو جلسوں، کانفرنسوں، مشاعروں سے کبھی بالکل دلچسپی نہیں۔ اگر گرفتار ہو جائیں تو اس طرح پھڑپھڑاتے اور مضطرب ہوتے ہیں جیسے کوئی طائر دام میں پھنس گیا ہو۔ جلسے کے وقت پہنچتے ہیں، اور پہلی گاڑی سے بھاگ نکلتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ جس جلسے کا انھوں نے افتتاح کیا، اس کے صدر کی تقریر بھی سننے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ انھیں خود اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلے میں کوئی مشاعرہ، یا ادبی صحبت منعقد کرنی پڑتی، تو اور بات ہے، ویسے وہ ان چیزوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ میں نے کبھی رشید صاحب کو بلند آواز سے داد دیتے، یا شعر پر وجد کرتے نہیں دیکھا۔ ہاں اچھّے شعر سے ان کے چہرے پر ایک انبساط ضرور کھیلنے لگتا ہے۔ شعر انھیں یاد نہیں رہتے۔ اچھا شعر ہو، تو بھی بہت ہے کہ انھیں شعر کا کوئی لفظ یا اس کی کوئی ترکیب یاد رہ گئی، ورنہ ایسے ویسے شعر سے تو وہ بالا بالا ہی گزر جاتے ہیں۔ انھیں مطالعے کا شوق ضرور

ہو، اور کسی کتاب یا مصنّف کی تعریف کی جائے" تو اس سے آشنا ہونا چاہتے ہیں، مگر مصنّف کے خیالات سے مستفید ہونے کے بجائے اس کی چنگاری سے اپنا چراغ جلاتے ہیں۔ وہ تصوّرات سے زیادہ تصویروں کو، اصولوں سے زیادہ آدمیوں کو، اور علم سے زیادہ عمل کو دیکھتے ہیں۔ وہ جس سے جھلا جائیں یا چڑ جائیں اس کا کام ضرور کر دیتے ہیں، گو اسے کبھی معاف نہیں کرتے۔ وہ ضرورتمندکی بڑی مدد کرتے ہیں، اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ اچھے خاصے کھاتے پیتے آدمیوں نے ان کو اپنی فرضی ضروریات ظاہر کر کے بیوقوف بنایا ہے، مگر وہ مدد کر کے کسی شکریے یا احسانمندی کے منتظر نہیں رہتے؛ وہ نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کے قائل ہیں۔

رشید صاحب سے زیادہ طلبا کے ہمدرد کم نکلیں گے۔ وہ اچھے طلبا کی بڑی ہمّت افزائی کرتے ہیں۔ وہ ذوق و شوق دیکھتے ہیں، نظریے یا نصب العین سے سروکار نہیں رکھتے، مگر وہ طلبا کی مقبولیّت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک دفعہ ہم لوگ علی گڑھ کی نمائش میں گھوم رہے تھے، خبر ملی کہ طلبا اور پولیس میں جھگڑا ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے طلبا کا ایک ہجوم جمع ہو گیا، اور پولیس کی چوکی کی طرف بڑھنے لگا۔ پہلے تو میں نے بھی طلبا کو روکنے کی کوشش کی، مگر جب دیکھا کہ وہ اس وقت جوش میں ہیں اور کسی کی نہیں سنیں گے، تو میں الگ کھڑا ہو گیا۔ مگر رشید صاحب نہ مانے؛ وہ ہجوم میں گھس گئے اور انھیں آگے بڑھنے سے روکنے لگے۔ کچھ لڑکے خاموش ہو گئے، مگر کچھ زور زور سے ان سے بحث کرنے لگے۔ اتنے میں رشید صاحب کو کسی نے ایک دھکّا بھی دے دیا، جو یقیناً غیر ارادی تھا، مگر وہ باز نہ آئے؛ آخر میں انھیں نکال کر لایا۔ راستے میں جب میں نے ان سے کہا کہ "کیوں، شہادت کے لیے کمر بستہ ہو رہے تھے؟ فنکار تو آپ کے نزدیک تماشائی ہوتا ہے، وہ معرکے میں حصّہ نہیں لیتا۔" کہنے لگے "فنکار کو گولی مارئیے، میں معلّم بھی تو ہوں۔ طلبا کو حماقت کرنے سے کیسے نہ روکوں؟" میں نے کہا "اس کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے، وہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ یا پھر آپ کی آواز کسی سارجنٹ میجر کی سی ہونی چاہیے، جس سے آپ محروم ہیں۔" رشید صاحب کا غصّہ اُتر گیا۔ کہنے لگے "کبھی کبھی رباب کے بغیر بھی گانا پڑتا ہے۔ علی گڑھ کی خاطر سب کچھ گوارا ہے۔"

رشید صاحب کی کچھ ادائیں بڑی عجیب ہیں۔ مثلاً انھیں اس میں تامّل ہے کہ عورتیں مردوں

سے زیادہ ذہین بھی ہوسکتی ہیں۔ ان کا عورت کا تصور رکھید" خاتونِ مشرق" کا سا ہے۔ آنچل پرچم بھی بن سکتا ہے، یہ رشید صاحب مشکل سے مانینگے۔ انھیں ہر اچھے شخص یا کام میں علی گڑھ کا فیضان ضرور نظر آتا ہے، گو وہاں دور دور تک اس قسم کا کوئی اثر نہ ہو۔ اس معاملے میں وہ "ہمہ اوست" نہ سہی تو "ہمہ از دست" پر ضرور ایمان رکھتے ہیں۔ وہ مرنے والوں کی نکتہ چینی کو برا سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے، جب عصمت چغتائی کا مضمون "دوزخی" شائع ہوا تو میں نے بڑی تعریف کے ساتھ، وہ رشید صاحب کر پڑھنے کے لیے دیا۔ رشید صاحب کو مضمون مطلق پسند نہ آیا۔ کہنے لگے کہ "یہ کیسی بہن ہے، جو مرحوم بھائی کے متعلق اس طرح لکھی ہے؟" میں نے کہا: "یہ اس فنکار کے قلم کا اعجاز ہے جو بہن ہونے کے ساتھ ساتھ بے لاگ مصور اور بے جھجک نقاد بھی ہے۔" میں بحث کرتا رہا، مگر رشید صاحب کو قائل نہ کرسکا۔ ڈاکٹر ضیا الدین مرحوم سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سوانح عمری "ضیائے حیات" کے نام سے شائع ہوئی۔ میں نے اس پر "اردو ادب" میں خاصی تفصیل سے ریویو کیا اور ڈاکٹر صاحب کی اسٹر اور کارناموں پر بھی تنقیدی نظر ڈالی۔ رشید صاحب نے ریویو کی بڑی تعریف کی، مگر اس کے لب و لہجے کو اس لیے کہیں کہیں نامناسب قرار دیا کہ مرنے کے بعد نکتہ چینی ختم ہو جانی چاہیے۔ اب اس کو کیا کیا جائے کہ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ کسی شخص پر سچی تنقید اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ انتقال کر چکا ہو یعنی اس کی شخصیت کا رنگین نقاب نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔

رشید صاحب سے میں نے "اردو ادب" کے لیے ایک مضمون کی فرمایش کی۔ جواب آیا کہ جس رسالے کا ایڈیٹر پورے رسالے کے مضامین اپنے قلم سے لکھ سکتا ہو، اُسے فرمایش کرنے کا کیا حق ہے؟ میں نے انھیں غیرت دلائی، خوشامد کی، دھمکیاں دیں، لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ ان کا ایک غیر مطبوعہ مضمون میرے پاس نکل آیا۔ غیر مطبوعہ اس لیے کہ یہ جگر صاحب کے نئے مجموعۂ کلام کے دیباچے کے طور پر لکھا گیا تھا۔ جگر صاحب کا نیا مجموعہ "آتشِ گل" ان کے لاابالی پن کی وجہ سے اب تک نہیں نکل سکا تھا، اس کی نقل تو نہ ملی، ان کے مضمون کی نقل مل گئی۔ میری شرافت دیکھیے کہ میں نے انھیں اطلاع دے دی کہ وہ مضمون بقول کسے

"شائع ہونے جارہا ہے۔" دوسرے دن ایس، او' ایس آیا کہ مضمون نظرِ ثانی کے لیے بھیج
دیا جائے۔ میں نے بھیج دیا۔ رسید آئی، اور یہ مژدۂ جانفزا کہ تین چار دن میں ٹھیک ٹھاک
کر کے بھیج دونگا۔ میں منتظر رہا۔ کچھ دن بعد اطلاع ملی کہ وہ مضمون کہیں کا کہیں ہو گیا، اب
عنقریب روانہ کیا جائیگا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ مضمون مل ہی جائیگا۔ مگر دو تین دن کے
بعد اطلاع ملی، کہ وہ ایک دوسرے پرچے کو دے دیا گیا ہے۔ میں نے بہت بُرا مانا اور بڑی
سخت شکایت کی جواب ندارد۔ اس عرصے میں عشرۂ محرم بھی آیا اور گزر گیا۔ چند دن
اور گزرنے کے بعد میں نے پھر اپنی آزردگی ظاہر کی۔ جواب ملا، کہ "محرم ختم ہو گیا۔ اب
ماتم موقوف کیجیے۔" خط پڑھ کر ہنسی آگئی، اور میں نے صدقِ دل سے رشید صاحب کو معاف
کر دیا۔

ایک دفعہ اُردو کے سلسلے میں سمپورنانند جی سے ملنا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب وفد کے صدر تھے۔
یادداشت پہلے سے بھجوا دی گئی تھی۔ ہم لوگ پہنچے تو وزیرِ تعلیم بظاہر اخلاق، مگر درحقیقت رُکھائی
سے پیش آئے۔ کہنے لگے کہ "یادداشت میں نے دیکھ لی ہے۔ کچھ اور کہنا ہو، تو فرمائیے۔" ڈاکٹر
صاحب نے ہم لوگوں کی طرف دیکھا۔ میں نے دو چار باتیں کیں، پھر ڈاکٹر علیم نے مصرع
اٹھایا۔ مگر فضا کچھ ایسی سرد تھی، کہ بات کرنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ غرض مشکل سے دس
منٹ کی سرسری سی بات چیت کے بعد ہم لوگ واپس ہوئے۔ مجھے سب سے زیادہ قلق اس بات
کا تھا، کہ وزیر موصوف نے ڈاکٹر صاحب جیسے مستند ماہرِ تعلیم کی بھی قرار واقعی تواضع نہیں
کی، اور بہت رسمی لہجہ رہا۔ گھر آ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے رشید صاحب کو ایک لمبا
خط لکھا، جس میں اہلِ علم کی ناقدری اور اربابِ سیاست کی فرعونیت کا ذکر تھا۔ رشید
صاحب نے پنسل سے جواب لکھا، جس کا ایک جملہ مجھے اب تک یاد ہے: "سرور صاحب!
میں سمپورنانند کی بےحسی کو کیا دیکھوں، مجھے تو گاندھی جی کی دردمندی اور دلنوازی یاد
ہے۔" میں رشید صاحب سے متفق نہ ہو سکا، مگر اس جذبے کا احترام کیسے نہ کرتا؟
ابھی حال کا واقعہ ہے کہ رشید صاحب نے مجھ سے کچھ پھولوں کے پودے لکھنؤ سے بھجوانے
کی فرمائش کی۔ میں نے لکھا کہ "میں گلرخوں کی یاد سے فرصت پاؤں، تو پھولوں کی طرف بھی

توجّہ کردں “ رشید صاحب نے فوراً اپنی فرمائش واپس لے لی اور اس رعایتِ لفظی کی خوب داد دی۔ اچھے فقرے کا اثر رشید صاحب پر اچھے شعر کی طرح ہوتا ہے۔

رشید صاحب بڑے شریف آدمی ہیں اور ان میں شرافت کی سادہ کمزوریاں بھی ہیں۔ وہ سادہ لوح نہیں، دوسروں کی شرافت سے بقدرِ ضرورت فائدہ اٹھانا بھی جانتے ہیں۔ وہ تصوّرات کے نہیں، تصویروں کے، نظریات کے نہیں، نظر کے قائل ہیں۔ وہ کارناموں سے آدمیوں کو نہیں، آدمیوں سے کارناموں کو پرکھتے ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی لگن، جذبہ اور جوش دیکھتے ہیں، تو اس کا احترام کرتے ہیں۔ وہ بیسویں صدی کے آغاز کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جو بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت، دونوں کو جزوِ ایمان جانتی تھی۔ وہ مذہبی قدروں سے زیادہ اخلاقی قدروں کے قائل ہیں۔ ان کا صحیفۂ اخلاق اس شعوری دَور کے لیے قدرے پرانا ہے، مگر پھر بھی لائقِ توجہ ہے۔ انتہا پسندی کے اس زمانے میں وہ لبرل، معتدل اور مرنجاں مرنج ہیں۔ وہ خود سرپھرے نہیں، مگر سرپھروں سے انھیں شغف ضرور ہے۔ وہ خاصے جذباتی ہیں، مگر جذباتیت کے شکار نہیں۔ جن لوگوں کو ان سے قریب رہنے کا موقع ملا ہے، وہ ان کو ہمیشہ یاد رکھنے پر مجبور رہیں۔ ان سے میں نے اکثر اختلاف کیا ہے، مگر اس کے باوجود میں ان کے لیے اپنے اندر احترام اور محبّت کا ملا جلا جذبہ پاتا ہوں۔ وہ قائد نہیں ہو سکتے، مگر بڑے اچھے رفیق ہیں۔ ان کی تصانیف میں افکار سے زیادہ ”شخصیت“ کا حسن ہے۔ انھوں نے علم و ادب کو ایک عاشق کی طرح چاہا ہے۔ وہ اس ذہنی کرب سے دوچار نہیں ہو سکے، جو اس نسل کی کمزوری بھی ہے اور طاقت بھی؛ مگر انھوں نے ہمیں جو مسرّت و بصیرت عطا کی ہے، اس کی وجہ سے زندگی کچھ اور گوارا، پُرکیف اور پُرمعنی ہو جاتی ہے۔ وہ گلاب کے پھول اور عطرِ حنا کی طرح ہماری تہذیب اور اس کی رنگینی و رعنائی کی ایک علامت ہیں۔ ان کے بہت سے خیالات سے لوگ بڑی جلدی ان کی طرف سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ کمیونزم اور ترقی پسندی یا مغرب اور جدیدیت سے انھیں کوئی چڑ نہیں، بلکہ وہ بہرو مان یا ہر فیشن پر اس لیے ہنس سکتے ہیں کہ ان کی تیز نظر

اس کے مضحکہ خیز پہلو دیکھ سکتی ہیں۔ انھوں نے آئی۔سی۔ایس یا مولوی کسی کا کبھی رعب نہیں مانا اور ہر قسم کی ذہنی غلامی کا پردہ فاش کیا۔ وہ ہر لیڈر کی کمزوری اور ہر بلندی کی پستی دیکھ لیتے ہیں۔ اُردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے ایک رشید صدیقی بھی پیدا کیا ہے، جس میں سودا کا سا تخیل، اکبر کی سی صنعت لفظی اور غالب کی سی نکتہ سنجی اور شوخی ہے۔ انھوں نے ظرافت کو ادب بنانے میں حصّہ لیا ہے اور ادب کو مشرقیت کی بعض صالح قدروں کا ترجمان بنایا ہے، اور "بقائے دوام" کے دربار میں ان کی جگہ محفوظ ہو۔

علی گڑھ سر سیّد کے خواب کی تعبیر رہے، پوری یا ادھوری، اس بحث کو فی الحال جہاں کا تہاں رہنے دیجیے۔ یہاں ذاکر صاحب کی پُر سوز شخصیت کی وجہ سے علم و عمل کی ایک نئی جنگاری ہے۔ یونیورسٹی کے بعد یہاں کے تالے، یہاں کا مکھن، یہاں کے بسکٹ اور یہاں کی گرد مشہور ہے۔ لیکن علی گڑھ کے اس عجائب خانے میں ایک اور قابل دید شخصیت رشید احمد صدیقی کی بھی ہے کیوں کہ ان سے مل کر اقبال کا خضر راہ یاد آتا ہے:۔

جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

خلیق انجم

رشید احمد صدیقی

داعیِ اسلام کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر اور مرعوب کر رکھا ہے، وہ میری ایک کمزوری ہے۔ یعنی میں کبھی اس کی ہمت نہیں کر سکتا کہ میری پرائیویٹ زندگی کی تمام جزئیات منظرِ عام پر آئیں، یا لائی جائیں۔ رسالت مآب کا ضبط و ظرف دیکھیے کہ مقرب ترین اصحاب، حتیٰ کہ ازواج مطہرات، کو اس امر کی ہدایت تھی کہ روحی فداک کی زندگی کے ہر جزو فعل تک کی خبر دوسروں تک پہنچائیں، اور یہ اس لیے کہ وہ اسوۂ حسنہ تھے۔ اس محکِ آتشین پر آزمائے جانے کے لیے کون آمادہ ہے؟

(رشید احمد صدیقی)

رشید صاحب کو جب پہلی بار میں نے دیکھا ہے، تو وہ خاصے بجھ چکے تھے۔ یوں تو بچپن ہی سے روگی تھے، لیکن اب صحت بالکل جواب دے چکی تھی۔ ذنگا رنگ بزم آرائیاں طاق نسیاں اور محبان عزیز "گنجہائے گرانمایہ" بن چکے تھے۔

رشید صاحب سے ہماری پہلی ملاقات کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ میں نے اور ڈاکٹر اسلم پرویز نے جب علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا، تو ہمیں سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ رشید احمد صدیقی سے ملاقات ہوگی۔ رشید صاحب کا غائبانہ

تعارف ہمارے ایک استاد رہبر پرتاپ گڑھی صاحب نے کرایا تھا جو رشید صاحب کے عاشق تھے۔ رہبر صاحب ہی کے توسط سے ہم رشید صاحب کے بیشتر مضامین اور گنجہائے گرانمایہ کے تمام خاکے پڑھ چکے تھے۔ ہمیں ان کے بیشتر طنزیہ اور مزاحیہ فقرے ازبر یاد تھے۔ علیگڑھ پہنچے، تو دو تین دن داخلہ میں لگ گئے۔ فارغ ہوتے ہی پہلا خیال رشید صاحب کا آیا۔ خلیل الرحمن صاحب اعظمی ان دنوں ممتاز ہوسٹل ہی میں تھے۔ ان سے اچانک ایک دن ملاقات ہوگئی۔ ہم نے پہلا سوال یہی کیا کہ رشید صاحب سے کہاں اور کیسے ملاقات ہوگی؟ وہ رشید صاحب کے پرانے شاگرد اور رمز شناس تھے، کہنے لگے، یونیورسٹی کھلنے پر شعبۂ اردو میں۔

گھر پر؟

سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اچھا آپ اُن کے گھر کا پتہ بتا دیجیے۔ ہم قسمت آزمائی تو کرلیں۔

خلیل صاحب نے ہمیں بہت سمجھانے کی کوشش کی، لیکن بالآخر ہماری ضد کے سامنے سپر ڈال دی۔ دوسرے ہی دن ہم اور اسلم پرویز، رشید صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ دروازے پر دستک دی، نوکر آیا۔ اس کے تیور نوکر کے کم اور تھانیدار کے زیادہ تھے۔ اُس نے پورا دروازہ نہیں کھولا۔ بس صرف اتنی جھری کھولی کہ گفتگو ہو سکے۔ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی رہی۔ وہ ایک لفظ نہیں بولا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ ہمارے ارادوں سے بخوبی واقف ہو۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ ہم کس انداز سے حملہ کرینگے۔ نیم باز دروازے اور نوکر کے چہرے کی خود اعتمادی نے ہمارے سارے ہتھیار چھین لیے تھے۔ اپنی مکمل شکست کے یقین کے باوجود ہم نے حملہ کر ہی دیا۔

رشید صاحب ہیں گھر پر؟

اس نے گردن ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

"کب آئینگے؟

اُس نے دروازے کی جھری میں سے سیدھا ہاتھ نکال کر پانچوں انگلیوں کو مخصوص انداز میں

گھمایا۔ جس کا مطلب تھا کہ اسے کیا معلوم! اس سے پہلے کہ ہم کوئی اور حملہ کرتے، اس نے دروازہ بند کردیا۔ نوکر کے اس رویّے سے ذلت کا اتنا شدید احساس ہوا کہ غالب کا وہ مشہور مصرع "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" تک یاد نہیں آیا۔ شام کو جب خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا: مل آئے رشید صاحب سے؟ تو جی چاہا کہ ان سے گلے لگ کر رونے لگیں۔

دو چار دن بعد جب یونیورسٹی کھلی، تو رشید صاحب سے ملاقات کی تمنّا پھر جوان ہوگئی۔ اب حالات سازگار تھے یعنی شعبے میں ملاقات ممکن تھی۔ ایک دن اس نیّت سے ہم اُردو ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ لکڑی کے پارٹیشن کے پیچھے ایک کونے میں رکھی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز کچھ پڑھنے میں مصروف ہیں ——— سفید شیروانی، علیگڑھ کٹ پاجامہ، سر پر رامپوری ٹوپی۔ سنہری فریم کی گول شیشوں والی عینک۔

انھوں نے گردن اٹھا کر ہمیں ایک نظر دیکھا، اور پھر مطالعے میں مصروف ہوگئے۔

عرض کیا: "رشید صاحب سے ملنا ہے"

"فرمائیے"

پھر عرض کیا "رشید صاحب سے ملنا ہے"

"جی، میں ہوں۔ کیا کام ہے؟"

ان الفاظ سے ہماری کیفیت اُس شکاری کی سی ہوگئی، جو جنگل میں چہل قدمی کر رہا ہو، اور اچانک شیر سامنے سے آجائے۔ اس سے پہلے کہ ہم خود پر قابو پائیں، رشید صاحب نے پھر وہی سوال دہرایا: "فرمائیے، کیا کام ہے؟"

"جی! آپ سے ملاقات کو حاضر ہوئے تھے"

"تو کر لیجیے" (رشید صاحب کے اس جواب کا لطف ہم نے بہت بعد میں اٹھایا) کسی اتنے بڑے ادیب سے ملاقات کا پہلا اتفاق تھا اور وہ بھی بغیر وساطت کے۔ "تو کر لیجیے" کے بعد سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ملاقات کیسے کی جائے۔ چند لمحوں کے لیے خاموشی طاری

ہوگئی۔ اور پھر رشید صاحب نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا۔
میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا! "کرسیاں کھینچ لیجیے۔ تشریف رکھیے۔" ہم دونوں کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔
پھر خاموشی۔
"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"
"جی، دہلی سے"
"کس کلاس میں داخلہ لیا ہے؟"
"جی! انٹرمیجٹ میں۔
"آپ لوگ دہلی کے رہنے والے ہیں، یا پنجاب کے؟"
ہمارے لیے یہ سوال بہت عجیب تھا۔ عرض کیا: "جی، خاص دلّی کے (اس دفعہ ہم نے دہلی کو دلّی کہہ کر دکھایا)۔ فرمایا: تو پھر آپ "جی" کا اتنا استعمال کیوں کرتے ہیں؟
ہم نے کہا: "جی، بس یونہی"
یہ بات بہت دن بعد سمجھ میں آئی کہ دلّی والے "جی" کا استعمال فقرے سے پہلے اور پنجاب والے فقرے کے بعد کرتے ہیں
"اچھا، اب کلاس میں ملاقات ہوگی۔"
لیجیے، ملاقات ختم، ہمارے ذہنوں میں رشید صاحب کی جو تصویر تھی، وہ تو اس سے بالکل مختلف نکلے۔ ہمارا خیال تھا کہ تحریروں کی طرح گفتگو میں بھی ان کی ہر بات میں بات ہوگی۔ وہ ایسے ہنس مکھ انسان ہونگے جن کی گل افشانی گفتار سے محفلیں زعفران زار ہونگی۔ لیکن وہ تو اس کے بالکل برعکس نکلے۔ رشید صاحب کو خانقاہ کے پاسبان کے ہاتھوں، وہ اذیت ناک تجربہ نہیں ہو رہا تھا، جو ہمیں آج شعبۂ اُردو میں ہوا۔ ہم آداب کر کے "اچھے دا" کرتے ہوئے شعبۂ اُردو سے باہر آگئے۔ آج کی اس مختصر اور بدمزہ ملاقات نے ہمیں رشید صاحب سے بالکل بددل کر دیا۔ بلکہ ہم علیگڑھ اور سرسیّد تک سے بددل ہوگئے۔ ان دونوں کے بارے میں تو ہمارے ذہن میں کچھ اس طرح کے خیالات آتے کہ ان کے اظہار سے

اندلشۂ جلسۂ و جلوس و فساد ہے ۔

اس مختصر سی ملاقات سے جو بد دلی پیدا ہوئی تھی ، وہ کافی دن میں گئی ؛ اور اس میں رشید صاحب کی نہیں، خود ہماری کوششوں کو دخل تھا۔ ہم نے علیگڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی کو ان رشید احمد صدیقی سے جُدا کرلیا ، جو مضامینِ رشید، خندا ں اور گنجہائے گرانمایہ کے مصنّف تھے ۔

رشید صاحب نے اپنے چاروں طرف ایک حصار بنا رکھا تھا ، جس میں بہت کم خوش نصیبوں کو داخل ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہو۔ دو سال ان کے شاگرد رہنے کے باوجود میں اس سعادت سے محروم رہا۔ بدنصیبی سے میرے ان کے تعلقات بہت عجیب رہے ۔ ایک شاگرد کی حیثیت سے انھیں کبھی متاثر نہیں کرسکا۔ ایک استاد کی حیثیت سے وہ مجھے متاثر نہیں کرسکے اس میں ان کی کم گوئی اور کم آمیزی کے ساتھ ساتھ شاید مردم شناسی کو بھی دخل ہو۔ اس سب کے باوجود میں ہمیشہ اپنے خیالوں کے رشید احمد صدیقی کا پرستار رہا ۔ آج جن رشید صاحب کے بارے میں کچھ عرض کر رہا ہوں انھیں میں نے اپنی آنکھوں سے بہت کم ، ان خوش نصیبوں کی آنکھوں سے زیادہ دیکھا ہے ، جنھیں اس محفل میں بار حاصل رہا ۔

رشید صاحب کی اسّی سال کی طویل عمر کے مقابلے میں ان کے دوستوں کی تعداد بہت مختصر ہے ۔ وہ غیر معمولی طور پر کم آمیز ہیں ۔ بڑی مشکل سے کسی کو اپنا دوست بناتے ہیں۔ لیکن اگر ایک بار وہ کسی کے دوست ہوگئے ، تو پھر اپنا سب کچھ اس پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں ۔ دوستی کے بارے میں ان کے بعض فقرے تو ضرب المثل بن چکے ہیں ۔ مثلاً "مخالف چاہے بقراط یا جالینوس ہی کیوں نہ ہو ووٹ میں اپنے دوست ہی کو دونگا" یا "میرے دوست کے مقابلے میں اگر حضرت جبرئیل بھی آسمان سے اُتر کر آئیں ، تو میں دوست ہی کی حمایت کرونگا"۔

دوست سے وفاداری کا تصوّر جاگیر دارانہ کی صالح اور ارفع اقدار میں سے ہے ۔ اور رشید صاحب ساری زندگی اسی قدر کو سینے سے لگائے رہے ۔ دوست کی دوستی سے کام، اس کے افعال سے کیا کام ! کہا جاتا ہے کہ وہ دوستوں کی تمام خامیوں کو نظر انداز

کردیتے ہیں۔ ان کے خاکے پڑھنے والے یہ الزام لگا سکتے ہیں کہ رشید صاحب اپنے دوستوں کی خوبیوں کے قصیدے پڑھتے ہیں، اور ان کے عیب دانستہ چھپاجاتے ہیں۔ لیکن رشید صاحب کو قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان کی نظر دوست کے عیب پر کبھی پڑتی ہی نہیں۔

دوستوں کی بات تو چھوڑیے، وہ تو اپنے دشمنوں کی بھی کبھی بُرائی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی نے انھیں لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ اگر کبھی کسی سے آزردہ ہوئے، تو انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں اس سے سامنا نہ ہوجائے۔ ہر اُس جگہ جانے سے گریز کرتے ہیں، جہاں اس شخص سے ملنے کا امکان ہو۔ اگر کسی سے ناراض ہوں، اور وہ کوئی کام لے کر آجائے، تو دنیا کا ہر کام چھوڑ کر پہلے اس کا کام کرینگے۔ اسے وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ جس شخص سے تعلقات میں کشیدگی آجائے، اس کے بارے میں کوئی رائے دینے سے ہر ممکن گریز کرینگے۔ کسی شخص سے ان کی ناراضی کی یہ انتہا ہے کہ رشید صاحب یہ کہنے پر مجبور ہوجائیں کہ "فلاں صاحب، بس یونہی ہیں۔"

بہت کم لوگ ہونگے جنھوں نے دوسروں کی خاطر رشید صاحب کی طرح اتنی تکلیفیں اٹھائی ہوں۔ گھر کا کوئی فرد ہو، رشتہ دار، دوست یا شاگرد ــــــ رشید صاحب سب کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات صاحب معاملہ سے زیادہ پریشانی کا بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ کبھی کسی اَور کو اپنے غم اور دکھ درد میں شریک نہیں کرینگے۔ ۱۹۵۹ء میں جب ان کی جوان جہان لڑکی کا انتقال ہوا، تو کافی عرصے تک انھوں نے خود کو کمرے میں بند رکھا۔ لوگ تعزیت کرنے آئے اور گھر کے دوسرے افراد سے مل کر چلے گئے۔ مگر رشید صاحب باہر نہیں آئے۔ جب اس سانحے کا اثر کچھ ہلکا ہوا، تو انھوں نے لوگوں سے پھر ملنا شروع کیا۔

رشید صاحب مہمانوں کے آنے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اس لیے عام طور پر ان کا

گھر مہمان سرائے بنا رہتا اور بعض اوقات تو مہمانوں کی اکثریت گھر والوں کو اقلیت میں بدل دیتی۔ ان مہمانوں میں رشتے دار بھی ہوتے اور دوست بھی۔ کبھی کبھی کوئی مہمان ایسا بھی ستم کر جاتا کہ سارے گھر والے تڑپ کر رہ جاتے۔ اس ستم میں خود رشید صاحب کی بھی سازش ہوتی، اگر کوئی مہمان کسی چیز کی تعریف کر دیتا، تو فوراً اس کا حق ملکیت اس کے نام منتقل کر دیا جاتا۔ رشید صاحب کی ایک کمزوری خرید و فروخت بھی رہی ہے۔ کسی زمانے میں انھیں نئی نئی چیزیں خریدنے کا بہت شوق تھا۔ اس سے بھی بڑی کمزوری اپنی پسند کی داد حاصل کرنا تھی۔ مہمان کو چیز دکھائی جاتی، اس سے داد حاصل کی جاتی، اور پھر وہ چیز اس کے سامان میں باندھ دی جاتی اور بچے منہ دیکھتے رہ جاتے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ ہے، جو غالباً رشید صاحب کے تمام بچوں کے ذہن پر نقش ہے۔

ریڈیو ابھی علیگڈھ میں عام نہیں ہوئے تھے، سارے شہر میں تین چار سے زیادہ سیٹ نہیں ہونگے۔ رشید صاحب بھی ایک ریڈیو خرید لائے۔ ابھی بمشکل دو تین دن ہوئے تھے کہ ایک مہمان آ ٹپکے۔ ریڈیو کی مدح میں قصیدہ پڑھا گیا، اور ریڈیو ان کے حوالے ہو گیا۔ بیوی بچوں کے دل پر جو گزری، وہ گزری، لیکن رشید صاحب کے چہرے پر مسرت و انبساط کے وہ آثار تھے، جو کسی انتہائی مشکل مقصد میں کامیاب ہونے والے کے چہرے پر ہوتے ہیں۔

ان مہمانوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح کے مہمانوں کی آمد سے رشید صاحب کی عید ہو جاتی تھی۔ رشید صاحب کو کھانے پینے کا ہمیشہ سے شوق رہا۔ مہمانوں کے آنے سے تو گویا اچھے کھانے اور پکانے کا موقع (اور جواز) ہاتھ آ جاتا۔ خوب دعوتیں ہوتیں۔ رات گئے تک ادبی محفلیں اور مشاعرے جمتے۔ دیکھنے والے اور سننے والے کہتے ہیں کہ ان موقعوں پر رشید صاحب بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے تھے۔ جب تک ڈاکٹر نے انھیں نمک تک کھانے سے منع نہیں کر دیا، ان دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان دعوتوں اور

محفلوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں کبھی حکّام نہیں بلائے جاتے تھے اور کبھی کسی بدذوق کو مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔

بیوی بچّوں کے ساتھ رشید صاحب کا وہی روّیہ ہے جو دوستوں کے ساتھ ہے۔ انھیں اچھے سے اچھا کھلایا، اچھے سے اچھا پہنایا۔ اعلیٰ التعلیم دلائی۔ غرض ایک انتہائی ذمّے دار باپ اپنی اولاد کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے، وہ رشید صاحب نے کیا۔ لیکن خود پوری زندگی انتہائی سادگی سے گزار دی۔ بچّوں کی تربیت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ بچوں پر چیخ پکار کی بجائے ہمیشہ طنز و مزاح سے اس طرح کام لیا کہ بچّے کی اصلاح بھی ہو گئی، اور گھر کا ماحول بھی خراب نہیں ہوا۔ اگر کسی بچّے سے ناراض ہوئے تو لفظ "بیٹا" یا "بیٹی" کو اس طرح چبا کر اور کھینچ کر ادا کرتے کہ مخاطب ان کی ناراضی سے واقف ہو جاتا۔ اپنے کام کے لیے کبھی کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا، اپنا سارا کام خود کرتے رہے۔ ہر روز اپنا بستر خود ٹھیک کرتے، مچّھر دانی لگاتے، میز صاف کرتے، اور حد تو یہ ہے کہ اپنے کمرے میں جھاڑو بھی خود دیتے۔ تولیہ اور پلنگ کی چادر ہمیشہ صاف رکھتے۔ نوکروں کو بھی گھر کے افراد شمار کرتے۔ کبھی کسی نے انھیں نوکر پر ناراض ہوتے نہیں دیکھا۔ اگر کوئی خلاف مرضی کام کرتا، تو اس کی سطح کے طنز و مزاح سے کام لیتے۔ شعبۂ اُردو کے چپراسی تک رشید صاحب کے اس روّیے کی وجہ سے خود کو صدرِ شعبہ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

رشید صاحب کی شرافت اور انسان دوستی کی تعریف دوست احباب تو خیر کرتے ہی، خود اُن کے رشتے دار تک کرتے ہیں۔ اور یہ مرتبہ وہ ہے، جو بعض پیغمبروں تک کو نہیں ملا۔

رشید صاحب کی جن خصوصیات نے مجھے غیر معمولی طور سے متاثر کیا ہے، ان میں ان کی مذہبی رواداری اور وسیع المشربی بھی ہے۔ رشید صاحب نے بچپن کے ایک برہمن استاد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اتنے ہی کٹّر برہمن تھے، جتنے شریف النفس

اور دردمند انسان"۔ خود رشید صاحب کی زندگی بھی اس قول کی مکمل آئینہ دار
ہے۔ وہ عقیدے کے راسخ مسلمان ہیں، مسلمانوں کے دکھ درد سے تڑپ اٹھتے ہیں،
لیکن دوسرے مذاہب کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ بچپن کا وہ ماحول ہے
جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا۔ قاعدۂ بغدادی، کلامِ پاک،
تختی لکھنے کی اور فارسی اور عربی کی تعلیم انھوں نے گھر ہی پر مولویوں سے حاصل کی۔
اسکول جانا شروع کیا، تو ماحول بالکل مختلف تھا۔ ہندو بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔
ماسٹر صاحب ملے، تو ایسے کہ بقول رشید صاحب "کوئی کلاس ہو، وہ پڑھتے تھے بڑے
زور زور سے صرف راماین"، علاقے میں طاعون پھیلتا، تو یہ اسکول ایک مندر
میں منتقل ہو جاتا، جہاں طرح طرح کی چھوٹی بڑی مورتیاں جابجا رکھی ہوئی تھیں۔
اور بقول رشید صاحب جو مورتیاں برآمدے اور صحن میں تھیں، ان کے چھونے کی
ہمیں اجازت تھی۔ ہم سب یعنی ہندو مسلمان طلبہ دونوں اس پر خوش تھے کہ مورتیوں
کو چھونے کا منصب ہم کو حاصل تھا۔ اسکول کے مندر میں منتقل ہو جانے سے
ماسٹر صاحب کے، جو پنڈت تھے، مزے ہو جاتے۔ دن بھر بھجن، راماین، اشنان،
آرتی اور پوجا پاٹھ میں مشغول رہتے، اور تمام طالب علم انھیں دیکھنے میں اپنے
عقائد پر تبصرہ کرتے ہوئے رشید صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے "دیہات اور ٹولے
کی فضا میں جو ابتدائی تعلیم میسر آئی، اس نے ذہن و دماغ کو اس طرح اپنی گرفت
میں لیا کہ طنز و ظرافت باوجود مدت العمر ادبی مشغلہ ہونے کے، آج تک اس کا
اتفاق نہ ہوا کہ طنز و ظرافت کا فقرہ ہندو معتقدات کے بارے میں زبان یا قلم
سے نکل جائے۔ علیگڈھ آیا، تو اس پر مزید مہر لگ گئی۔ اور شاید یہ دونوں کا تصرف
تھا کہ حتی الوسع میں نے کسی مذہب پر نہ کبھی نکتہ چینی کی، نہ اس کا مذاق اڑایا۔
اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی سنا دوں۔
رشید صاحب ہمیں دیوانِ غالب پڑھاتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ سب طالبعلم
دیوانِ غالب کھول کر بیٹھ جاتے۔ رشید صاحب آنکھ کے اشارے سے کسی طالبعلم

سے کہتے ۔ وہ ایک شعر پڑھتا، اور پھر اس کی شرح کرتا ۔ اگر شعر اس کی سمجھ میں نہ آتا یا مفہوم بیان کرنے میں اس سے کوئی غلطی ہو جاتی، تو رشید صاحب دیوانِ غالب پر سے نظریں اٹھا کر اس طالبعلم کی طرف اس طرح سے دیکھتے، جیسے غالب کے شعر کا ایسا بے رحمانہ قتل ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے ۔ استاد اور شاگرد چند لمحوں کے لیے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو دیکھتے ۔ اس دوران میں طالبعلم اپنی نااہلیت کا اعتراف کر لیتا، تو رشید صاحب کسی اور طالبعلم کی طرف متوجّہ ہوتے اور آنکھ ہی کے اشارے سے اسے حکم دیا جاتا ۔ ایک دن یہ مرحلہ غالب کے اس شعر پر پیش آ گیا:

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

ایک صاحب نے اس کا مفہوم غلط بتایا ۔ دوسرے صاحب نے مفہوم تو صحیح بتایا، لیکن ضمناً کچھ ایسی باتیں بھی کہہ گئے، جن سے اسلامی عقائد کی نکتہ چینی کا پہلو نکلتا تھا ۔ بس پھر کیا تھا ۔ ایک اور صاحب آتشِ نمرود میں دیوانہ وار کود پڑے ۔ یہ صاحب ہر وقت دائرۂ اسلام وسیع کرنے کی فکر میں رہتے تھے ۔ انھیں غالب کی یہ آزادخیالی اور بقول ان کے مذہبی بےراہ روی قطعی ناپسند تھی ۔ کلاس میں گرماگرم بحث ہو گئی ۔ غالب کے طرفدار دس بارہ لڑکے ایک طرف، اور دو تین حامیانِ توحید دوسری طرف ۔ باقی کلاس غیر جانبدار، یعنی تماشائی بن گئی ۔ تمام طلبا رشید صاحب کا غیر معمولی احترام کرتے تھے، اس لیے کلاس میں کسی طرح کی بدتمیزی کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ مگر آج چونکہ مقطع میں اسلام کی بات آ پڑی تھی، اس لیے مجاہدین کی رگِ حمیّت پھڑک اٹھی تھی ۔ دوسری طرف غالب کے طرفداروں کی غیرت اور اس سے زیادہ غالب دوستی کے جذبات کی رسوائی کا خاصا سامان ہو چکا تھا ۔ اس لیے کچھ دیر کے لیے طرفین کو رشید صاحب کی موجودگی کا احساس ہی نہیں رہا ۔ رشید صاحب خاموشی سے مباحثہ سنتے رہے ۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انھیں یہ مناظرہ

پسند نہیں۔ چونکہ انھیں کسی کو کچھ کہنے کی عادت ہی نہیں تھی، اس لیے حسبِ معمول
خاموش رہے۔ بحث بہت جلد ہی غالب کے شعر کے حدود پار کرتی ہوئی دوسرے
مذاہب کی خامیوں کے شمار تک پہنچ گئی۔ اب رشید صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز
ہوگیا۔ فرمانے لگے: اچھا مسلمان وہی ہے، جو تمام مذاہب کا احترام کرے۔
(مفہوم یہی تھا، الفاظ میرے ہیں) اس کے بعد اس موضوع پر انتہائی مختصر الفاظ
میں ایسی دلنشین تقریر کی، کہ مباحثہ ختم ہوگیا

جب مذہب کے نام پر علیگڑھ کو سیاست کا اکھاڑا بنایا گیا، تو سیاستدانوں اور
ان کے شکار طالبعلموں کی ناعاقبت اندیشی اور بےراہ روی کے مظاہرے دیکھ کر رشید
صاحب غم و غیرت سے تڑپ اٹھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے "آشفتہ بیانی میری" میں
جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ صرف ایک بیباک اور حق گو انسان ہی کر سکتا ہے
لکھتے ہیں:

> پھر علی گڑھ پر ایک وقت ایسا آیا، جب سیاست نے مذہب سے، یا مذہب
> نے سیاست سے رشتہ جوڑ کر یہاں کی فضا کو اس قابل نہ رکھا کہ علم و ادب
> کی تحصیل و تحقیق اور سچائی کے ساتھ نوجوانوں کو صالح و صحتمند اقدار کو اپنانے
> اور پھیلانے کی تلقین کی جا سکتی یا تربیت دی جا سکتی ..... اقبال کا
> مشہور مصرع مجھے اکثر یاد آیا ہے:
>
> جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
>
> سوچتا ہوں، کہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جُدا رکھنے پر جس
> چنگیزی کا سامنا ہوگا، وہ قابلِ قبول ہے، یا دین کو سیاست سے جوڑنے
> میں جس چنگیزی کا سابقہ ہوگا وہ قابلِ ترجیح ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر وہ کسی سیاسی جماعت کے مخالف ہیں، تو صرف مسلم لیگ کے۔
غرض رشید صاحب تمام مذاہب کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔ خود پکے مسلمان ہیں۔
اور اسی لیے مسلمانوں کے دکھ، درد سے بہت ملول و مضطرب ہوتے ہیں۔ میں جس زمانے

ماہنامہ سیکولر ڈیموکریسی کا ایڈیٹر تھا۔ خود بھی مسلمانوں کے مسائل پر مضامین لکھ رہا تھا، اور دوسروں سے بھی لکھوا رہا تھا۔ رشید صاحب نے اس شمارے کا مطالعہ کیا جس میں بنگلادیش مسلمانوں سے چند سوالات، مشترکہ کوڈ جیسے موضوعات پر مضامین تھے۔ ان مضامین کے بارے میں انھوں نے مجھے ایک خط لکھا (یہ خط سیکولر ڈیموکریسی کی جون ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے) اس میں لکھتے ہیں:

..... رسالے کے اور مضامین بھی جہاں تہاں سے پڑھ گیا۔ ہندستان اور پاکستان کی حالیہ جنگ کے بعد سے ہندستان کے مسلمانوں سے باز پرس کے کیسے اور کیسے کیسے گوشے آئے۔ دن روشن یا روشن تر ہوتے جاتے ہیں، اس کا پہلے کبھی اندازہ نہیں تھا۔ خدا کرے، یہ زہر غم تلخی کام و دہن کی آزمایش تک ختم ہو جائے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی وہ خط بھی ہے جو رشید صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو لکھا تھا۔ لکھتے ہیں:

دو باتوں کا خیال رکھیے۔ ایک تو یہ کہ جو گاڑی مجھے اسٹیشن پر لینے آئے، وہ صدر ہندوستان کی گاڑی نہ ہو، بلکہ کسی معمولی سی گاڑی ہو، جس میں سے باوردی ڈرائیور نہ نکلے۔ میں باوردی ڈرائیور سے نروس ہو جاتا ہوں۔ دوسرے، آپ تکلف نہ کریں، کھانا اپنے ساتھ لا رہا ہوں۔

یہ اس خط کا تقریباً مفہوم ہے جو رشید صاحب نے اپنے عزیز ترین دوست ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو دہلی آتے ہوئے لکھا تھا۔ جن لوگوں نے رشید صاحب کو قریب سے دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس خط میں تصنع اور بناوٹ نہیں، بلکہ یہ ان کی پوری شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ رشید صاحب بڑے لوگوں سے ملنے سے ہمیشہ کتراتے تھے۔ یونیورسٹی کے صاحب اقتدار لوگوں سے ان کے تعلقات محض فرض منصبی کی حد تک رہے۔ اس سے آگے ان تعلقات کو بڑھانے کی انھوں نے کبھی کوشش کی، نہ خواہش۔ اگر ان کا کوئی قریب ترین دوست بھی بڑا آدمی بن گیا، تو اس کی بڑائی

الله دونوں کے تعلقات کے درمیان دیوار بن جاتی، جیسا کہ ذاکر صاحب کے ساتھ ہوا۔
ذاکر صاحب پر ایک مضمون میں رشید صاحب نے لکھا ہے: "میں دوست کے فضائل
پر مرتا ہوں، نہ کہ اس کے اقتدار و اختیار پر"۔
مولانا ابوالکلام آزاد کو رشید صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ انھوں نے دو بار خط لکھ کر
ملاقات کی خواہش کی۔ لیکن رشید صاحب نے معذوری کا اظہار کر دیا۔ سیاستدانوں میں
رشید صاحب کو پنڈت نہرو سے بڑی عقیدت و ارادت تھی۔ پنڈت جی بھی رشید صاحب
کی عظمت کے قائل تھے۔ لیکن رشید صاحب نے بات اس سے آگے نہیں بڑھنے دی۔
رشید صاحب ان خوش نصیب فنکاروں میں سے ہیں، جو اپنی زندگی ہی میں شہرت و مقبولیت
کے بام عروج پر پہنچ گئے، لیکن وہ شہرت کے پیچھے نہیں بھاگے؛ شہرت ان کے پیچھے بھاگی
ذاتی پروپیگنڈا بڑے سے بڑے فنکار کی کمزوری ہوتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں رشید
صاحب کی مثال ہندستان کی تو بات ہی کیا، عالمی ادب میں بھی مشکل سے ملیگی۔ انھیں
پسند نہیں کہ اُن پر کچھ لکھا جائے۔ کئی بار مختلف رسالوں نے رشید احمد صدیقی نمبر نکالنے
کا اعلان کیا لیکن رشید صاحب کی ناراضی سے ڈر کر ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ انھیں یہ بھی
پسند نہیں کہ ان کے ذاتی خطوط بھی شائع کیے جائیں۔ اس معاملے میں تو وہ غلو کی حد تک
کام لیتے ہیں۔ کبھی کسی کا خط اپنے پاس نہیں رکھتے۔ خط موصول ہوا، جواب لکھا اور خط
پھاڑ دیا۔ میں نے سُنا ہے کہ پطرس بخاری، اصغر گونڈوی، ذاکر صاحب، جگر صاحب،
پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر مسعود حسین خان جیسے مشاہیر کے خطوط بھی ان کی اس
عادت کی نذر ہو گئے۔ کئی برس کی بات ہے، غالباً ہماری زبان میں ان کا ایک خط شائع
ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ "یہ اُن کی وصیت ہے کہ ان کے تمام خطوط ضائع کر دیئے
جائیں"۔
ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ایک دلچسپ حرکت کی۔ وہ رشید صاحب سے ملنے گئے، اور
ٹیپ ریکارڈر اپنے ساتھ لیتے گئے۔ مختلف مسائل پر ڈیڑھ دو گھنٹے گفتگو ہوتی رہی، اور
انھوں نے رشید صاحب کو بتائے بغیر تمام گفتگو ریکارڈ کر لی، بعد میں اُسے مرتب کر کے

شائع کر دیا۔ رشید صاحب کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور اس کا اظہار انھوں نے خود مجھ سے فرمایا۔ میرے ساتھ بھی ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ پچھلے سال میں ترقی اردو بورڈ کے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے علیگڑھ گیا۔ تین دن کا سیمینار تھا۔ دو دن انتہائی مصروفیت میں گزر گئے۔ تیسرے دن ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل اور مجھے ناشتے پر مدعو کیا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آ رہے تھے کہ میں نے مسعود صاحب سے عرض کیا، رشید صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔

آپ نے پہلے سے وقت لیا ہے؟

جی نہیں۔

تو مشکل ہے۔

ہمیں علم تھا کہ رشید صاحب قبلہ مسعود صاحب کا بہت خیال کرتے ہیں۔ سوچا، اگر وہ ہمارے ساتھ ہوں، تو شاید ملاقات ہو جائے۔ اصرار کر کے مسعود صاحب کو راضی کر لیا۔ رشید صاحب کے ہاں پہنچے۔ ایک پرچے پر سب کے نام لکھے، مسعود صاحب کا نام سب سے اوپر لکھا۔ اور نوکر کے ہاتھ پرچہ اندر بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد شرف ملاقات بخشا گیا۔ بات چیت ہوئی۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا، جیسے رشید صاحب کچھ نروس ہیں۔ میں اپنے ساتھ کیمرہ لیتا گیا تھا۔ میں نے کیمرہ نکالا۔ رشید صاحب نے انتہائی نرمی سے کہا: فوٹو نہ لیجیے۔ میں نے اصرار کیا۔ رشید صاحب نے اب کے انتہائی ناگواری کا اظہار کیا۔ مجبور ہو کر میں نے کیمرہ بند کر لیا۔ اس پر رشید صاحب نے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی شرارت کا قصہ سنایا۔ مسعود صاحب، رشید صاحب کے مزاج داں ہیں۔ انھوں نے اچانک کہا: اچھا اجازت دیجیے۔ رشید صاحب نے ایک بار بھی ہم سے رکنے کے لیے نہیں کہا۔ جب ہم لوگ باہر آ گئے، تو مسعود صاحب نے بتایا کہ رشید صاحب ملاقاتیوں سے نروس ہو جاتے ہیں، بلکہ اب تو ان کے نروس ہونے کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی شخص دروازے کی گھنٹی بجا دے، یا ڈاکیہ تار لے آئے، تو وہ گھبرا جاتے ہیں۔

جب کوئی فنکار آپ بیتی لکھتا ہے، تو کیا کیا ن ترانیاں کرتا ہے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت

اور دوسروں پر اپنے تفوق کے کیا کیا قصیدے پڑھتا ہے، بلکہ دوسروں پر مضامین لکھتے ہوئے
بھی اپنی مدح کے پہلو نکال لیتا ہے۔ رشید صاحب نے ہمیشہ " در مدح خود" قسم کی چیزوں سے
گریز کیا۔ "آشفتہ بیانی میری" میں انھوں نے جس انکساری اور خاکساری کا مظاہرہ کیا
ہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اسلاف کی تو بات ہی کیا، انھوں نے اپنے والد بزرگوار
تک کا ذکر نہیں کیا۔ پوری کتاب میں اپنی شخصیت اور فن کے بارے میں ایک آدھ جملے سے
زیادہ نہیں لکھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "اسکول کے زمانے میں تھوڑی بہت نثر لکھ لیتا تھا۔
ایسی نثر جو اس زمانے کے معمولی اخبارات اور رسائل میں جگہ پا جاتی"۔ حالاں کہ رشید
صاحب سے بہت کم درجہ کے ادیب اور شاعر اس موقع پر کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ جب
میں نے پہلا مضمون لکھا، تو چاروں طرف دھوم مچ گئی اور ایڈیٹر حضرات گھر کے چکر کاٹنے
لگے۔ کسی کو یقین نہیں آیا کہ مضمون کا مصنف اتنا کم عمر لڑکا ہو سکتا ہے۔ پھر میرا
امتحان ہوا: میں اس میں پہلے سے بھی زیادہ کامیاب رہا وغیرہ۔ رشید صاحب نے
اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ انھوں نے علیگڈھ پر توجہ مرکوز کر کے بات کا رُخ ہی بدل
دیا۔ [illegible] انھوں نے بہت صحیح کہا ہے کہ "میں بذات خود کچھ مقامی سا آدمی
واقع ہوا ہوں۔ آفاقی یا ماورائی قسم کا ہونے کی نہ صلاحیت رکھتا ہوں، نہ حوصلہ
نہ ہوس" یہ اور بات ہے کہ لوگوں کی کوششوں کے باوجود انھیں آفاقیت نصیب ہو
گئی۔

شہرت کی طرح رشید صاحب دولت سے بھی بے نیاز رہے۔ وہ کبھی پیسہ جمع کرنے کے چکر
میں نہیں پڑے۔ کبھی تالا چابی استعمال نہیں کیا۔ اور کبھی کسی بینک میں حساب نہیں کھولا۔
جب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور پراویڈنٹ فنڈ کا چیک ملا، تو
ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ان کے ایک عزیز کمال الدین صاحب کے ذریعے یہ مسئلہ حل ہوا۔
کمال الدین صاحب بہت عرصے سے ان کے ساتھ رہتے ہیں، اور اس عمر میں رشید
صاحب کا بہت بڑا سہارا ہیں۔
دولت جمع کرنے، یا جائداد بنانے میں انھیں کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ جس مکان میں رہتے ہیں،

وہ البتہ ان کی اپنی ملکیت ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک زمانے میں یونیورسٹی کیمپس میں کچھ پلاٹ فروخت ہو رہے تھے۔ اکثر لوگوں نے پلاٹ خریدے، لیکن رشید صاحب نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ان کے ایک عزیز دوست ایوب انصاری نے بڑا اصرار کر کے انھیں پلاٹ خریدنے پر آمادہ کیا۔ اور پھر ان کے اور دوسرے دوستوں کے اصرار اور کوششوں سے مکان کی تعمیر ہوئی۔

گھر میں رشید صاحب کا روپے پیسے سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ خرچ ہمیشہ ان کی بیگم کے ہاتھ میں رہا۔ ان کی میز پر البتہ کچھ ریزگاری پڑی رہتی تھی، جو بچوں کو دی جاتی تھی۔

کسی زمانے میں رشید صاحب کو پان کھانے کا بہت شوق تھا۔ پاندان ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے، اور اپنے لیے پان خود بناتے تھے۔ اب ڈاکٹروں نے اچھے کھانوں کے ساتھ، پان کھانے پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔

رشید صاحب کو گلابوں کا بھی بہت شوق ہے۔ گھر میں ایک بہت خوبصورت باغیچہ بنا رکھا ہے۔ پہلے تو کئی کئی گھنٹے تک نیکر اور بنیان پہنے مالی کے ساتھ باغیچے میں لگے رہتے تھے۔ اور اس دوران میں نوکر کو ملاقاتیوں سے کہنا پڑتا تھا کہ رشید صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ اس شوق کے بارے میں رشید صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں: "باغ مجھے بہت پسند ہیں، درختوں، پودوں کو تھوڑی سی راحت پہنچا دیجیے، شاداب و شگفتہ ہو جائیں گے۔ اور آپ محسوس کریں گے کہ وہ اپنی استطاعت سے زیادہ آپ کی محبت و محنت کا معاوضہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔" گلاب کے پھولوں کے بارے میں رشید صاحب کی معلومات غیر معمولی ہیں۔ وہ انسان اور پھولوں کے حسب و نسب کو برابر اہمیت دیتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی عزیز کے مسلسل اصرار پر وہ راشٹرپتی بھون کا مغل گارڈن دیکھنے کو دلی آئے۔ وہاں گلاب کے پھول دیکھ کر سخت بدمزہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ بہت سے پھولوں اور اچھے پھولوں میں بڑا فرق ہے۔ "بہت سے پھول" ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔

گھر میں جب پھول ار کھلے ۔ تو ان کا سب سے دلچسپ مشغلہ ان کی خوبیاں بیان کرنا ہوتا۔

ہر آنے جانے والے کو کھول دکھاتے، اس کی قسم اور دوسری تفصیلات پر روشنی ڈال کر، اس طرح داد چاہتے، جس طرح کوئی شاعر کلام سنا کر داد کا طالب ہوتا ہے۔
رشید صاحب اب تو مضمون نہیں لکھتے، جس زمانے میں لکھتے تھے، تو ان کا لکھنے کا عجیب انداز ہوتا تھا۔ میز کرسی کے بدلے وہ کھٹولے اور مونڈھے سے کام لیتے تھے۔ کھٹولے پر خود بیٹھ جاتے اور مونڈھے سے میز کا کام لیتے کبھی مونڈھے پر بیٹھتے، اور دونوں پیر کھٹولے پر رکھ لیتے۔ ایک تختی پر چٹکی سے کاغذ لگے ہوتے۔ تختی ہاتھ میں لیتے ہی وہ اپنے خول میں چلے جاتے۔ اب بچوں کا شور وغل، چیخ پکار کوئی ان پر اثر نہیں کر سکتی تھی۔
عام طور پر اپنے مسودے خود صاف کرتے۔ جب تک سلمیٰ صدیقی کی شادی نہیں ہوئی تھی کبھی کبھی یہ خدمت اُن سے لی جاتی تھی۔ اور انھیں اس کا معاوضہ دو آنے فی صفحہ کے حساب سے دیا جاتا تھا۔
رشید صاحب نے ہمیں بی اے میں دو سال پڑھایا ہے۔ وہ وقت کے بہت پابند تھے۔ ادھر گھنٹہ بجا، اُدھر ظہور وارڈ کی طرف سے ان کی رکشا آتی ہوئی نظر آئی۔ کسی کی طرف دیکھے بغیر سیدھے جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے؛ رجسٹر کھول کر حاضری لیتے، رجسٹر بند کرتے اور دیوانِ غالب کھول لیتے، اور پڑھائی شروع ہو جاتی۔ کلاس کے دو دلچسپ واقعات میرے ہم جماعت ڈاکٹر اسلم پرویز نے دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔ اس لیے انھیں یہاں نقل کیے دیتا ہوں:

> رشید صاحب کے پڑھانے کا دستور یہ تھا کہ وہ بات کرنے کا موقع کم ہی دیتے تھے، اور اس میں وہ باتیں بھی شامل تھیں، جو کورس سے متعلق ہو سکتی تھیں۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں نے بڑے غور و فکر کے بعد ایک سوال رشید صاحب سے دریافت کرنے کے لیے تیار کیا۔ سوال یہ تھا: "کیا غالب فلسفی تھے؟" حسبِ دستور رشید صاحب تشریف لائے، حاضری لی، اور حاضری کے رجسٹر پر سے نگاہ اُٹھائے بغیر اس پر دیوانِ غالب رکھ کر کھول لیا۔ لیکن اس سے قبل کہ رشید صاحب اپنا لکچر شروع کرتے

ایک طالبعلم نے ہمت کر کے کہا: سر! ایک سوال دریافت کرنا ہے! رشید
صاحب [illegible] گویا ہوئے دیوانِ غالب کا [illegible] پڑھتے ہوئے جواب دیا! فرمائیے۔
طالبعلم نے کہا: سوال یہ ہے کہ کیا غالب فلسفی تھے؟ رشید صاحب نے
اسی انداز و لب و لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے [illegible] کا سلسلہ لیکچر
سے ملاتے ہوئے فرمایا: جی ہاں! غالب فلسفی تھے، [illegible] سوال لیجیے۔
ایک اور مرتبہ کا ذکر ہے کہ رشید صاحب کلاس [illegible] رہے تھے۔
حاضری لیتے وقت ایک نام پکارا: وسیم فاضلی، پہلی مرتبہ اس نام پر آخ "یس"
کی آواز آئی، اور رشید صاحب نے بھی غالباً پہلی مرتبہ نیت توڑ کر نگاہ اٹھائی
اور "یس سر" کہنے والے صاحب سے کہا: حضرت! اب تک نیاز کیوں نہ حاصل
ہو سکے؟ انھوں نے جواب دیا "بدنصیبی ہے" رشید صاحب نے پھر برجستہ
سوال کیا: کس کی۔ آپ کی یا میری۔

[illegible] مشرقیت کے [illegible] محبت کا احساس چھچھورا پن انھیں قطعی پسند
[illegible] رشید [illegible] بہت فصیح اور درست ہونی چاہیے۔
[illegible] عورتیں الفاظ کا تلفظ غلط کریں، تو نا قابلِ معافی ہیں۔ وہ خوش خطی کو بھی لڑکیوں
کے سلیقے میں شمار کرتے ہیں۔ بعض الفاظ انھیں عورتوں کے منہ سے سخت ناگوار گزرتے
ہیں۔ مثلاً السلام علیکم، لاحول ولاقوۃ وغیرہ۔

ان کی پسند اور ناپسند دونوں ہی شدید ہیں۔ اس لیے بعض اوقات ان کے رویے میں
شدید ترین جذباتیت ہوتی ہے۔ جس کا اظہار ان کی تحریروں میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً وہ اردو
کے بارے میں لکھتے ہیں: "اردو جاننا اور علیگڑھ سے واقف نہ ہونا بجائے خود کسی
فتور کی علامت ہے۔ اردو کا نام علیگڈھ بھی ہے۔" "میں سمجھتا ہوں کہ سیرت پاک پر
خطباتِ احمدیہ سے بہتر کوئی دوسری تصنیف سرسید سے پہلے نہیں ملتی۔" یا اردو ہی کے
بارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "اردو ایک قیمتی ورثہ، ایک قابل قدر روایت، ایک
نادر آرٹ، ایک مسحور کن نغمہ، قابلِ فخر کارنامہ، کوئی پیمانِ وفا وغیرہ۔" ذاکر صاحب

کے بارے میں لکھتے ہیں :" ڈاکر صاحب کو کوئی بُرا کہتا ہے، تو بھونچکا رہ جاتا ہوں۔ اس کے فوراً بعد جو بات میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ یا تو یہ شخص شیطان محض ہے، یا نادانِ محض ۔" اسی جذباتیت کا اظہار علیگڈھ سے ان کی محبت میں ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے کسی بھی موضوع پر لکھ رہے ہوں، اس میں علیگڈھ یا علی گڈھ کی کسی شخصیت کا ذکر ضرور آجائیگا ۔ علیگڈھ سے ان کے اس جذباتی رشتے کے تجزیے کے لیے ہمیں ان کی ابتدائی زندگی کے کچھ حالات پیشِ نظر رکھنا ہونگے ۔

رشید صاحب جون پور کے ایک قصبے مڑیا ہوں میں پیدا ہوئے تھے ان کی ابتدائی تعلیم مڑیا ہوں اور پھر جونپور میں ہوئی ۔ جہاں سے انھوں نے انٹرنس پاس کیا تھا۔ جونپور ایک تاریخی شہر ہے ۔ شاہانِ شرقی نے اسے غیر معمولی علمی اور تہذیبی اہمیت کا حامل بنادیا تھا۔ رشید صاحب نے جب ہوش سنبھالا، تو یہ سب کچھ ختم ہوئے عرصہ ہوچکا تھا، لیکن عظیم الشان مسجدوں، مزاروں، مقبروں، قلعے، پل، اور ربخانے کتنی عمارتوں کے کھنڈر زبانِ حال سے شاہانِ شرقی کی عظمت کی گواہی دے رہے تھے ۔ تہذیبی سطح پر جاگیردارانہ قدریں ابھی تک زندہ تھیں ۔ اس دَور کے جون پور کا ذکر کرتے ہوئے "آشفتہ بیانی میری" میں رشید صاحب لکھتے ہیں:-

> اب سوچتا ہوں، اس زمانے کا جون پور علم وفضل اور شاعری وشرافت کی قدیم روایات کے اعتبار سے کتنا قابلِ قدر خطہ تھا ۔ بیشتر مسلمان گھرانے ایسے تھے، جو کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی ایک حیثیت رکھتے تھے ۔ نجابت اور شرافت کا اس زمانے میں کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا ۔

ایک اور جگہ جونپور کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے طلبا کے رشتہ داروں کے بارے میں لکھتے ہیں :

> یہ لوگ قدیم تہذیب اور وضعداری کا نمونہ ہوتے اور اسلاف کے حالات اس شفقت اور دلچسپ انداز سے سناتے اور اخلاق وتہذیب کے حدود میں

رہنے کی نصیحت اس پیرایے میں کرتے ، کہ لڑکوں پر بڑا اچھا اور گہرا اثر پڑتا۔
دوسرے لفظوں میں جاگیرداری نظام کی بہترین ، صالح اور صحتمند اقدار نے رشید صاحب کی ذہنی ساخت میں نمایاں حصّہ لیا۔ رشید صاحب طالب علم کی حیثیت سے جس علیگڈھ آئے تھے، وہ آج کے علیگڈھ سے بالکل مختلف تھا۔ اس وقت وہاں اکثریت ان طلبا کی تھی، جن کا جاگیرداری طبقے سے تعلّق تھا۔ اسی علیگڈھ نے ان کی تعمیر شدہ شخصیّت کو تب وتاب اور رنگ و آہنگ دیا۔ چونکہ علیگڈھ ان تمام اعلیٰ و ارفع اقدار کا حامل تھا، جو رشید صاحب کو عزیز تھیں، اس لیے جونپور نے رشید صاحب کے ذہن میں علیگڈھ کی صورت اختیار کر لی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رشید صاحب کو جو والہانہ عشق ایم، اے، او کالج سے تھا، وہ یونیورسٹی سے نہیں ہو سکا۔ ان کے خیالوں کی دنیا میں جدید علیگڈھ کی عظیم الشّان عمارتوں کے پس منظر میں وہ کچّی بارک ابھرتی ہے، جس کے بارے میں انھوں نے کبھی لکھا تھا کہ:

> باوجود طرح طرح کی تکالیف اٹھانے کے ایک متنفّس نے کبھی کبھی اس کی شکایت نہ کی کہ کچّی بارک میں رہنا صحت، عافیت، حیثیت، شان یا شرافت کے خلاف تھا۔ یہی نہیں بلکہ کتنے اس کی آرزو کرتے کہ کچّی بارک میں جگہ مل جائے۔"

بہت کم لوگ ایم، اے، او کالج کے بارے میں ان کی اس عقیدتمندانہ رائے سے اتفاق کریں گے کہ "مسلم یونیورسٹی ایم، اے، او کالج سے برآمد ہوئی۔ لیکن بوجوہ وہ اتنی ہونہار اور شاندار ثابت نہیں ہوئی، جتنا کہ ایم اے او کالج تھا۔۔۔۔ وہ ان روایات کو برقرار نہ رکھ سکی جو کالج کی ناموری کا باعث تھیں۔" مسلم یونیورسٹی کو وقت کے تقاضوں نے جنم دیا تھا۔ اور وقت کے تقاضوں کے مطابق وہ بدلتی رہی ہے۔ ایم اے، او کالج کی بیشتر اقدار جاگیرداری طبقے کی تھیں۔ اس کے برعکس یونیورسٹی پر برطانوی تہذیب اور تمدّن کی پرچھائیاں پڑ رہی تھیں۔ اس لیے یہاں کی اقدار بدل رہی تھیں ظاہر ہے کہ جاگیرداریت کی بہترین اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے انسان کے لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا۔ ایسا شخص ہی یہ بات کہہ سکتا تھا کہ

انسان کی صالح و صحتمند زندگی کا مدار اس پر ہے کہ اس کے ہاں اقدار کی کیا اہمیت ہے، اور اقدار کے لیے ضروری ہے کہ ان میں استقلال ہو اور وہ ہوا کے ہر جھونکے سے زیر و زبر نہ ہوں۔ یہ اقدار نتیجہ ہوتے ہیں مدتوں کے تجربے اور ریاضت کا۔

جونپور اور اس کی اقدار طرح طرح کے بھیس بدل کر رشید صاحب کی زندگی میں آتے ہیں۔ کبھی یہ ایم اے او کالج کی شکل میں، کبھی ذاکر صاحب، کبھی غالب، کبھی اردو اور تاج محل اور کبھی سراج بیرا۔ رشید صاحب کرکٹ میچ، مشاعرہ اور یونیورسٹی یونین میں بھی انھیں اقدار کی تلاش کرتے ہیں۔ انھوں نے ان تمام لوگوں، اداروں اور تقریبوں کے لیے، جو توصیفی کلمات استعمال کیے ہیں، انھیں میں نے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر یکجا کر لیا ہے۔ وہ الفاظ اور کلمات یہ ہیں: ایمانداری، شائستگی، شرافت، انسان دوستی، علمیت و قابلیت، شعر و شاعری کا شوق، کلاسیکی ادب پر عبور، وضعداری، خوش گفتاری، خوش لباسی، علم مجلس، خوش اطواری، فقرے بازی، عاجزی و خاکساری، قناعت، قربانی و ایثار، حق پرستی، بیباکی، دوست نوازی، خلوص، وسیع المشربی، دردمندی، عالی حوصلگی، خود اعتمادی، حق پرستی، بزرگوں کا احترام، چھوٹوں سے محبت اور شفقت، اسپورٹس مین شپ وغیرہ۔ یہ تمام خصوصیات جاگیردارانہ کی بہترین اقدار کا حصہ ہیں، اور رشید صاحب انھیں وہ اپنے علیگڑھ اور ذاکر صاحب کی ہستی میں متشکل دیکھتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انھیں دراصل ان اقدار کے مداح ہیں۔ جہاں کہیں بھی اور جس چیز میں بھی ان اقدار کی جھلک نظر آتی ہو، وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔

رشید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ مکتوب نگاری رہا ہے۔ علیگڑھ کے حضرات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہو کہ آپ انھیں کتنا ہی ضروری خط لکھیں، وہ جواب نہیں دینگے۔ لیکن رشید صاحب علیگڑھ کی اس روایت کے باغی ہیں۔ ممکن نہیں کہ رشید صاحب سے دو تین دن میں آپ کو اپنے خط کا جواب نہ مل جائے، حال آں کہ ان کے ہاتھ میں رعشہ آگیا ہے، جس کا اظہار ان کی تحریر سے ہوتا ہے۔ بالعموم رشید صاحب خط پوسٹ کارڈ

پڑھ سکتے ہیں۔ اگر خط کا مضمون طویل ہوا تو عبارت کو غیر معمولی حد تک خفی کر دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ ادیب نہ ہوتے، تو چاول کے دانے پر سورۂ اخلاص لکھنے کے ماہر ہوتے، ان کے خط ہمیشہ دلچسپ اور پُر لطف ہوتے ہیں۔ کیسا ہی کاروباری خط کیوں نہ ہو، اس میں ایک آدھ پُر مزاح جملہ ضرور ان کے قلم سے نکل جاتا ہے۔ آل احمد سرور نے ان کی مکتوب نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ

> ان کی باتوں سے زیادہ ان کے خط دلچسپ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کو جو خط لکھتے ہیں ان میں بے تکلف مختلف اشخاص یا واقعات پر بڑے پُر لطف تبصرے کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کا سب سے بھرپور اظہار نہ ان کے مزاحیہ مضامین میں ہے، نہ قلمی خاکوں میں، نہ تنقید میں، نہ ان کے دوسرے مضامین میں ہے، بلکہ ان کے خطوں میں ہے۔

جن لوگوں کو رشید صاحب کے خطوط کے مطالعے کا موقعہ ملا ہے، وہ سرور صاحب کی اس رائے سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ "جب رشید صاحب کے خطوط شائع ہوں گے، تو غالب کے بعد ہمارے خطوط کے سرمایہ میں سب سے بڑا اضافہ ہوگا۔ غالب کی طرح رشید صاحب کی زندگی کا دار و مدار بھی اب مکتوب نگاری پر ہے۔ ان کے بچے ہندستان اور ہندستان سے باہر ہیں۔ ان بچوں اور دوستوں کے خطوط کے لیے اُن کی آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ خط ملتے ہی وہ اس کا جواب لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اس مشغلے میں ان کا اچھا خاصا وقت گزر جاتا ہے۔

رشید صاحب کبھی دوستوں کی محفلوں کی جان تھے۔ ان کی فقرہ بازی محفلوں کو زعفران زار بنا دیتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان کے عزیز دوست ان سے جدا ہوتے گئے۔ بچے جو گھر کی رونق تھے، وہ بھی جوان ہو کر زندگی کی تگ و دو میں مصروف ہو گئے۔ رشید صاحب نے پہلے خود کو علیگڑھ میں، پھر گھر میں، بالآخر گھر کے ایک کمرے میں بند کر لیا۔ اب ان کی ساری دنیا سمٹ کر یہ کمرہ، کچھ کتابیں، رسائل اور لکھنے پڑھنے کا سامان ہو کر رہ گئے ہیں۔

مالک رام

حیاتِ رشید

"حضرت، آپ کا سالِ ولادت کیا ہے؟ کوئی ۱۸۹۸ء لکھتا ہے، کوئی ۱۸۹۶ء، کوئی ۱۸۹۴ء!
ایک صاحب نے ۱۸۹۲ء بھی لکھا ہے۔ ٹھیک تاریخ کیا ہے؟"

"۱۸۹۲ء"

"مہینا؟"

"دسمبر"

"تاریخ؟"

"۲۴"

"سبحان اللہ! آپ تو حضرت یسوع مسیح سے بھی ایک دن پہلے پیدا ہوئے"۔
چونکہ یہ فقرہ ان کے مذاق کے مطابق تھا، اس پر انھوں نے مسرت کا اظہار کیا اور اپنے مخصوص
انداز میں کھل کر مسکرا دیئے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے، یہ گفتگو میرے اور جناب رشید احمد صدیقی
مدظلہ کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے؛ مہینا غالباً مئی کا تھا۔
تو یہ طے ہو گیا کہ قبلہ رشید احمد صدیقی کی تاریخ ولادت ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء ہے۔ اس کے
بہت دن بعد انھوں نے پھر ایک مرتبہ بتایا کہ انھیں اپنے پرانے کاغذوں میں کسی اور عزیز
کی کوئی یادداشت ملی تھی، اس میں بھی یہی تاریخ ولادت درج تھی۔

مشرقی اتر پردیش کے ضلع جونپور کا ایک قصبہ مریاہو[1] ہے۔ یہ جونپور سے ۱۱ میل دُور ہو اور تحصیل کا صدر مقام بھی۔ حضرت پیر ذکریا دادا کا مزار یہاں کا بہت مشہور زیارتی مقام ہے۔ اب تو تعلیم کا رواج عام ہو گیا؛ اور لوگ، خاص کر تعلیم یافتہ لوگ، ہر ایک چیز کے انکار اور روایت شکنی ہی کو روشن خیالی کی دلیل سمجھنے لگے ہیں، پہلے مریاہو میں شادی بیاہ کے موقع پر یہ مسلّمہ رواج تھا کہ دولھا پہلے اس مزار پر سلام کے لیے حاضری دیتا، سلام کرکے نذر پیش کرتا، اور اس کے بعد بارات روانہ ہوتی۔ ان بزرگ کے اخلاف جس محلے میں مقیم ہیں، وہ آج بھی محلّہ پیر ذکریا کہلاتا ہے۔

یہی حضرت پیر ذکریا ہمارے رشید صاحب کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ روایت یہ ہے کہ وہ ستر ہویں صدی عیسوی میں تبلیغِ دین کی غرض سے ترکستان سے ہندستان آئے تھے۔ پہلے چند سے پنجاب میں قیام کیا۔ جب وہاں کے حالات نے مجبور کیا، تو دلّی اور الہ آباد ٹھہرتے ہوئے جونپور پہنچ گئے، اور بالآخر مریاہو میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کی اولاد حکومتِ وقت کی ملازمت میں داخل ہو گئی، اور بیشتر نے فوج اور سپہگری کے پیشے کو ترجیح دی۔ انھیں میں رشید صاحب کے اسلاف بھی تھے۔

رشید احمد صدّیقی صاحب کے والد جناب عبدالقدیر صاحب پولیس کے محکمے میں ملازم تھے۔ وہ مدّتوں بلیا اور غازی پور اور جونپور کے اضلاع میں تھانیدار رہے۔ قیامِ جونپور کے آخری زمانے میں وہ کوتوال شہر کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ پولیس کا محکمہ اپنی سخت گیری اور بدعنوانیوں کے لیے مشہور، بلکہ بہت حد تک بجا طور پر، بدنام ہے، لیکن عبدالقدیر صاحب کی نیکی اور دینداری کا شہرہ تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند، اور مشہورِ زمانہ صوفی حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (ف ستمبر ۱۸۹۵ء) کے مُرید تھے۔ اسی سے ان کے عام رجحانِ طبع کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

عبدالقدیر صاحب کا نکاح بھدوہی (ضلع بنارس) کے سیّد باسط علی کی صاحبزادی

[1] اس لفظ کے تلفظ کے بارے میں یقین نہیں ہے۔ اسے مختلف طریقے سے لکھا گیا ہے، مُریا ہُوں، مَنڈیاہُوں، منڈدیا، منڈوی آہو۔ خدا معلوم، مقامی لوگ کیسے لکھتے اور بولتے ہیں!

سے ہوا تھا۔ ان کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں: سائرہ، طاہرہ، آمنہ، عبدالصمد صدیقی، رشید احمد صدیقی، نیاز احمد صدیقی، نذیر احمد صدیقی۔

جناب عبدالقدیر اپنی ملازمت کے سلسلے میں بریا (ضلع بلیا) میں تعینات تھے، جب خدا نے انھیں دوسرا بیٹا دیا جس کا نام انھوں نے رشید احمد رکھا۔ یہی ہمارے پروفیسر رشید احمد صدیقی ہیں۔ ان سے بڑے بھائی عبدالصمد صاحب وکیل تھے؛ ان کا ۱۹۶۰ء میں انتقال ہوا۔ چھوٹے جناب نیاز احمد صدیقی ابھی حال تک محمد حسن کالج، جونپور کے پرنسپل تھے، بفضلہ حیات ہیں۔ سب سے چھوٹے نذیر احمد کم عمری ہی میں رحلت کر گئے تھے۔

رشید احمد صدیقی صاحب اپنے بچپن میں بہت کمزور اور نحیف الجثہ تھے۔ مدتوں مختلف عوارض کا شکار رہے۔ طرح طرح کے علاج معالجے اور ٹونے ٹوٹکے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی، لیکن ان کی علالت کا سلسلہ بہت دن تک چلا۔ اسی وجہ سے ان کی تعلیم بھی دیر میں شروع ہوئی کیونکہ اندیشہ تھا کہ جسمانی کمزوری کے باعث یہ ذہنی بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں۔

جیسا کہ اس زمانے میں کھاتے پیتے شریف گھرانوں کا دستور تھا، ان کی تعلیم بھی گھر ہی پر، اور وہ بھی دینیات اور عربی فارسی سے شروع ہوئی۔ اس دور میں انھوں نے مختلف اساتذہ سے فارسی کی کچھ کتابیں، عربی کے چند رسالے، دینیات کے کچھ اسباق اور قرآن شریف پڑھا۔ جب یہاں سے فارغ ہوئے، تو اردو اور حساب، پہاڑے وغیرہ سیکھنے کو مقامی پرائمری اسکول میں چلے جاتے۔ لطیفہ یہ ہے کہ اس اسکول میں، جو مدرس انھیں اردو پڑھاتے تھے، وہ خود اردو سے بالکل نابلد تھے؛ اردو میں ان کی ساری کائنات دستخط کر لینے تک محدود تھی۔

اگرچہ ان مدرس کو نہ پڑھنے سے کچھ تعلق تھا، نہ پڑھانے سے؛ اور مذہباً بھی وہ کٹر قسم کے برہمن تھے، لیکن بحیثیت انسان بہت بلند تھے، شریف النفس اور خادمِ خلق اور ہمدرد۔ جب وبائی طاعون کا موسم آتا (اور یہ ہر سال ہی آتا تھا)، تو مدرسہ اپنی عمارت سے اٹھ کر گاؤں کے مندر میں منتقل ہو جاتا۔ ماسٹر صاحب کی روزانہ کی صحبت اور سال بسال اس مندر میں مہینوں بسر کرنے، بلکہ مندر کے بعض چھوٹے موٹے کام بھی سرانجام دینے کا نتیجہ یہ ہوا، کہ

رشید صاحب کے دل میں ہندو دھرم، بلکہ تمام دوسرے مذاہب کے لیے رواداری کے جذبات پیدا ہو گئے، اور خوش گواری، لعینت اور نرمی، تحمّل اور بُردباری ان کے مزاج کے گویا اجزائے ترکیبی بن گئے۔

پرائمری اسکول سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لیے انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول، جونپور بھیجا گیا۔ یہاں سے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں دسویں درجہ کی سند حاصل کی۔ یہ سند تو انھوں نے جوں توں حاصل کر لی، لیکن ایک بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ جہاں اور تمام مضامین میں ان کا نتیجہ ہمیشہ اچھا دہا، ریاضی میں یہ ہمیشہ فیل ہوتے رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں ریاضی اور حساب کتاب سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ غرض اب سوال تھا آئندہ کا، لیکن چونکہ یہ جونپور کا تشکیلی دور ان کی تعمیرِ زندگی کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے پہلے اس کے اثرات و نتائج سے متعلق چند لفظ لکھنا بےمحل نہ ہوگا۔

جونپور کو "شیرازِ ہند" کہا گیا ہے، اور واقعی وہ اس نام کا مستحق تھا۔ شاہانِ شرقی کے عہد میں اس نے مختلف علوم و فنون میں جو ترقی کی، اس کے آثار آج تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ حکومتِ وقت کی نگرانی نے جونپور میں یگانۂ روزگار علماء و فضلا کو جمع کر دیا تھا۔ وہ آئے اور انھوں نے یہاں مدارس و مکاتب کھول دیے، رشد و ہدایت کی مجلسیں قائم کر دیں۔ اور یوں ہر طرف علم اور اس کی تمام شاخوں کا چرچا عام ہو گیا۔

حکومت نے شہر کی ظاہری تزئین و تہذیب پر بھی خاص توجّہ کی۔ عالیشان عمارات، مساجد، مقابر، سرائیں جو اس زمانے میں تعمیر ہوئیں، ان میں سے بیسیوں کی باقیات آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ سطوت و جلالِ ماضی کے یہ سب آثار رشید احمد صدیقی نے دیکھے۔ ان کا اپنا خاندان بھی تاریخی حیثیت رکھتا تھا، ان کی ابتدائی گھریلو تعلیم بھی بیشتر مذہبی نوعیت کی تھی، طبیعت بھی حسّاس اور دردمند اور غور و فکر کی عادی تھی۔ اس پر جونپور میں جن ساتھیوں سے، اور ان کے واسطے سے ان کے خاندانوں سے، تعلّق پیدا ہوا، وہ بھی اسی کاروانِ رفتہ کی یادگار تھے۔ جاگیرداری نظام میں لوگ لاکھ کیڑے ڈالیں، لیکن اس کی خوبیوں سے چشم پوشی کرنا بھی قرینِ انصاف نہیں۔ ادب آداب کی پابندی، رکھ رکھاؤ،

کے طریقے، بزرگوں کی شفقت اور ان کا خردوں سے محبت سے پیش آنا، اس دَور کا مابہ الامتیاز تھا۔

جونپور میں بیشتر پرانے گھرانے شیعہ عقائد کے تھے۔ رشید صاحب کے ساتھ پڑھنے والے انھیں خاندانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے ساتھ یہ ان کے گھروں پر جاتے۔ ان سے محبت اور شفقت کا سلوک تو ہونا ہی چاہیے تھا، اس کے ساتھ وہاں انھیں شعرا کا کلام، مرثیہ اور سوز اور سلام سننے اور پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ اس سے گویا ان کی اردو دوستی کی بنیاد پڑی اور اردو ادیب بننے کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ وسطِ شہر میں دریائے گومتی بہتا ہے۔ اس کے کنارے ایک دو منزلہ عمارت میں ایک اچھا خاصا کتب خانہ تھا۔ رشید صاحب باقاعدگی سے اس کتب خانے میں جاتے اور گھنٹوں وہاں بیٹھتے اور اردو انگریزی کے ناول اور افسانے پڑھا کرتے۔ یوں رہی سہی کسر اس مطالعے نے پوری کردی۔ اور وہ اردو ادب کے خاصے ذخیرے سے واقف ہو گئے۔

[illegible] جن کو رشید صاحب سے بے تکلفانہ ملنے کا موقع ملا ہے، وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ [illegible] سے ان کے شوق [illegible] مسلم ثقافت، پرانی قدروں، تہذیب، اردو۔ اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی بنیاد ان کے قیامِ جونپور کے زمانے میں پڑی تھی۔ بعد کو وسیع ذاتی مطالعے اور دوست احباب سے تبادلۂ خیالات، نیز تہذیب کے انحطاط اور نئی نسل کی اخلاق باختگی کے نظارے سے ان میں ان موضوعات کے زمانۂ حال سے تقابل اور ان کے بارے میں غور و فکر کی عادت پیدا ہوئی۔

غرض جونپور کے یہ تین چار سال ان کی زندگی اور ذہنی نشو و نما کے مطالعے کے لیے بہت اہم زمانہ ہے۔

جونپور گورنمنٹ اسکول سے دسویں درجہ کی سند لینے کے بعد اب مستقبل کا مسئلہ در پیش تھا۔ گھر کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں رہی تھی کہ ان کی کالج کی تعلیم کا بار برداشت کر سکتی۔ مجبوراً نوکری کرنا پڑی۔ خوش قسمتی سے اس کے لیے کہیں دور نہیں جانا پڑا؛

وہیں جونپور کی عدالت دیوانی میں کلرک مقرر ہو گئے۔ یہ ملازمت عارضی تھی اور مشاہرہ ۱۵ ۔ ۲۰ روپے سے زیادہ نہیں تھا۔ اگرچہ سب لوگ ان کے ملازم اور گھر کا کما ؤ فرد بن جانے پر مطمئن اور خوش تھے، لیکن رشید صاحب خود اس سے سخت بیزار تھے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے۔ آخر سال بھر بعد وہ رسّی تڑا کر بھاگ نکلے اور علیگڈھ آ کر دم لیا۔ یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔

اسکول کے زمانے میں انھیں کھیل کود کا لپکا تھا۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال ان کے دلپسند کھیل تھے اور وہ اپنے اسکول کی ان تینوں ٹیموں کے کپتان تھے۔ علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں کھیل کود پر خاص توجہ تھی اور یہاں کے طلبہ کی اس میدان میں دور دور شہرت تھی۔ جیسا کہ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے، رشید صاحب دراصل علیگڈھ اتنا پڑھنے کے شوق میں نہیں آئے تھے، جتنا یہاں کے کھیل کا چرچا سن کر۔ لیکن یہاں ان کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہوا؛ اُس زمانے میں یہاں ان کھیلوں کے کھلاڑیوں کی کمی نہیں تھی اور کالج میں ان کا ایک سے ایک اچھا کھیلنے والا موجود تھا۔ ناچار انھوں نے ٹینس پر توجہ کی، اور رفتہ رفتہ اس میں بھی بہت اچھی مہارت پیدا کر لی۔ کھیلوں میں انھیں برج کا بھی شوق رہا ہے۔

علیگڈھ کالج میں وہ چھ برس پڑھے، ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۱ء تک؛ ۱۹۱۹ء میں بی، اے کیا اور ۱۹۲۱ء میں ایم، اے۔ اس زمانے میں یہ کالج الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا اور یہاں کے طلبہ کو وہیں کا نصاب پڑھایا جاتا اور وہیں جا کر امتحان دینا پڑتا تھا۔ رشید صاحب نے بھی یہ امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیے تھے۔

طالبعلمی کا دور مالی پہلو سے بہت پریشان کن رہا۔ والد پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے، اور ان کی پنشن ایک بڑے کنبے کی ذمہ داریوں کے ساتھ، ان کی تعلیم کے مصارف بھی برداشت کرنے سے قاصر تھی۔ اس کا حل رشید صاحب نے یہ نکالا کہ ہر سال گرمی کی لمبی تعطیلات میں نوکری سے اتنا کما لاتے، کہ یہ تنگی ترشی سے سال بھر کے خرچ کے لیے کفایت کرتا۔ کالج میں ۱۵ جولائی سے ۱۵ اکتوبر تک، تین مہینے گرمی کی چھٹیاں

ہوا کرتی تھیں۔ یہاں آیام میں بنارس جاتے اور وہاں دیوانی کی گشتی عدالتوں میں کلرکی کرتے۔ ان کا کام بیشتر مسلوں کی نقل کرنا تھا۔ یہ اسی زمانے کی مشق کا نتیجہ تھا، کہ رشید صاحب زود نویس بھی ہو گئے اور خوشخط بھی۔ یہ "مشغوت" پانچ برس تک جاری رہی۔ جس صبر و شکر سے انھوں نے یہ زمانہ بسر کیا، اور جس آن بان سے انھوں نے ہمچشموں میں اپنا سر اونچا رکھا، وہ اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

علیگڈھ ایم، اے او کالج محض ایک درسگاہ نہیں تھا، بلکہ ایک تہذیبی ادارہ، ملک کی تعلیمی تاریخ کا ایک سنگ میل، اور ہندستانی مسلمانوں کی امیدوں اور آرزوؤں کی آماجگاہ بھی تھا۔ یہاں ملک کے ہر گوشے سے نونہالان قوم جمع ہوتے اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے تیاری کرتے۔ رشید صاحب جب یہاں پہنچے، تو قدرتی طور پر وہ بھی اسی ماحول کا ایک حصہ بن گئے۔ حسن اتفاق سے ان کی اس سے پہلے کی ساری تعلیم و تربیت نہ صرف علیگڈھ کی روایات کے منافی نہیں تھی، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نقطۂ معراج ہونا ہی علیگڈھ چاہیے تھا۔

علیگڈھ میں رشید صاحب کے حلقۂ احباب میں اقبال احمد خان سہیل (ف نومبر ۱۹۵۵ء) بھی تھے۔ سہیل اردو فارسی کے فاضل اور برگزیدہ شاعر اور غیر معمولی طور پر ذہین و فطین شخص تھے۔ رشید صاحب اور سہیل مرحوم کا تقریباً چار سال تک ساتھ رہا؛ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، رہن سہن ایسا کہ من تو شدم، تو من شدی کا مضمون ہو گیا۔ بلا خوف تردید و شبہہ کہا جا سکتا ہے کہ رشید صاحب کی تصنیفی صلاحیتوں کے ابھارنے اور اجاگر کرنے اور بڑھانے میں سہیل مرحوم کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ رشید صاحب اپنے جونپور کے زمانۂ طالبعلمی ہی میں نثر لکھنے لگے تھے۔ شاہ نذیر غازیپوری اس زمانے کے اچھا لکھنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے نوجوان رشید صاحب کی رہنمائی کی، اور انھیں ادب میں راہِ راست پر لگا دیا۔ علیگڈھ آئے، تو یہاں سہیل نے انھیں اس اسلوبِ تحریر کی راہ دکھلائی، جس کے لیے وہ ازل سے منسوب ہو چکے تھے یعنی طنز و مزاح کا اسلوب۔

رشید صاحب پہلے کالج یونین کے سکتر مقرر ہوئے، اور پھر "علیگڈھ منتھلی" (کالج کا سرکاری جریدہ) کے ایڈیٹر۔ یہ ماہانہ دو زبانوں (انگریزی اور اردو) میں شائع ہوتا تھا۔ رشید صاحب کے کہنے پر اس کا نام "منتھلی" سے بدل کر "میگزین" رکھا گیا۔ ان سے پہلے دونوں حصّوں کے الگ الگ مدیر اسٹاف میں سے ہوا کرتے تھے۔ پہلی مرتبہ انگریزی اور اردو حصّوں کی ادارت ایک ہی شخص اور وہ بھی ایک طالبعلم (رشید صاحب) کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب دونوں حصّوں کے مضمون لکھا کرتے تھے۔ اردو میں اپنے نام سے اور انگریزی میں "وہیبن" (آوارہ گرد) کے نام سے۔ یہیں ہی نے انھیں سب سے پہلے طنزیہ مضامین لکھنے کی طرف راغب کیا۔ یہاں علی گڑھ میں ان کا قیام "کچی بارک" نامی ہوسٹل میں تھا۔ رشید صاحب نے اس سے متعلق ایک سلسلۂ مضامین "گل منزل" کے عنوان سے لکھا۔ یہی مضمون ان کے طنز و مزاح کے سفر کا نقطۂ آغاز تھا۔

کالج میں ایک ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الفرض) قائم تھی۔ اسے سرسید کی زندگی ہی میں، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (ف جنوری ۱۹۳۰ء) نے اپنی طالبعلمی کے زمانے میں (۱۸۹۰ء) شروع کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد کالج کے نادار، لیکن ہونہار طلبہ کی مالی امداد کے لیے مستقل سرمایہ جمع کرنا تھا۔ بعد کو فیصلہ ہوا کہ جو وفد روپیہ جمع کرنے کو باہر جائیں وہ کالج کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کریں۔ رشید صاحب اس انجمن کے ممتاز رکن تھے۔ اس انجمن کے وفد ہر سال چھٹیوں کے ایام میں ملک کا دورہ کرتے تھے۔ وہ چندہ بھی جمع کرتے اور تقریروں اور ملاقاتوں کے ذریعے سے کالج کے حق میں فضا پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے۔ رشید صاحب نے انجمن کے ۱۹۱۷ء کے وفد کے ساتھ شمالی ہندستان کے مختلف شہروں کے علاوہ برما میں میمو تک کا سفر کیا۔ واپسی پر انھوں نے "سیاحتِ برما" کے عنوان سے چند مضامین لکھے، جو میگزین میں شائع ہوئے تھے۔

ڈیوٹی سوسائٹی کی خط و کتابت بھی بہت حد تک رشید صاحب کے سپرد تھی۔ نیز مختلف مباحث اور موضوعات پر مضامین اور خطبے اور کتابچے بھی لکھنا پڑتے تھے۔ اس سے

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے انھیں کتنا فائدہ پہنچا۔ ...... اور ان کی تحریر اور اسلوب میں کیسے پختگی پیدا ہو گئی۔

کالج کے زمانۂ طالبعلمی میں ایک اور بات نے بھی ان کی مدد کی۔ ان کے انگریزی کے مدرس انعام اللہ خان صاحب تھے۔ وہ اپنے عہد کے بہت ممتاز اور ماہر انگریزی دان سمجھے جاتے تھے۔ لیکن انگریزی ایسی مرصّع اور مسجّع اور ثقیل بولتے تھے کہ سننے والوں کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ رشید صاحب پروفیسر انعام اللہ خان کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے بیشتر انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ انھیں کا کیا ہوا ہے۔

۱۹۲۱ء میں انھوں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور اسی سال دسمبر ۱۹۲۱ء میں عارضی طور پر صرف تین مہینے کے لیے اردو پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ یہ عہدہ اس زمانے میں "اردو مولوی" کہلاتا تھا۔ اس میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ جگہ مستقل نہیں تھی۔ اور معلوم نہیں تھا کہ اصحابِ مجاز کس دن کس بات سے ناراض ہو کر نکال باہر کر دیں۔

اس کے بعد جب یونیورسٹی بنی اور اس میں اردو لیکچرر کی جگہ نکلی، تو انھوں نے بھی درخواست دی۔ بعض اصحاب نے سخت مخالفت کی اور طرح طرح کے اعتراض کیے۔ ان کے اس مستقل اسامی پر تقرر کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے آج تک کوئی مستقل تصنیف شائع نہیں کی۔ اس پر اتمامِ حجت کے لیے انھوں نے مقالہ "طنزیات و مضحکات" لکھا، جو پہلے ہندستانی اکیڈمی، الٰہ آباد کے تماہی رسالے ہندستانی میں بالاقساط چھپا اور پھر کتابی شکل میں بھی وہیں سے شائع ہوا۔ خیر قرعۂ فال ان کے نام پڑا، اور یہ عارضی طور پر مقرر ہو گئے۔ بڑے جوڑ توڑ اور سفارشوں کے بعد کہیں ۱۹۲۶ء میں وہ مستقل لیکچرر (ریڈر) مقرر ہوئے۔ منجملہ اور اصحاب کے علامہ اقبال نے بھی ان کی سفارش کی تھی۔ نو سال بعد ترقی ملی اور ریڈر ہوئے؛ اور ۱۹۵۴ء میں پروفیسر، جو کسی یونیورسٹی میں گویا نقطۂ معراج ہے۔ یہیں سے یکم مئی ۱۹۵۸ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ جب سے آج تک علیگڑھ میں مقیم ہیں۔ یہاں انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔

اپنی طالبعلمی کے زمانے میں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے بھی، جو ان سے تین برس پہلے ۱۹۱۲ء میں کالج میں آچکے تھے، بہت گہرے تعلقات تھے۔ دونوں اس بات پر افسوس کیا کرتے کہ اُردو میں معیاری رسالے ناپید ہیں اور پھر خود ایک بہترین رسالہ جاری کرنے کی اسکیم مرتب کرتے۔ دونوں نے اتفاق کیا کہ اس کا نام "شمع" ہو یا "سہیل" کہ دونوں میں روشنی کا تصور ہے، اور نہ صرف خود روشن ہیں، بلکہ اپنے چاروں طرف بھی نور کی بارش کر دیتے ہیں۔ اسی سے خیال کیجیے کہ ان کے نزدیک پرچے کا مقصد اور معیار کتنا بلند تھا۔
تو خیر، ذاکر صاحب ۱۹۲۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ اور پروفیسر محمد حبیب مرحوم (ف جون ۱۹۷۱ء) نے بعض احباب کے تعاون سے ایک ماہنامہ جاری کیا جس کا نام شمع رکھ دیا۔ رشید صاحب نے سنا تو افسوس کیا کہ وہ جو دو ناموں میں کسی ایک کے انتخاب کرنے میں لذّت تھی، وہ ہاتھ سے جاتی رہی۔ لیکن انھیں اطمینان تھا کہ خیر "سہیل" تو ہے ہی؛ جب پرچہ جاری کریں گے، اس کا یہ نام رکھ لیں گے۔ اس زمانے میں سیّد سجّاد حیدر یلدرم (ف اپریل ۱۹۴۳ء) یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ ایک دن رشید صاحب ان سے تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہ اردو میں اچھے پرچے کم ہیں، ایک پرچہ "سہیل" کے نام سے نکالنے کا خیال ہے، تو یلدرم مرحوم نے کہا، کہ ہاں یہ نام عرصے سے میرے ذہن میں ہے"۔ رشید صاحب یہ سُن کر گھبرائے کہ "شمع" تو ہاتھ سے گیا ہی تھا، اگر یلدرم نے "سہیل" پر بھی ہاتھ صاف کر دیا، تو ہم تو ہاتھ ملتے رہ جائیں گے؛ ذاکر صاحب بھی یورپ میں ہیں، ان سے کسی اور نام کے لیے مشورہ کرنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ عنقریب سہ ماہی "سہیل" شائع ہونے والا ہے۔
سہیل انجمن اردوئے معلی، مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی آرگن کی شکل میں ۱۹۲۶ء کے آغاز میں جاری ہوا۔ لیکن آج تک کسی اچھے پرچے کو الّا ما شاء اللہ اردو دانوں اور اردو حلقوں کی فضا راس نہیں آئی، نہ ان کا تعاون ہی حاصل ہوا۔ یہی حشر "سہیل" کا بھی ہوا۔ سب نے اس کے مضامین کے بلند معیار، اعلیٰ کتابت و طباعت، دیدہ زیب شکل و صورت کی تعریف کی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے صرف چھ شمارے شائع ہوئے، اور وسط ۱۹۲۷ء

میں اس نے مالی مشکلات کے باعث دم توڑ دیا۔
رشید صاحب نے اس پر بھی ہار نہیں مانی۔ ۱۹۳۵ء کے آخر میں انھوں نے پھر اسے جاری کیا۔ اب کے اعلان کیا کہ یہ ہر سال کے آخر میں یعنی دسمبر میں ایک مرتبہ شائع ہوا کریگا۔ لیکن افسوس کہ دسمبر ۱۹۳۵ء کا یہ شمارہ اس نئے سلسلے کا بھی اکلوتا پرچہ ثابت ہوا۔
رشید صاحب آج بجا طور پر اُردو ادب کے مسلّمہ اور مایۂ ناز نثر نگار، اور طنز و مزاح کے منفرد مصنّف ہیں۔ انھوں نے اپنے بیشتر مّداحوں اور پڑھنے والوں کو خوشوقت کیا ہو! ان کی زندگی کی اداس اور بے کیف گھڑیوں کو مسرت و انبساط سے رنگین کیا ہے۔ وہ خود بہت کم آمیز اور کم سخن ہیں، لیکن انھوں نے دوسروں کو آپس میں ملنے جلنے کا سلیقہ اور شائستہ بات چیت کرنے کا ہنر سکھایا ہے۔ یوں اگر ان کی طویل تصنیفی زندگی کا جائزہ لیا جائے، تو اس کے مقابلے میں ان کا تحریری سرمایہ کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے! اگر آپ وسیع و عریض کھارے سمندر کو متھ کر اس میں سے خالص شیریں امرت کا ایک گھونٹ بھی پیدا کر لیں، تو اس کی ابدی کیفیت پر سمندر کی ناپیدا کنار کمیّت سو مرتبہ قربان کی جاسکتی ہے۔ یہی مثال رشید صاحب کی نگارشات پر صادق آتی ہے۔
ان کی ادبی فتوحات کی جو پذیرائی اور قدر، اور خود ان سے ملک کے اہلِ علم و فن طبقے نے جو محبّت کی ہے، اسی کی آدانباز گشت "پدم شری" کا وہ اعزاز ہے، جس سے حکومتِ ہند نے انھیں یومِ جمہوریہ ۱۹۶۳ء کے موقع پر نوازا تھا۔
میں یہاں رشید صاحب کے فن سے متعلق کچھ نہیں لکھونگا۔ اسی شمارے میں آپ کو بعض اہلِ نظر کے مضامین، ان کے فن کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ملینگے۔ یہاں میں ان کی مصنّفات اور مضامین کی ایک مختصر اور نامکمل فہرست بطورِ ضمیمہ پیش کر رہا ہوں، جس کی ترتیب کے لیے میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب کا ممنون ہوں:

ضمیمہ

کتب

۱۔ طنزیات و مضحکات — ہندستانی اکیڈمی، الٰہ آباد

۲۔ مضامینِ رشید — مکتبۂ اردو، دلّی: (۱۹۴۱، ۱۹۴۲، ۱۹۶۴ء

۳۔ خنداں — مکتبۂ جامعہ نئی دلّی — ۱۹۴۰ء (۱۹۶۵ء)

۴۔ سہیل کی سرگزشت — نفیس اکیڈمی، حیدرآباد، ۱۹۴۷ء

۵۔ گنجہائے گراں مایہ — ۱۹۵۱ء، ۱۹۶۲ء

۶۔ ذاکر صاحب — کتابی دنیا لمیٹڈ، دلی

۷۔ ہمارے ذاکر صاحب — مکتبۂ جامعہ، نئی دلّی — ۱۹۷۳ء (نمبر ۶ پر اضافہ)

۸۔ جدید غزل — مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ: ۱۹۵۵ء (۱۹۵۸ء

۹۔ شیخ نیازی — سرسید بک ڈپو، علیگڈھ: ۱۹۵۸ء

۱۰۔ آشفتہ بیانی میری — مصنف علیگڈھ — ۱۹۵۸ء (۱۹۶۰، ۱۹۶۲، ۱۹۷۲، ۱۹۷۳ء

۱۱۔ ہمنفسانِ رفتہ — انڈین بک ہاؤس علیگڈھ، ۱۹۶۶ء (۱۹۷۱

۱۲۔ عزیزانِ ندوہ کے نام — دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ

۱۳۔ علیگڈھ کی مسجدِ قرطبہ — مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، ۱۹۶۷ء

۱۴۔ غالب کی شخصیت اور شاعری شعبۂ اُردو، دلّی یونیورسٹی، دلی ۱۹۷۰ء
۱۵۔ علیگڑھ: ماضی و حال مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ: ۱۹۷۰ء

خطبات

۱۶۔ خطبۂ صدارت، اردو کانفرنس، بریلی: ۱۹۴۰ء (نگار، لکھنؤ، ستمبر ۱۹۴۰ء)
۱۷۔ "اصلاحِ زبان و مصطلحاتِ اُردو"
(خطبۂ صدارت، کل ہند اردو کانفرنس
حیدرآباد: ۲۲ جولائی ۱۹۴۴ء) (ادبی دنیا، لاہور: ستمبر ۱۹۴۴ء)
۱۸۔ خطبۂ صدارت، کل بہار ریاستی اردو
کانفرنس، پٹنہ: ۱۲۔۱۴ مئی ۱۹۵۱ء : (علیگڑھ میگزین: ۱۹۵۱۔۱۹۵۲ء)
۱۹۔ خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد، جامعۂ ملیہ اسلامیہ:
۲۹ اکتوبر ۱۹۶۸ء : (جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، نئی دلّی: ۱۹۶۸ء)
۲۰۔ خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد، جامعۂ اُردو، علیگڑھ:
۱۵ ستمبر ۱۹۷۳ء : (جامعۂ اُردو علیگڑھ: ۱۹۷۳ء)

مقالات:

۲۱۔ خصوصیات کالج: گل منزل (۱)؛	علیگڑھ منتھلی، علیگڑھ	: ستمبر ۱۹۱۷ء
۲۲۔ خصوصیات کالج: گل منزل (۲)؛	علیگڑھ منتھلی، علیگڑھ	: اکتوبر ۱۹۱۷ء
۲۳۔ خصوصیات کالج: گل منزل (۳)؛	علیگڑھ منتھلی، علیگڑھ	: دسمبر ۱۹۱۸ء
۲۴۔ خصوصیات کالج: گل منزل (۴)[۵]	علیگڑھ منتھلی، علیگڑھ	: اگست/اکتوبر ۱۹۱۹ء
۲۵۔ قبرِ درویش	علیگڑھ منتھلی، علیگڑھ	: نومبر/دسمبر ۱۹۲۱ء
۲۶۔ فلسفۂ ازدواج	النّاظر، لکھنؤ	: جنوری ۱۹۲۴ء

[۵] یہ مضامین علیگڑھ میگزین (انتخاب نمبر) ۱۹۷۱ء میں بھی شامل ہیں

۲۷۔ مشترکہ شعر و ادب : کانفرنس گزٹ، علیگڈھ : یکم دسمبر ۱۹۳۶ء

۲۸۔ مکتوباتِ نیاز پر اظہارِ خیالات : نگار، لکھنؤ : جولائی ۱۹۴۰ء

۲۹۔ رُباعیں تفنّن : اجمل (روزنامہ) بمبئی : ۹ فروری ۱۹۴۳ء

۳۰۔ اپنی یادیں : علیگڈھ میگزین، علی گڑھ : مارچ ۱۹۴۴ء

۳۱۔ زندگی کی پریشانیاں، چغلی : آجکل، دہلی : ۱۵ مئی ۱۹۴۶ء

۳۲۔ سویرے جو آنکھ کھلی : ساقی (سالنامہ)، دہلی : جنوری ۱۹۴۷ء

۳۳۔ ایڈیٹوریل : کانفرنس گزٹ، علی گڑھ : ۱۶ جنوری ۱۹۴۷ء

۳۴۔ قسمیں کھانا : نیا ہندستان (ہفت روزہ) بمبئی : ۲۴ ستمبر ۱۹۴۸ء

۳۵۔ جھگڑالو : نگار، لکھنؤ : مارچ ۱۹۴۹ء

۳۶۔ اشتہار بازی : نگار، لکھنؤ : مئی ۱۹۵۰ء

۳۷۔ دھوبی : محمد حسن کالج میگزین، جونپور : اپریل ۱۹۵۱ء

۳۸۔ آجکل کے نقّاد : نگار، لکھنؤ : اگست ۱۹۵۱ء

۳۹۔ حسن آفرین، مرحبا، مرحبا : علیگڈھ میگزین (طنز و مزاح نمبر) علیگڈھ : ۱۹۵۳ء

۴۰۔ غالب: ایک صاحبِ طرز انشا پرداز : ہندستانی ادب، حیدرآباد : مئی ۱۹۵۵ء

۴۱۔ اکبر الٰہ آبادی : آئینہ (ہفت روزہ)، نئی دلّی : ۸ اگست ۱۹۵۵ء

۴۲۔ کچھ فسانۂ عجائب کے بارے میں : نقوش، لاہور : اکتوبر ۱۹۵۶ء

۴۳۔ نیا سال اور پامال اشعار : مجلۂ عثمانیہ، حیدرآباد : ۱۹۵۷-۵۸ء

۴۴۔ سرگزشتِ عہدِ گل : ادیب، علی گڑھ : جنوری ۱۹۵۹ء

۴۵۔ کندن : آجکل، نئی دلی : جنوری ۱۹۶۰ء

۴۶۔ اردو نثر کا بنیادی اسلوب : فکر و نظر (سہ ماہی) علیگڈھ : جنوری ۱۹۶۰ء

۴۷۔ جگر صاحب : نقوش (ادبِ عالیہ نمبر)، لاہور : اپریل ۱۹۶۰ء

۴۸۔ تری یاد کا عالم : فکر و نظر، علیگڈھ : اکتوبر ۱۹۶۰ء

۴۹۔ جامعہ کی دوسری جوبلی : جامعہ، نئی دلّی : جنوری ۱۹۶۱ء

۵۰۔ خودکشی علیگڈھ میگزین، علیگڈھ : مارچ اپریل ۱۹۶۲ء
۵۱۔ پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ : فکر و نظر (سہ ماہی) علیگڈھ : جولائی ۱۹۶۲ء
۵۲۔ کہاں ہو آج تم، اے آفتاب نیم شبی : فکر و نظر " " : جولائی ۱۹۶۴ء
۵۳۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے : اردو ادب " " : شمارہ (۳) ۱۹۶۹ء
۵۴۔ اردو رسم خط فکر و نظر، علی گڑھ : شمارہ (۱) ۱۹۷۱ء
۵۵۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد : " " : شمارہ (۲) ۱۹۷۱ء
۵۶۔ عزیزانِ علیگڈھ (۱) " " : شمارہ (۱-۲) ۱۹۷۲ء
۵۷۔ عزیزانِ علیگڈھ (۲) : " " : شمارہ (۳) ۱۹۷۲ء
۵۸۔ عزیزانِ علیگڈھ (۳) : " " : شمارہ (۱،۲) ۱۹۷۳ء
۵۹۔ نیا شعر و ادب۔ مشمولہ "مداوا" از فرقت کاکوروی : لکھنؤ : ۱۹۴۴ء
۶۰۔ نیا ادب میری نظر میں مشمولہ "نیا ادب میری نظر میں" از آغا سرخوش
قزلباش : دہلی : ۱۹۴۴ء
۶۱۔ اردو لٹریچر (انگریزی) مشمولہ انڈین لٹریچر آف ٹوڈے (انگریزی)
مرتبہ بھارتن کماراپا : بمبئی : ۱۹۴۷ء
۶۲۔ غالب اور علیگڈھ مشمولہ "احوالِ غالب" مرتبہ مختار الدین، علیگڈھ : ۱۹۵۳ء
۶۳۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ مشمولہ "نقدِ غالب" مرتبہ مختار الدین، علیگڈھ : ۱۹۵۶ء
۶۴۔ سرسید اور علی گڑھ مشمولہ "علیگڈھ تحریک آغاز تا امروز"
مرتبہ نسیم قریشی : علیگڈھ : ۱۹۶۰ء

مقدمات، پیش لفظ وغیرہ

۶۵۔ سلسبیل آلِ احمد سرور دہلی : ۱۹۳۵ء
۶۶۔ باقیاتِ بجنوری عبدالرحمٰن بجنوری " : ۱۹۴۰ء
۶۷۔ باقیاتِ فانی (دیوان) شوکت علی خان فانی بدایونی آگرہ

۶۸۔ آتشِ گل (دیوان)	جگر مرادآبادی	لاہور[1]		
۶۹۔ ادب کا مطالعہ	اطہر پرویز	علی گڑھ	۱۹۶۲ء	
۷۰۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ	قمر رئیس	〃	۱۹۶۳ء	
۷۱۔ نقشِ قدم	جمیلہ خاتون	لاہور	۱۹۶۶ء	
۷۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، سیرت و شخصیت	عبداللطیف اعظمی	نئی دلی	۱۹۷۰ء	
۷۳۔ اُردو کا المیہ[2]	مسعود حسین خاں	علیگڈھ	۱۹۷۳ء	

۱۔ لاہور کے ایڈیشن کا سالِ اشاعت معلوم نہیں ہو سکا۔ انجمن ترقی اُردو ہند، علیگڈھ نے اسے جولائی ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا۔

۲۔ اس کتاب کے شروع میں پیش لفظ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے قلم سے ہے۔ دراصل یہ موصوف کے متعدد خطوط [illegible]ات پر مشتمل ہے، جو انھوں نے مصنف کو ان کے مضامین کے بارے میں لکھے تھے، جن کا مجموعہ اس کتاب میں ہے۔

افکار

محمد حسن

رشید احمد صدیقی

کرشمہ اور کارنامہ

رشید صاحب اس دور کے عظیم ترین صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ اردو نثر کی مزاج دانی اور آہنگ شناسی جس طرح ان کی تحریروں میں ملتی ہے اس کی نظیر اردو ادب میں کمیاب ہے۔ وہ الفاظ کی نغمگی، معنویت، تصویر کشی اور جمالیاتی کیفیت کو اس انداز سے برتتے ہیں کہ بقول انیس "اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں"۔ رشید صاحب کے طرز تحریر نے اردو نثر کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ اور اسے وسعت، پہنائی اور رنگینی کی نئی کیفیات بخشی ہیں۔ ان کے اس ست رنگے اسلوب کے کئی رنگ ہیں۔ اس کے سجیلے پن، نکیلے پن اور البیلے پن نے اردو نثر کو نئی تہ داری اور طرحداری بخشی ہے۔

رشید صاحب کے طرز تحریر کی تشکیل میں تین عناصر کی واضح طور پر نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ پہلا عنصر مریاہو ضلع جونپور کے اطراف و جوانب کی قصباتی زندگی اور تہذیب اور اسی کے ساتھ ساتھ ضلع کی عدالتوں کے اس ماحول کا اثر ہے جن سے رشید صاحب ابتدا میں وابستہ رہے۔ یہ قصباتی تہذیب وہ تھی، جو واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد دہلی اور لکھنؤ کی پروردہ ہند ایرانی تمدن کی باقیات کی حیثیت سے نواح کے قصبوں میں بکھر گئی تھی۔ اس تہذیب میں رکھ رکھاؤ، ضبط و احتیاط، توازن، تمیز اور شائستگی موجود تھی اس پر مستزاد قانون کا ڈسپلن جو لفظوں کو ضبط و احتیاط سے برتنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ قانون، منطق اور ریاضی فکر کی

ژولیدگی کو دور کرکے استدلال کی صلابت اور راست خیالی پیدا کرتے ہیں۔ قانونی عدالتوں کی فضا لفظوں کے منطقی طلسمات کے گرد بکھری ہوئی اور لفظی موشگافیوں کی پیدا کردہ دلیلوں، جھوٹے گواہوں، اہلمدوں اور پیشکاروں کی فضا ہے جس میں ہندوستانی سماج کی ذہانت، چالاکی اور عظمت و عبرت کی داستان سموئی گئی ہے۔

دوسرا اہم عنصر ہے علیگڈھ کی اقامتی زندگی۔ علیگڈھ کالج کا تصور آج کی علیگڈھ یونیورسٹی کو دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ علیگڈھ کالج آکسفرڈ کے طور پر قائم کیا ہوا بنیادی طور پر اقامتی ادارہ تھا، جہاں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے اور بالخصوص اتر پردیش کے رؤسا کے گھرانوں کے نوجوان انگریزی اساتذہ کی نگرانی میں تعلیم ہی نہیں تربیت پاتے تھے۔ لباس، کھانا، پینا، ملنا، جلنا، کھیل کود، اٹھنا بیٹھنا، شہسواری، تقریر و تحریر اور کرکٹ سبھی کے اصول و ضوابط یہاں سکھائے جاتے تھے۔ علیگڈھ آج بھی چھوٹا سا شہر ہے رشید صاحب کے زمانے میں قصبہ ہی تھا۔ اکوں کا چلن تھا۔ اقامت گاہوں میں دھول اڑتی تھی۔ کچی بارکیں تھیں لہذا تفریحی مشاغل میں گپ اور اقامتی زندگی کی شرارتوں کا درجہ سب سے بلند تھا اس کے بعد یونین کی ڈیبیٹ اور کرکٹ اور ٹینس کے لان کا اقامتی زندگی کی گپ میں ایک خاص شگفتہ لب و لہجہ، نجی انداز گفتگو، قصہ گوئی کی تصویر کشی قوت بیان اور خوش طبعی کا رنگ لازمی ہے۔ جہاں گفتگو سنجیدگی سے بوجھل ہوئی تو توجہ بھٹکنے لگی۔ اسی اقامتی زندگی کا ایک فیض یہ بھی تھا کہ رشید صاحب صرف انہی موضوعات پر قلم اٹھاتے تھے جو اس زمانے کے علیگڈھ کالج والوں کے لیے مانوس اور متعارف تھے۔

تیسرا اہم عنصر انگریزی کے ان صاحب طرز انشاء پردازوں کا اثر ہے جن تک رشید صاحب کی رسائی غالباً علیگڈھ کالج کے ذریعے ہوئی ان سے رشید صاحب نے طہارت فکر اور لزوم ہی نہیں سیکھا بلکہ اظہار کے ایسے متعدد پیرایے بھی سیکھے جو انگریزی نثر میں خاصے کا درجہ رکھتے تھے۔ مختصر ترین لفظوں میں بلیغ انداز سے کسی بات کو اس انداز سے ادا کر دینا کہ اس سے ایک جہان معنی نظر کے سامنے آ جائے اور پھر ندرت ادا،

شگفتہ بیانی اور لطیف مزاح کے پہلو بھی ہاتھ سے نہ جانے پائیں، یا متضاد خیالات کو قولِ محال کی شکل میں ترتیب دے کر رنگین بیانی کا انداز پیدا کرنا یا طویل مرکب جملوں کی مدد سے پورا نقار خانہ سجانا، یہ سب ہنر ایسے ہیں جو مغرب سے اور بالخصوص انگریزی نثر نگاروں کے اثر سے ان تک پہنچے ہیں اور انھیں رشید صاحب نے اپنے مزاج کے نسخۂ کیمیا سے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ وہ انھیں کی خاص ایجاد قرار پائے۔

(۱)

بقول نیاز فتح پوری رشید صاحب اردو کے تنہا مزاح نگار ہیں، جو فکر انگیزی کو مزاح کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ جوکر اور مزاح نگار میں بنیادی فرق یہی ہے۔ جوکر مضحک صورتیں بنا کر لوگوں کو ہنسنے پر آمادہ کرتا ہے۔ مزاح نگار لوگوں کو ان کی اپنی مضحک شکلیں دکھاتا ہے، گویا سماج کے سامنے آئینہ رکھ دیتا ہے اور سماج کی تمام ناہمواریوں کو بے نقاب کرکے انھیں ہنسنے ہنسانے ہی کا نہیں، عبرت اور فکر کا سامان مہیا کر دیتا ہے۔ رشید صاحب کے مزاح کے موضوعات متنوع اور رنگارنگ ہیں لیکن ان کے اسلوب کی گہری ادبیت ان کا منفرد رنگ ہے) اسی لیے رشید صاحب کا مزاح پطرس کی طرح نہ زود ہضم ہے، نہ ہلکا پھلکا۔ رشید صاحب کے مزاحیہ اسلوب میں کلاسیکی روایت کا رچاؤ اور رومانیت کی رنگینی اور ادب کی فکر خیزی، خیال انگیزی اور ہنر اور شیوگی موجود ہو۔

ادب رشید صاحب کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ نقاد رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ غزل کی جو بات انھیں سب سے زیادہ عزیز ہے، وہ اس کی موجیت اور جامعیت ہے۔ رشید صاحب نے غزل کے اشعار کو جس قدر متنوع اور مختلف حالات پر منطبق کیا ہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ایسا لگتا ہو، جیسے غزل بھی تصوف کی اصطلاح میں بے ہمہ اور باہمہ کا درجہ رکھتی ہو اور ہر موقعہ اور ہر محل کو بیان کرنے پر قادر ہو۔ دراصل رشید صاحب کے لیے ادب روایت نہیں، زندگی ہے۔ ان کے نزدیک ادب صرف بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب ہی نہیں ہے، اظہار کا بہترین وسیلہ

اور خیر الکلام ہی نہیں، بلکہ زندگی کے تجربوں کا عطر ہے اور جب وہ زندگی کے مختلف تجربوں سے گزرتے ہیں تو اگلوں کے ان تجربوں کے عطرِ مجموعہ کو ساتھ رکھتے ہیں، جو اجداد نے زندگی کی بوقلمونی سے حاصل کیا تھا۔

اردو کے نثری اسلوب پر علم فصاحت و بلاغت کے فاضلوں کے ہاتھوں بڑا ستم یہ ہوا کہ اوّل تو نثر کی خودمختاری ہی کو تسلیم نہیں کیا گیا اور اس کے مقفّیٰ، مسجّع یا مرجز ہونے پر اس کی خوبی اور درجہ بندی قایم ہوئی، دوسرے ان خصوصیات سے مبرا نثر کو عاری کہہ کر ہر طرح کے نثری اسالیب کو اسی تحت میں شامل کر لیا گیا (سچ پوچھیے تو سچی نثر ہمیشہ عاری ہی کے تحت آئیگی کیونکہ وہ قافیے یا سجع کے کھٹکے یا شعر کی ترصیع اور رعایت لفظی کی پابند ہوئی، تو وہ شاعری کی محتاج ہو کر رہ جائیگی اور اپنی خود مختاری حاصل ہی نہ کر سکیگی) بہت آگے بڑھے، تو علمائے فصاحت نے نثر پر بھی ایجاز و اطناب کی اصطلاحیں صرف کر ڈالیں جن میں سے اکثر بےمحل تھیں۔ یہ کہنا کہ کلام موقع و محل کے مناسب ہو، یا اس میں غیر ضروری تکرار یا پھیلاؤ نہ ہو، کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی کو سمو دیا جائے، سامنے کی باتیں ہیں اور نثری اسلوب کی طرحداری کے مختلف انداز و اسالیب کے تجزیے سے ذہن کو ہٹاتی ہیں۔

غالباً رشید صاحب پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اُردو کے بنیادی اسلوب کا مسئلہ اٹھایا ہے، اور اس کی حدبندی کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشا کی طرح وہ اسے بھاکاپن اور عربیت، فارسیت کے درمیان سلاست کی کوئی منزل قرار نہیں دیتے۔ مگر اسے ایک ایسا اسلوب ضرور قرار دیتے ہیں، جو ایک طرف روزمرہ کی بول چال سے اپنے رشتہ استوار رکھے اور دوسری طرف ادبی روایات کے کلاسیکی ماخذوں سے گل بوٹے کھلاتا چلے۔ رشید صاحب کا اپنا اسلوب سادگی اور سلاست سے تو اتنا معمور نہیں، لیکن کلاسیکی انداز کو اوڑھنا بچھونا بنا لینے والا انداز انھوں نے اس کامیابی سے برتا ہے کہ اسے سلیس بنا دیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ غالبؔ کے خطوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ایسا لگتا ہے کہ ان خطوط کا مصنّف کسی بازار کے نکڑ پر بیٹھا ہے اور آنے جانے والوں سے بات چیت کرتا جاتا ہے، کسی کی خیریت

پوچھ لی، کسی سے دوگال ہنس بول لیے، کسی پر چھینٹا کسا، کسی سے غمگساری کی دو باتیں کہیں، غرض خوش طبعی کی ایک ایسی فضا ہے جو خطوں کے ہر لفظ میں برقی رو کی طرح دوڑتی نظر آتی ہے۔ یہی حال رشید صاحب کی نثر نگاری کا ہے۔ تنقید ہو یا طنز و مزاح، سماجی اور سیاسی مسائل پر ان کے مضامین ہوں، یا ان کے مکاتیب سب میں یہی خوش دلی، دردمندی، خوش طبعی اور رکھ رکھاؤ جاری و ساری ہے۔

ہر صاحب اسلوب کے کچھ مخصوص پینترے اور کچھ محبوب پیرایے ہوتے ہیں۔ پینترے رشید صاحب کے بھی ہیں۔ لیکن ان میں ذات کا خلوص اور تجربے کی روشنی کچھ اس ڈھنگ سے شامل ہے کہ یہ کرتب بازی نہیں رہتی، جگر کاوی بن جاتی ہے۔ رشید صاحب اکثر پیراگرافوں میں سوچتے ہیں۔ ہر پیراگراف گویا ایک فکری وحدت ہو اور مختلف ٹکڑوں سے بنائے ہوئے تدریجی کلائمکس کی تشکیل کی گئی ہو۔ عام طور پر ! کا نشان اسی کلائمکس کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس عمل سے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ اوّل تو اس پورے عمل کے پیچھے پس منظر کا بڑا وسیع اور گہرا احساس جانے، انجانے شامل رہتا ہے۔ رشید صاحب کے ہاں محض ادبی ہی نہیں، تاریخی تسلسل کا احساس بہت شدید ہے اسی لیے وہ کبھی بکھی وقتی ہیجانات سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ مزاجاً مشرقی ہیں اور مشرق کے آئین و آداب انھیں اس درجہ عزیز ہیں کہ اسے وہ اشرافیہ کا کلچر ہی نہیں جانتے بلکہ کلچروں کا اشرافیہ قرار دیتے ہیں یہاں مراد مشرق کی کئی جہات سے ہے جس میں روحانیت کا ایک خاص تصور، مذہبی اقدار کا ایک خاص حد تک احترام، جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ، ضبط و نظم کا لحاظ اور مشرق کی اس تہذیب کی تصویر سے محبت بھی شامل ہے جس میں غرناطہ و بغداد کا رنگ و آہنگ اور اسلام کے ماضی کے شاندار لمحوں کا گزرا ہوا جمال بھی رچا بسا ہوا ہے۔ بایں ہمہ، رشید صاحب کے ہاں عصبیت اور تنگ نظری شاذ ہی ملیگی۔ انھیں فرقہ پرست کہنا، یا کسی ایک طبقے (خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو وہ) پر دوسروں کو قربان کر دینے والا ظلمت پسند کہنا ممکن نہیں کیونکہ ان کی نظریں کبھی تاریخی اور تہذیبی سیاق و سباق سے نہیں ہٹتیں اور اسی لیے تاریخی شعور پر کبھی تعصب کو فوقیت دینا، ان کے

لیے محال ہے ۔
وہ ذہنی طور پر لبرل ہیں، گو طبعاً ان کا میلان کنزرٹیوز کی طرف ہے، (مگر ان اصطلاحوں سے یہاں برطانوی طرزِ فکر کے مختلف اسالیب مراد ہیں) وہ طبیعت کے اعتبار سے میانہ روی کے قائل ہیں۔ ان کا نظامِ شمسی ایک مخصوص کشش پر قائم ہے اور جب تک مرکزِ ثقل کی یہ کشش قائم ہے وہ انتشار اور اختلال سے بھری دنیا میں اپنے جواہر نگار قلم سے اسی قدر دلسوزی اور دل آویزی کے ساتھ اقدار کے ایسے مراکزِ ثقل کی تلاش کرتے رہنگے، جو اس بکھراؤ اور بے ترتیب عناصر کو یکجا کر سکیں ۔ ان کا اسلوب اسی تلاش کا ایک وسیلہ ہے ۔
ایک بار گفتگو میں انھوں نے نثری اسلوب کو سمفنی سے تشبیہ دی ہے، جس میں مختلف نغموں کے درمیان ایک توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنا لازمی ہو۔ پھر اس کی توجیہ کرتے ہوئے اقدار کے درمیان توازن پر زور دیا تھا۔

> کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا ہے جیسے یہ تمام کائنات جو ہمارے علم میں ہے یا علم کے باہر ہے جس میں ہم ملفوف یا سمفنی ہیں اپنی جملہ تفصیلات، جزئیات اور تضاد و توافق کے ساتھ ایک مکمل سمفنی یا سنگیت ہو، جس کا کوئی نغمہ غیر ازآہنگ نہ ہو۔ کائنات کی یہی صفت یا قدرت اس کے تمام مشمولات کو خواہ وہ کتنے ہی عظیم یا حقیر، معلوم یا نا معلوم کیوں نہ ہوں ایک دوسرے میں پیوست اور ایک دوسرے سے مربوط، مزین، مستحکم اور با مقصد رکھتی ہے یا قانون کی زبان میں، تولے اور سنبھالے رکھتی ہے ۔
> اس حقیقت یا استعارے کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ اخلاق ہو یا آرٹ مذہب ہو، یا زندگی، ان کے مشیاد شیئون کے اظہار میں لازم آتا ہے کہ ہم مذکورہ کائناتی یا الہیاتی سمفنی کا پورے طور پر لحاظ رکھیں، جس سے وہ شہ پارہ ظہور میں آیا، یا لایا گیا ۔ اس میں نظم و نثر کی قید نہیں ۔ قید صرف آتی اور اس کی ہے کہ نظم ہو یا نثر "عبارت، اشارت اور ادا" کے اعتبار سے غیر ازآہنگ یا بے سُری

نہ ہو جا لفاظ دیگر اسلوب یا اظہار یا دونوں میں مناسب حال ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہے اس لیے ہر اظہار یا اسلوب کائناتی سمفنی کا جزو ہوتا ہے۔ نہیں ہوتا، تو ہونا چاہیے! اخلاق و فلسفہ ہوں یا فنون لطیفہ یا زندگی کے دوسرے اہم مسائل و معاملات، موزوں اسلوب و اظہار کے بغیر وہ ہمیشہ کم عیار قرار پائینگے ؟"

فکر اور تہذیب کی یہی استقامت رشید صاحب کے اسلوب کی کلید ہے۔ بلا شبہ ان کے اسلوب کی بنیاد فکر پر ہے محض جمالیاتی کیف لفظی شعبدہ گری اور تفریح و مزاح پر نہیں وہ پڑھنے والے تک نئی بصیرت پہنچانا چاہتے اور اس کے لیے خطیبانہ یا ناصحانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے اپنے تجربے میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور پڑھنے والے کو اپنا جلیس بنا لیتے ہیں رموز مملکت کو نجی راز و نیاز کے پیرایے میں ڈھال کر بیان کرتے ہیں اور کہیں کہیں ایسی سادہ مزاجی اور بے ساختگی سے کہ ان پر سعدی شیرازی کا گمان ہونے لگتا ہے جملہ معترضہ انھیں بہت عزیز ہے اور ان کے اکثر جملہ ہائے معترضہ، بلکہ بقول ان کے "صفحہ ہائے معترضہ" تک اخلاقی اقدار کے تذکرے میں صرف ہوئے ہیں، اخلاقی اقدار کے نظام کو انھوں نے جہاز کے لنگر سے جابجا تشبیہ دی ہو کہ طوفان میں یہی لنگر جہاز کو بچانے کا وسیلہ بنتا ہے ان کا آرٹ استقامت کی تلاش ہے اور یہ استقامت انھوں نے اپنے اسلوب میں مختلف اجزا کی مدد سے بہم پہنچائی۔

فکر اس استقامت کی اساس ہے لیکن فکر کو وہ کئی پردوں میں چھپا کر دلکش اور دل آویز ہی نہیں بڑا ہی سکت اور قابل قبول بنا کر پیش کرتے ہیں اس کے لیے ان کے پاس سب سے بڑا حربہ ان کی اپنی شخصیت ہے "ناکردہ گناہوں کی داد" غالب نے چاہی تھی۔ ان کی بیداد رشید صاحب ہنسی خوشی قبول کرتے ہیں۔ افراد و اقوام کی جن خرابیوں کو ہدف بنانا مقصود ہو گا انھیں خواہی نخواہی وہ یا تو اعتراف جرم کر کے انھیں اپنا لینگے کہ تنقید ہو، تو خود ان کی ذات پر ہو، اور وہ ہنسیں تو پہلے اپنے آپ پر ہنسیں، تاکہ پڑھنے والے کو ناگواری نہ ہو اور اس کے جی کا ملال دھل جائے پھر بات جتنی سنجیدہ ہو گی وہ مزاح کا اتنا ہی سہارا لینگے، لیکن یہاں مزاح پیرایہ ہوتا ہے مقصود بالذات نہیں یہ گویا نمک خوان تکلم ہے جس کا مقصد لذت و کیفیت

میں اضافہ ہے۔ قرنوں کا تجربہ اور روایتوں کی روح ایک آدھ بانکے ترچھے جملے میں جگمگا
اٹھتی ہے (مثلاً اس قسم کے جملے: "شاعر خدا سے جتنا گستاخ اور عورت سے جتنا محتاط ہو اتنا ہی
عظیم ہے") مزاح کی لگاوٹ سے وہ تہذیبی اور ثقافتی صداقتوں تک پہنچتے ہیں اور انھیں
اپنی فکر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے پیرایۂ بیان ایسا ڈھونڈھ نکالتے
ہیں جس میں ادب کی رنگینی کے اسلحہ خانوں سے مناسب زرہ بکتر بہم پہنچ سکے۔ یہ فکر و احساس
چونکہ پوری شخصیت کے رچاؤ بساؤ کا حصہ ہے اس لیے پوری شخصیت کو دلسوزی، ندرت،
ادا اور بانکپن کے ساتھ ابھرتا ہے۔

فکر و احساس کی صراحت کے واسطے رشید صاحب آزادی کے ساتھ واقعات اور کرداروں کا سہارا
لیتے ہیں کہیں کوئی پرانا قصہ ایک خاص ڈھنگ سے سناتے ہیں کہیں کوئی قصہ تصنیف کر ڈالتے
ہیں اس کی سب سے عمدہ مثالیں پرانے دنگل میں استادوں کا اپنے شاگردوں کو لنگوٹا کے سچے ہونے
کی قسم کھلوانے کا قصہ ہو یا پھر ان مفلوک الحال شریف زادے کا قصہ جو محنت مزدوری کر کے
پیٹ بھرتے تھے، مگر کھانا کھاتے وقت ضرور کسی کو کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دیتے
تھے یا پھر بکنے والے کے گھر کا قصہ جو عبرت و عظمت کا مرقع ہے فکر و احساس کے اسی پیرایے کو کبھی
کبھی وہ کرداروں کی شکل دے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض کردار ان کے تخیل کی تخلیق ہیں بعض
مادی زندگی میں موجود تو تھے یا ہیں، لیکن ان کی شخصیت اور کردار کو رشید صاحب کی نظر ہی
نے ایک واضح رخ بخش دیا ہے۔ ان میں حاجی بلغ العلیٰ جیسے کئی کردار شامل ہیں۔

کردار نگاری اور شخصیت فہمی کے سلسلے میں ایک ضمنی بحث رشید صاحب کے ان سوانحی اور تاثراتی خاکوں پر
بھی واجب ہے جو انھوں نے مختلف شخصیات پر لکھے۔ رشید صاحب بامروت اور نستعلیق ہیں،
اس لیے جس شخصیت کے بارے میں قلم اٹھاتے ہیں، اسے بے نقاب کرنا، یا اس کی کمزوریوں
کا تذکرہ کرنا خلاف تہذیب جانتے ہیں اور مشرقی تہذیب کے پرانے آئین و آداب کے مطابق
اپنے ہیرو کے مناقب پر اکتفا کرتے ہیں ان کے تخیل کی رسائی دور تک ہے اور وہ بالطبع فیاض ہیں۔
لہٰذا اپنے ہیرو کی معمولی معمولی باتوں کو بھی خوبیوں کی طرح بیان کرتے ہیں اور انسانی فطرت
کی کمزوریوں کی بھی فیاضی اور درگزر سے پردہ پوشی کرتے ہیں۔ ان کے ہیرو ایسے بھی ہیں جن سے

وہ خود کبھی بہت قریب نہیں رہے۔ جذباتی اور ذہنی طور پر بھی نہیں مثلاً ابوالکلام آزاد یا
جواہر لال نہرو، ایسے بھی ہیں، جن کے دامن میں ایسی کوئی چنگاری تھی، جو شعلہ بن کر خراج وصول
کر سکے، جیسے گھنٹہ بجانے والا چپراسی، مگر رشید صاحب نے بلے لو دو ریستان، کو بھی 'رستم پہلوان'
بنانے کے اصول پر عمل کر کے اپنے انداز بیان کے امرت سے ان شخصیات کو جگمگا دیا ہے۔ جن
سے ہیرو کی شخصیت کی بے کم و کاست تصویر تو سامنے نہیں آتی البتہ خود رشید صاحب اور
ان کا نظام اقدار بے نقاب ہوتے ہیں۔ غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا۔ رشید
صاحب کو غالب کے اشعار اور ان کے ممدوحین کے انتخاب نے۔ مگر وہ اس نیت پر بھی اپنے
ممدوحین کی کلاہ داری زیادہ کج کرنے میں کمی روا نہیں رکھتے۔ ان ممدوحین کے انتخاب اور
ان کے پیرایۂ ستایش پر غور کیجیے تو ایسا لگتا ہے کہ رشید صاحب کو چند اعلیٰ اقدار کی تلاش
ہے جنھیں وہ تہذیب و طمانیت کا جوہر جانتے ہیں۔ جہاں کہیں اور جس کسی میں وہ اقدار
پاتے ہیں اسے اپنا لیتے ہیں، جس کسی کو پسند کرتے ہیں، اس میں ان اقدار کو ڈھونڈ نکالتے
ہیں، یا پیدا کر لیتے ہیں۔ ان اقدار میں گرمجوشی، خلوص، استقامت، ذہانت اور
وضعداری کو جیسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یونیورسٹی کا گھنٹہ بجانے والے چپراسی کی استقامت
اور وضعداری انھیں پسند ہے۔ حسرت بھی انھیں خوبیوں کے باعث عزیز ہیں۔ اصغر اور
جگر کے ہاں بھی وہ انھیں خوبیوں کو ڈھونڈھتے ہیں۔ گرمجوشی، ذہانت اور خلوص کی تلاش میں
وہ ذاکر صاحب اور اقبال سہیل تک پہنچتے ہیں۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کو ادبی اور فنی رنگ
بانکپن بخشنے اور انھیں ایک ہیرو کی طرح ابھارنے میں رشید صاحب کی تحریروں کا بڑا حصہ
ہے۔ جن ذاکر صاحب سے ہندوستان واقف ہے وہ صدر جمہوریۂ ہند تھے مگر جن ذاکر صاحب
سے ادبی دنیا واقف ہے وہ رشید صاحب کے 'مرشد' تھے، جن کی ذہانت برقِ بے اماں تھی۔
جن کی محبت اور گرمجوشی متاعِ بے بہا اور جن کی سخن سنجی، حسنِ مزاح اور بزم آرائی دولت
بیدار کی حیثیت رکھتی تھی۔ رشید صاحب نے ذاکر صاحب کو ان تمام اعلیٰ اقدار کے امین
کی طرح پیش کیا جو مشرق میں تہذیب کی بنیاد سمجھی جاتی ہیں۔

ان ممدوحین کی فہرست پر غور کرنے سے یہ بھی احساس ہوگا کہ رشید صاحب کو ہندایرانی

تہذیب عزیز ہے، جو اسلامی تہذیب کے غلط نام سے مشہور ہے۔ رشید صاحب کو اس تہذیب کے ہندستانی روپ ہی سے پیار نہیں ہے اس کا عجمی اور عرب روپ بھی عزیز ہے اس کے حال زبوں سے ان کا جی دکھتا ہے اور اس کے ماضی کے عیوب کی پردہ پوشی کر کے اس کے کارناموں پر فخر کرنا انھیں پسند ہے تاکہ ماضی کی اقدار سے مستقبل کا تانا بانا تیار کیا جا سکے۔ انھیں وہ سب لوگ عزیز ہیں جو اس تہذیب کے پروردہ یا اس کے معمار ہیں۔ جو اس تہذیبی روایت سے جتنا قریب ہے اور اس تہذیب کی قدروں کا جتنا زیادہ قائل اور جتنا زیادہ عامل ہے رشید صاحب کی تعریف و تحسین کا اتنا ہی زیادہ مستحق ہے۔ اسی لیے سرسید احمد خان اور مولانا محمد علی اور ان کی فکری وراثت کے ادبی روپ اور اس کے رہبر و رہنما انھیں یکساں طور پر پیارے ہیں۔ یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ یہ لگاؤ تعصب اور تنگ نظری کے سبب نہیں بلکہ اس کی بنیاد یہ احساس ہے کہ جسے اسلامی تہذیب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ عالمی تہذیب کا ایک اہم تاریخی جزو ہے اور انسان نے تہذیب و تمدن کی جو منازل طے کی ہیں ان میں اس تہذیب نے بھی بہت کچھ دیا ہے اور عالمی تہذیب کے اس حصے کو فراموش کرنا، گویا عالمی کلچر کی نفی کرنا ہے۔ ہندستان میں بدقسمتی سے اسے "ہندو" تہذیب کے مقابل سمجھ لیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندستان میں عالمی تہذیب کے ایک وسیلے کی حیثیت سے آئی اور اس کی آفاقیت کو یہاں کی "مقامیت" میں گم کر دینا نامناسب ہوگا۔ ایک کا رشتہ ہندستان کی زمین سے ہے دوسرے کا آفاقی کلچر کی کھلی ہواؤں سے۔ اسی تہذیب کے حال زبوں نے رشید صاحب کو مزاح نگار سے مصلح قوم بنا دیا۔ وہ سیاسی اور تہذیبی مضامین کی طرف رجوع ہوئے۔ اس بات کو ایک بار انھوں نے نجی گفتگو میں عجیب انداز سے بیان کیا تھا۔ ذکر اپنے ایک مجوزہ مضمون کا تھا، جس میں گویا روز حساب اور داور محشر کے سامنے جواب دہی کا بیان ہونا تھا۔ الزام یہ تھا کہ قدرت نے مزاح نگاری کی بہترین صلاحیتیں بخشی تھیں، انھیں پوری طرح روبکار لانے کے بجائے آخر تہذیبی اور مصلحانہ مضامین کی طرف توجہ کر کے ان صلاحیتوں کا خون کیوں کیا گیا؟ جواب عرض دعوے کا یہ تھا کہ جب بازی کے سبھی شاہ پٹے۔ یکّا غلام بیگم۔ بادشاہ کٹ جائیں تو جوکر ہی کو اپنا فرض سنبھالنا پڑتا ہے۔

اس چھوٹے سے قصے میں رشید صاحب کی پوری شخصیت جلوہ گر ہے۔ اوّل تو ان کی مذہبیت کی طرف اشارہ داور محشر کے دربار اور صلاحیتوں کے خداداد ہونے کے بیان سے ملتا ہے۔ دوسرے پیشی اور مدافعت کا پورا انداز عدالتوں سے رشید صاحب کے شغف اور ان کے ماضی کا آئینہ دار ہے۔ پھر تاش کے کھیلوں کی اصطلاحات ان کی برج سے دلچسپی کو ظاہر کرتی ہیں جو ٹینس کے بعد شاید ان کا محبوب ترین کھیل تھا۔ علاوہ بریں جس سیاق و سباق میں انھوں نے یہ بات کہی، اس سے ان کی دردمندی اور دلسوزی صاف جھلکتی ہے کہ انھیں ہندستان کی اور خاص کر ہندستانی مسلمانوں کی حالت زبوں اور نام نہاد رہنماؤں کی مصلحت پرستیوں کی نذر ہو جانے کا رنج کس قدر شدید ہے۔ اور اس رنج کو رشید صاحب کس قدر لطیف بلکہ مزاحیہ انداز میں ڈھالنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں رشید صاحب کی سیاسی سمجھ بوجھ کے بارے میں کچھ لکھنا بےمحل نہ ہوگا۔ رشید صاحب کو علیگڈھ بہت عزیز ہے اور وہ اسے مسلمانان ہند ہی نہیں مسلمانانِ عالم کی تہذیبی قدروں کا امین جانتے ہیں۔ لہٰذا جب کبھی ملک کی سیاست میں افتراق و انتشار پھیلتا دیکھتے ہیں، ان کا جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر علیگڈھ ہی انتشار و اختلال کو دور کرے اور یہاں کے دانشور ملک کے سامنے نیا لائحۂ عمل پیش کریں۔ وہ علیگڈھ کی اقامتی زندگی اور اس کے اقلیتی کردار دونوں کے قائل ہیں۔ یہی ان کے سیاسی میلان کی کلید ہے۔ مجلسِ مشاورت کا قیام بہت بعد میں عمل میں آیا؛ مگر مختلف نقاطِ خیال کے مسلمان اہلِ نظر کے درمیان مشاورت کی مدد سے ایک مشترکہ عملی پروگرام طے کرنے کا خیال جن لوگوں کے ذہن میں آیا تھا، ان میں رشید صاحب سرِفہرست تھے۔ یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ رشید   سیاست لبرل اور کنزرویٹو نقاطِ نظر کا امتزاج ہے اور اس پر علمی سیاست کی   یا جذباتیت کے بجائے تحمّل، اور میانہ روی کی مہر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سیاسی نقطۂ نظر خوش عقیدگی اور مثالیت کا آئینہ دار ہے۔ آج کی دنیا جمہوریت اور سوشلزم کی دنیا ہے۔ نصف سے زیادہ دنیا پر عوام کی حکمرانی ہے، جنھوں نے قدیم اشرافیہ جاگیردارانہ شان و شکوہ اور سرمایہ دارانہ تہذیب کی چمک دمک کو ماند کر کے چاند پر کمندیں ڈالی ہیں اور انسانی عزم و ارادے کی نئی سرحدیں متعیّن کی ہیں۔ رشید صاحب کا لبرل ازم نئی عوامی

تو توں کا قائل نہیں، ان کے مضامین پڑھتے ہوئے بالزاک بار بار یاد آتا ہے جو سماجی حقیقتوں کی عکاسی، اور اپنے شگفتہ اسلوب سے دل موہ لیتا ہے، مگر اس کی ہمدرویاں انحطاط پذیر اشرافیہ کے ساتھ ہیں۔ رشید صاحب طرزِ فکر کے اعتبار سے انقلابی نہیں، اصلاح پسند ہیں۔ جو اصلاحات انھوں نے پیش کی ہیں، وہ محض خیالی نہیں، ان میں تجربے کی روشنی اور دلسوزی کی آنچ ہے۔ (مثال کے طور پر عزیزانِ علیگڈھ کے نام مطبوعہ "قومی آواز" لکھنؤ کے آخری حصے کی تجاویز ملاحظہ ہوں)

جہاں کرداروں کی تراش خراش یا واقعات کے بیان سے کام نہیں چلتا، وہاں رشید صاحب تلمیحی اور تمثیلی رنگ اختیار کرتے ہیں، ان کے مضامین کے بعض تلمیحی تمثیلی ٹکڑے کلاسیک میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔ شاید ہی اردو کے کسی نثر نگار نے تلمیح کا استعمال اس قدر زیادہ اور اس قدر خوبصورتی سے کیا ہو جتنا رشید صاحب کے مضامین میں ہوا ہے۔

تلمیح بھی رشید صاحب کا محبوب حربہ ہے اعلیٰ کلاسیکی موسیقی کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے موسیقی بنیادی ڈسپلن ضروری ہے اس کے بغیر تال سُر کی تمیز نہیں ہوتی، یہی حال رشید صاحب کے طرزِ تحریر کا ہے۔ کافی اور پکے گانے کی طرح، پہلے اس کے مزے سے مانوس ہونا درکار ہے طرزِ تحریر سے لُطف لینے کے لیے پہلے روایت کے سرمایے اور کلاسیک کی دولت سے بہرہ مند ہونا ضروری ہے کیونکہ رشید صاحب کا معمولی سے معمولی جملہ بھی سیاق وسباق کی کائنات ہمرکاب لاتا ہے اور تلمیح کے جہان آباد کرتا چلتا ہے۔ عبدالرحیم خانخانان کی تعریف میں کسی شاعر نے کہا:

منعم بکوہ ودشت وبیاباں غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

یہی خانخاناں والی رنگ رشید صاحب کے طرزِ تحریر کا ہے کہ ان کا قلم بنجر زمینوں کو گلستان بناتا اور ریگستان میں خیابان وباغ آباد کرتا گزرتا ہے اور اس کام کے لیے تلمیح کے ذریعے تاریخ و تہذیب اور فنونِ لطیفہ کے ذخیروں سے خوشہ چینی کرتا رہتا ہے۔ اگر تلمیح پر نظر نہ ہو تو ان کی تحریر کا سیاق وسباق واضح نہ ہو پائیگا۔

رشید صاحب کے مزاحیہ مضامین اور سنجیدہ تحریروں پر اکثر یہ اعتراض غلط فہمی کی بنا پر کیا جاتا رہا ہے کہ ان میں علیگڈھ بہت ہے۔ خود رشید صاحب نے یہ جرم بہت عام کر دیا ہے کہ علیگڈ

جانے پہچانے بغیر ان کی شناخت ممکن نہیں۔ اس بھرم کا سبب رشید صاحب کی علیگڑھ سے بڑھی ہوئی محبت ہے اور محبت اور جنگ میں سب کچھ روا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رشید صاحب کے طرزِ تحریر کی پہچان کے لیے علیگڈھ اتنا لازمی نہیں، جتنا ان تحریروں کا تہذیبی سیاق و سباق ہے۔ اور اس عظیم تہذیبی سیاق میں ایک صید زبوں علیگڈھ بھی ہے بقول غالب، مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجۂ خوں وہ بھی، یعنی علیگڈھ محبوب نہیں، اس کا سمبل ہے۔

تمثیل سے بھی رشید صاحب نے بڑا کام لیا ہے۔ ان کے بہترین تمثیلی ٹکڑے ان کے مضامین "یکہ والا"، "سلام ہو نجد پر"، اور "دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے" میں نمایاں ہیں۔ (آخر الذکر دونوں "فکر و نظر" علیگڈھ میں چھپے)۔ ایک مضمون طلبا کی بدعنوانیوں اور تعلیمی دنیا کے خلفشار اور بدنظمی پر ہے، خطاب طلبا ہی سے ہے۔ جابجا پرانی تعلیم اور تربیت کی اعلیٰ قدروں کا تذکرہ ہے۔ ضبط و نظم، آئین بندی اور ضابطے کی پابندی کی برکتوں کا ذکر ہے اور طلبا کی نئی نسل کی بے راہ روی پر افسوس کا اظہار ہے۔ مضمون کا خاتمہ ذاتی، بلکہ نجی لہجے پر ہوتا ہے لکھتے ہیں

> جب کبھی کانووکیشن سے واپس گھر جاتا تھا راستے میں نالے پر سے گزرتے ہوئے یہ سوچ کر افسوس ہوتا تھا کہ نالے میں بہتا ہوا شفاف پانی اگر میرے باغیچے کو ملتا تو کیسے کیسے گلاب کھلتے اس بار جب نالے پر سے گزرا، تو اس کے گندے اور کیچڑ بھرے پانی کو دیکھ کر اس کا شکر یہ ادا کیا کہ میرا باغیچہ اس گندے پانی سے محفوظ ہے۔

یہاں گلاب سے رشید صاحب کے غیر معمولی شغف کا اظہار بھی ہوتا ہے اور یہ غیر معمولی شغف رشید صاحب کی شخصیت کا ایسا ہی لازمی جزو ہے، جیسے علیگڈھ، غالب، نیس یا مرشد کیونکہ گلاب کے بغیر رشید صاحب کی کوئی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ گلاب ان کے جیب و گریبان کی زینت نہیں، ان کی شخصیت میں، ان کے اسلوب اور ان کے ذوق میں گلاب کی یہ مہک سمائی ہوئی ہے۔ اس اقتباس میں کیسی تمثیلی تہہ داری مضمر ہے۔ آج کے نوجوانوں کی صلاحیتیں اگر تعمیری راہ

پا جائیں تو کیسے کیسے گلزار کھلا سکتی ہے۔
رشید صاحب کو ہم آواز اور ہم وزن الفاظ کی ترتیب دینے اور ان سے نئی نئی تراکیب بنانے کا بھی شوق ہے۔ اس کا ذکر گلابوں میں قلم لگا کر نئی اقسام پیدا کرنے کے ضمن میں کیا جانا چاہیے۔ جونپور، لکھنؤ کے دبستان سے متاثر رہا ہے صفی لکھنوی نے جونپور پر جو نظم لکھی ہے وہ اس تمدنی یگانگت کی ایک مثال ہے لکھنؤ الفاظ کی مزاج دانی اور ان کی تہ داری اور ترکیب وضع کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ رشید صاحب نے اس معاملے کو بازیگری، کرتب بازی، ثقالت اور بے نمکی سے آزاد کر کے زندہ کیا اور دلچسپ بنا دیا۔ ان کی تراشی ہوئی متعدد ہم وزن الفاظ کی تراکیب اردو ادب میں عام ہوئیں اور ان کے نقش قدم پر چل کر متعدد انشا پردازوں نے اس قسم کے الفاظ کو یکجا کر کے نئی جھنکار پیدا کرنے کی کوشش کی۔
ہم صورت الفاظ کی یکجائی سے خوشنمائی پیدا کرنا رشید صاحب کو قول محال اور ایجاز بیان کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ جس کی بنا پر بعض نقادوں نے ان کا رشتہ آسکر وائلڈ سے ملایا ہے۔ بعض نے سجاد انصاری سے بعض نے برنارڈ شا سے۔ یہ صحیح ہے کہ مزاجاً رشید صاحب دکنٹو رین ہیں ان کا قلعہ ان کا گھر ہے ان کا پائین باغ ان کی سلطنت، لفظوں کو ہیرے کی طرح تراشنا اور ان کو نت نئے مرکبات میں سجا کر ان سے برقی رَو پیدا کر لینا ان کا مشغلہ ہے۔ مذہب اور اخلاق کا پاس، مروت اور وضعداری سے لگاؤ اور اس کے ساتھ سارا کائنات اور اس کی اقدار کو ایک ضابطے اور نظام کا پابند پاکر گردش زمین سے سیارے کا نغمہ سن لینے کی کاوش یہ بھی کچھ دکٹوریَن ہے لیکن اس کے باوجود ان کا طرز لفظوں کا غلام نہیں، تہذیب اور معاشرت کو سنوار دینے والے خیالات کا وسیلہ ہے۔ اسی لیے الفاظ ماورائے سخن والی بات کو ادا کرتے ہیں محض بازیگری اور رعایت لفظی کا ذریعہ نہیں بنتے۔
لفظوں سے یہ شغف، ان سے آواز، رنگ، تصویر اور کردار نگاری کے کام نکالنا دراصل رشید صاحب کی اس خوش مذاقی کی دلیل ہے، جو ان کے نزدیک زندگی کی

اصل روح ہے ۔ وہ کڑھے ہوئے ذوق سلیم کے قائل ہیں، جہاں وہ زندگی کی اور لطافتوں کو عزیز رکھتے ہیں، وہیں حسنِ بیان کے بھی قدردان ہیں۔ مزاح انھیں اس لیے عزیز ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کی برکتوں کا ضامن ہے اور جہاں کہیں کو بڑا دیکھتے ہیں، اسے ہنسی ہنسی میں ٹوک ضرور دیتے ہیں تاکہ ضمیرِ تہذیب مجروح نہ ہو۔ یہ GENTLEMAN'S WIT محض خوش وقتی نہیں، اجتماعی ذمّے داری کا نشان ہے ۔ اندرے ژید نے کہا تھا کہ ہر حال میں خوش رہنا محض طبعی احتیاج ہی نہیں، اجتماعی ذمّہ داری بھی ہے ۔

اسی متوازن مذاقِ سلیم اور خوش ذوقی کی تلاش رشید صاحب نے اپنی تنقیدوں میں بھی کی ہے۔ ان کے اصولِ تنقید بھی اسی لطافتِ احساس کے آئینہ دار ہیں جس کے رشتے تصوّف اور الہام سے جا ملتے ہیں۔ ان کا کوئی نام نہیں ۔ اصول اور ضابطے کی حدبندیاں یہاں کام نہیں آئیں ۔ اس قسم کے تنقیدی شعور کو نہ یونیورسٹیوں میں پڑھایا جا سکتا ہے، نہ سائنسی ضابطوں کی زبان میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کا اظہار رشید صاحب کی تنقیدوں میں کوندتے اور دمکتے جملوں سے ہوتا ہے۔ یہ جملے ثبوت مہیا نہیں کرتے، مگر دور تک بصیرت کے افق روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ پڑھنے والا اپنے کو اجنبی ارتعاشات کی گرفت میں محسوس کرتا ہے اور اپنی پوری علمی اور ادبی شناسائیوں کی متاع کو لخت لخت مرتّب کرنے لگتا ہے ۔

مثلاً مغلوں نے ہندستان کو تین تحفے دیے : "تاج محل، غزل اور مرزا غالب" یا "غالب نے اردو غزل کو اپنا نسب نامہ دینے کی کوشش کی" (یعنی اپنی وراثت کے ایرانی اثرات بخش دیے) نیا وجدان شعر بخشنے کے لیے کافی ہیں ۔

رشید احمد صدیقی دلّی "قامت آزادوں" کی نسل سے تعلّق رکھتے ہیں ۔ ان میں فسانۂ آزاد بھی شامل ہے۔ محمد حسین آزاد کی باغ وبہار نثر بھی، اور ابوالکلام آزاد کی پُروقار اور دلآویز ادبی شخصیت بھی ۔ مگر ان سب "آزادوں" سے بھی وہ آزاد رہے ہیں : دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من ۔ وہ اپنی انفرادیت کے بانکپن پر آنچ نہیں آنے دیتے ۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت اور اسلوب دونوں دورِ حاضر میں متاعِ رفتہ کا حسین ترین سراغ ہیں،

جسے غالب نے رہزن پر قرض سمجھ لیا تھا، متاعِ رفتہ جس میں صدیوں کی تہذیب کے زر و جواہر کی چمک جھلملا رہی ہے اور جس کے حسن اور دل آویزی سے اُردو نثر نے نیا رنگ آہنگ پایا ہے۔

وزیر آغا

رشید احمد صدّیقی

ایک مفکّر!

اکثر لوگ رشید احمد صدیقی کا نام سنتے ہی مسکرانے یا قہقہہ لگانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ہر اچھا مزاح نگار قاری میں REFLEX ACTION ضرور پیدا کرتا ہے، اور یوں وہ زمین از خود ہموار ہو جاتی ہے جس پر چند لمحوں کے بعد زعفران زار کا گمان ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی! فائدہ یوں کہ مزاح نگار کو موزوں اور ہمدردانہ فضا کی تعمیر کے لیے کوئی خاص تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، جس کے نتیجے میں اس کی طنز کی لطیف سے لطیف جراحت اور مزاح کا موہوم خم بھی قاری کو مس کرتے ہوئے گزرنے لگتا ہے۔ نقصان یوں کہ قاری مزاح نگار کی اس صفت کے طلسم میں اس قدر گم ہو جاتا ہے کہ اس کی نظریں ان بیشتر دوسری صفات کے لیے اندھی ہو کر رہ جاتی ہے جو ممکن ہے کہ اس مزاح نگار کا زیادہ قابلِ قدر سرمایہ تھیں۔ رشید احمد صدیقی کو اپنی مزاح نگاری سے فائدہ تو یقیناً پہنچا ہے کہ آج ان کا شمار اُردو کے بہترین طنز اور مزاح لکھنے والوں میں ہوتا ہے، لیکن نقصان کا اندازہ بھی لگائیے کہ اکثر لوگوں نے انھیں محض ہنسنے ہنسانے کا ایک ذریعہ سمجھا اور ان کی بیشتر دوسری صفات سے اس حد تک چشم پوشی اختیار کر لی، کہ ان کی مکمل ادبی شخصیت ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ کچھ لوگوں کو یہ تک نہیں معلوم کہ رشید احمد صدیقی کو طنز نگاری

کے علاوہ خاکہ نگاری میں بھی کمال حاصل ہے اور انھوں نے "گنجہائے گرانمایہ" اور "ہمنفسانِ رفتہ" میں اپنے چند معروف اور غیر معروف رفقاء کے ایسے خوبصورت خاکے لکھے ہیں کہ شاید اس میدان میں ابھی ایک لمبی مدت تک انھیں کسی حریف کا خدشہ نہیں ہوگا۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ۔ خاکہ نگاری کی اس صنف کو تو پھر بھی چند ناقدین نے سامنے لانے کی کوشش کی ہے (گو اس ضمن میں بھی رشید احمد صدیقی کی چھوڑی ہوئی "پھلجھڑیوں" ہی نے انھیں زیادہ متاثر کیا ہے) مگر ان خاکوں میں رشید احمد صدیقی خاکہ نگاری اور مزاح نگاری سے اوپر اٹھ کر جس خوبصورتی اور اعتماد کے ساتھ ایک مفکر کی حیثیت میں ہمارے سامنے آئے ہیں، اس کا بھرپور تذکرہ ابھی تک ہم نے نہیں کیا؛ اور یہ بڑے ظلم کی بات ہے ۔

یاد رہے کہ میں نے رشید احمد صدیقی کو مفکر کہا ہے، مصلح نہیں! مصلح کے ہاں بھی فکر کا عنصر ہی غالب حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ یہ عنصر زیادہ تر مستعار ہوتا ہے، جب کہ مفکر اسے اپنے تجربات سے کشید کرتا ہے ۔ دوسرے مصلح چاہتا ہے کہ اپنے فکری جواہر کو اس طرح سے بروئے کار لائے کہ قارئین اس کی دکھائی ہوئی راہ پر بڑھتے چلے جائیں، جب کہ مفکر کے ہاں ایسا کوئی مقصد نہیں ہوتا؛ اس کے ہاں افکار کے اظہار کا اس کی اپنی ذات کے انکشاف کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہوتا ۔ ان دونوں میں ایک اور فرق بھی ہے مصلح جب بھی خطاب کرے گا، ایک اونچے سنگھاسن پر کھڑے ہو کر، جس کے نتیجے میں اس کی آواز تصنع کی حد تک بلند بانگ ہو جاتی ہے ۔ مگر مفکر کے ہاں خود کلامی کا انداز ملتا ہے، جو ایک معتدل لہجے کو جنم دیتا ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں مصلحین تو انگنت دستیاب ہوتے رہے ہیں، جب کہ مفکر کبھی کبھار ہی پیدا ہوتا ہے ۔ رشید احمد صدیقی بھی مفکر ہیں، مصلح نہیں! جب وہ کسی شخصیت پر سے پرتیں اتارنے لگتے ہیں، تو اس عمل کے دوران میں قطعاً غیر ارادی طور پر اپنی ذات پر سے بھی ایک آدھ پرت اتار دیتے ہیں، اور قاری فکر کی تازگی اور تجربے کی صداقت کی ایک ہلکی سی جھلک ہی سے دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے ۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے زندگی کو کسی مکان کی چھت پر سے نہیں دیکھا،

بلکہ انھوں نے اسے نیچے بازار میں اُتر کر "محسوس" کیا ہے ۔ احساس کی یہ سطح صرف اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب گزرتا ہوا انبوہ آپ سے ٹکرا کر گزرے؛ اور آپ خوشبو کو بدبو سے، سختی کو نرمی، اور حرکت کو ٹھہراؤ سے ممیز کرنے کے قابل ہو جائیں۔ رشید احمد صدیقی نے نصف صدی تک زمانے کو "محسوس" کیا ہے اور زندگی کے لاتعداد کرداروں کو ان کے ہر رنگ روپ میں دیکھا ہے۔ نتیجۃً ان کے ہاں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ تجربے کی صداقت اور تازگی بھی اُبھری ہے۔ مگر خوبی کی بات یہ ہے کہ صدیقی صاحب نے اپنے افکار کو قارئین پر لادنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ باتوں باتوں میں غیر رسمی طور پر ان کا اظہار کیا ہے۔ اسی لیے ان کا تاثر بھی شدید ہے۔

رشید احمد صدیقی کے ہاں فکر کی گہرائی، اسلوب کی تازگی اور تجربے کی صداقت کا اندازہ ان چند جملوں سے لگایئے، جو میں نے اُن کی تازہ کتاب "ہم نفسانِ رفتہ" سے لیے ہیں:

> سچی وطن دوستی اور سچی انسان دوستی میں کوئی فرق نہیں۔ انسان دوستی بغیر وطن دوستی ایک واہمہ ہے، اور وطن دوستی بغیر انسان دوستی ایک مغالطہ ہے۔

> جو قومیں کسی بیرونی طاقت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہیں، وہ تھوڑی سی کوشش سے جلد رہائی حاصل کر لیتی ہیں، لیکن جو اپنے ہی بنائے اور اختیار کیے ہوئے طوق و سلاسل میں گرفتار ہوں، وہ بڑی مدت میں "بعد از خرابیِ بسیار"، ان سے نجات پاتی ہیں۔

> انسان کی سیرت اور شخصیت کا بھید جتنا مصیبت اور بیماری میں کھلتا ہے، کہیں اور نہیں کھلتا۔ مصیبت اور بیماری کی بھٹی میں کسی طرح کا ملمع قائم نہیں رہ جاتا۔

> زندگی اپنا چولا افراد میں بدلتی ہے، جماعت میں نہیں۔ جماعت اختراع اور انقلاب سے محروم ہوتی ہے؛ اختراع اور انقلاب صرف افراد کا حصّہ ہے۔

جب تک کوئی معلّم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیے ۔

مذہب کا بیوپار کرنے والوں سے میں دور اکم ہی یاداللہ رکھتا ہوں ۔ ایسے لوگوں کو میں نے بالعموم احساس کمتری کا شکار پایا اور یہ احساس انسان کے خصائل کو ایسا مسخ کر دیتا ہے کہ شرافت و شجاعت، درگزر اور دردمندی اور اسی طرح کی دوسری انسانی صفات جو مذہب اور اخلاق کی رُوح ہیں، اکثر لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہیں، جو اپنے آپ کو مذہب کا اجارہ دار بتاتے ہیں ۔

سید صاحب (سید سلیمان ندوی) کی شخصیت بڑی دلآویز اور قابلِ احترام تھی ۔ اُن کو دیکھ کر اور پاکر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی، کہ وہ شفقت کرینگے، رسوا نہ کرینگے، اور حربت کے ساتھ رہنگے، زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی

کھیل میں، کھاتے پر اور سفر میں ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے ۔

علماء کی رسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سُنی تھی، طلبا کے ہاتھوں کبھی سننے میں نہیں آئی تھی ۔ اب تک طالبعلم کو عالم کی ناموس کا سب سے بڑا محافظ خیال کرتا تھا ۔ اگر ایک عالِم کی موت عالَم کی موت ہے، تو ایک عالِم کی بے حرمتی کو کیا کہینگے !

مذہبی آدمی اپنے کو دوسرے سے علٰحدہ اور ممتاز سمجھتا ہے، جیسے اس میں برہمنیت راہ پاگئی ہو، اور وہ اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھتا ہو ۔ لیکن وہ اپنی معمولی سی بات سے بےخبر ہوتا ہے کہ اگر وہ خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہے، تو اس کا مامور ہونا اس کی آزمائش پہلے ہے، اور فضیلت بعد میں ۔

کسی آدمی کے بڑے ہونے کی پہچان ایک یہ بھی ہے کہ اس کو غریبوں اور بچّوں سے کتنی محبت ہے ۔

آخر کار منصب نہیں، بلکہ شخصیت فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے ۔

دنیوی جاہ وحشمت سے بے نیاز تھے، کسی سے جھگڑتے نہیں تھے، جھگڑنا اپنے
رُتبے سے فروتر سمجھتے تھے، لیکن اس کی نوبت آجاتی تو اپنی سطح سے نیچے نہیں
اُترتے تھے۔ حریف کے مقابلے میں یہ ان کی پہلی جیت ہوتی تھی

ان چند اقتباسات کے مطالعہ سے رشید احمد صدیقی کی شخصیت کے بہت سے پہلو نظر کے سامنے ابھر آتے ہیں، جن سے امکمزوریں تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کشادہ نظری کے ساتھ ساتھ کشادہ دلی کی بھی فراوانی ہے۔ وہ مذہبی تنگ نظری اور "برہمنیت" کے مخالف اور عام زندگی میں چشم پوشی اور درگزر کے قائل ہیں۔ ایک اسکالر کی شان بھی یہی ہے۔ ورنہ ہمارے ہاں خیر سے ایسے ایسے "اسکالر" بھی موجود ہیں، جو اپنی شکست کا انتقام لینے یا محض حسد یا احساس کمتری کے تحت شخصی سطح پر اُتر کر پست ترین انداز تخاطب اختیار کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں دیکھتے۔ پھر ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جن کے لغت میں کشادہ نظری گالی کے مترادف ہے۔ چنانچہ وہ اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ وہ "تنگ نظر دانشمندوں" کی صف میں شامل ہیں۔ ادبی پستی اور بازاری سطح کی اس فضا میں جب پروفیسر رشید احمد صدیقی کی عالی ظرفی کی مثال سامنے آتی ہے، تو زندہ رہنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ جو لوگ موصوف کے مزاحیہ مضامین کو اس غرض سے پڑھتے رہے ہیں کہ مکروہات دنیا سے چند لمحوں کے لیے فرار حاصل کر سکیں، ان سے میری گزارش ہے کہ وہ ایسا اللہ کہ ان مضامین کا بھی مطالعہ کریں جو ہمیں زندہ رہنے اور زندگی کو اس کی تمام تر صعوبتوں اور ناخوشیوں کے ساتھ قبول کرنے پر مائل کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے یہ مضامین قاری کو زندگی کی پست سطح سے اوپر اُٹھانے اور اسے زندگی کرنے کا گُر سمجھاتے ہیں۔ ان میں فکر کے عناصر ایک ایسی دلآویز شخصیت کو بے نقاب کرتے ہیں، جو تعصب، جنگ، گھٹن اور تنگ نظری کے اندھیروں میں روشنی کے ایک مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔ کاش کہ ہم لوگ روشنی کے اس مینار سے نور کا اکتساب کر سکتے!

رشید احمد صدیقی
بحیثیت مزاح نگار

اُردو ادب میں طنز و ظرافت کا نام لیجیے، تو وزن و وقار، گہرائی اور معنویت، نفاست اور پُرکاری کے اعتبار سے سب سے پہلے ہماری نظر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی طرف جاتی ہے۔ وہ بہرحال اپنے فن اور مواد کے بل بوتے پر اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز اور سب سے زیادہ دیر تک زندہ رہنے والے طنز نگار ہیں۔ دور سے دیکھیے، تو ان پر فلسفی اور مرثیہ گو کے معجون مرکب کا گمان گزرتا ہے؛ گفتگو سنیے، یا ان کی تحریر پڑھیے، تو زعفران زار، فرحت و انبساط سے بھری ہوئی، خندۂ زیرِ لب کو دعوت دینے والی، قول محال کا اعلیٰ نمونہ، ذہن کے گوشوں کو بیدار کرنے والی۔

مزاح زندگی کے غیر متناسب اور بے جوڑ مظاہر کو نمایاں کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور طنز کی ہلکی ہلکی آمیزش اسے جاندار، تابناک اور دیرپا بنا دیتی ہے۔ زندگی کی کجروی، افراد کی کمزوریاں، ان کے تناقص اور ان کی بوالعجبیاں، اسی صورت میں نظر آتی اور مزاح کے لیے خام مواد فراہم کرتی ہیں، جب ایک طرف مزاح نگار کے تجربے میں وسعت، تنوع اور رنگا رنگی ہو، اور دوسری جانب اسے اظہار و ابلاغ کے ذرائع پر پوری دسترس۔ مزاح کے نقوش ہلکے اور گہرے ہوتے ہیں، اس کی اقسام بھی مختلف ہیں اور ان میں طنز کی چاشنی اسی وقت پیدا کی جاسکتی ہے، جب تنظر حجابات سے گزر کر حقیقت کے جلوہ کی تاب

لا سکے۔ مزاح نگار کا مزاح، ہجو نگار کے مزاج سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں جوش و جذبہ
کی کمی، عام سوجھ بوجھ اور لاتعلقی کی فراوانی ہوتی ہے۔ حسد ہنسی کا سب سے بڑا دشمن
ہے۔ مزاح نگار میں تندی، تیزی اور جھلاہٹ نہیں ہوتی، بلکہ سطحِ آب کا سا سکون
اور نرم روی۔ وہ نہ انقلاب کا پجاری ہوتا ہے، نہ بلند آہنگ اصول کی میزان پر عمل
اور اخلاق کی بے راہ روی کو تولتا ہے، نہ اپنے اعلا نصب العین کے طلسم کے ٹوٹ جانے
اپنی روح کی واماندگی اور تلخی کو آفاقیت کا رنگ دینے پر آمادہ۔ وہ تو بس اپنے ذہنی مینار
میں اطمینان سے بیٹھ کر انگنت، رواں دواں مخلوق پر نظر ڈالتا اور اس سے لطف اندوز
ہوتا ہے۔ انسان کی بے تکی اور غیر آہنگ باتیں، ان کے اقوال و افعال کا تضاد، ان کے
احوال و رجحانات کا تناقض، ان کی دماغی غیر حاضری، ان کی غیر ارادی حرکات، اُن کا
غیر سماجی پن، ان کے حیاتی ردِ عمل کی سست رفتاری، ان کے اندر لچک اور مطابقت
کی کمی، ان کی شخصیتوں میں حقیقت اور فریب کا تنافر، ان سب کو وہ خود دیکھتا، دوسروں
کو دکھاتا اور اپنے تاثرات کو قہقہے میں ڈبو دینا چاہتا ہے۔ اس کا مشاہدہ اس کو ہنسنے پر
مجبور کرتا ہے۔ سماجی یا اخلاقی انقلاب کے لیے نہیں اُبھارتا۔ ہنسی چونکہ ایک سماجی
عمل ہے، ایک آواز ہے، جو بازگشت کی طالب ہوئی ہے، اس لیے ہم بھی اس ہنسی میں
خوشی خوشی شریک ہو جاتے ہیں۔ برگساں کی رائے کے مطابق مزاح نگار وحدت کی بجائے
کثرت کے ماحول کو پسند کرتا اور اس میں اپنے فن کو پروان چڑھاتا ہے۔ وہ براہِ راست
ترغیب نہیں دیتا، محض لطیف اشارے کرتا ہے۔ اس کا تعمیر کی بہ نسبت تنقید کی جانب
زیادہ میلان ہوتا ہے۔ اس کا احساس برتری صرف فریبِ نظر ہے، کیونکہ وہ اپنی کوتاہی
اور غیر آہنگ برتاؤ اور عمل پر بھی خوب کھلے دل سے ہنستا ہے۔ وہ بزرگوں کے اس عقیدے
کو سمجھتا اور اس پر ایمان رکھتا ہے کہ ہنسی سلیم الطبع انسان کی صحت کی ضامن ہے۔ غیظ
غضب، اور کینہ پروری سے وہ اپنے آئینۂ دل کو ملوث نہیں ہونے دیتا۔ لیکن اس کے ساتھ
ہی وہ ہمدردی، رحم اور محبت پر بھی عارضی طور سے پہرے بٹھا دیتا ہے، کیونکہ یہ دونوں قسم کے
کے شفاف، رواں اور ابلتے ہوئے چشمے میں ٹھہراؤ پیدا کرتے اور اسے گدلا کر دیتے ہیں

اس کی پہیلی ہمیشہ خالص ذہانت سے ہوتی ہے۔
رشید احمد صدیقی کا فن اور ان کی شخصیت ان تمام لوازمات کو پورا کرتی ہیں، جن کا ذکر ابھی کیا گیا۔ ان کے تجربات میں وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ وہ مزاح پیدا کرنے کے تمام وسائل پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور انھوں نے ان کو عملاً استعمال بھی کیا ہے۔ اگر ان کے مضامین اور تقریروں کے مجموعہ پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان کے مزاح کی کارفرمائی کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ وہ مختلف النوع افراد، جماعتوں اور پیشوں کے حالات سے صحیح واقفیت رکھتے ہیں، اور ان کی بوالعجبیوں کو اپنے مزاح اور تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ مولوی، پروفیسر، لیڈر، شاعر، وکیل، گواہ، عاشق، [illegible] آئی سی، ایس افسر، نان کوآپریٹر، اراکین پارلیمنٹ، فلسفی، چودھری، فنکار اور مقررین ان کے خاص کردار ہیں، جن کے قول و عمل کے تضاد، تنافر اور بے تکے پہلوؤں کو توڑ مروڑ کر مبالغہ آمیزی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں، اس لیے کہ مبالغہ اور توڑ مروڑ، مزاح اور تضحیک کے عناصر ترکیبی میں شامل ہیں۔ علاوہ ان خامیوں کے، جن کا ذکر ہوا، مزاحیہ کردار میں دو خصوصیات کا پایا جانا بہت ضروری ہے۔ اوّل، ایک قسم کا بے لوچ پن اور سخت گیری؛ اور دوسرے خود بینی اور خود نمائی۔ یہ دونوں خصوصیات اس امر کی علامت ہیں کہ ایسا کردار نہ اپنے آپ میں ربط تلاش کر سکتا ہے، اور نہ سماج کے دوسرے افراد سے تطابق اور ہم آہنگی قائم کر سکتا ہے۔ وہ خود ہمیشہ فریب میں مبتلا رہتا ہے، اور دوسروں کو بھی فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہی چیز مزاح نگار کو ہنسنے پر اکساتی ہے اور چونکہ مزاح کو طنز سے الگ رکھنا دشوار ہے، اس لیے بعض مستثنیٰ صورتوں کے علاوہ ہنسی کبھی خالص اور بے میل نہیں ہوتی۔ مگر رشید صاحب کے طنز میں زہر آلود تلخی، مردم بیزاری اور شقاوت نہیں ملتی، بلکہ بہت ہلکے اور معقول سے چھینٹے۔ یہ کہنا بھی کچھ زیادہ غلط نہیں ہے کہ نہ صرف سنجیدہ اور اہم خامیاں اور کوتاہیاں ہی، بلکہ بعض اوقات غیر اہم خامیاں بھی، مزاح نگار کے طنز کا ہدف بن جاتی ہیں، اور ایسی حرکات بھی جن میں خلوص کے ساتھ غلو برتا گیا ہو۔ یہ اس لیے کہ مزاح نگار خوش مذاقی اور ضبط کا دلدادہ ہوتا

ہے، اور ضرورت سے زیادہ جوشش و خروش کو شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے؛ وہ اس پر مسکرا دیتا ہے۔ لیکن یہ امر ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ مزاح نگار کا مقصد ضرر رسانی، یا دل آزاری نہیں ہوتا؛ اس کا مطمح نظر اصلاحی اور افادی بھی نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے تفنن طبع اور طنز کے تیروں کا نشانہ بننے کے بعد ہمارے اندر احساس نفس جاگ اٹھے، جو پایان کار ہماری اصلاح کا موجب بن جائے۔ لیکن یہ مزاح نگار کا مقصد اوّلین نہیں ہوتا۔ اس کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ ہمارے بے ہنگم افعال اور خود بینی و خود نمائی کے مظاہر کا تماشہ خود دیکھے، اور دوسروں کو دکھائے؛ اور ان سے انبساط حاصل کرنے کا سامان فراہم کرے۔

اس امر کا ذکر کیا جا چکا ہے ۔۔۔ اشیا اور خاص طور پر افراد کے غیر متناسب پہلوؤں کے مشاہدات اور ان پر غور و فکر کے نتیجہ کے طور پر مزاح وجود میں آتا ہے۔ لیکن مزاح کی مختلف اقسام ہیں۔ یہ تقسیم ان اثرات کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے، جو اس سے مرتب ہوتے ہیں۔ مزاح خالص نقالی بھی ہوتا ہے، علمی، اور جذباتی بھی، اور طنزیاتی بھی۔ پہلی قسم وہ ہے جس میں ہم بے تحاشا ہنسنے بلکہ قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہمارے ذہن سے کہیں زیادہ ہمارے پھیپھڑوں کی ورزش ہوتی ہے؛ اس میں لطافت اور بذلہ سنجی کو دخل نہیں ہوتا۔ اس کا جواب، وہ عملی مذاق ہے، جس کے ذریعے سے ابتدائی زمانے کا انسان اپنی ظرافت کو ظاہر کیا کرتا تھا۔ اس میں تناسب اور اعتدال بھی بار نہیں پاتے۔ علمی مزاح خالص ذہانت کو اپیل کرتا ہے۔ عمل کی طرح خیال میں بھی بوالعجبیاں ہو سکتی ہیں؛ انھیں ظاہر کرنے کے لیے مزاح نگار لفظوں کے الٹ پھیر کے فن سے کام لیتا ہے۔ علمی مزاح قہقہہ کے بجائے صرف تبسم زیرلبی کی دعوت دیتا ہے۔ اور ذہن میں ایسی خوشگواری کے ساتھ نفوذ کرتا ہے، جیسے بنفشئی شعاعیں جسم کے مساموں میں، داخل ہو جاتی ہیں۔ جذباتی مزاح بظاہر ایسا مرکب معلوم ہوتا ہے، جس کے عناصر ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں [illegible]۔ اس سے مراد، مزاح کی وہ قسم ہے جو جذبات کو اپیل کرنے والے حالات کا متیجہ [illegible] ہوتا ہے۔ ہمدردی، محبت، رقابت اور خلوص کے مظاہرے بھی بعض اوقات ہمیں

ہنسنے کی دعوت دیتا ہے، اس لیے نہیں کہ یہ جذبات بجائے خود قابل تضحیک ہوتے ہیں، بلکہ اس لیے کہ کبھی کبھی ان جذبات کا مظاہرہ کرنے والے حد اعتدال سے متجاوز ہوجانے کی وجہ سے مضحک نظر آتے ہیں، اور بعض اوقات ان کے یہاں حقیقت اور اس کے خیالی پیکر میں بغایت تفاوت ہوتا ہے۔ مزاح کی چوتھی اور آخری قسم وہ ہے جہاں تفنن طبع کے پیچھے اور اس میں ملی ہوئی تھوڑی سی جلن (ENVY) بھی ہوتی ہے، اور یہ سر اسر اس مزاح نگار کے یہاں مل جائے گی، جو لطف و انبساط کا شائق ہونے کے ساتھ ہی تھوڑا سا شعور اور آگہی بھی رکھتا ہو، جس کے مزاج میں ہمواری، توازن اور عقل سلیم کے ساتھ ہی تفکر، احساس اور کسی قدر عینیت پسندی بھی ہو؛ ایسے شخص کی ہنسی سادہ اور بے میل نہیں ہوسکتی۔

مزاح کی تقسیم ایک اور اصول پر بھی کی جاسکتی ہے۔ بعض اوقات مزاح صرف الفاظ کے ذریعے سے پیدا کیا جاتا ہے، یعنی الفاظ کی ترتیب کچھ اس طور پر کی جاتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس وہ مزاح ہے، جو خیالات کے تضاد اور ان کی غیر ہم آہنگی سے وجود میں آتا ہے۔ پھر مزاح کے لیے قول محال کا استعمال بھی حد درجہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ اس میں بھی عکس ترکیب کا وہی طریقہ بروئے کار لایا جاتا ہے، جو الفاظ کے سلسلے میں مفید ہوتا ہے۔ مزاح اس وقت بھی پیدا ہوتا ہے، جب مزاح نگار کسی خاص صورت حال کے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ بعض دفعہ محض نامتناسب اشیا یا خصوصیات کو بالمقابل رکھنے سے مزاح پیدا ہوتا ہے۔ مقبول ترین مزاح اقدار کے نرالے لامرکزی اور غیر متناسب پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے ابھرتا ہے۔ ہم ان پر کچھ تو اس لیے ہنستے ہیں کہ یہ پہلو حقیقت کی عام تفسیر سے مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ سماج کے مطالبات سے غیر آہنگ ہوتے ہیں؛ اور کچھ اس لیے کہ ہم اپنے تئیں کم از کم عارضی طور پر یعنی ان کرداروں سے لطف اندوز ہونے کے دوران میں، انھیں کمزوریوں اور غلطی سے منزہ اور بلند و برتر سمجھتے ہیں۔ غالباً اسی بنا پر سترھویں صدی کے مشہور سیاسی مفکر ہابس نے یہ

خیال ظاہر کیا تھا کہ مزاح عارضی احساسِ تفاخر کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ اسی سے ملتا جلتا خیال حکیم افلاطون کے یہاں بھی ملتا ہے۔ مزید برآں مزاحیہ فضا کی تشکیل سے بھی ہمارے احساسِ مزاح کی تسکین ہوتی ہے۔ اور ہم تھوڑی دیر کے لیے زندگی کے غموں، اور اس کی گرانباریوں اور محرومیوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ لیکن مکمل ترین مزاح اسی وقت وجود میں آتا ہے جب کہ خیال، کردار، صورتِ حال اور فضا چاروں ایسی ہوں کہ وہ ہمیں بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیں، اور ہم ایک غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے زندگی کے طربیہ سے لطف اندوز ہو سکیں۔

رشید صاحب مزاحیہ تاثرات کی تشکیل کے لیے مختلف وسائل سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنی سنجیدہ تحریروں میں بھی سرحرفی صنعت (ALLITARATION) کے بہت دلدادہ ہیں۔ مزاحیہ مضامین میں اس صنعت کا استعمال بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ بذاتِ خود یہ صنعت مزاح کا موجب نہیں بن سکتی، لیکن جب اسے مخصوص سیاق و سباق میں استعمال کیا جائے، تو نتیجہ حسبِ دلخواہ برآمد ہوتا ہے۔ مثلاً ان جملوں کو پڑھیے، جن میں کہیں مزاح کا مدار سرحرفی صنعت سے کام لینے پر ہے اور کہیں ایک ہی لفظ کو مختلف مفہوم میں استعمال کرنے پر۔ بہرحال الفاظ کی صوتی حیثیت غور طلب ہے:

"میرے نزدیک مارواڑی عورتیں مجموعہ ہیں تین چیزوں کا، گھونگھٹ، گدرگی اور گہنا۔"

"ہر مرض کی کوئی نہ کوئی حد ہونی چاہیے۔ بصورتِ دیگر مریض کو اختیار ہے کہ وہ حد سے گزر جائے۔"

"تجسس عورت کی فطرت ہے اور رازدانی اس کی عادت۔ اس حقیقت کا ستہاہ نہ پردہ ہے، نہ پیانو۔"

"ایک دن میں نے میرٹھ اور موسم دونوں متبسم نظر آئے۔"

"ایک دکان کی بالائی منزل پر ریڈ ویسٹ تانیں اڑا رہا تھا۔ نیچے مجمع تھا۔ بچے بان تانیں سیکھنے کی مشق کر رہے تھے، بوڑھی عورتیں کھانس رہی تھیں،

فقیر بھیک مانگ رہے تھے، بچّے گلی کھیلتے تھے، بوڑھے قیامت کے منتظر تھے، نوجوانوں پر قیامت گزر رہی تھی۔"

"قوم کو خطرہ میں پاتے ہیں، تو چندہ وصول کر کے اپنے آپ کو خطرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں، اس لیے کہ روپیا پیسا خطرہ کی چیز ہے، جس کے پاس ہو گی، وہ خطرہ میں ہو گا۔"

"بہر حال ہم لوگ آگے بڑھے، اور بہزار خرابی دوسری زندگی کے کنارے پہنچے، سورج ڈوب چکا تھا، اور ہم ڈوبنے کی فکر میں تھے۔"

مزاح کی ایک قسم وہ بھی ہے، جو سادہ اور بے میل ہنسی کی محرّک ہوتی ہے، جس میں صنعت کاری کو دخل ہوتا ہے۔ نہ ارادہ اور تفکّر کو، اور جس کی کوئی فنّی فلسفیانہ توضیح بھی نہیں کی جا سکتی، بجز اس کے کہ وہ کسی کی خلاف معمول حرکت یا برتاؤ کی طرف اشارہ کرے۔ ایسی ہنسی کی جھنکار کے بھی مدارج ہیں۔ ایسی ہنسی بھونڈی اور غیر شائستہ بھی ہو سکتی ہے، اور لطیف اور ستھری بھی۔ اس کا انحصار خود اس امر پر ہے کہ مزاح نگار کا طبعی رجحان کس طرف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کسی چیز کو بگڑتے دیکھ کر، کسی شخص کی ہیئت کذائی کا مشاہدہ کرنے یا بعض اوقات ایسے افعال کے سرزد ہو جانے سے جو ہماری توقع اور ہمارے معمول کی شکست کریں، ہمیں بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ لیکن اس قسم کی ہنسی میں بھی اعتدال، ضبط اور خوش مذاقی کو برقرار رکھنا اچھے مزاح نگار ہی کا کام ہے۔ رشید صاحب کے یہاں اس کے بعض نمونے دیکھیے:

"ان میں سے بعض ایسے فربہ تھے کہ خیال آیا کہ شاید ایک نہیں، دو ہوں۔ اس لیے ایک طرف مڑ کر دیکھنے لگا کہ کہیں ان کے پیچھے بھی تو دو ہاتھ اور دو منہ نہیں ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی چیز ہندوستان میں کسی زمانے میں پائی جاتی تھی۔"

پوچھنے لگے:

حضرت، آپ کا آنا کہاں سے ہوا؟ میں نے کہا: جناب ٹمبکٹو سے آ رہا ہوں۔

فرمایا: وہاں مزرات ہیں؟ میں نے کہا جہاں کہیں مسلمان ہیں، وہاں مزارات ہیں۔ متولی اور سجادہ نشین کون ہیں؟ میں نے کہا: فی الحال تو میں ہی ہوں، اور اس وقت مزارات کے مسائل پر تحقیقات کرنے کے لیے ہندستان آیا ہوں۔"

"ہمارے محلّے کے چوکیدار کی آواز ایسی ہوتی ہے، گویا چور کو دیکھ کر مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی ہے"۔

"بالآخر معلوم ہوا کہ بیمار ہیں۔ (ڈاکٹر خان) کوئی کہتا ہے، ملیریا ہے؛ کوئی کہتا ہے، ٹائیفائیڈ ہے۔ چنانچہ وہاں پہنچا، تو معلوم ہوا کہ واقعی بیمار ہیں؛ اور ان کے طالبعلم تیمارداری میں مصروف ہیں۔ میں نے پوچھا: کیسا مزاج ہے؟ تو اس قدر آہستہ جواب دیا۔ گویا المونڑہ سے آواز آرہی ہے: بخار ہے"۔

"مرشد نے فرمایا (ڈاکٹر ذاکر حسین): میری رائے تو یہ ہے کہ یورپ چلا جائے۔ راؤنڈ ٹیبل میں شرکت بھی ہو جائیگی، اور میموں سے جھجک بھی نکل جائیگی۔ میں نے کہا: مرشد، میموں سے جھجک کے کیا معنی؟ فرمایا: یہی کھوڑی بہت یاد اللہ"۔

"میر صاحب چاہتے ہیں کہ نہ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑے، اور نہ شکار کو اپنے پاؤں سے چلنے کی توفیق ہو۔ آرزو یہ ہوتی ہے کہ شکار کے بنگلے پر چلے جائیں۔ اگر مل جائے، تو فبہا، ورنہ کارڈ چھوڑ آئیں، اور شکار کی اخلاقی پابندی یہ ہے کہ وہ بازدید کے لیے میر صاحب کے آستانے پر حاضر ہو"۔

"بات صرف اتنی تھی کہ سب کے روپے میر منجھو کے پاس تھے اور میر منجھو سب گھر بھول گئے تھے۔ لیکن خود میر منجھو سے اس کی تحقیقات کی گئی، تو معلوم ہوا کہ روپے ان کے تھے اور ریقبوں کے وعدے۔ غلطی سے وعدے ساتھ

چلے آئے تھے اور روپے گھر رہ گئے تھے"

"میں نے خطوط کی طرف رُخ کیا، معلوم ہوا کہ بیوی ہسپتال میں ہیں؛ اور بچے مکان پر ہیں؛ اور بچوں کے نانا لیڈر آپریشن۔ بیوی کو لکھا کہ میں دوسری شادی ہرگز نہ کروں گا؛ اور نہ یہاں اس نیت سے آیا ہوں۔ بچوں کو لکھا کہ تم لوگ اماں بی کو پریشان نہ کرو گے، تو پڑھنے سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیے جاؤ گے۔ ان کے نانا میاں کو لکھا: مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔"

"میرے غسلخانے کی آبادی صرف ایک گھڑے پر مشتمل تھی۔ دوسرے کی جگہ خالی تھی۔ اس پر مولانا (اقبال سہیل) بلا تکلف اس طور پر بیٹھ گئے، گویا موصوف آج تک صرف اسی قسم کی نشست پر بیٹھنے کے عادی تھے۔ مجھ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔ یہ البتہ نہیں معلوم کہ اس گھڑے پر اس کا کیا اثر پڑا، جس کے رفیق کی جگہ مولانا نے غصب کر لی تھی۔"

"ابھی میں ان (بیرا) سے پورے طور پر ڈرنے بھی نہ پایا تھا کہ جھجک کر انھیں سلام کیا اور گلا صاف کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا: مجھے لیک سرٹیفکٹ چاہیے۔ انھوں نے غالباً اس قسم کے تماشے اکثر دیکھے تھے، اس لیے بغیر کسی جھجک کے فرمایا: "ٹکٹ لاؤ"۔ میں نے کہا: میں تو پیدل آیا ہوں۔ جھنجھلا کر بولے کارڈ۔ میں نے کہا، آج تو اتوار ہے۔ اس پر وہ مسکرا پڑے اور کہا بیٹھ جاؤ۔"

"مجسٹریٹ صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے، اور بیگموں میں سماتے تھے۔ کسی قسم کا شعور باقی نہیں رہا تھا۔ اس لیے وزن میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔"

بعض اوقات غیر متناسب اشیا کو پہلو بہ پہلو رکھنے سے بھی مزاح پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ بے ربط الفاظ، اشیا یا خصوصیات عام طور سے تجربے میں بیک وقت نہیں آتیں، یا کم از کم ہم ایسی اُمید نہیں کرتے، لہٰذا جب مزاح نگار انھیں ہم رشتہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو ہم اس غیر متوقع واقعے سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اکثر ہم یہ بھی محسوس کرنے لگتے ہیں

کہ ان کی بے ربط اور غیر آہنگ خصوصیات کی موجودگی ہی ایسے کردار کو مضحکہ خیز بنانے کے جواز میں پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ طریقۂ عمل ہماری پسندیدگی یا حقارت کو برانگیختہ نہیں کرتا، بلکہ ہم اس کے مشاہدے میں لطف اور خوشگواری پاتے ہیں، اور اس سے ہمارے احساسِ برتری و تفوق کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

"معلوم نہیں مرحوم اس وقت علیین میں ہیں یا امریکہ میں؛ خاندان کو کھچڑی پکانے اور کیمیا بنانے کا خبط تھا ...... نمونیہ سے ڈرتے تھے اور ایک لڑکی پر عاشق تھے"۔

"آپ کا شمار نہ تو ائمۂ معصومین میں سے ہو، نہ حکومتِ برطانیہ سے کہ آپ سے غلطی کا ارتکاب ممکن نہ ہو"۔

"میں نے کہا: خوب، جنت نباشد، یہ دنیا ہے، جہاں مولوی اور پروفیسر اور تعزیراتِ ہند، اور ملیریا اور بیوی بچوں سے پالا پڑے گا۔

"آپ کسی چیز، شخص یا موقع کا تصور نہیں کر سکتے، جو پاسبانی سے خالی ہو"۔ ایک بار یہ فقرہ میری زبان سے نکلا ہی تھا کہ ایک منطقی نے گرفت کی۔ فرمایا: "چیزیں ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔ میں نے کہا: کیوں نہیں، جیسے علم اور حماقت۔ فرمایا: کیسے؟ میں نے کہا: اور منطق کسے کہتے ہیں!"۔

"اتنا ہی بیان دے کر حاجی صاحب نے ڈاڑھی کو اس طور پر تکان دی کہ ایک ایک بال باہم اور بے ہم ہو گیا۔ پیشانی پر شکنیں پڑنی شروع ہو گئیں تو کرۂ سر کے خطِ استوا پر جا کر ختم ہوئیں۔ اور آنکھیں شاہنامۂ فردوسی بن گئیں"۔

"ہندستان کی سرزمین صرف دو چیزوں کے لیے موزوں ہے: مہابھارت یا ارہر کا کھیت۔ مہابھارت تو شاید اختتام پہ ہے، سائمن کمیشن کی سفارش اور ارہر کے کھیت کا انتظار ہے"۔

"ہندستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے: اکثر شفاخانہ میں، ورنہ جیلخانے میں، جیلخانے کا راستہ تو اکثر ادھر کے کھیت سے گزرتا ہے، اور شفاخانہ کا شہروں کی صاف شفاف سڑکوں سے، جس پر سے موٹر بھی گزرتے ہیں اور مولوی بھی"۔

"کتنے ہیں جو ہندستان کے امن و ترقی کے لیے سلطنت برطانیہ ہی کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ حال آں کہ حکومتِ برطانیہ کے پاس دفعہ ۱۴۴ سے لے کر سرمائیکل اوڈوائر تک موجود ہیں۔"

"میر مجلو نہایت تندرست تھے، لیکن شکل سے ہندستانی دواخانہ۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس سے عورتیں اور لڑکے ان سے بھاگتے، اور دوست احباب ان کے گرد رہتے تھے۔"

طنز کی صنعت مزاح کی صنعت سے وابستہ اور مربوط ہے۔ مزاح کا افادی پہلو براہ راست اسی وقت کارگر ہوتا ہے، جب کہ ہم ہنسی کی شادابی اور برجستگی میں تھوڑی سی کڑواہٹ اور ترشی بھی محسوس کریں۔ ہر وہ مزاح نگار جو محض تفنن طبع کا قائل نہیں ہے، بلکہ جس کے شعور و ادراک میں ذکاوت اور زود حسی بھی ہے، اپنے مزاح کو طنز کے چھینٹوں سے پاک نہیں رکھ سکتا۔ رشید احمد صدیقی کی طنزیہ مسکراہٹ کی تان ہمیشہ تمدن کے شیشوں پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ چونکہ ان کا مزاح جن اجزا سے مرکب ہے، وہ عام مزاح نگار کی رسائی سے دور ہوتے ہیں، اس لیے یہ چھینٹے اوسط درجے کے پڑھنے والے پر خاطر خواہ اثر نہیں ڈالتے۔ لیکن تربیت یافتہ قاری فوراً یہ محسوس کر لیتا ہے کہ مزاح نگار کے طنز کے تازیانے کی چوٹ کہاں پڑ رہی ہے، اور کسی خاص مقام پر اس نے اپنے مشاہدے میں ایسا پیچ و خم پیدا کر دیا ہے، جس سے اس کی ہنسی صرف ہنسی نہیں رہی ہے، بلکہ وہ ایک نوع کی بالواسطہ اور ہوشیار تنقید بن گئی ہے۔ رشید صاحب کے یہاں یہ نتیجہ اس لیے پیدا ہوتا ہے، کیونکہ وہ محض واقعات سے مزاح نہیں پیدا کرتے، بلکہ ان کی نظر خاصی گہری اور دور تک جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ وہ اپنی اس خوبی کو اپنی بعد کی تحریروں میں قائم نہیں رکھ سکے لیکن

بہرحال "مضامین رشید" میں بیشمار جملے ایسے ملتے ہیں، جو مصنف کی بالغ نظری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اور جنھیں پڑھ کر ہم بیک وقت ہنسنے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور اس امر کے اعتراف پر بھی، کہ رشید صاحب نے مزاحیہ انداز میں تمدنی حالات پر چبھتی ہوئی تنقید کر دی ہے۔ ان تنقیدی اشاروں کی سچائی اور ان کا مؤثر ہونا ہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ یہ خصوصیت اکبر اور رشید صاحب کے یہاں مشترک ہے:

"میرے سفر کی محرک اکثر دو چیزیں ہوتی ہیں، آپریشن کرانا، یا سفر خرچ وصول کرنا، جس کے مجموعے کا نام بڑے لوگوں نے قومی کام رکھا ہے۔"

"یہی حالت بنگالیوں کی ہے۔ سفر میں ان کا محبوب ترین اور تنہا مشغلہ کھانا اور بکنا ہے۔ دنیا کی خرافات ترین اور کم سے کم داموں والی چیزیں کثیر ترین مقدار میں خریدینگے اور کھائینگے۔ دو چار پیسے سے زیادہ کی چیز نہیں خریدینگے اور بیچنے والے سے حجت کرینگے، گویا ہندستان کی حکومت خود اختیاری پر نمایندگانِ برطانیہ سے ردّ و کد کر رہے ہیں۔"

"عشاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں، جو نہ تعزیرات ہند سے ڈرتی ہیں اور نہ میونسپلٹی سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انگریزوں کو آئی، سی ایس نے خراب کیا اور عشاق کو شعرا نے۔"

"کرسمس کا زمانہ تھا جب انگریز کیک، اور ہندستانی سردی کھاتا ہے"

"(ڈاکٹر ذاکر حسین) کے آنے سے پہلے لوگ کچھ سراسیمہ سے ہو رہے تھے کہ اتنے میں کمرے کا کواڑ کھلا اور آپ اس طور سے ڈرتے جھجکتے داخل ہوئے، اور آتے ہی سارے مجمع پر چھا گئے۔ جیسے کبھی انگریزوں کی آمد ہندستان میں ہوتی ہوگی۔"

"یکّہ چلتا رہا (مع تمام سامان اور اشخاص ضروریہ وغیر ضروریہ کے)، ایسا ہی جیسا کہ مسلمانوں کی انجمنیں یا تعلیم گاہیں چلتی ہیں، یا جس طور پر عشاق کا بیان ہے، کہ اکثر ان کے گلے پر خنجر پھرا کرتا ہے"۔

"دلیر بننا یا نہ بننا، قطعاً ذوقی چیز ہے؛ اور میرے لیے ہر ذوقی چیز قابلِ درگزر

ہے خواہ وہ عمر طبعی پر پہنچ کر شادی کرنا ہو یا لیڈری سے روٹی کمانا۔"

"عورت سے محبت کرنا ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر ادب میں مقبول رہا ہے۔ اسی محبت کی آڑ یا زد میں سب کچھ ہوا، جیلخانہ، ہسپتال، فنون لطیفہ، مضمون نویسی، اکاسا، وصیت نامے اور پاگل خانہ قسم کی تمام چیزیں اس کی منت کش ہیں۔"

"یہ دیہاتیوں کی اسمبلی ہے، جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے، جتنا ہندستانی پارلیمنٹ میں اراکین پارلیمنٹ کو۔"

"کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ اور شاید عبرت آمیز منظر ہے، جتنا کسی پبلک مشاعرے میں بھلے مانس شاعر کا کلام سنانا۔"

"گواہ جھوٹا ہو، یا سچا، عدالت کے لیے اس کا وجود اتنا ہی ناگزیر ہے، جتنا برطانوی اقتدار کے لیے آئی سی، ایس کا وجود۔ جس طرح عدالت کی کمزوری گواہ ہے، اس طرح برطانیہ کی کمزوری آئی سی، ایس۔"

"ڈپٹی کلکٹر کو گورنمنٹ سے وہی نسبت ہو، جو کنگارو کو اپنے بچے کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس طرح کنگارو کا بچہ خطرہ کی آہٹ پاکر ماں کی جھولی میں بیٹھ جاتا ہو، اسی طرح ڈپٹی کلکٹر بھی حکومت کی پناہ ڈھونڈنے میں نہایت آزاد اور کامیاب ہوتا ہے۔"

"میں نے کہا، آپ کے یہ خیالات قطعاً غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میں احمق نہیں ہوں، اس لیے کہ چندہ دیتا ہوں، خیرات نہیں کرتا۔ پردہ کا حامی ہوں، ہاں میں رقص کرتا ہوں۔"

"میر منجھو ان لوگوں میں سے تھے، جن کی شادی والدین کرتے ہیں، اور عقد ثانی دوست احباب۔ کسی زمانے میں ان کی شادی ضرور ہوئی تھی کیونکہ ان کا

مخصوص برزخ اس پر گراہ تھا"

"لیکن مولوی پھر وحشی ہے۔ اس کا تہمد بوسیدہ ہو جاتا ہے، تو اس کی دھجیاں
مریدوں میں تبرکاً تقسیم کر دی جاتی ہیں ۔۔۔۔ لیکن آئی، سی، ایس از کار رفتہ
ہو کر مراجعت وطن کرتا ہے، تو اس کے اخراجات موت و حیات بھی ہندستانیوں
کے سر پڑتے ہیں۔"

"گھریلو بیوی، ہندستانی بیوی ہے، جس کو فریقین کے والدین بیاہتے ہیں،
فریقین نباہتے ہیں اور ملک و ملت سراہتے ہیں' دوسری طرف تعلیم یافتہ
روشن خیال بیوی ہے جس کو فریقین کے احباب بیاہتے ہیں، احباب ہی نباہتے
ہیں اور سوسائٹی سراہتی ہے"۔

"آج کل اخبار نویس کو بعض حواسوں کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً آنکھ
اس کے لیے بالکل زائد ہے۔ اس کا کام کان سے لیا جا سکتا ہے۔ گو ایسی حالت
میں اکثر ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ ایڈیٹری شروع کرتے وقت کانوں کا جو
سائز تھا، وہ ایڈیٹری ختم کرتے وقت بہت بڑھ جاتا ہے"۔

"صاحب عام طور پر ان لوگوں کو کہتے ہیں، جو صبح آنکھ کھلتے ہی بغیر کلی کیے
چائے پی لیتے ہیں، اور دوسروں کی بیوی کا اپنے باپ سے زیادہ خیال رکھتے
ہیں۔ جتنا بڑا صاحب ہوگا، اتنا ہی اس کا بیت الخلا اس کی چارپائی
کے قریب تر اور بھائی بند دور تر ہوں گے"۔

رشید صاحب کا مزاح نگاری کا فن کرداروں کے پیش کرنے میں بڑی آب و تاب کے
ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ ہمیشہ ان کے نئے نئے نمونے پیش کرتے ہیں، جو جماعتوں کی نمائندگی
کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے مخصوص افراد کی کمزوریوں کا خاکا نہ اڑایا ہو۔
ان کے نگار خانے میں ہمیں بعض تصویریں بڑی دلچسپ نظر آتی ہیں۔ ایسے مطالعے بہت
قریب کے مشاہدے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور ان کا تمسخر جس انداز میں اڑایا جاتا
ہے، اس کی وجہ سے وہ ہمارے حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مزاحیہ نگار ایسے مرقعے بنر

کرنے میں قدرے بیرحمی برتتا ہے۔ اس لیے کہ تخلیقی عمل کے دوران میں وہ ہمدردی اور جانبداری کو خیرباد کہہ دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے، تو مزاح پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر یہ دو خاکے دیکھیے:

"یہاں سے بابو رفیع اللہ خان صاحب کے پاس پہنچا۔ ان کو دیکھ کر خیال آیا کہ کوئی محدث دہلوی ہیں، یا پنشنر تحصیلدار۔ آنکھ اور عینک کے درمیان تقریباً چھ انگل کا فاصلہ، پیشانی پر اتنی ہی جھریاں اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ اس کے بعد پان کی پیک منہ میں تولتے ہوئے گرج کر بولے، لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ عراق عرب میں افواج برطانیہ کے ساتھ عرصے تک رہ چکے ہیں۔ تمھارے باپ کا کیا نام ہے؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ امرتیاں لائے ہو؟"

"جیب میں شیشیاں، بغل میں بوتل، ہاتھ میں آلات جراحی، پیٹ میں درد، سر میں سودا، اور زبان پر اشعار، ڈاکٹر خنداں مرض بھی ہیں، اور مریض بھی"

ڈاکٹر خنداں اور حاجی بلغ العلیٰ، دو ایسے مزاحیہ کردار ہیں جن کا نقش ذہن پر دیر تک قائم رہتا ہے۔ لیکن رشید صاحب کے یہاں بیشتر کردار ایسے ہیں، جن کا کوئی نام نہیں ہے، بلکہ مختلف پیشوں اور گروہوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان میں سے تین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں یعنی مولوی، لیڈر اور وکیل۔ المیہ اور طربیہ کے کرداروں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ المیہ کردار اپنی ذاتی اور انفرادی خامیوں اور خوبیوں سے اپنے آپ کو اس درجہ ہم آہنگ کر لیتے ہیں کہ ہم ان خامیوں اور خوبیوں کا مطالعہ کرداروں کے بغیر کر ہی نہیں سکتے۔ طربیہ کے کردار نہ صرف سماج سے پوری طرح مربوط نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنی خامیوں کو بھی اپنی شخصیت سے گہرا علاقہ نہیں قائم کرنے دیتے۔ اسی سطحیت اور عدم تطابق کی وجہ سے ہم ان خامیوں کا مطالعہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ المیہ کرداروں کی شخصیتیں تہ در تہ ہوتی ہیں۔ اور طربیہ کے کرداروں میں شخصیت کا رچاؤ، اس کی گہرائی اور اس کے نشیب و فراز نہیں ہوتے۔ رشید صاحب نے وکیلوں اور مولویوں اور لیڈروں کی جتنی تصویریں کھینچی ہے، ان میں ایک طرف تو خاصی سفاکی اور شقاوت نظر آتی ہے، اور

دوسری جانب وہ ہمارے ذہن کو کسی مخصوص وکیل یا مولوی یا لیڈر کی سمت منتقل نہیں کرتیں، بلکہ وہ پوری جماعت کا ایک واضح تخیل پیدا کر دیتی ہیں۔ "گھاگھ" کی اصطلاح بھی بڑی ہمہ گیر اور کارآمد ہے۔ کیونکہ اس کا اطلاق مختلف النوع خامیاں رکھنے والے مختلف جماعتوں کے نمایندوں پر کیا جا سکتا ہے۔ "گھاگھ" اور "گھاگھس" کا فرق بھی گو بظاہر یہاں مہمل سا معلوم ہوتا ہے، مگر در اصل ایک نازک فرق ہے، اور تجربے کے مدارج کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس طریقۂ کار سے مزاح نگار کی تنقید اور اس کے نقطۂ نظر میں ایک طرح کی عمومیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انگنت مخلوق کے ہجومِ بیکراں میں اپنی نظروں کو بعض نمونوں پر جما دیا ہے اور ان کی فنکارانہ تنقید کر کے عام انسانوں کی خامیوں کی جانب ہماری توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے۔ ان خامیوں میں بے لچکی، لالچ، خود بینی اور ذہنی غیر حاضری کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور یہ تمام کوتاہیاں ایسی ہیں، جو فرد اور سماج کے درمیان عدمِ مصالحت یا عدمِ توازن و تطابق کو ظاہر کرتی ہیں۔ مزاح نگار کی تخلیق کا مقصد اصلاح یا انقلاب چاہے نہ ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی طنز و ظرافت کے نشتر ہمارے خود اطمینانی اور خود فراموشی کے خول میں سوراخ کر دیتے ہیں، اور ہم چونکتا ہو کر اپنا جائزہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ پڑھنے والوں کے لیے ایسے مرقعوں کی دلکشی صرف عارضی انبساط اور تفنن میں نہیں ہوتی، بلکہ وہ انسانی فطرت کے مختلف مظاہر میں اس کی بصیرت میں اضافے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ایک وکیل صاحب کا حلیہ ملاحظہ کیجیے، جو پوری ایک جماعت کی نمایندگی کرتے ہیں۔

> سر پر پٹّے، جو نیچے سے علاحدہ کر دیے گئے تھے؛ ریشِ مبارک لمبی اور رسولی، سر اور ڈاڑھی کے بال خضاب کے مجرّب ترین نسخوں سے سیاہ؛ چہرہ پر جھرّیاں، آنکھوں میں سُرمہ کی تحریر جلی۔ ململ کی ایک بند دار اچکن زیبِ تن جو شاید کبھی تہ نہیں کی گئی۔ کیونکہ شکن کی وجہ سے تمام اچکن گھونگھر یالے بال کی طرح مزہ دیتی تھی۔ سر پر ایک سفید عمامہ، گویا ابھی کہیں عقد پڑھا کر

چھوارے لیے چلے آ رہے ہیں۔ غرارہ دار پائجامہ جس میں چار انگل گوٹ لگی ہوئی تھی، اور جس کے حاشیے کے اندر سرخ ڈورے دیے گئے تھے، جو دھوبی کی مرحمت اور مرورِ ایام سے کپڑے کے اوپر نمایاں ہو چلی تھی۔ اردو کی قانونی کتابوں کا بستہ سامنے تھا، جس میں عرضی دعویٰ وغیرہ لکھنے کے مجرب نسخے تہ کیے ہوئے تھے۔

اب ذرا لیڈروں اور مولویوں کا حال بھی سنیے:

سیاسی گھاگھ، کرسیِ صدارت پر، سب سے زیادہ ہار پہن کر بیٹھتا ہے، اور تحریر و تقریر میں صرف پولیس اور حکومت کے نمائندوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ لیکن اگر گولیاں چلنے والی ہوں، یا طوق و رسن کی باری آئی، تو پھر وہ اپنے ڈرائنگ روم یا قلعۂ کو کو اتنا محفوظ سمجھتا ہے، جتنا مسٹر لائیڈ جارج برطانوی اقتدار کو ارباب آئی سی ایس کے آہنی پنجوں میں سمجھتے ہیں۔ اس کے نزدیک قوم کی حیثیت ایک نفس کی ہے، موقع ہو، تو اس پر ایک مزار تعمیر کر کے نذرانے اور چڑھاوے وصول کیے جا سکتے ہیں۔

مذہبی گھاگھ کو مذہب سے وہی نسبت ہو، جو آج کے نوجوانوں کو اپنے والدین سے ہوتی ہو... ایک موقع پر تو وہ مذہب کا نام لے کر ہجرت پر آمادہ ہو جائیگا اور دوسروں کو ہجرت کرا بھی دیگا، لیکن دوسری جگہ وہ اسی مذہب کی آڑ پکڑ کر دارالحرب میں سود بھی لینے لگیگا اور شاید کسی بدنصیب مہاجر کی بیوی سے دوسرا نکاح بھی کر لے۔"

" لیکن مولوی کو دیکھیے: قول و فعل میں کسی سے پیچھے نہ رہا، ایک طرف وعظ کرتا رہا اور فتوئے تکفیر دیتا رہا، دوسری طرف دعوت رد نہ کی اور تعداد ازواج میں کمی نہ کی؛ تارکِ حوالات رہا، تارکِ لذات نہ ہوا۔ مولوی صاحب نازل ہوتے ہیں، "صائم النہار"، "قائم اللیل"، کسی کو اولادِ نرینہ عطا ہوتی ہے، کسی کو بہشت نصیب ہوتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کو جہنم کے لیے نامزد کیا جاتا ہے۔ بعضوں کی جایداد کے متولی بنتے ہیں، تعویذ لکھتے ہیں، تو صرف مرغ سفید کے خون سے، تاکہ دسترخوان پر مرغِ مسلّم موجود ہو، عورتوں کو باجماعت تہجد ادا کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

شید صاحب کی ظرافت عام طور پر دو زندار اور خیال انگیز ہوتی ہے۔ لیکن بسا اوقات وہ اپنی

مزاحیہ غایت کی طرف مکمل طور سے اشارہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس سے نہ صرف شدید قسم کا ابہام پیدا ہو جاتا ہو، بلکہ یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ غالباً وہ اس ماٹ کے مزاحیہ امکانات کو پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکے ہیں۔ یہ بات مثال سے صاف ہو جائیگی

نان کو آپریٹر کو انھوں نے ایک اشارے کی حیثیت سے جگہ جگہ استعمال کیا ہے اور اس سے مقصد ایک خاص جماعت کی بوالعجبیوں کو اپنی طنز و ظرافت کا نقشہ بنانا ہے۔ حال آں کہ ان تمام مضامین کو پڑھ لینے کے بعد جہاں یہ ذکر آیا ہے، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یا تو رشید صاحب اس جماعت کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں اور اس کے طریقۂ کار کی خامیوں کا احاطہ کرنے میں ناکام رہے ہیں، یا یہ اشارہ ان کے مفہوم کی پوری طرح وضاحت نہیں کرتا۔ مزاحیہ نگار سے ہم کسی اخلاقی حقیقت پسندی کا مطالبہ نہیں کرتے، لیکن کم از کم اس مفہوم کی وضاحت کے ضرور خواہاں ہوتے ہیں جس کے ابلاغ کے لیے اس نے بعض اشارے یا کنایے وضع کیے ہیں۔ صوتی اعتبار سے بھی اس لفظ میں کوئی ایسی جدت نہیں ہے، جو مزاحیہ اثرات کی تشکیل میں ممد ہو۔ اس کے برعکس روشن خیال بیوی، آئی، سی، ایس، اور حاجی بلغ العلیٰ ایسے اشارے ہیں، جن سے کام لے کر رشید صاحب نے اجتماعی اور انفرادی حادثات اور حماقتوں پر اہم تنقیدیں کی ہیں، اور غالباً وہ ان اشاروں کو برتنے میں نان کو آپریٹر کی نسبت زیادہ کامیاب رہے ہیں۔

اس سے کہیں زیادہ مسئلہ آرٹ کا ہے۔ رشید صاحب نے جگہ جگہ آرٹ کا ذکر تمسخر کے انداز میں کیا ہے اور ہر جگہ یہ کوشش مصنف کا منہ چڑاتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آپ آرٹ کے کسی خاص اسکول کو ناپسند کرتے ہوں، آرٹ کی بعض اقدار سے متفق نہ ہوں کبھی مخصوص آرٹ کو اخلاق کے معیار پر پرکھنا چاہتے ہوں، اور ایسا کرنے پر اسے تسلی بخش اور اجتماعی ... کے مطابق نہ پائیں، مگر انسانی فکر و عمل کی آزادی، انسانی تخیل کی تگ و تاز، انسانی ... کے ارتقا اور انسانی خواہشوں اور رموز ائم کی اندرونی طاقت اور اس کے اظہار کو مضحک سمجھ ... اس کے لیے آرٹ کی ہمہ گیر اصطلاح وضع کر لینا، اور اسے ہر جگہ بلاتفریق اس مفہوم میں استعمال کرنا ذرا غیر منطقی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس سے مصنف کے محدود نقطۂ نظر اور ...

تقلیدی اندازِ فکر کا پتا چلتا ہے۔ میں بخوفِ طوالت اقتباس پیش کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ لیکن "گھاگھ" کے آخری ٹکڑے کی طرف اشارہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا جہاں رشید صاحب نے آرٹ کو آزادیِ کار، آزادیِ افکار، آزادیِ نسواں کا مرادف قرار دے کر اسے قابلِ تضحیک قرار دیا ہے۔ یہ طرزِ عمل خود مضحکہ خیز ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رشید صاحب اپنی بھلی بُری دنیا میں بند رہنا چاہتے ہیں، انھیں نئے خیالات اور نئی تحریکات سے نہ کوئی دلچسپی ہے، نہ ہمدردی، اور نہ انصاف سے وہ ان کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس معاملے میں، پیشرو اور ذہنی اور روحانی مرشد اکبر کو خضرِ راہ بناتے ہیں، جنھوں نے اپنے مزاحیہ اور طنزیہ کلام میں مغربی تہذیب اور تمدن کے کارناموں پر نہایت سطحی تنقید کی ہے۔

مضمون نگاری کے فن میں رشید صاحب نے ایک نئی صنف کا اضافہ کیا ہے۔ یہ صنف اپنی جگہ بالکل اچھوتی اور منفرد ہے۔ اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں حد سے زیادہ الجھاؤ اور انتشار پایا جاتا ہے، اور قاری کو عجیب عجیب طرح کی بھول بھلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بادی النظر میں یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ تاثراتی مضمون کو منطقی حدود میں مقید کر دینا جائز نہیں ہے۔ ایسے مضمون میں مصنف پہلے سے کسی بنی بنائی اسکیم کے مطابق آغاز اور انجام کی فکر نہیں کرتا، بلکہ اس کے وجدان کی لہریں خود مضمون کا تانا بانا اور رنگ روغن تیار کرتی اور اسے ایک عضوی وحدت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ کسی اچھے ادیب کے تاثرات محض ایک بےمعنی طومار کی صورت میں نہیں رہتے، بلکہ اس کی سطح بر طلب کے نیچے معنی و مفہوم اور وابستگی کی تہ چھپی ہوتی ہے۔ ہاں کسی کو یہ بات مان لینے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ رشید صاحب بعض اوقات مضمون کے مزاحیہ ماحول میں فلسفے اور الٰہیات کی لمبی لمبی بحثیں شروع کر دیتے ہیں، جن سے قاری ہرگز لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ "گندم چشی پر آدم و حوا سے باز پرس کی گئی۔ گھاگھس کی گھگھی بندھ گئی۔ اپنے ظلم و خطا کا اس طور پر اعتراف کیا کہ گویا آپ کو ظلم و خطا پر قدرت تھی اور آپ ایسا کر بھی سکتے تھے۔ گھاگھ سے دریافت کیا گیا، بولے: "مجھے آخر کس نے گمراہ کیا؟" یہ سوال ارتکاب جرم سے بھی زیادہ سنجیدہ اور شاید اندیشہ ناک تھا۔ حکم دیا گیا، گھاگھ اور گھاگھس دونوں جلا وطن کیے جائیں،" اگ

قسم کی بحثیں اکثر جگہ فکر کو ابھارنے پر ختم ہوتی ہیں، اور کہیں کہیں محض دھاندلی بازی پر۔
"مضامین رشید" کے سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان پر مقامی رنگ اس حد تک غالب
ہے کہ علیگڑھ والے ہی ان سے اچھی طرح لطف اٹھا سکتے ہیں، اور اس سے مزاح نگار کی
اپیل کا دائرہ محدود ہو گیا ہے۔ یہ اعتراض کچھ زیادہ قابلِ التفات نہیں ہے، اس لیے کہ
رشید صاحب کے مضامین کی تحسین کے لیے پڑھا لکھا اور خوش نداق ہونا زیادہ ضروری ہے۔
کہیں کہیں ایسے واقعات کا ذکر ضرور ہے، جو صرف علیگڑھ کی اقامتی زندگی کے پس منظر
ہی میں قابلِ تفہیم ہو سکتے ہیں مگر مضامین کے اہم حصّے جہاں اعلیٰ طنز و مزاح کے فن کی
کارفرمائی ہے، علیگڑھ سے عدم واقفیت کے باوجود بھی ہم سے خراجِ تحسین حاصل کر لیتے
ہیں۔ "مضامینِ رشید" کی فضا پر علیگڑھ کی زندگی کا پرتو کوئی ایسا سقم نہیں ہے جس سے
ان کی اہمیت پر معتدبہ اثر پڑے۔ اکثر فنی کارناموں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمیں اس
ماحول اور فضا کی باز آفرینی کی ضرورت پیش آتی ہے جس میں ان کی تخلیق ہوئی ہو۔ آیندہ نسلیں
اگر ان مضامین سے لطف اندوز ہونا چاہینگی، تو انھیں ان حالات کی باز آفرینی کرنا پڑیگی،
جو ان مضامین کا مرکز و محور ہیں۔

رشید صاحب اپنے بیشتر دوں اور ہمعصروں میں غالب اور اکبر کے علاوہ سب سے برتر ہیں۔ ان کی
برتری کے دو سبب ہیں۔ اول تو یہ کہ ان کے مزاح کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے تعلیم، شعر و
ادب، قومی تحریکات، سائنس کے کمالات، سیاست اور حکومت، مغربی تہذیب، قومی اداروں اور
افراد کی کمزوریوں، سب پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے مزاح کی خصوصیت یہ ہے کہ
وہ خیال انگیز ہنسی کی تحریک کرتا ہے۔ ان کے مزاح میں تفکر ہے۔ ان کا مشاہدہ تیز، بیباک اور صحیح
ہے۔ وہ بےجوڑ اشیا میں رشتہ دیکھ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور انہی امتیازات کو نمایاں کرنے
پر ان کے مزاحیہ اثرات کا دارومدار ہے۔ رشید صاحب کی ہنسی فکر کو ابھارتی ہے۔ اس کے مقابلے
میں پطرس کی ہنسی صرف فرحت بخش ہے، اور احساسات کو آہنگ عطا کرتی ہے۔ اس معیار سے
دونوں کے مدارج متعین کرنے میں دشواری نہیں ہو سکتی۔ رشید صاحب بغیر کسی کوشش اور
ذہنی پس و پیش کے کرداروں کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لے آتے ہیں۔ عام کوجو ا[illegible]

زاح نگار کا ایک فطری ملکہ کہا گیا ہے؛ اور رشید صاحب کی سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے۔ ان
طبیعت میں ایک طرح کی نفسیاتی لاتعلقی کا عنصر ہے۔ انگریزی میں مزاح نگار لیمب کی
یہی خصوصیت ہو۔ اس لاتعلقی کے باعث وہ بعض اوقات خود اپنے آپ کو بھی مضحکہ خیز انداز
پیش کرنے سے اجتناب نہیں کرتے۔ میریڈتھ نے کہا ہو کہ طربیہ کی روح جس قسم کی ہنسی کی
ریک کرتی ہے کم ہم بغیر ورت شراب سے مشابہت دے سکتے ہیں جو ہمارے اندر اسی نسبت سے
انت پیدا کرتی ہے جس نسبت سے خوشگواری؛ وہ ہمارے اندر اسی طرح داخل ہوتی ہے جس
ح پڑھنے کے کمرہ میں تازہ ہوا۔ رشید صاحب کے طنز میں ڈنک تو ضرور ہے، مگر وہ ہماری روح
کھلتا نہیں ہے۔ وہ زندگی کو کسی مصلح کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے، جو برائیوں اور خامیوں
سی طرح مفاہمت نہیں کر سکتا۔ وہ زندگی کے سخت و سست کو ہموار کرنے اور زندگی کی اس
ساری خرافات، بے تکے پن اور رنگ۔ و بدکے باوجود قبول کرنے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ وہ
رد نصیحت بد باطنی اور حقارت کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور شاید یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں
نسی اصلاح کے لیے یہ حربے بیکار ہیں۔ وہ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں، اس پر فیصلہ نہیں صادر
تے۔ وہ انسانی کوتاہیوں، نقائص اور تعصبات پر چیں بجبیں ہونے کے بجائے ان پر شفقت
یز رواداری کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں اور انھیں معاف کر دیتے ہیں۔ وہ زندگی، اشیا، اور
سانوں سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ترغیب دلاتے ہیں، عقیدوں میں ترمیم کی دعوت نہیں دیتے۔
زندگی کے تضاد کو شاید اس لیے گوارا کرتے ہیں، کیونکہ ان کی آنکھیں ظاہری تضاد سے گزر کر
اندرونی توازن کو پا لیتی ہیں۔ وہ انسان کی من موجی حرکتوں کی اصلاح ان پر بگڑ کر نہیں کرنا
ہتے۔ وہ زندگی کے قص پر لب آسا ہنستے ہیں۔ انسانوں کی حماقت زدائیاں، مزاح نگار کے
نر کا شکار بنتی ہیں لیکن اس سے ان کے مسلک انسانیت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ میریڈتھ کا قول ہو
سحر آمیز شعوری صلاحیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم ان لوگوں میں مضحک پہلو تلاش
یں جن سے ہمیں محبت ہو، لیکن اس طرح کہ ہماری محبت میں کمی نہ آئے۔ رشید صاحب کی
نزد مزاح میں رحمت دو آسودگی پائی جاتی ہے۔

رشید صاحب کے یہاں صرف زندہ دلی نہیں ہو جیسی شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کے یہاں

پائی جاتی ہے۔ وہ صرف محاوروں اور واقعات سے ہلکا اور سادہ مزاح نہیں پیدا کرتے، جیسا فرحت اللہ بیگ نے کیا ہو۔ ان کے یہاں زندہ دلی اور سادہ مزاجی کے ساتھ شادابی، فراوانی، کشادہ قلبی اور گہری طنز بھی پائی جاتی ہو۔ اس میں بعض جگہ ثقالت بھی آگئی ہے، رشید صاحب کے مزاح کے اعلیٰ نمونے صرف خواص کے لیے ہیں مزاحیہ انشا اور نقوش کی لطافت اور نزہت میں وہ ہمیں ایڈیسن کی یاد دلاتے ہیں اور قول محال کے برجستہ اور خیال انگیز استعمال میں ان پر چسٹرٹن کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ان کے مزاح کو ان کی شخصیت کا اعجاز کہنا چاہیے۔ ان کے یہاں بعض جگہ عربی اور فارسی کی غریب اور نامانوس ترکیبیں بھی ملتی ہیں، جو گراں گزرتی ہیں، مگر بحیثیت مجموعی ان کی مزاحیہ تحریروں میں ایک نوع کی تازگی، جدت اور صلابت پائی جاتی ہے اور تکنیک کے اعتبار سے ان کے مضامین ان کی اخلاقی بلندی اور طباعی کا بیّن ثبوت ہیں۔

یہ امر البتہ قابل افسوس ہو کہ "مضامین رشید" کے بعد سے جو بالکل ابتدائی زمانہ میں لکھے گئے تھے، رشید صاحب کے مزاح نگاری کے فن نے کوئی قابل لحاظ ترقی نہیں کی ہو حتیٰ کہ "خنداں" میں تو وہ تقریباً معکوس کے درجے پر پہنچ گئے ہیں۔ یوں بھی ان مضامین میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ یہ ان کی ریڈیو کی تقریروں کا مجموعہ ہے، جہاں وقت محدود اور گفتگو کو بڑھانے کے مواقع محدود تر ہوتے ہیں۔ مصنف کو اس طرح کی تحریر میں مجبوراً ادا کی جگہ صرف بندشوں پر قناعت کرنا پڑتی ہے، اور مشاہدے، تجربے اور فن کی صداقت، شگفتگی اور برگزیدگی کی جگہ صرف بیمعنی، اور بہیمزہ فقروں اور جملوں کی تکرار اور الٹ پھیر سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر اس وقع الوقتی کے کام اور ریڈیو پر تقریریں کرنے کی جگہ وہ اپنے طنز اور مزاح نگاری اور اسلوب بیان کو وسعت اور تنوع بخشتے، تو آج بےتکلف اُردو کے چسٹرٹن یا ... ہوتے۔ لیکن شاید ذہنی کاہلی اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے انھوں نے اپنے اندوختے کو سینت سینت کر رکھنا اور خرچ کرنا ہی مناسب سمجھا، ورنہ ممکن تھا کہ اُردو بلکہ ایشیائی طنز و ظرافت کی صنف میں نادر اور حیرت انگیز اضافے ہو جاتے۔

اسلوب احمد انصاری

رشید احمد صدیقی
نقاد اور نثر نگار

رشید صاحب کی فطانت کا بہترین اظہار بلاشبہ ان کے قلمی مرقعوں اور مزاحیہ مضامین میں ہوا ہے، مگر انھوں نے وقتاً فوقتاً ادبی تنقید کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ رشید صاحب کی اس حیثیت پر محاکمے سے قبل تین باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ فارسی ادب سے انھیں خصوصی شغف رہا ہے اور اس لیے ان کی ذہنی تربیت اور افتادِ مزاج میں فارسی ادب کی روایات کو بڑا دخل ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بالطبع تاثراتی تنقید نگاروں کے مکتبِ فکر سے زیادہ ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہمارے یہاں وہ تنقید کے اس مسلک کو عام کرنے والوں میں ہیں جس کے سب سے ممتاز نمایندے مولانا شبلی تھے۔ اور تیسرے یہ کہ رشید صاحب کے یہاں تنقید میں بھی بعض ان اقدار پر زور ملتا ہے، جو ادبی ہونے سے زیادہ تہذیبی اور ثقافتی ہیں۔ رشید صاحب کی تنقیدی مساعی کا اوّلین نمونہ "طنزیات و مضحکات" ہے جس میں طنز و مزاح کے فن کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ چونکہ انھوں نے خود اس فن کو تخلیقی طور پر برتا ہے، اس لیے وہ جائز طور پر دوسروں کی بہ نسبت "رازِ درونِ میخانہ" سے زیادہ واقف ہیں۔ لیکن تاریخ نگاری میں تنقیدی صلاحیتوں کا اظہار پورے طور پر نہیں ہونے پاتا۔

اس سلسلے کی دوسری کڑی "باقیاتِ فانی" کا مقدمہ ہے، جو عرصہ ہوا، رشید صاحب نے

لکھا تھا۔ اسے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رشید صاحب نے جو معیار برتتے ہیں، وہ تمام مشرقی ہیں۔ اس مقدمہ کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں شعر و شاعری کی ماہیت اور شاعر کے منصب اور اس کی تشریعت پر اظہار خیال کیا گیا ہے، اور دوسرے میں کلام فانی کی خوبیوں پر مفصل بحث ہے، اور فانی کا دوسرے شعرا، خاص طور پر غالب سے موازنہ کیا گیا ہے۔ موازنے کا وسیلہ ہم اشعار کا پہلو بہ پہلو رکھنا اور اس بنیاد پر نتائج کا انبساط اور استخراج ہے۔ پہلے حصے میں مندرجۂ ذیل اقتباس دیکھیے:۔

> شاعر کی زبان سے عالم بیخودی میں ایک ترانہ نکل جاتا ہے جو سامعہ سے دماغ تک پہنچ کر ہم کو وارفتہ ہستی کر دیتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لیے ہم اپنے دامن خیال سے کثافت عنصری کا غبار جھاڑ کر اس خاکدان آب و گل کی ناسوتی پستی سے بلند ہو جاتے، اور اس عالم میں جا پہنچتے ہیں جہاں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا خدا اور اس کی ساری کائنات اور ہم خود صرف ایک دلکش ترانے اور ایک لطیف حقیقت میں گم ہو گئے ہیں۔ جہاں کوئی خالق ہے اور نہ کوئی مخلوق؛ جہاں جبر ہے اور نہ اختیار؛ نہ سزا ہے نہ جزا۔ جہاں وہ سب کچھ ہے جو ہم جانتے ہیں لیکن کسی طور پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ جس کی لطافت تاب اظہار نہیں لا سکتی۔ جس کی رنگین نوائیوں کو لمس نظر گوارا نہیں، اور جس کا احساس ایک ایسی نازک، بسیط اور روح پرور کیفیت ہے جو اپنے علم کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ (ص ۲۶)

یہ بیان ایک ایسی یعنیت پسندی کی عکاسی کرتا ہے جو آج کل زیادہ معتبر نہیں سمجھی جاتی کیونکہ یہ خیال کے دھندلکوں پر زیادہ تکیہ کرتی ہے، اور ہمیں نفس شعر و شاعری کی قابل اطمینان تفہیم عطا نہیں کرتی۔ یہ پورا بیان خاصا مبہم ہے، اور کسی طرح ہماری رہنمائی کا حق ادا نہیں کرتا۔ موجودہ زمانے کا قاری ان تعمیمات کی بہ نسبت زیادہ واضح اور قابل اثبات نظریات کو قبول کرنے کی طرف میلان رکھتا ہے۔ تقابلی مطالعے کا جو انداز دوسرے حصے میں اختیار کیا گیا ہے، وہ البتہ غالب اور فانی کے فکری اور ذہنی عمل کو سمجھنے میں ہماری اعا

سکتا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کرنا شاید بےمحل نہ ہوگا کہ فانی کے یہاں ہمیں ایک طرح کا تفلسف ملتا ہے اور غالب کے یہاں حقائق کا فلسفیانہ ادراک۔

"جدید غزل" خطبۂ رشید صاحب نے اس وقت دیا تھا، جب وہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ بعد میں یہ خطبہ ترمیم و اضافہ کے ساتھ ۱۹۶۷ء میں دوبارہ اشاعت پذیر ہوا۔ اس خطبے میں جدید اردو غزل کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ شروع میں غزل کی ماہیت، اس کی روایت اور ان دونوں پر مختلف قسم کے اعتراضات سے بحث کی گئی ہے؛ اور اس کے بعد غزل کے کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ رشید صاحب کا یہ جملہ کہ وہ غزل کو اردو زبان کی آبرو سمجھتے ہیں، ایک طور سے ضرب المثل بن گیا ہے۔ انھوں نے حالی سے فراق، بلکہ فیض تک اردو غزل کے ممتاز نمایندوں کے کلام پر اپنے مخصوص انداز میں بعض بلیغ اور چونکا دینے والے اشارے کیے ہیں۔ حالی کے سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

بڑے شاعروں کی شاعری میں تاریخی تہلکے انسانی تہذیب میں ڈھلتے ہیں۔ شاعر خوانچہ والوں کی پکار نہیں ہوتی، انسانیت کے خاصانِ بارگاہ کی فغانِ نیم شبی اور گریۂ سحری ہوتی ہے۔ (ص، ص ۵۸-۵۹)

حسرت کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے:

حسرت سے پہلے اردو کا کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جس کا محبوب اور جس کی عشق ورزی اتنی سادہ، شائستہ، سرور افزا اور نارمل ہو، جتنی کہ حسرت کی۔ انھوں نے اپنی عاشقی کو قصۂ زمین برسر زمین ہی رکھا۔ اس کو نہ آسمان پر لیے پھرے، نہ خانقاہوں اور دیرانوں میں بھٹکنے دیا۔ اپنے عشق کو نہ گاؤں سدھار کا میلہ بنایا نہ بغاوت اور انقلاب کا دبیلہ، نہ یزدان و اہرمن کا مسئلہ (ص ۶۴)

جگر کے بارے میں صرف یہ دو جملے قابلِ غور ہیں:

عاشقی میں جگر دوری و مہجوری کی عظمت کے قائل ہیں ..... جگر میں بےپایاں سرشاری اور سپردگی کے ساتھ عشق اور اس کے متعلقات کا جو احساس یا بصیرت ملتی ہے، وہ ان کی شخصیت کو بہت دلآویز اور محترم بنا دیتی ہے۔ (ص ۶۸)

اصغر کے بارے میں کسی قدر زیادہ تفصیل ملتی ہے:۔

اصغر کی غزل گوئی میں محبوب کی وہ کارفرمائی نہ ملیگی، جو عام غزل گویوں کے یہاں نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں نزاکت، نغمگی اور نفاست کے ساتھ جو شائستگی، شیرینی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے، وہ نتیجہ ہے اس اعلیٰ تہذیبی کشود وکشید اور برنائی اور برومندی کا، جسے ہم اُردو زبان اور اردو سماج کہتے ہیں

(ص ۷۶)

اصغر کے کلام میں خیالات وجذبات کی جو عفت ملتی ہے اور ان کے اظہار میں شرافت اور صناعت کے جن لوازم کو جس کامیابی کے ساتھ وہ برتتے ہیں، وہ کم غزل گویوں کے حصّے میں آتی ہے۔ غزل میں بے جھجک ہونے یا لڑکھڑا جانے کی مثالیں عام ہیں؛ اس حمّام میں ستر کا لحاظ کم ہی کرتے ہیں، لیکن اصغر کے یہاں اس کا غیر معمولی احترام والتزام ملیگا۔ (ص ۷۸)

فانی کے بارے میں ان کا فیصلہ یہ ہے؛

فانی کو موت کا عرفان دوسرے راستوں سے نہ ہوا، غم کے راستے سے ہوا۔ لیکن غم اس کا ہے کہ انھوں نے موت کو اس درجہ ہیجان کیوں قرار دیا۔ غم اور موت شاعری کے بہت بڑے موضوعات ہیں، لیکن فانی کی شاعری میں یہ اتنے بڑے نظر نہیں آتے۔ (ص ۸۲)

شاعری میں غم کے عنصر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ غم ہماری زندگی میں پیوست ہے؛ غم اور غم گیتی، شاعری اور موسیقی کو تاثیر بخشتا ہے۔ لیکن زندگی، ادب اور آرٹ، غرض ہر عظیم انسانی سرگرمی کو روشنی، رہبری اور رفعت اُمید سے ملتی ہے الم سے نہیں۔ انسان غم سے بڑا ہے خدا اور رجایت دونوں ابدی ہیں، اور خدا یقیناً غم نہیں ہے۔ (ص ۸۵)

فانی کی شاعری غم والم کی شاعری ہے۔ لیکن موضوع سے قطعِ نظر ان کی غزلیں بجائے خود بڑی پاکیزہ سجل اور آراستہ ہوتی ہیں۔ فانی کے یہاں فن اور زبان

کا بڑا احترام ہے۔ ان کا لہجہ بڑا استوار و ہموار ہے۔ کبھی کبھی ان کی حرمت میں شرافت ان کی حرمت میں شاعری سے بڑی معلوم ہونے لگتی ہے۔ (ص ۸۶)

فراق کے بارے میں بھی رشید صاحب کا فیصلہ بہت بے لاگ ہے:

فراق کی شاعری میں عورت کا ضرورت سے زیادہ عمل دخل ہے۔ جیسے شاعر کی یہ طلب کبھی آسودہ نہ ہوتی ہو۔ عاشقی اور شاعری کے بہت سے پہلو ہیں، ان میں مقبولِ عام وہ ہیں، جہاں عاشقی اور شاعری کا محور عورت کا جسم و جمال ہو۔ اس طرح کی شاعری کا بھی ایک مقام ہے، لیکن یہ وہ مقام بلند نہیں ہے، جہاں کسی تہذیب یا تاریخ کا سوادِ اعظم بڑے شاعر اور اس کے مخاطب کی آنکھوں کے سامنے آسکے۔ یہ سوادِ اعظم بڑے شاعر کے بطون میں طوفان بن کر اترتا ہے اور تہلکہ بن کر برآمد ہوتا ہے۔ یہ تہلکہ جذب و جنون کا ہوتا ہے۔ عورت کے جسم و جمال کا نہیں۔ (ص ص ۹۲، ۹۳)

اقبال کے سلسلے میں یہ تین تبصرے قابلِ غور ہیں:

اقبال نے اپنی غزل میں ہم کو یہ محسوس کرایا کہ عشق و محبت دل ہی کا ماجرا نہیں ذہن کا بھی ہے۔ نئی غزل گوئی کا یہی سنگِ بنیاد ہے۔" (ص ۹۷)

انھوں نے اپنے عقیدے کی بنیاد فلسفے پر نہیں رکھی ہے بلکہ اپنے عقیدے کو فلسفے کا جامہ پہنایا ہے۔ اگر یہ جامہ عقیدے کے جسم پر جہاں تہاں چست نظر نہیں آتا، تو اس سے اقبال کے عقیدے پر حرف نہیں آتا۔ عقیدہ یوں بھی فلسفے کا دست نگر نہیں ہوتا۔ (ص ۹۸)

اقبال نے اپنی غزلوں میں عام غزل گو شعرا کی نہ زبان رکھی، نہ موضوع، نہ لہجہ؛ بلکہ ایسی زبان اور موضوع اور لہجہ اختیار کیا، جن کا غزل سے ایسا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تنوع، تاثیر، شیرینی و شایستگی، نزاکت و نغمگی کے علاوہ جو اچھی غزل کے لوازم ہیں، وہ فرّ و فرزانگی اور قاہری اور دلبری ملتی ہے، جو مناظرِ فطرت اور صحفِ سماوی میں ملتی ہے (ص ۱۰۲)

مندرجۂ بالا اقتباسوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ رشید صاحب نے جدید غزل کے اکابر کے بارے میں ان کے کلام کے مطالعے کے دوران چند تاثرات قائم کیے ہیں، جنھیں انھوں نے اس خطبے میں پیش کر دیا ہے۔ یہاں ایک خاص خامی یہ کھٹکتی ہے کہ اقبال کے علاوہ کسی بھی شاعر کے کلام سے مثالیں نہیں پیش کی گئیں، جن سے ان تاثرات کی صداقت متحقق اور مستحکم ہو سکتی۔ دعوے بغیر دلیل کے ہیں؛ اور شاعری کا تجزیہ کہیں نہیں ملتا۔ اس دوران رشید صاحب نے اور مختلف امور کا ذکر کیا ہے اور اپنے مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں بعض معاشرتی حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔ رشید صاحب کو عام طور پر تنقید کے ان نظریات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، جن کے مطابق ادب اور شاعری ایک متحرک اور تغیر پذیر سماج کا عکس ہوتی ہے، نہ انھیں غزل یا نظم کے استعاراتی یا اشاراتی نظام اور اس کے تجزیے اور تحلیل کی طرف کوئی رغبت ہے اس کے برعکس وہ نجی، روایاتی اور تہذیبی اقدار کی روشنی میں ادیب یا شاعر کے کارنامے کو پرکھنے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ بیچ بیچ میں کچھ اہم اور غیر اہم مسائل بھی زیر بحث آجاتے ہیں، جن کی وجہ سے نظر موضوع سے ہٹ جاتی ہے؛ لیکن بحیثیتِ مجموعی ان کی نظر میں بڑی بلوغت اور پختگی پائی جاتی ہے۔

غالب کی شخصیت اور شاعری پر محاکمہ رشید صاحب کا تیسرا تنقیدی کارنامہ ہے اور ہر اعتبار سے اسے پہلی دو کوششوں پر فوقیت حاصل ہے۔ ان خطبات کے شروع ہی میں انھوں نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ "شاعری میں شخص کی تلاش میری بڑی کمزوری ہے"۔ یعنی وہ شاعر کے ظرف، شعور اور قد و قامت کا اندازہ اس کی تخلیقی کاوش کی وسعتوں اور گہرائیوں کی روشنی میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ رشید صاحب کے لیے ادب کا مطالعہ بڑی حد تک ذوقی چیز ہے اور خوش ذوقی کی دولت، جس میں ذہنی چوکنّاپن، جذباتی رچاؤ اور حساسیت تینوں شامل ہیں، ہر شخص کے لیے مقدر نہیں۔ ادبی تخلیق کے سلسلے میں تاثرات اور ردّعمل کو نہ میکانکی انداز سے تولا جا سکتا ہے، نہ اس کے لیے اعداد و شمار جمع کرنا ضروری ہے۔ غزل کی تنقید میں اور بھی کئی پابندیاں ہیں۔ ہمارے یہاں کوئی دیومالائی تصور نہیں ہے، فنی اور جمالیاتی محرکات کی ویسی تکرار، جو نسلوں اور قوموں کے تجربات میں مشترک ورثے کی حیثیت

سے شامل ہو۔ غالب کی قدر و قیمت متعین کرنے کے سلسلے میں کچھ نئے زاویے مزید تلاش کیے گئے ہیں۔ مثلاً ان کے یہاں محاکات اور ترنّم کے سانچوں کا تعیّن، یا ادّعائے ذات اور وجودیت کے عناصر۔ رشید صاحب نے غالب پر اپنے نظام خطبات میں یقیناً اہم باتوں کی طرف توجّہ دلائی ہے، لیکن محض اس وجہ سے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تعیمات کو نئی تنقیدی اصطلاحات سے مزیّن نہیں کرتے، یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ فنِّ شعر کی ماہیّت یا اس کے اثرات سے اوروں کی بہ نسبت کچھ کم واقف ہیں۔ ان خطبات میں خاص طور پر ہمیں ایک شگفتگی، بیدار مغزی اور اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے۔

رشید صاحب غالب اور اکبر دونوں سے ایک طرح کی ذہنی اور مزاجی وابستگی اور ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے اسباب شاید دو ہیں: اول، رشید صاحب کے یہاں فکر اور جذبے کی توانائی اور برانگیختگی، اور دوسرے طنز و مزاح کی طرف وہ میلان جو اشیاء اور حوادث و کیفیات کے لیے بے ہنگم پن کو ملنے کا ایک وسیلہ فراہم کرتا ہے۔ یہی دو عناصر غالب پر ان کی تنقید میں بھی بروئے کار آئے ہیں۔ رشید صاحب نے بہت حسن و خوبی سے یہ بات نمایاں کی ہے کہ غالب کے مزاج میں عجمیّت کا عنصر، بحیثیت ایک قومی، ترکیبی عنصر کے موجود ہے:

> وہ شاعر اور شخص، دونوں اعتبار سے عجمی ہیں۔ عجم کے یزدان و اہرمن، لہراسپ اور جاماسپ، جام و جمشید، آتشکدوں اور لالہ زاروں اور ان سب کے رسم و روایات کی رُو سے۔ اس کا سراغ ان کے اردو کلام یا خطوط میں اتنا نہیں، جتنا فارسی کلام میں ملتا ہے۔ (ص ۱۸)
>
> غالب کے کلام میں آتش نفسی کی جو ایک زیریں رَو ملتی ہے، وہ بھی آتشکدۂ ایران کا تصرف ہے۔ (ص ۱۹)

لیکن یہ عنصر غالب کے یہاں جتنا بھی راسخ رہا ہو، رشید صاحب نے جائز طور پر اس طرف بھی اشارہ کیا ہے، کہ اس کی نشو و نما اور تہذیب اور تنقیح میں ان اشراف کی صحبت کو بھی بڑا دخل تھا، جو سیاسی طور پر زوال آمادہ تہذیب کے دَور میں دلّی کی ہر کھ میں موجود تھے۔ مجموعی طور پر شاعری کا ذکر کرتے ہوئے رشید صاحب نے دوسرے خطبے میں ایک جگہ لکھا ہے:

لیکن شاعر، ادیب، موسیقار، مصور اسی کائنات کی مخلوق ہوتے ہوئے، نئے جہان اور نئی کائنات کی تخلیق پر قدرت رکھتے ہیں جن کے یزدان و اہرمن، ارض و سما، لمس و لذت، کشش و گریز اور حضور و سرور کا خالق خود شاعر ہوتا ہے۔ شاعر کے اس جہان میں ہم ان حقیقتوں، آرزوؤں اور بصیرتوں سے آشنا ہوتے ہیں، جو انسان کے شایستہ ذہن، ذوق اور ظرف کی مستقل اور مسلسل آبیاری اور سیرابی کا باعث ہوتی ہیں۔ ہمارے ادب میں غالب اور ان کی شاعری نے ایک ایسے جہان کی تخلیق کی ہے، جس میں ہماری تہذیبی زندگی کے لالہ کار و تازہ کار رہنے کے امکانات روشن تر ہو گئے ہیں (ص ۵۷)

غالب پر اطلاق سے قطع نظر اس اقتباس کا مقابلہ "باقیاتِ فانی" کے مقدمے کے اس اقتباس سے کیا جائے، جو اس مضمون کے شروع میں دیا گیا ہے، تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رشید صاحب کا نقطۂ آغاز کیا تھا اور وہ اس سے چل کر کس منزل تک پہنچے ہیں۔ عینیت پسندی دونوں جگہ موجود ہے، لیکن وہاں جو ابہام اور بے یقینی کی کیفیت تھی، وہ یہاں ایک روشن بصیرت سے بدل گئی ہے۔

شاعری میں انانیت کا ذکر کرتے ہوئے رشید صاحب نے ایک بہت پتے کی بات کہی ہے:

کہا جاتا ہے کہ انانیت کا تصور شیطنیت کے تصور سے جا ملتا ہے، اور ہر بڑے شاعر میں بقدر ذوق یا ظرف سے "عظیم انحراف" یا شیطنیت ملتی ہے۔ اس عنصر کے بغیر ایک اچھا شاعر تو بن سکتا ہے، لیکن عظیم شاعری کی سرحدیں اکثر و بیشتر کافری کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ملیں گی۔ غالب کی عظمت میں اس کافری کا خاصا دخل ملتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لے اتنی بلند ہوتی ہے کہ غالب منصور سے بھی آگے نکلتے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں (ص ۳۹)

رشید صاحب نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ غالب نے غزل کی روایت کو جس میں انفعالیت کا دور دورہ تھا، اور جو سپردگی اور "کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے" سے عبارت تھی، مردانہ وقار اور آن بان عطا کی۔ ان کے بقول غالب کا عشق "وارداتی نہیں، تصوراتی ہے" اور اسی لیے انھوں

نے انیسویں صدی کی غزل کی شاعری میں آنے والے دور کے شعور کی سمت اور رفتار کی نشاندہی کی۔ اس ضمن میں رشید صاحب کا یہ مشاہدہ بالکل صحیح ہے:

غالب کا عشق نہ جنسی ہے، نہ رومانی، وہ حسرت و عشرت کا عشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں حسنِ نسوانی کے مرقعے نہیں ملتے۔ زلف، کاکل، نگہ اور مژہ کی درازی سے قطعِ نظر انھوں نے اجزائے حسن یا اعضائے حسن کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے، آنکھوں کے حسن پر جب کہ متقدمین عش عش کرتے ہیں، غالب سرسری گزر جاتے ہیں۔ دہن برائے بیت ہے اور لب برائے نام۔ لیکن نگہ اور مژہ کی خلش انھوں نے تمام عمر محسوس کی ہے۔ (ص ص۔ ۷۰، ۷۱)

دراصل غالب کے یہاں ایک فکری فعت، ایک ذہنی بیداری اور تجزیے کی مہم، پُر پیچ کیفیات پائی جاتی ہیں اور یہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن ان کے یہاں ذہنی عمل کی جو اہمیت ہے اس کے پیشِ نظر یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کا سروکار محض تصورات ہی سے ہو۔ اس کے برعکس ان کے یہاں خیال اور جذبے کا وہ امتزاج پایا جاتا ہے، جو بڑی شاعری کی پہچان اور خصوصیت ہے۔ رشید صاحب کا کہنا ہے:

یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ غالب محض خیال اور فکر کے شاعر ہیں، جذبے کے نہیں۔ عظیم غنائیہ شاعری میں جذبے کی گرمی ہی نہیں، روشنی ملتی ہے (ص ۷۴)

غالب پر گفتگو کے سلسلے میں رشید صاحب نے اس مہذب الم کا بھی ذکر کیا ہے، جو ان کے کلام میں ایک موجِ تہ نشیں کی طرح موجود ہے اور جسے حزن کا نام دیا جا سکتا ہے، اور جو نشاطیہ اور سطحی نشاط کا رد دونوں سے مختلف اور برتر ہے:

غالب کا حزن عشقیہ واردات کا نہیں، بلکہ سماجی حالات و واقعات کی پیداوار تھا۔ ان کے کلام میں حزن کی ایک زیریں لے ملتی ہے اور ایک طرح کی شدید ناآسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسے شخص کی حرماں نصیبی ملتی ہے، جس کا بچپن اور ابتدائے شباب شمع و شاہد و شعر و شراب میں گزرا ہو، اور ناسازگار حالات کے نتیجے میں خود کو اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

کا مصداق پاتا ہے (ص ۶۵)

ان کی شاعری کا عام لہجہ حزنیہ ہے ۔حسرت، داغ، تمنا، بلا، برق وغیرہ کے الفاظ جوان کی شاعری میں بار بار آئے ہیں، وہ اس کی غمازی کرتے ہیں" (ص ۶۷)

رشید صاحب نے غالب کے اردو اور فارسی کلام کے تقابلی وزن و وقار کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے، اس میں ایک حد تک تضاد نظر آتا ہے ۔ مثلاً پہلے خطبے میں وہ یہ کہتے ہیں:

میں غالب کے فارسی کلام کو جس میں غزل، قصیدہ، مثنوی سب شامل ہیں، بحیثیت مجموعی اُردو کلام سے زیادہ ان کا نمایندہ سمجھتا ہوں ..... کلام کو نمایندہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے اعتقاد و افکار اور ذہن و ذوق کی جو ترجمانی اور زورِ بیان و روانیِ طبع کے نمونے ان کے فارسی کلام میں ملتے ہیں، وہ ان کے اُردو کلام میں کم ہیں ۔
(ص ۷۰)

دوسرے خطبے میں وہ یہ کہتے ہیں:

میری ماہرانہ نہیں، لیکن نیاز مندانہ رائے ہے کہ فارسی میں غالب کا اصلی کمال ان کی مثنویات اور قصائد میں ظاہر ہوتا ہے ۔ ان کی فارسی غزلیں اپنے تنوع اور شاعرانہ ابلاغ کی وجہ سے ظہوری کی غزلوں سے یقیناً زیادہ کامیاب ہیں ۔ اہل اعتبار سے ظہوری، خفائی اور غالب ظہوری ہیں ۔ تاہم وہ اب تک اہلِ زبان کی نظر میں کچھ زیادہ وزن و وقعت نہیں حاصل کر سکے ہیں (ص ۷۹)

اسی خطبے میں ذرا آگے چل کر کہتے ہیں:

ان کی فارسی میں کلاسیکی توانائی اور طنطنہ ملتا ہے ۔ لہجہ عام طور پر فکری ہے، استوار اور ہموار اُردو کلام میں وہ جتنے بےتکلف نظر آتے ہیں، اتنے ہی فارسی میں بادب ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مادری زبان اور اکتسابی زبان میں شاعری کرنے کا کیا فرق ہے ۔ اس لیے غالب کے فارسی کلام میں چاشنی نہیں ملتی ۔ اس کے برعکس اُردو میں روزمرہ کی لذت اور روزمرہ کا بانکپن ہے ۔ فارسی کے اہلِ زبان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ غالب کے یہاں جا بجا روزمرہ سے انحراف بھی ملتا ہے (ص ۸۱

راقم الحروف کا خیال ہے کہ قصائد اور مثنویوں سے قطع نظر غالب کے فارسی کلام کا وہ معیار نہیں ہے، جو بحیثیت مجموعی ان کے اردو کلام کا ہے۔ فارسی غزل میں غالب کا درجہ اقبال سے کہیں زیادہ بلند ہو، اور امیر خسرو کا غالب اور ہندوستان کے باقی تمام شعرائے فارسی سے۔ غالب کی اردو شاعری میں خیالات کے جو کوندے لپکتے ہیں اور فکر اور جذبے کا جیسا بھرپور امتزاج ملتا ہے، اس کی کوئی جھلک ان کی فارسی غزلوں میں نہیں ملتی، گو ان کے صیقل شدہ ہونے میں شبہ نہیں۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا، اقبال کی فارسی شاعری غالب کے مقابلے میں خاصی دبتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اردو شاعری میں اقبال کے یہاں جو تنوع، وسعت اور جدید شعور کی تابناکی اور پہلو داری ہے غالب کے یہاں نسبتاً کم ہے۔ رشید صاحب نے اس امر کی طرف البتہ بہت بلیغ اشارہ کیا ہے کہ جہاں ایک طرف اقبال کے یہاں قطعیت ملتی ہے، غالب کے یہاں ایک ضمنی (TENTATIVE) اور متجسسانہ (EXPLORATORY) انداز زیادہ نمایاں ہے۔

رشید صاحب نے غالب کے یہاں بعض ایسے اشعار کی ندرت کا ذکر کیا ہے، جو شراب کی تعریف میں کہے گئے ہیں۔ موضوع گفتگو اگر خمریات کی شاعری ہوتا، تو ان اشعار کی خصوصی تحسین کا جواز ہو سکتا تھا۔ لیکن شاعری کی بڑائی اور بلندی کا انحصار بڑی حد تک موضوع کی بڑائی اور ہمہ گیری پر ہوتا ہے۔ اور کسی زبان میں بھی بڑی شاعری پامال اور محدود موضوعات کی پابند نہیں ہوتی۔ غالب اور اقبال کی فسطانت میں بنیادی فرق ہے۔ غالب کے ذہن اور ادراک کی پیچیدگی اور طرفگی میں شبہ نہیں۔ لیکن ان کی شاعری وقت کی گرفت میں بری طرح اسیر ہے۔ دور حاضر کے انگریزی کے ایک ممتاز عالم اور نقاد ہیلٹن نے بڑی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ بڑی چونکا دینے والی بات کہی ہے: "عظیم شاعری وقت کو شکست دینے کی مسلسل جدوجہد کرتی رہتی ہے"۔

It is engaged in a continual struggle to abrogate time.

اس معیار پر پرکھنے سے اقبال کی شاعری بہ نسبت زیادہ عظمت کی حامل معلوم ہوتی ہے۔

گئی ہیں، وہ ایک حد تک موضوع کے اعتبار سے بھی ہیں، اور وہ مقصد بھی انھیں متعین کرتا ہے، جس کا حصول لکھنے والے کے پیش نظر ہوتا ہے۔

رشید صاحب کی تحریریں عام طور پر اس تعریف کی ضمن میں آتی ہیں، جسے رغبت دلانے کا فن کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، اس لیے کہ نہ ان کا مقصد تشریح و تنقیح یعنی وضاحت ہوتا ہے نہ خفگی کے ذریعہ قاری کے اعصاب پر چھا جانا۔ ان کی مزاحیہ تحریروں اور جدید ترین تحریروں پر ایک امر مشترک معلوم ہوتا ہے یعنی ایک نوع کی چبھن اور ایک طرح کا تیکھاپن اور اسی طرح بعض رویوں کو اپنانے کی طرف رغبت دلانے کی کوشش کرنا جو عام طور پر ان کی تحریروں کی خصوصیت ہو۔ ہم ان کی تحریروں کو اسٹائل کی ایک دوسری قسم کے ذیل میں بھی دکھ سکتے ہیں، جسے Aculeate style کہا جا سکتا ہے۔ ایک بار رشید صاحب کی مزاحیہ تحریروں کے سلسلے میں راقم الحروف نے اس رائے کا اظہار کیا تھا، کہ وہ اپنے فن کے ذریعے سے کسی اصلاح یا انقلاب کی دعوت نہیں دیتے، بلکہ ایک معتدل نقطۂ نظر کے اپنانے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ اس رائے کا اطلاق رشید صاحب کی بیشتر تحریروں پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ شعوری طور پر اور براہ راست نہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ الفاظ اور تراکیب کی گرانبار ندرت سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تشبیہ اور استعارے کا استعمال بھی ناگوار حد تک نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ان کے یہاں وہ معروضیت بھی نہیں ملتی، جو سائنٹفک اور فلسفیانہ تحریروں کا طرۂ امتیاز کہی جا سکتی ہے۔ ان کے یہاں نثر کا آہنگ ایسی زبان کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے، جو بیّن طور پر شاعرانہ اور انتہائی منطقی اظہار بیان کے مابین ایک نادر جوہ رکھتی ہے۔

رشید صاحب کے نثری اسلوب کی ایک خصوصیت جو اکثر توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہے، صنعت تخالف (Antithesis) کا استعمال ہے یعنی اشیاء کی خصوصیات یا پہلو کو یکجا کر دینا جو بظاہر ایک دوسرے کے متنافر ہوں۔ مثال کے طور پر ان جملوں کو دیکھیے جو سب کے سب "مضامین رشید" (طبع اول) سے لیے گئے ہیں۔

آپ کسی چیز، شخص یا موت کا تصور نہیں کر سکتے، جو پامالی سے خالی ہو۔ ایک بار

یہ فقرہ میری زبان سے نکلا ہی تھا کہ ایک منطقی نے گرفت کی۔ فرمایا: دو چیزیں ایک ہی جگہ، ایک ہی وقت میں کیسے موجود ہو سکتی ہیں؟ میں نے کہا، کیوں، جیسے علم اور حماقت۔ فرمایا کیسے؟ میں نے کہا، اور منطقی کسے کہتے ہیں؟

ہندستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے، اکثر شفا خانے میں، ورنہ جیلخانے میں جیلخانے کا راستہ اکثر ارہر کے کھیت ہی سے گزرتا ہے اور شفاخانوں کا شہروں کی صاف، شفاف سڑکوں سے جس پر سے موٹر بھی گزرتے ہیں اور مولوی بھی (ص ۱۳۵)

گواہ قرب قیامت کی دلیل ہے۔ عدالت سے قیامت تک جس سے مفر نہیں، وہ گواہ ہے اور کیوں نہیں، عدالت ایک مختصر نمونۂ قیامت ہو اور قیامت صرف ایک وسیع پیمانے پر نمونۂ عدالت۔ فرق صرف یہ ہے کہ عدالت کے گواہ انسان ہوتے ہیں اور قیامت کے گواہ، انسانی کمزوریاں یا فرشتے (ص ۱۴۳)

رشید صاحب اپنی تحریروں میں تجنیس صوتی (یعنی صنعت سرحرفی) کے بھی بہت دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس سے کبھی کبھی ظرافت کے اثرات کا حصول بھی مقصود ہوتا ہے لیکن اکثر و بیشتر لسانی برجستگی کا:-

میرے نزدیک مارواڑی عورتیں مجموعہ ہیں تین چیزوں کا: گھونگھٹ، گندگی اور گہنا۔

تجسس عورت کی فطرت ہے اور پاسبانی اس کی عادت۔ اس حقیقت کا سدِ راہ نہ پردہ ہے، نہ پیالو

ایک دن میر منجھو اور موسم دونوں متبسم نظر آئے۔

پنشن اور پاسبان نے غالب کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ اور غالب کے پرستاروں نے بہاری۔

•

لیکن ان کی شخصیت کا یہ پہلو جتنا انقیاد و اطاعت کا ہے، اتنا فکر و تخیل کی بلندی و برنائی اور عرفان و یقین کا نہیں۔ وہ شاعر اور شخصی دونوں اعتبار سے عجمی ہیں۔
لسانی اور معنوی اعتبار سے ان کی فارسی میں کلاسیکی توانائی اور طنطنہ ملتا ہے۔

غالب کے غیر معمولی شخص اور شاعر ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے، جب اس کی گواہی دینے میں ان کے عہد کے تمام معتبر و محترم اشخاص ہمزبان ہیں۔ اعلیٰ ذہن، ذوق اور ظرف کا جتنا متنوع، ہم آہنگ اور حسین امتزاج غالب کے یہاں ملتا ہے، وہ باستثنائے اقبال ہمارے کسی اور شاعر یا ادیب کے حصّے میں نہیں آیا۔
عورت کا تصوّر اکبر، حالی اور اقبال نے عفّت، عزّت اور عظمت کی جس سطح سے پیش کیا ہے، وہ کسی دوسرے اردو یا فارسی شاعر کے حصّے میں نہیں آیا۔
اصغر کی غزلگوئی میں محبوب کی وہ کارفرمائی نہ ملیگی جو عام غزلگویوں کے یہاں نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں نزاکت، نغمگی اور نفاست کے ساتھ جس شائستگی، شیرینی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے، وہ نتیجہ ہے، اس اعلیٰ تہذیبی کشود و کشید اور برنائی و برومندی کا، جسے ہم اردو زبان اور اردو سماج کہتے ہیں۔
اس کے باوجود ان (اقبال) کی غزلوں میں تنوّع، تاثیر، شیرینی و شائستگی، نزاکت و نغمگی کے علاوہ جو اچھی غزل کے لوازم ہیں، وہ فرّ و فرزانگی اور قاہری و دلبری ملتی ہے، جو مناظر فطرت اور صحف سماوی میں بھی ملتی ہیں۔
رشید صاحب کی تحریروں میں زور اور توانائی کا سرچشمہ افعال کا استعمال بھی ہے، جس کے مسلسل اور پے در پے لانے سے مفہوم میں یک لخت حرکت اور رفتار کا احساس پیدا ہو جاتا ہے:

اور جملے انقباد و خیزاں آگے بڑھنے کی بجائے ایک تموّج کی کیفیت اختیار کر لیتے ہیں، دو مثالیں دیکھیے:

> کچھ دیر بعد کمرے سے نکل کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ جھیل میں بادبانی کشتیاں آبی تتلیوں کی مانند رقص کر رہی تھیں۔ دور سے آبشاروں کی اور نزدیک سے ان خوبصورت چڑیوں کی آواز آرہی تھی، جو ایک طرف لٹکے ہوئے پنجرے میں پھدک رہی تھیں۔ کبھی یہ خیال آتا کہ ان کو آزاد کر دیا جائے تو کیسی مسرور ہوں گی..... سامنے سڑک پر سے قلی گزر رہے تھے۔ ایک تندرست آدمی کو چار کمزور آدمی ڈانڈی میں لیے جا رہے تھے۔ ڈانڈی کا منظر بھی کس درجے عافیت سوز ہوتا ہے۔
>
> (مضامین رشید، ۲۴۷)

> اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھومتے، بل کھاتے، بھنچتے، جس کڑک، تڑپ، غرّاہٹ اور علم سے بولتے، وہ میں نے دیکھا ہے۔ وہ ہاتھ میں تلوار اور گرز دونوں سے کام لیتے تھے۔ دنیا کے ہر حربے کا جواب اپنی تقریر سے دے سکتے تھے۔ (گنجہائے گرانمایہ: ۸۴)

رشید کی تحریروں کی دلکشی اور معنویت کا راز ایک حد تک اس امر میں بھی ہے کہ وہ اکثر اوقات شابہات (Analogies) کا استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان جملوں کو دیکھیے، جو مضامین رشید میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں:

> جس طور پر حکومت ہند کو آئی سی ایس نے مغالطے میں مبتلا کر رکھا ہے، اسی طور پر طبقۂ رؤسا کو مصاحبین اور متوسلین نے گمراہ کر رکھا ہے۔ حکومت ہند نے طبقۂ آئی سی ایس کو اپنا ہاتھ پاؤں ہی نہیں، بلکہ عقل و دماغ قرار دے دیا ہے، اسی طور پر رؤسا کے مصاحبین ہیں، جو ان کے ہاتھ پاؤں ہی نہیں بلکہ اور اعضائے رئیسہ کا بھی کام کرتے ہیں۔ (ص ۱۵۷)

> ڈپٹی کلکٹر کو گورنمنٹ سے وہی نسبت ہے، جو کنگارو کو اپنے بچے کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس طور پر کنگارو کا بچہ خطرے کی آہٹ پاکر ماں کی جھونجھ میں بیٹھ جاتا ہے، اسی طرح ڈپٹی کلکٹر بھی حکومت کی پناہ ڈھونڈنے میں نہایت آزاد اور کامیاب ہوتا ہے۔ (ص ۱۶۳)

سیاسی گھاگھ کرسی صدارت پر سب سے زیادہ ہار پہن کر بیٹھتا ہے اور تحریر و تقریر میں صرف پریس اور حکومت کے نمایندوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ لیکن اگر گولیاں چلنے لگیں یا طوق و رسن کی باری آئے، تو پھر اپنے ڈرائنگ روم یا قلعے کو وہ کو اتنا ہی محفوظ سمجھتا ہے جتنا مسٹر لائیڈ جارج برطانوی اقتدار کو ارباب آئی، سی، ایس کے آہنی پنجوں میں سمجھتے ہیں (ص ۷۲)

میر منجھو نہایت تندرست آدمی تھے لیکن شکل و صورت سے بالکل ہندستانی دواخانہ ایک سبب یہ بھی تھا جس سے عورتیں اور لڑکے ان سے بھاگتے اور دوست احباب ان کے گرد رہتے تھے (ص ۲۲۳)

مولانا محمد علی کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

مردِ غازی کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی دھوم، طرب انگیزی، برگستواں کی زینت، مالِ یغما اور اسلحہ کی چمک دمک سے نہیں کیا جاتا؛ بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے، ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح، اور دمکتے ہوئے چہرے، ڈوبتے ہوئے سورج سے۔

رشید صاحب کی تحریروں سے مندرجۂ ذیل اقتباسات غور طلب ہیں:

کھڑکی سے دریا کی طغیانی نظر آتی تھی۔ پل کے طاقوں سے الغاروں ٹیالے پانی کا امنڈتے، گونجتے، غراتے گزرنا اور ریل کا اس طغیانی میں پیاں سے بےخبر و بے پروا ہونا؛ دریا کی دوسری طرف نزدیک ہی قلعے کی سنگین فصیل، دیو پیکر پشتبانوں سے مستحکم، جن پر کہیں کہیں تناور درخت اور کٹیلی گنجان جھاڑیاں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی تھیں؛ سیلاب کے تند و تیز دھارے سے اپنے ہمدم دیرینہ پل کی طرح بے نیاز؛ پورب کی برسات کا ہر چہار طرف تسلط، سرمئی اگھیے بادلوں کے غلاف کئی کئی دن تک سورج کی روشنی کا راستہ بند رکھتے۔ یہ بادل طرح طرح سے امنڈتے رہتے

کبھی تہ بہ تہ اکٹھا ہو کر ہوا کے جھکڑوں میں ایک دوسرے کو رَوندتے پھاندنے لگتے۔ کبھی ان کے گونجتے، گرجنے کی آواز اس طرح سُنائی دیتی جیسے غیب کی آواز دور اور قریب سے یکساں سنائی دے اور قضاو قدر کا کوئی اندوہناک فیصلہ نافذ ہونے والا ہو۔ تاریکی اور تھلکے کی اس دار و گیر میں ہل کی سنگین حصار اور قلعے کی فصیل پشتیبان، ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے بے ہنگم بادلوں کے بڑے بڑے تودے بغیر کسی خیال کے ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیئے گئے ہوں۔

(آشفتہ بیانی میری: ۱۵)

دوسرے دن الہ آباد پہنچا۔ بلدیڈ کا راستہ سونا تھا۔ طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ خلوص و محبت و مرحمت کا وہ پیکرِ مجسّم ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی ہو۔ زندگی جو عبارت تھی، دوست کی محبّت و شیفتگی سے، اس میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی، برفستانی ہواؤں اور گورستانی سناٹوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

(گنجہائے گرانمایہ: ۱۳۶)

خطوط نویسی کو میں فنونِ لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں۔ لیکن اردو میں اس کی مثال صرف غالب کے خطوط میں ملتی ہے جن و ہنر کا جو اظہار و ابلاغ، مختلف فنونِ لطیفہ سے علیٰحدہ علیٰحدہ ہوتا ہے، گفتگو کرنے میں ان سب سے بطریقِ احسن کام لینا پڑتا ہے۔ اچھی گفتگو کرنے والے کی گفتگو میں نقش، رنگ، رقص، آہنگ، اور شخصیت کی بیک وقت جلوہ گری ملتی ہے شخص کی عدم موجودگی میں یہی کرشمہ اس کے خطوط میں نظر آئیگا۔ (غالب کی شخصیت اور شاعری: ۱۲۵)

مندرجۂ بالا تین اقتباسوں میں پہلا بیانیہ انداز کا نمونہ ہے، دوسرے میں ایک شدید جذباتی ردِّعمل کو معروضیت کے چوکھٹے میں پیش کیا گیا ہے، تیسرے میں ایک تنقیدی محاکمے کو سامنے لایا گیا ہے۔ تینوں میں ایک طرح کی دلآویزی اور تخیل کو چھو لینے والی صلاحیت مشترک نظر آتی ہے۔ اور یہ تینوں اقتباس حشو و زوائد اور شعوری اہتمام و انصرام سے منزّہ ہیں۔ اس کے باوجود وہ

پڑھنے والے پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ان میں تازگی بھی ہے، برجستگی اور لطافت بھی، اور ایک رواں دواں کیفیت بھی۔ ان کی تاثیر کا راز جذبے کی اس گرماہٹ میں ہے، جسے سطح کے نیچے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہاں بجز پہلے اقتباس کے، جملوں کی ساخت میں پیچیدگی نہیں ہے، لیکن ان کا مجموعی تاثر شادابی، شگفتگی اور صلابت کا ہے۔ سرحرفی صنعت کے استعمال کے سوا، جس میں بعض جگہ شعوری ارادے کا دخل نظر آتا ہے، رشید صاحب اپنی تحریروں کو مرصع اور مزین کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن وہ زبان کے مختلف وسائل پر ایسی دسترس رکھتے ہیں کہ وہ خود بخود ان کے مفہوم کے مطابق ڈھل جاتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری، دونوں سے ممتاز اور افضل ہیں کیونکہ ان دونوں بزرگوں نے اُردو زبان کے مزاج اور اس کے فطری عمل اظہار کو غلط راستے پر ڈالنے میں خاصا اہم رول ادا کیا تھا: زبان کو اپنے "الیغو" (انا) کے جارحانہ مظاہرے کے لیے استعمال بھی کیا اور اسے فارسی اور عربی کی ثقیل تراکیب سے گرانبار بھی کیا۔ نثر کے آہنگ کے سلسلے میں رشید صاحب کا براہ راست تعلق غالب کی روایت سے ہے۔ الفاظ ان کے ہاتھوں میں ایک ایسا معمول اور ہتھیار ہیں، جن کے ذریعے سے وہ تجربے کے جزو کل کے ابلاغ پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اسٹائل کی کوئی ایک تعریف ایسی نہیں ہے، جو جامع کہی جاسکے اور اس کے مختلف شعبوں کا احاطہ کر سکے پھر بھی اچھی اور معیاری طرزِ نگارش وہی ہے، جس میں جھول اور رخنہ نہ ہو، جو ذہن اور جذبات دونوں کو اپیل کرے، جس میں الفاظ اور معانی مبرم طور پر اور قطعیت کے ساتھ باہم شیر و شکر ہو گئے ہوں، اور نظم و ضبط کے باوجود شخصیت کی تابناکی، رنگ اور حرارت اس میں جھلکتی ہو۔ رشید صاحب کی بیشتر تحریریں ان تمام محاسن سے پوری طرح آراستہ ہیں، اور اردو زبان میں انشاپردازی کا ایک منفرد نمونہ ہیں۔

گیان چند

رشید احمد صدّیقی
بحیثیتِ معلّمِ اخلاق

محترم رشید صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی کا ایوارڈ ملا، تو میں نے مبارک باد کی ایک چٹھی لکھی۔ اپنے جوابی خط میں انھوں نے کمالِ شفقت سے میری رہبری کے لیے ایک بزرگانہ نصیحت کی جو کہ یوں تھی۔

> کچھ بھی لکھتے وقت، خواہ کتنا بڑا Provocation ہو شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ فارسی شعر کو خفیف سی تبدیلی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔
>
> بندۂ علم شدی، ترکِ نسب کن جامی! کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

نصیحتیں اکثر پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں، لیکن بعض ایسی تیر بہدف ہوتی ہیں کہ دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ یہ مشورہ میرے دل پر مرتسم ہو گیا ہے کہ کسی قلمی معرکے میں درشت اور دل آزار الفاظ کا استعمال نہ کرنا چاہیے۔ ان کی اس نصیحت سے میری توجہ اس پر بھی گئی، کہ رشید صاحب پر لکھنے والوں نے ان کے طنز و مزاح پر تو لکھا ہے، لیکن ان کے ناصح کے روپ پر دھیان نہیں دیا۔ سرور صاحب نے اپنے بعض مضامین میں اس طرف اشارے ضرور کیے ہیں۔

وہ موضوع سے اکثر دور جا پڑتے ہیں، اور ادب اور اخلاق، آرٹ اور

عورت پر لمبی لمبی بحثیں چھیڑ دیتے ہیں[1]۔

"انھیں اشخاص کی ذاتی کمزوریوں سے اتنی دلچسپی نہیں، جتنی قومی اور اجتماعی خامیوں سے[2]۔"

"وہ ادب کو زندگی سے اور زندگی کو معقولیت سے الگ نہیں کرسکتے۔ ..... ان کی انسانیت یا معقولیت ان پر غالب رہتی ہے[3]۔"

"علیگڑھ کی پرستش کے ساتھ ساتھ وہ انسانیت کی پرستش بھی کرتے رہتے[4]۔"

"وہ اپنی انسان دوستی، اخلاقی معیاروں پر ایمان، عوام سے محبت و دلّفیت، شرافت اور خدمت کی وجہ سے زیادہ ممتاز ہیں اور اس وجہ سے سب سے زیادہ بلند[5]۔"

"مشرقیت، شرافت، معقولیت، انسانیت کو انھوں نے جس طرح زندگی میں برت کر دکھایا ہے، کم نے دکھایا ہوگا[6]۔"

اسی مضمون میں (۳۹۳) سرور صاحب نے رشید صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کوئی شاعر بڑا نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ معقول آدمی نہ ہو۔ رشید صاحب بڑے مصنف بھی ہیں اور معقول آدمی بھی۔ گویا خود ان کی ذات اور تخلیقات ان کے کلیے کا ثبوت ہیں۔

ان کی تحریروں میں بعض اوقات آفاقی و دوامی، خالص اخلاقی حقیقتیں آجاتی ہیں جن سے صفحۂ تحریر اور قاری دونوں کی رفعت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً قدیم ہندستانی ڈھنگ سے کہا جاتا تھا کہ ہر انسان کے اندر ایک راکشس اور ایک دیوتا ہوتا ہے۔ چاہیے یہ کہ راکشس کو دبا کر دیوتا کو غالب رکھا جائے۔ رشید صاحب نے اپنے الفاظ

۱۔ (خنداں پر تبصرہ) تنقیدی اشارے: ۱۸۴ (طبع سوم ۱۹۵۵ء) ۲۔ ایضاً: ۱۸۶

۳۔ رشید احمد صدیقی (مشمولہ ادب اور نظریہ) ۱۴۷ (۱۹۵۴ء) ۴۔ ایضاً: ۱۴۶ ۵۔ ایضاً: ۱۴۷

۶۔ رشید احمد صدیقی کی شخصیت (نئے اور پرانے چراغ): ۳۸۹ (طبع چہارم ۱۹۷۲ء)

ہیں یہی دائمی حقیقت یوں بیان کی گئی ہے:

انسان نے ابتدا سے آج تک جو ترقی کی ہے، اس میں اس کے وجود کے حیوانی تقاضوں اور اخلاقی و روحانی صلاحیتوں میں مسلسل جدال یا مازو ستیز ہوتی رہی ہے۔ یہ عمل تا یوم الآخر قائم رہیگا۔ اس میں بحیثیت مجموعی واضح طور پر خیر کو شر، یا انسان کو حیوان پر غلبہ رہا ہے۔

وہ زندگی میں بعض اعلیٰ مقاصد، بعض اخلاقی قدروں کو سامنے رکھنے پر زور دیتے ہیں اور ان سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ فرماتے ہیں[8]:

جب تک آپ کے دل میں کسی بڑے عقیدے، ادارے، مقصد، یا شخصیت کا احترام اور اس سے بےلوث شغف نہ ہوگا، نہ آپ اپنے لیے کسی مصرف کے رہینگے، نہ کسی دوسرے کے لیے۔

اسی لیے ایک اور جگہ انھوں نے شاگردی استادی، پیری مریدی یا گرو چیلے کے رشتے پر زور دیا ہے؛ اور یہ رشتہ زندگی اور ادبیات دونوں میں صراطِ مستقیم کی پابندی کا سبب بنتا ہے۔ اقدار کے معاملے میں وہ استقلال پر زور دیتے ہیں[9]:

انسان کی صالح اور صحتمند زندگی کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کے ہاں اقدار کی اہمیت کیا ہے اور اقدار کے لیے ضروری ہے کہ ان میں استقلال ہو اور وہ ہوا کے ہر جھونکے سے زیر و زبر نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر اقدار نتیجہ ہوتے ہیں مدتوں کے تجربے اور ریاضت کا۔ زندگی کی کشتی کو طرح طرح کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدار وہی کام کرتے ہیں، جو لنگر اور ناخدا کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ رشید صاحب پرانی قدروں کے پُرزور حامی ہیں۔ انھوں نے ماضی اور اہلِ ماضی کو شدت سے سراہا ہے۔ سرور صاحب نے اس کو مشرقیت کہا ہے۔

۷۔ عزیزان علیگڑھ، فکر و نظر (جلد ۱۲ شمارہ ۱ و ۲ ۱۹۷۲ء): ۱۶۴

۸۔ سرگزشتِ عہدِ گل (مضامینِ رشید): ۹ (۱۹۶۴ء)

۹۔ آشفتہ بیانی میری: ۸۷ (۱۹۵۸ء)

ایک مضمون میں لکھتے ہیں:[10]

رشید صاحب پر اقبال کا اثر اچھا نہیں ہوا۔ ان کی مشرقیت اور گہری ہوگئی۔ ماضی کی دنیا ان کے لیے اور زیادہ اہم ہوگئی۔

وہ زندگی میں روایات کی حفاظت پر زور دیتے ہیں:[11]

آج سے پہلے ہمارے نوجوان خاندان کی اعلیٰ روایات کو ایک قیمتی ترکہ سمجھ کر اس کی پیروی یا اس کا احترام کرتے تھے اور معمولی سے معمولی خاندان بھی ایسا نہ تھا جو کسی صالح و صحتمند روایت کا کسی نہ کسی حد تک حامل نہ ہو۔ رفتہ رفتہ یہ بات ختم ہوگئی۔

وہ معاشرے کے مرض کی تشخیص یوں کرتے ہیں کہ پرانی قدریں ختم ہوگئیں اور ان کی جگہ لینے کے لیے نئی قدریں نہیں ابھریں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انقلاب کی پکار نے مستقل قدروں کو بے وقار کر دیا۔ لکھتے ہیں:[12]

گزشتہ زمانے میں نوجوانوں کو ریاضت کرنے اور نتیجے کا انتظار کرنے کی تلقین کی جاتی تھی اور اسی پر عمل کیا جاتا تھا اس سے ان میں بیصبری، بے اعتمادی یا غیر ذمّہ داری کے جذبات پیدا نہیں ہونے پاتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ظاہر ہے، جہاں انقلاب بلانے اور بغاوت کرنے کا اذن عام ہو، وہاں ریاضت اور انتظار کو کیا دخل!

انھوں نے طالب علموں اور نوجوانوں کو تنبیہ کی ہے کہ اگر وہ انسانیت سے گزرے، تو قابل مواخذہ ٹھہرینگے۔ طالبعلموں کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ ان کی غیر ذمہ دارانہ حرکات پر ڈانٹ پلائی ہے۔ اپنے طویل خطبے "عزیزانِ علیگڈھ" میں ایک بزرگ معلّم کی حیثیت سے کہتے ہیں:[13]

---

۱۰ - ادب اور نظریہ: ۶۴ (۱۹۵۴ء)

۱۱ - آشفتہ بیانی میری: ۸۶ - ۱۲ - ایضاً۔

۱۳ - عزیزانِ علیگڈھ۔ فکر و نظر ص ۱۶۳

آپ طلبہ سے ڈر کر آپ کے حد سے بڑھے ہوئے مطالبات جو اس طرح پیش کیے جاتے ہیں، جیسے یہ تاوانِ جنگ، بلیک میل یا یرغمال ہو، آپ کے شایانِ شان نہیں۔ ان میں سب سے نامسعود اور عبرت انگیز یہ ہے کہ امتحان کے مقررہ ضوابط اور معیار کو گرا دیا جائے، یا بالکل ختم کر دیا جائے۔

وہ جانتے ہیں کہ نصیحت کرنا کوئی بہت اچھی بات نہیں۔ اپنی ریڈیو تقریر 'ناصح' میں کہتے ہیں:[۱۴]

نصیحت کے باب میں ایک بزرگ نے بڑی اچھی بات بتائی ہے یعنی نصیحت کرنا بڑی بیوقوفی کی بات ہے ۔۔۔۔ نصیحت کر دینے کے بعد نصیحت کرنے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس پر کسی اور قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اس کے باوجود انھوں نے یہ فرض انجام دیا ہے، مضامین میں کہیں کہیں اور خطبوں میں زیادہ تندہی کے ساتھ۔ بزرگی اور منصب کی وجہ سے انھیں بار بار نوجوانوں اور طلبہ کو خطاب کرنے کو بلایا جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر نصیحت کرنے سے مفر نہیں۔ اس قسم کا شاہکار ان کا طویل خطبہ "عزیزانِ علیگڈھ" ہے۔ معلوم نہیں، یہ خطبہ واقعی دیا گیا یا محض تحریر کے ذریعے پہنچایا گیا۔ اس میں انھوں نے جم کر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نصیحت کے دریا بہا دیے ہیں۔ غریب طلبہ سُن یا پڑھ کر گھبرا گئے ہونگے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس قیمتی تقریر سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہوگا۔

اس قطع کلام کے بعد عرض کرتا ہوں کہ جوانوں اور بوڑھوں کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے عدل کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بوڑھوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ اپنی جوانی کو بھول گئے، وہ نوجوانوں سے کیونکر مطالبہ کرتے ہیں کہ نوجوان اُن کی دنیا میں رہیں۔ دوسری طرف، نوجوانوں کو یوں آڑے ہاتھوں لیا ہے:[۱۵]

۱۴۔ ناصح۔ مشمولہ خنداں: ۲۷۹ (۱۹۶۵ء)
۱۵۔ سلام ہو تجدید پر، مضامینِ رشید: ۲۷۴

نوجوانوں کا یہ زعم کردہ اسوارِ شب دوراں ہیں، اور دوسرے یعنی بڈھے اور کم نوجوان صرف گردِ راہ، ایک ایسا مغالطہ ہے جس میں بعض امراض کی طرح بچے اور نوجوان ہی زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔

لیکن عدالت کی تمام کوششوں کے باوجود وہ اپنی ترجیح چھپا نہیں سکے:[16]

نئی زندگی اور نیا زمانہ مجموعۂ صد کرامات سہی، لیکن ذاتی طور پر میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الآیام کے جبر و ترک کا حاصل، اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی، انسان اور انسانیت کے لیے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعث خیر و برکت تھی۔

اخلاق کا گہرا تعلق مذہب سے ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے مذہب اسلام اور ملّت اسلامی پر کثرت سے لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اکثر مضامین اور خطبوں میں یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کے مخاطب صرف مسلمان ہیں۔ لیکن انھوں نے مسلمانوں کے مسائل اور اخلاق سے متعلق جو کچھ کہا ہے، اس کا اطلاق عام بنی نوع انسان پر بھی ہوتا ہے۔ ان کا خطبہ "عزیزان علی گڑھ" صریحاً صرف مسلمان طلبہ سے خطاب ہے، لیکن انھوں نے اس کا تراشا مجھے بھیج کر نہ صرف مجھے مفتخر کیا، بلکہ مجھے راہِ راست پر چلنے کی ترغیب بھی دی۔ انھوں نے اپنی سوانح میں صحیح طور پر لکھا ہے کہ بچپن کے اسکول اور شوالے کی فضا کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے کبھی ہندو معتقدات بلکہ حتی الوسع کسی مذہب پر نہ کبھی نکتہ چینی کی، نہ اس کا مذاق اڑایا۔ ان کی تحریریں اس کی شاہد ہیں۔ وہ اپنے ہیرو اقبال کے اس نظریے سے اختلاف کرتے ہیں:

جدا دیں ہو سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

کہتے ہیں:[18]

۱۶۔ احسن مارہروی۔ گنج ہائے گرانمایہ: ۱۷۴ (۱۹۶۲ء)

۱۷۔ آشفتہ بیانی میری: ۲۹

۱۸۔ ایضاً: ۶۸

میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے
جدا رکھنے پر جس چنگیزی سے سابقہ ہوگا، وہ قابلِ قبول ہے یا دین کو
سیاست سے جوڑنے میں جس چنگیزی سے سابقہ ہوگا، وہ قابلِ قبول
ہے۔

وہ فرقہ وارانیت کے خلاف ہیں، جن میں اس نقطۂ نظر سے اپنی محبوب درسگاہ کو جو امتیاز دیتے ہیں، اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں[19]:

علی گڑھ سے باہر فرقہ وارانہ جھگڑے اور صوبجاتی عصبیت کے جہاں
تہاں اکثر مظاہرے ہوتے رہے، لیکن کالج کی فضا اس طرح کی نحوست
ونجاست سے ہمیشہ پاک رہی ... علیگڈھ کے تعلیم یافتہ نکو...رت کے
جن چھوٹے بڑے مناصب پر فائز رہے، یا جہاں کہیں ... حال میں
رہے، فرقہ وارانہ عفونت سے پاک رہے۔

ان کے عقیدے میں علیگڈھ کی ایک اور فوقیت ملاحظہ ہو۔[20]

مسلمانوں کا صحیفۂ مذہب و اخلاق دوسروں کے صحیفۂ مذہب و اخلاق
سے زیادہ ہمہ گیر ہی نہیں سخت گیر بھی ہے ... جہاں تک مذہبی اور اخلاقی
اعتبار سے مسلمان ہونے کا تعلق ہے، ہندستان کے مسلمان ممالک اسلامیہ
کے مسلمانوں سے زیادہ معتبر اور قابلِ تقلید ہیں، نہ کہ اس کا عکس۔ اس
کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ بحیثیت مجموعی ہندستان کے
مسلمانوں کی سب سے بہتر نمائندگی علیگڈھ کرتا ہے۔

مسلمانوں کا صحیفۂ اخلاق دوسرے مذاہب سے زیادہ ہمہ گیر اور سخت ہے۔ دنیائے اسلام میں ہندستان کے مسلمان بہترین ہیں، اور ہندستانی مسلمانوں میں درسگاہِ علیگڈھ کے مسلمان بیت الغزل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک کو اپنے اصول قائم کرنے کی آزادی

۱۹۔ آشفتہ بیانی میری، ۴۲

۲۰۔ سلام ہو نجار پر، مضامینِ رشید: ۲۷۱

ہے، اور قارئین کو بھی ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کی آزادی ہے ۔

وہ مذہب کے بارے میں بہت سخت گیر ہے اور بے لچک واقع ہوئے ہیں ۔ وہ مذہب کے ساتھ غیر مشروط وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ انھیں اس کی تاب نہیں کہ مذہب کے احکام عقل کی کسوٹی پر پرکھے جائیں ۔ کہتے ہیں :[21]

مذہب کے دیے ہوئے اعتقاد و احکام میں تفتیش و تفحص کے معنی، استثنا کی اتنی گنجائش رکھتے ہوئے جتنی عموماً رکھی جاتی ہے، بدنیتی کے ہیں یعنی مذہب و اعتقاد میں کرید بالعموم اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب دل میں اوامر سے گریز اور نواہی کا مرتکب ہونے کے لیے چور دروازوں کی تلاش کرنے اور پانے کی خواہش سر اٹھاتی ہے ۔

وہ سیاست کو مذہب سے الگ کر سکتے ہیں، لیکن اخلاق کو نہیں ۔ ان کے نزدیک غیر مذہبی شخص اخلاقی اعتبار سے اچھا نہیں ہو سکتا ۔ ایک طویل مقولہ ملاحظہ ہو :[22]

اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے ۔ مذہب سے علٰحدہ ہو کر اخلاق پر زور دینا ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے، جن کی نیت بالعموم بالخیر نہیں ہوتی ۔ مذہب اخلاق کا محافظ و محتسب ہے، اور اخلاق بغیر مذہب، عورت بغیر شوہر ہے ۔

خود غرض طبائع مذہب کی ہمہ گیر و ہمہ وقت گرفت سے بچنے کے لیے اخلاق کے دائرے میں پناہ لیتی ہیں، جس کی سرحد پھاند کر وہ تہذیب کی قلمرو میں آجاتے ہیں ۔ وہاں سے سیاست کی وادی میں پہنچتے ہیں ۔ سیاست سے قومیت اور تجارت کی منزلیں دور نہیں رہ جاتیں ۔ یہیں پہنچنا بالعموم ان کا مقصد ہوتا ہے ۔ مذہب کے تقاضوں سے بچنے کے لیے یا مذہب کی پابندی سے اترنے کے لیے جو زینے ہیں، ان میں پہلا اخلاق، پھر تہذیب، اس کے بعد سیاست، قومیت اور تجارت ہیں ۔ مؤخر الذکر تینوں کا نامسعود اتحاد آج عام انسانیت کا

21 ۔ ہمارے ذاکر صاحب : ۱۴۸ (۱۹۷۳ء)

22 ۔ جگر مرادآبادی، گنجہ ۔ رانمایہ : ۲۴۹

سب سے بڑا آشوب ہے۔
یبون ہیں، جو مذہب پر تعقل کو ترجیح دیتے تھے، لیکن ہم انھیں بد اخلاق نہیں کہہ
تے۔ ان کی زندگی میں اخلاق، تہذیب، سیاست اور قومیت، سب کسی نہ کسی درجے
ملتے ہیں۔ لیکن تجارت لازماً نہیں۔ پس ہم خواہ مخواہ یہ فرض نہیں کر سکتے کہ اگر
شخص مذہب پر عقیدہ نہیں رکھتا تو وہ لامحالہ بدکردار یا بددیانت دار ہوگا۔ اور
ہر سیاست اور قومیت کا تجارت سے کوئی لازمی رشتہ بھی نہیں۔
اختلافِ رائے کے باوجود مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ رشید صاحب
ہب کی روح کے عارف اور ظواہر کے مخالف ہیں۔ مذہب کا لُبِّ لباب ان کے
یک خدمتِ خلق ہے:[۲۳]

خدا نے عقائد و عبادت کو خدمتِ خلق کے راستے سے نازل کیا ہے اور اسی معیار
سے وہ ان کو پرکھیگا۔

یسے وہ محض زاہد و واعظ سے مرعوب نہیں۔ اعلان کرتے ہیں:[۲۴]

میں مذہب کا احترام کرتا تھا، مگر مذہبی آدمی کو بالعموم اچھا انسان نہ پایا۔
مذہبی آدمی اکثر عقائد کی خانہ پُری کرکے اعمال کی طرف سے بےفکر ہو جاتے
ہیں۔

ب کی اس تعبیر (خدمتِ خلق) اور مذہبی زعماء کی اس تشخیص کے بعد ان سے کون
ر سکتا ہے!۔
ق کا گہرا تعلق ایک طرف مذہبی عقائد اور معبود سے ہے، تو دوسری طرف سماجی
و اور حق العباد سے۔ رشید صاحب نے اس سلسلے میں جابجا بڑے قابلِ قدر خیالات
ہار کیا ہے۔ مثلاً کھیل کے میدان میں تماشائیوں کو مخالف ٹیم پر آوازے نہیں کسنا
ہیے۔ یونین کے الکشن میں اپنی ذہنی اور اخلاقی برتری کا سہارا پکڑنا چاہیے، نہ کہ

۔ اپنی یاد میں، مضامینِ رشید: ۸۲
۔ ایضاً: ۸۲

مذہبی اختلافات اور دوسرے بیرونی مقاصد کا؛ پہاڑوں پر ڈانڈی اور رکشہ میں سفر کرنا انسانیت کے خلاف ہو، گفتگو کرنے میں سنجیدگی اور تحمل سے کام لینا چاہیے، دعوتوں میں سلیقے سے، بلکہ ہاتھ روک کے کھانا چاہیے؛ لباس کو آرام دہ اور قرین حیا ہونا چاہیے، نمایش مقصود نہ ہو۔ مشرقی تہذیب میں سر کو ڈھکے رکھنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ شیروانی اور اچکن میں کسی شخص کو برہنہ سر سڑکوں پر یا تقریبوں میں دیکھتا ہوں، تو اس کی وقعت کافی حد تک نظروں سے گر جاتی ہے۔[25] وغیرہ

اخلاق کے ان سماجی پہلوؤں پر انھوں نے بار بار لکھا ہے۔ لباس کے معاملے میں البتہ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مردوں کے لیے جس جامے پر وہ رک جانا چاہتے ہیں، اس کے بارے میں فرماتے ہیں:[26]

> قلِ اعوذیت کا میں بھی قائل نہیں، لیکن زنانہ پن یا شہدپن کے مقابلے میں قلِ اعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دے سکتا۔ لباس و جسم کی نمایش یا تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لیے مباح ہے۔ مسلمان مردوں کا یہ وطیرہ نہ ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانے میں مردوں نے بھی لباس کو نمایش و تزئین کے لیے استعمال کیا ہے۔ اور رشید صاحب جیسے بزرگوں کی ہیبت سے اس میں معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ موجودہ سماج بالعموم اور نئی نسل بالخصوص رشید صاحب کا مشورہ قبول نہیں کرےگی۔ اور میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہے کہ نہیں کرےگی، ورنہ دنیا بڑی حد تک بےرنگ ہو جائےگی۔ مردوں، بالخصوص نوجوانوں، کو جامۂ بےرنگ میں ملبوس کرنے سے قبل وہ صنفِ نازک کی رائے بھی معلوم کر لیتے، تو اچھا تھا۔

وہ کھدر کے لباس بالخصوص کھدر کی شیروانی اور پاجامے کو سراہتے ہیں،[27] اور اس کے

۲۵۔ عزیزانِ علیگڑھ۔ فکر و نظر: ۱۷۴

۲۶۔ احسن مارہروی۔ گنجہائے گرانمایہ: ۱۷۴

۲۷۔ ہمارے ذاکر صاحب: ۱۶۶

اخلاقی پہلو پر زور دیتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ کھدّر پوشی فی زمانہ گندم نمائی و جو فروشی کے مرادف بن کر رہ گئی ہے۔

وہ سماج کی اخلاقی گراوٹ کے لیے بڑی حد تک انقلاب و اشتراکیت کو ذمّہ دار گردانتے ہیں۔

کہتے ہیں[29] کہ اس کی وجہ سے ہر شخص یہ کہنے لگا ہے کہ دوسرے اس کا حق غصب کر رہے ہیں اور اس کے تدارک کے لیے اسے قانون شکنی اور سماج پر لعنت بھیجنے کا حق ہے۔

اشتراکیت سے ان کی خفگی بہت شدید ہے۔ ان کی رائے میں[29]:

> جب سے اشتراکی طریقِ فکر و عمل کا آغاز ہوا، فرد، سماج، ادارے، مذہب، حکومت، شعر و ادب، فنونِ لطیفہ، اقدارِ عالیہ میں ایسا عالمگیر ہیجان، فساد فتور آیا کہ اب تک کوئی دوسری طاقت اس کو صحت و اعتدال پر لانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

سماجی اخلاق کے سلسلے میں انھوں نے بعض موقعوں پر بڑی جرأت کے ساتھ اپنی بعض کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے، جو در اصل ایسی شدید کمزوریاں نہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر یہ ہے[30]:

> اس کا دوسرا پہلو بھی کچھ اچھا نہ تھا یعنی میں جس کو دوست سمجھتا یا جس کا مجھ پر احسان ہوتا، یا جس کو میں مجبور و مظلوم سمجھتا تھا، اس کی حمایت میں خواہ وہ بیجا کیوں نہ ہو، عقل اور اخلاق دونوں سے گزر جانے میں تامّل نہ کرتا تھا۔ الکشن وغیرہ میں ووٹ اپنے دوست ہی کو دیتا، خواہ فریقِ مخالف آسمان ہی سے کیوں نہ اترا ہو۔

"اپنی یاد میں" کے عنوان سے انھوں نے خاکم بدہن، اپنی وفات (خدا نہ کرے) کے بعد اپنی زندگی پر تبصرہ کیا ہے۔ الکشن میں غیر مستحق کو ووٹ دینا ضرور نامناسب ہے،

۲۹۔ عزیزانِ علیگڈھ، فکر و نظر: ۱۶۵

۳۰۔ اپنی یاد میں، مضامینِ رشید: ۸۵

لیکن ہمیں یہ ماننے میں تامّل ہے کہ وہ کسی کی حمایت میں عقل واخلاق سے گزر جاتے ہونگے۔ وہ تو ہرفرد، ہرعمل اور ہرادارے کو اخلاق کے پیمانے سے پرکھتے ہیں۔ شاعر اور فنکار کے لیے ان کا یہ قول مشہور ہے[۳۱]:

"نامعقول شخص معقول شاعر نہیں ہوسکتا جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنونِ شریفہ کے آداب کہاں سے آئینگے۔"

سرور صاحب کے مطابق رشید صاحب کے بعض فقرے چونکانے والے ہیں لیکن ان میں حقیقت کچھ سمٹ کر محدود ہوجاتی ہے[۳۲]۔ مندرجہ بالا جملے کو بھی انھوں نے انھیں کے جملہ قرار دیا ہے۔ سچ یہی ہے کہ عالمی ادب کے اکابر شعرا پر اس پیمانے کا اطلاق کیا جائے تو یہ یقیناً محلِ نظر ثابت ہوگا۔

جنس اور عورت کے معاملے میں ان کے نظریات بہت محتاط ہیں۔ وہ جنسی جذبے کے مظاہرے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ جنس کے تخلیقی پہلو اور اخلاقی ذمّہ داریوں کے قائل ہیں۔

فرائڈ نے کہا تھا کہ انسانی افعال کے پس پشت جنسی جبلّت کارفرما ہے۔ رشید صاحب اس سے بہت خفا معلوم ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں[۳۳]:

"اس انکشاف نے انسانوں کے اخلاقی اقدار و کردار اور ان کی لائی ہوئی ہزاروں سال کی برکت اور برگزیدگی کو جس طرح مسخ و مسمار اور انسان کی ترقی کی رفتار اور سمت کو جن بداعمالیوں کی طرف موڑ دیا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔"

مغرب کی بے لگام جنسی ہوسناکی سے وہ بجا طور پر خفا ہیں[۳۴] لیکن ان کا یہ خیال کہ یہی

۳۱ - سیّد سجاد حیدر یلدرم، گنجہائے گرانمایہ: ۲۰۸

۳۲ - رشید احمد صدیقی کی شخصیت، نئے اور پرانے چراغ: ۳۹۳

۳۳ - عزیزانِ علیگڈھ، فکرونظر: ۱۵۰

۳۴ - ایضاً: ۱۵۴

اس ہو نا کی کی مخلوق ہیں، صحیح نہیں۔ ہپیت اختیار کرنے کی بڑی وجہ موجودہ صنعتی تہذیب اور زندگی کی بیمقصدیت ہے۔

عورت کی آزادی اور جنسی معاملات میں وہ قدیم بزرگوں سے ذرا بھی آگے بڑھنے کو تیار نہیں، لکھتے ہیں[۳۵]:

ہر عورت کے فرائض میں ہے کہ وہ اچھی سے اچھی ماں اور بہتر سے بہتر بیوی کا رول ادا کرے۔ شرف و سعادت کا یہ رول صرف اس کے حصے میں آیا ہے۔۔۔
عورت اور مرد کے مساوی حقوق یا عورت کی آزادی کا کچھ دنوں سے عالمگیر چرچا ہے۔ اس تحریک یا تفریح کے صحیح یا غلط ہونے سے قطع نظر اس دشواری کو نظر میں رکھنا پڑیگا کہ جب تک عورت کی جنس اور فطری وظائف یا معذوریوں کو دور یا دفع نہ کیا جائیگا، وہ مرد کی مدد یا محافظت سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

یہ خیالات اپنی جگہ، لیکن ۱۹۷۵ء میں بپا ہونے والی عالمی خواتین کانفرنس ان خیالات اور دلائل سے بمشکل ہی متفق ہو سکتی ہے۔ اگر آج عورت کو صرف ماں اور بیوی کے رول تک محدود کر دیا جائے، تو یہ اسے بیرونِ خانہ دنیا سے بدر کر دینے کے ہم معنی ہو گا متعدد صفِ اول کی عورتوں کی خدمت سے محروم نہیں ہو جائینگے؟

حقیقت یہ ہے کہ رشید صاحب سائنس اور ٹکنالوجی کے آوارہ معاشرے سے بیحد ناآسودہ ہیں اور بجا طور پر۔ فرماتے ہیں[۳۶]:

"سائنس کے کرشموں کو انسانیت کی معراج کیسے قرار دیا جائے! آرٹ اور آزادی کی قربانگاہ پر کن سعادتوں کی بھینٹ چڑھائی جارہی ہے!"
"موجودہ دنیا کی بے یقینی و محرومی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم فن اور فنکار، سائنس اور سائنسدانوں کو انسانیت پر ترجیح دینے لگے ہیں کبھی

۳۵۔ ایضاً: ۱۵۵

۳۶۔ ڈاکٹر انصاری، گنجہائے گرانمایہ: ۱۹

کبھی تو ایسا گمان ہونے لگتا ہے، جیسے انسانیت کو فن اور سائنس کی غلامی میں دے دیا گیا ہو۔ حالانکہ ان دونوں کو بہر حال انسانیت کا تابع رہنا چاہیے۔[۳۷]

وہ سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں، لیکن انھیں مذہب اور اخلاق اور معاشرے کی اندار اعلیٰ میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دے سکتے۔ وہ اس تضاد کو نہیں دیکھتے کہ اگر سائنس اور ٹکنالوجی کی راہ پر چلا جائیگا، تو معاشرے کا مذہب اور اخلاق کی دکھائی ہوئی راہ پر قائم رہنا محال ہے:۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ باز می گوئی کہ دامن تر مکن، ہشیار باش

قصہ کوتاہ رشید صاحب کے نقطۂ نظر سے جزوی اختلاف کے باوجود ہمیں اس سے انکار نہیں کہ سارا موجودہ سماج اخلاقی اور اقداری اعتبار سے بیراہ روی کا شکار ہو گیا ہے۔ ایسے میں رشید صاحب نے اخلاقی جرأت سے کام لے کر جو تنبیہیں کی ہیں، ان کے جائز اور برمحل ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ سماجی معاملوں میں ان کے عقائد اور مطالبات نذیر احمد کے نصوح سے سے ہیں، لیکن ان کا جزوی اثر بھی ہو جائے، تو یہ بھی اخلاقی اصلاح کی جانب ایک اہم قدم ہوگا۔ مجھے ان کی تحریریں بہت سی ان حقیقتوں اور قدروں کو یاد دلاتی ہیں جنھیں ہم جانتے اور مانتے تو ہیں، لیکن بھول گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے مخاطب جوانوں اور طلبہ پر بھی ان کا صالح اثر ضرور ہوا ہوگا، اور ہوتا رہیگا۔

۳۷۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، گنجہائے گرانمایہ: ۲۹۸

سیدہ جعفر

رشید احمد صدّیقی کی نثر نگاری

ہنسنا جتنا آسان ہے، ہنسانا اتنا ہی مشکل فن ہے کیونکہ بقولِ برگساں مزاح کا تعلق براہِ راست ذہانت سے ہوتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص بہت آسانی سے ایسی صورتِ حال پیدا کر سکتا ہے کہ دوسرے ہنسنے لگیں۔ اس میں نہ ذہانت کی ضرورت ہے نہ فنکاری کی۔ لیکن اعلیٰ طنز و مزاح طبّاعی، قوتِ مشاہدہ، ریاضت اور دیدہ وری کا آفریدہ ہوتا ہے۔ سنجیدہ مشاغل اور سنجیدہ تحریروں میں شخصیت کامیابی کے ساتھ پس پردہ جاگزیں ہو سکتی ہے، لیکن مزاح اور ظرافت میں اکثر اس کی اصلی روح بےنقاب ہو جاتی ہے۔ ثقہ لطائف مزاح نگار کی شخصیت اور اس کی شائستگی و وضعداری کی اسی طرح غمازی کرتے ہیں، جس طرح مسخرگی اور ٹھٹھول، اس کے کھلے پن اور سطحیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اُردو ادب کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں طنز و مزاح کی روایت خاصی قدیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کا طنز و مزاح اس کے اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی معیار کا آئینہ ہوتا ہے اور اس آئینے میں اس نسل کے خدوخال آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں ان کے سماجی ماحول اور شخصیت کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح نے اُردو ظرافت کو وقار و تمکنت سے روشناس کیا اور

اسے شائستہ لب و لہجہ عطا کیا۔ انھوں نے اردو مزاح کو تفکر و تامل کے آداب سکھائے۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں زندگی کا ایک رچا ہوا شعور ہے اور اسی شعور کی مدد سے وہ زندگی کی لغویت اور بے معنویت اور گرد و پیش کے بے ہنگم واقعات، بے اعتدالیوں اور کجرویوں کو محسوس کرتے ہیں، اور انھیں اپنے مزاح کا موضوع بناتے ہیں۔ دقیق مسائل اور سنجیدہ موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے بھی انھوں نے اپنی فطری ظرافت کے سہارے شگفتہ نگاری کے نئے معیار قائم کیے ہیں۔ ان کی حساس طبیعت اور ذہانت نے روز مرہ کے معمولی معمولی واقعات اور غیر اہم باتوں میں بھی ظرافت کا پہلو ڈھونڈھ نکالا ہے۔ مزاح نگار میں یہ استعداد موجود ہوتی ہے کہ اس کا جذبۂ تفریح زیادہ بیدار ہوتا ہے۔ اس میں خوش طبعی کا عنصر زیادہ جاندار ہوتا ہے اور اسی کے سہارے وہ واقعات کے سنجیدہ خد و خال میں بھی ظرافت کا جلوہ دیکھتا اور دوسروں کو دکھا سکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے مضامین میں مزاح کی پھلجھڑیاں روز مرہ کے واقعات کے گرد چھوٹتی ہیں۔ "ہوٹل میں ریڈیو"، "سفر"، "دعوت"، "باغ"، "امتحانات" اور "الکشن" میں واقعات کی ظریفانہ مرقع کشی کا ایک خاص ذوق اور سلیقہ نظر آتا ہے۔ یہ ہلکے پھلکے دلچسپ اور پُرلطف مضامین ہیں، جن میں نہ کوئی چونکا دینے والا تجربہ پیش کیا گیا ہے، نہ کوئی فلسفہ طرازی موجود ہے۔ ان میں زندگی کے ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات پیش کیے گئے ہیں، جن سے ہر شخص اپنے آپ کو مانوس پاتا ہے۔ لیکن ان کا مضحک پہلو اس کی نظر سے اس لیے پوشیدہ ہوتا ہے کہ اس میں مزاح نگار کی سی زود حسی، رمز شناسی اور بالغ نظری موجود نہیں ہوتی۔ اچھا مزاح نگار ذکی الحس ہونے کی وجہ سے بہت جلد اثر قبول کرتا ہے اور اس کا ذہن بڑی سرعت کے ساتھ ایک نکتے سے دوسرے نکتے تک پہنچ جاتا ہے۔ مزاح نگار کی یہی غیر معمولی صلاحیت اسے عام آدمی سے ممیز کرتی اور اس کی "عبارت" اور "اشارت" اور "ادا" کو ایک نئی معنویت بخشتی ہے۔

اختصار اور جامعیت رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا جوہر ہے۔ اپنے اکثر مضامین میں

وہ ایک کارٹونسٹ کی طرح چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے پُر اثر اور دلچسپ اسکیچ پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ وہ خاص مواقع اور واقعات کی تصویر ہی نہیں کھینچ دیتے، بلکہ انھیں نظروں کے سامنے متحرک کر دیتے ہیں اور اس سلسلے میں تفصیلی بیانات، جزئیات نگاری اور شرح و بسط سے دامن بچا کے صرف چند اشاروں اور دو چار بلیغ جملوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ کفایت الفاظ ان کی نثر نگاری کا خاص وصف ہے ۔ بیکن کی طرح رشید احمد صدیقی بھی کم سے کم لفظوں میں اپنے مطلب کو ادا کرنے پر قادر نظر آتے ہیں ۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں ظرافت کی ایک وسیع دنیا دکھائی دیتی ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں :۔

"ہمارے محلے کے چوکیدار کی آواز ایسی ہوتی ہے، گویا چور کو دیکھ کر مارے خوف کے اس کی چیخ نکل گئی ہو ۔

ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں پر ہوتا ہے : اکثر شفا خانے میں، ورنہ جیلخانہ میں ۔

شاعر کا گویا اور گویے کا شاعر ہونا کوئی اچنبھے کی بات ہے ، نہ بُری بات۔ صرف بات کا پھیر ہے ۔

اخبار نویس کو بعض حواس کی بالکل ضرورت نہیں ہے ۔ مثلاً آنکھ اس کے لیے بالکل زائد ہے، اس کا کام کان سے لیا جاسکتا ہے ۔

"مضامین رشید" اور "خنداں" اردو نثر میں شائستہ مزاح اور متوازن ظرافت کے اچھے نمونے ہیں ۔ اسلوب کی تازگی اور رچاؤ اور جملوں کی ساحرانہ رمزیت کے علاوہ مصنف کی ادبی ذکاوت اور مزاح نگاری کے فن کو چابکدستی کے ساتھ برتنے کے سلیقے نے ان مضامین کو وقیع بنا دیا ہے ۔ رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ مضامین نے اُن کی

طالب علمی ہی کے دور میں اردو دان طبقے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ان کی تحریروں میں جدّت، البیلا پن اور ادبی حسن ابتدا ہی سے موجود ہے، لیکن بعد کی تحریروں میں یہ رنگ زیادہ چوکھا اور یہ خصوصیات زیادہ پختہ اور نکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ بعد کے مضامین میں فکر و بصیرت اور رمز و علامت کے لطیف و بلیغ استعمال کے ساتھ ساتھ مزاح نگاری میں سماجی آگہی کا عنصر زیادہ تابناک اور فنکاری زیادہ گمبھیر اور باوقار انداز میں جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی مزاحیہ تحریروں سے محظوظ ہونے کے لیے قاری کا ادبی استعداد اور سماجی شعور سے بدرجۂ وافر بہرہ مند ہونا ضروری ہے۔ ان کا مزاح خالص ادبی مزاح ہے، اور اپنے اس طرز سے انھوں نے نثر نگاروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے بلیغ اشاروں اور ان کے مخصوص مزاح سے پڑھا لکھا طبقہ ہی پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ مضامین کی ادبیت، ستھرے مذاق، برجستہ فقروں اور خلقی ظرافت نے ان کی تحریروں کو ایسی انفرادیت عطا کر دی ہے جو اُردو نثر میں ان کے اسلوب سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ فارسی اور اُردو کے کلاسیکی ادب سے رشید احمد صدیقی کی گہری واقفیت اور جذباتی وابستگی اور انگریزی ادب کے شاہکاروں سے ان کی دلچسپی نے ان کی مزاح نگاری اور ادبیت سے مالا مال کر دیا ہے۔ وہ برنارڈ شا اور چسٹرٹن کے مدّاح ہیں اور ان کی تحریروں میں قول محال کا برجستہ اور برمحل استعمال ہمیں آسکر وائلڈ کی یاد دلاتا ہے۔ غالب کے اشعار، ان کے استعارات اور ترکیبوں اور اقبال و اکبر کے طرز ادا سے اثر پذیری نے ان کی تحریروں کو مزاح اور ادبیت کا ایک خوشگوار امتزاج بنا دیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی بعض تحریروں پر ادبیت اور علمیت اتنی غالب ہے کہ ان کا "ہر سخن اک مقام" سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

عوام کا خیال ضروری ہے، لیکن ہر دفعہ کیا ضروری ہے کہ جو ہماری اصطلاحوں سے ناواقف ہو اسے ہمارے جواہر پاروں سے کھیلنے دیا جائے۔

"مضامین رشید" میں مقامی رنگ زیادہ ہے اور "خنداں" میں یہ اثر کم محسوس ہوتا ہے۔ "خنداں" کے مضامین میں عنوانات کا تنوع ان کے وسیع تجربے، انسانی مسائل سے دلچسپی اور زندگی کے جلوۂ صد رنگ کے ادراک کا مظہر ہے۔ رشید احمد صدیقی کی اکثر تحریروں میں علیگڈھ کی روایات سے والہانہ وابستگی اور اس کی مخصوص فضا سے جذباتی لگاؤ، موضوعات میں یکرنگی پیدا کر دیتی ہے۔ ایک خاص ماحول کی عکاسی میں اختصاصی اہمیت اختیار کرنا اور ایک مخصوص فضا کا رمز شناس بننا کوئی قابل اعتراض بات نہ سہی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی تحریروں میں علیگڈھ کے طلسمی حصار کے باہر وہ اجنبی سے محسوس ہوتے ہیں۔ اس فضا کا ان کی سیرت و شخصیت اور ادبی مزاج کی تعمیر و تشکیل میں جو اہم مقام ہے، "آشفتہ بیانی میری" میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میری پسند اور ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار اور فکر و نظر جسے بحیثیت مجموعی شخصیت کہ سکتے ہیں، سب کی سب علیگڈھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر و تشکیل کے لیے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے لایا تھا، لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معنیٰ علیگڈھ نے دیے۔

بعض نثر نگاروں کے پیش نظر ان کا اپنا ایک نصب العین ہوتا ہے اور اسی سے وہ اپنے فن کو گرمی اور توانائی عطا کرتے ہیں اور اس کی رگوں میں خون پہنچاتے ہیں۔ علیگڈھ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا ایک زبردست محرک محسوس ہوتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> ہر شخص اپنا محبوب اور اپنا عقیدہ منتخب کرنے میں آزاد ہے۔ میرے عہد میں یہ آزادی تھی۔ ممکن ہے، آپ کے عہد میں نہ ہو اور آپ اس پر مجبور ہوں کہ دوسرے آپ کے لیے محبوب اور معتقدات متعین اور منتخب کریں۔

بعض اوقات رشید احمد صدیقی پر تنقید کی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کو

ایک خاص نصب العین کا پابند بنا کے اپنے موضوعات کو محدود اور اپنے مزاح کو ایک خاص دائرے میں مقید کر لیا ہے؛ اور اس "مقامیت" پر انھیں سطحیت کا گمان بھی ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے "آشفتہ بیانی میری" اور "مضامین رشید" میں لکھا ہے کہ علیگڑھ سے جو انگنت تجربات انھوں نے حاصل کیے ہیں وہی ان کا سرمایۂ انبساط اور مزاح نگاری کی اصل روح ہیں۔ ایسا مزاح جس پر مقامی رنگ کی چھاپ بہت گہری ہو، مکانی بعد اور فاصلوں کی زیادہ تاب نہیں لا سکتا۔ یہی وجہ ہے، ان کے مضامین سے وہی افراد کما حقہٗ محظوظ ہو سکتے ہیں، اور اُن کے پُر لطف اشاروں سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں، جن کا علیگڈھ سے قریبی تعلق ہو۔

رشید احمد صدیقی نے تہذیبی مسائل اور سنجیدہ موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور ان مضامین میں بھی اپنے مخصوص اسلوب کی دلفریبی کو برقرار رکھا ہے "سلام ہو تجھ پر"، "دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے" اور "جگر میری نظر میں" ان کی ایسی تحریریں ہیں، جن میں مزاح کی چاشنی بھی ہے، اور ادبیت کی شان بھی۔ ان کے تنقیدی محاکے، فنی تجزیے سے زیادہ شخصیت کا مطالعہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں مصنّف کے دو ٹوک فیصلوں اور ان کی آزادہ روی اور اس کے منفرد طرزِ فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ ایسی پُر لطف نگارشات ہیں، جن میں تفکّر و بصیرت کا عنصر بھی ہے اور ظرافت کی سحر آفرینی بھی ان کے مضامین میں طنز کی کاٹ بھی ہے، لیکن ان کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ وہ طنز تلخ نوائی، استہزا یا پھبتی کی شکل نہیں اختیار کرتا۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں ایک دبا دبا سا طنز ہمیشہ موجود ہوتا ہے، لیکن ان کا اصلی فن مزاح نگاری میں اپنا جا دکھاتا ہے۔ ایل۔ جے۔ پاٹس نے طنز و مزاح کے نازک فرق کو واضح کرتے ہو لکھا تھا کہ:

> مزاحیہ، المیہ کی طرح، طنز سے نہ صرف مختلف ہوتا ہے بلکہ اعلیٰ معیار کا حامل بھی۔ . . . جب کوئی طنز نگار مزاح پر توجّہ صرف کرتا ہے، تو اس کی فکر زیادہ بالغ اور اس کا فن سچائی پر مبنی ہوتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کے خیال میں طنز و مزاح دو مختلف ادبی عناصر ہیں۔ وہ ان کے باہمی ربط کے کچھ زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتے۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا[؎] کہ طنز و مزاح ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ وہ دو علیحدہ علیحدہ رجحانات ہیں، اس لیے ان میں ارتباط اور ہم آہنگی کی تلاش بے سود نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ظرافت میں طنز مضمر ہوتی ہے۔ طنز میں ظرافت کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک ظرافت طنز سے زیادہ مشکل فن ہے ظرافت کے لیے خوش دلی اور رحمت درکار ہوتی ہے؛ طنز میں جوش، رنج، غصہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

نارمن فرلانگ اپنی کتاب انگلش سٹائر (English Satire) میں طنز و ظرافت کو شائستگی کی پرکھ کا بہترین ذریعہ قرار دیا ہے، اس لیے کہ طنز و مزاح کے دوران شخصیت کو بےنقاب ہونے کا اچھا موقع فراہم ہوتا ہے؛ اور اس طرح یہ تہذیبِ نفس، شرافت اور شائستگی کے متعلق رائے قائم کرنے کا وسیلہ ثابت ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریریں ثقہ، تربیت یافتہ اور ستھرے مزاح کا مقبول اور پسندیدہ نمونہ ہیں۔ مزاح ہمیں ایک ایسے احساس سے ہمکنار کرتا ہے، جو نہ صرف سماج کی منتشر، غیر معتدل اور غیر متوازن طاقتوں کے خلاف صف آرا ہو سکتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی فرد کے ذہن اور اس کی شخصیت کی کجروی کی بھی اصلاح کر سکتا ہے۔ انھوں نے فرد اور سماج دونوں کو اپنے مزاح کا نشانہ بنایا ہے اور اس کے پیچھے اصلاح کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کے طرزِ تحریر کی خوبی یہ ہے کہ مقصدیت کہیں مزاح پر غالب نہیں آتی۔ ان کا مزاح خوش طبعی اور جدت سے مالامال ہے۔ رشید احمد صدیقی کی ظرافت، دانشمندی اور ذوقِ آگہی کا سرچشمہ ہے اور قاری میں رجائیت کے احساس کو تقویت دیتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں ان کا سیاسی اور سماجی شعور اجاگر نظر آتا ہے لیکن

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے تحریکات سے کم اور افراد سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ خلافت تحریک اور ترکِ موالات ان کے ابتدائی عہد کی اہم تحریکیں تھیں۔ انھوں نے برطانوی سامراج اور پارلیمان پر کہیں کہیں لطیف طنز کیا ہے۔ ان کا روئے سخن دراصل ان افراد کی طرف ہے جو ظاہر پرستی، مفاد پسندی اور تصنع کا شکار ہیں۔ خود غرض اور موقع پرست لیڈروں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اصل لیڈر نہ مار کھاتا ہے اور نہ مرنا گوارا کرتا ہے۔ لیڈر مار کھانا شروع کر دے، تو پھر قوم کی رہبری کون کرے! مار کھانا اور رہبری کرنا دونوں کام ایک ہی لیڈر سے کیونکر سرانجام پا سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاہم یہ دستور چلا آتا ہے کہ مار کھانا قوم کا حق ہے اور مار سے بچنا لیڈر کا فرض۔

رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح میں تمدنی تنقید کے بھرپور عناصر موجود ہیں۔ وہ ہیئتِ اجتماعی کی ناہمواری، اس کے عدمِ توازن اور لغویت کی اصلاح چاہتے ہیں اور ان کو اکثر جگہ انھوں نے اپنے مزاح کا موضوع بنایا ہے۔ مزاح کے لیے ماحول اور زندگی کے منفی پہلو پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ لی کاک مزاح کو افراد کی تربیت اور سماج کی تعمیرِ نو کا ایک مؤثر ذریعہ قرار دیتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری بذلہ سنجی کی رہینِ منت نظر آتی ہے۔ ان کے برجستہ فقرے اور برمحل اشارے تضاد اور مماثلت کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کر دیتے ہیں۔ وہ فقرے تراشنے اور اندازِ بیان کے سہارے عبارتوں کو دلنشین بنانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں، اور اس خصوصیت نے بھی ان کی بذلہ سنجی کو آب و تاب عطا کی ہے۔ زود حسی تیز ادراک، اور طباعی و ذہانت، ان کے فن کے معاون محسوس ہوتے ہیں۔ جیسٹرٹن کی طرح بعض اوقات وہ مختصر عبارتوں میں مزاح، بذلہ سنجی اور شگفتہ بیانی کے جوہر سمو کر قولِ محال کا لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ چند جملے ملاحظہ ہوں۔

> جہاں اپنی عقل کام نہ دے وہاں دوسروں کی حماقت سے فائدہ اٹھانا چاہیے

—

"جھوٹ بولنے کی وہاں زیادہ ضرورت پڑتی ہے، جہاں آپ سچ بولنے کے لیے مجبور کیے جاتے ہیں۔"

"ڈاکٹر نہ ہوں تو موت آسان اور زندگی دلچسپ ہو جائے۔"

"آج کل سب سے زیادہ آسان کوئی بات ثابت کر دینا ہے۔ دس بیوقوف کسی بات پر متفق ہو جائیں، تو وہ بات ثابت ہے۔"

"مضامین رشید" کی اشاعت پہلے عمل میں آئی، اور "خنداں" کی بعد ازاں، لیکن نقش اول نقش ثانی سے بہتر معلوم ہوتا ہے۔ "مضامین رشید" میں مصنف کے طنز و مزاح کی تخلیقی اور فطری صلاحیتوں کا بخوبی اظہار ہوا ہے۔ "خنداں" کے مضامین در اصل ریڈیائی تقریریں ہیں۔ ریڈیائی تقریروں میں بعض تحدیدات اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان مضامین میں وہ "انداز گل افشانی گفتار" نہیں ملتا جس نے ان کی دوسری تصانیف کو نظر فریب اور دلکش بنا دیا ہے۔

خوجی، چچا چھکن اور حاجی بغلول اردو ادب کے ایسے مزاحیہ کردار ہیں، جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ رشید احمد صدیقی کے یہاں اس قسم کی کردار نگاری نہیں ملتی۔ ان کا فن بلیغ اشارات اور ظرافت کی رچی ہوئی حس کا آفریدہ ہے۔ ان کے مضامین میں روشن خیال بیوی، حاجی بلغ العلیٰ، مولوی، بابو، آئی، سی، ایس اور مرشد (ذاکر حسین صاحب) ایک خاص پس منظر اور ایک مخصوص معنوی فضا کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ لیکن یہ ایسے مستقل کردار بن کر ہمارے سامنے نہیں آتے، جو حاجی بغلول، چچا چھکن اور خوجی کی طرح ادب کی ایک زندہ علامت بن جائیں۔

رشید احمد صدیقی کی تصانیف "گنجہائے گرانمایہ" اور "ہمنفسان رفتہ" اپنی خوبصورت و پُر اثر مرقع نگاری کی وجہ سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ اردو نثر میں مرقع نگاری کا فن ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ شخصیتوں کا عکس پیش کرنے اور ان کی سیرت کے اہم خد و خال کو نمایاں کرنے کی کوشش یوں تو تذکروں میں بھی موجود ہیں، لیکن ان میں حدت تاثر نہیں ہے۔ تذکروں میں شخصیتوں کے بارے میں سرسری اور اچٹتے ہوئے اشارے

ضرور دکھائی دیتے ہیں، جن کو پیش کرنے کا مقصد سیرت کے بعض گوشوں کو بے نقاب کرنا ہے
مرقع نگار کسی خاص شخص کی سیرت کی دھوپ چھاؤں، اس کی عادات و اطوار اور کردار کے
سیاہ و سفید کی ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے، جو اپنے اختصار اور ارتکاز کے باوجود اس
شخصیت کے بہت سے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرلے۔ رشید احمد صدیقی کی تصنیف "گنجہائے
گرانمایہ" میں مرقع نگاری کی بہت سی اہم خصوصیات جمع ہو گئی ہیں۔ انھوں نے ایسی
شخصیتوں کو منتخب کیا ہے، جنھیں انھوں نے قریب سے دیکھا تھا، اور جن کی سیرت کے
صحیح خد و خال ان کے سامنے تھے۔ انھوں نے ان اشخاص کی سیرتوں کے آثار، ان کی عادات
و اطوار ان کے حلیے، ڈیل ڈول، اور خوب و زشت کی ایسی متحرک اور گویا تصویریں پیش
کردی ہیں، جو اردو نثر میں ایک عرصے تک مدھم نہ ہو سکیں گی۔ رشید احمد صدیقی اچھی
مرقع نگاری کے اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں کہ جن افراد کے چہرے پیش کیے جائیں
اپنے تمام کمالات اور اپنی ساری چھوٹی بڑی کمزوریوں کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر
ہوں۔ وہ انسان کو فرشتہ یا شیطان بنا کے پیش کرنے کے قائل نہیں۔ رشید احمد صدیقی
انسان کی انسانیت اور اس کی بشری خصوصیات کی تصویر کشی کو مرقع نگاری کا اصل
جوہر سمجھتے ہیں۔ معیاری خاکہ نگاری میں زیر بحث کردار کی افتاد طبع اور خصائل کی تمام
اہم خصوصیات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے یہاں نہ طرح سرائی کا
ملتا ہے، نہ ہجو کی سی انتہا پسندی نظر آتی ہے۔ انھوں نے شخصی تعصبات سے بلند ہو
حقیقتوں کو بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> وہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہ تھے۔ دولتمند نہ تھے۔ کچھ بہت ذہین بھی نہ تھے!
> نہ انھیں جوڑ توڑ آتا تھا۔ خوش پوشاک، نہ خوش گفتار، نہ خوش باش، نہ رنگین
> ادا۔ وہ معمولی سے بھی زیادہ معمولی آدمی تھے۔ پھر بھی وہ ایسے تھے کہ اب ہم
> میں کوئی ویسا نہیں، اور نہ اب ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا ملے۔ سیاہ فام،
> چیچک رو، نحیف الجثہ۔ پہلے پہل کوئی دیکھے تو منہ پھیرے۔ بہتے، تو غلام بن
> جائے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ آپ کی خوبیوں نے ان کی بدصورتی کو کس درجہ

دلآویز بنادیا تھا ۔

رشید احمد صدیقی نے شخصیتوں کے مرتبے اور مقام سے متاثر ہوئے بغیر محض اپنی وابستگی اور ذاتی تعلقات کی بنا پر ان کے مرقعے پیش کیے ہیں ۔ جہاں انھوں نے مولانا محمد علی ، ابو الکلام آزاد ، اقبال اور ذاکر حسین کے مرقعے پیش کیے ہیں ، وہیں کالج کے ایک چپراسی کندن کی شخصیت کو بھی انھوں نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے ۔ شخصی وابستگی ، ذاتی ربط و ضبط ، تعلقات اور نجی واقفیت نے ان کے مرقعوں کو پُر اثر ، کامیاب اور جامع بنا دیا ہے ۔ ان افراد کی سیرت ، نجی زندگی ، ان کے معمولات اور ان کے کردار سے پوری طرح آگاہ ہونے کی وجہ سے شخصیت کے ان ایسے گوشوں پر اُن کی نظر پڑتی ہے ، جو سوانح نگار اور محقق کی نظر سے اوجھل رہے ہوں ۔

رشید احمد صدیقی روزمرہ کے غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے واقعات کی مدد سے شخصیت اور سیرت کا تجزیہ کرنے اور ان کی بنیادی خصوصیات کا پتا چلانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مرقع نگاری کا فن بصارت اور بصیرت دونوں کا متقاضی ہے ۔ سوانح نگار حقائق جمع کرنے اور انھیں زمانی ترتیب میں پیش کر دینے پر اکتفا کرتا ہے ، جب کہ مرقع نگار زندگی کے ہر واقعے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا ۔ وہ زندگی کے رنگا رنگ جلووں کا تماشائی ضرور ہے ، لیکن ذوقِ نظارہ کو کثرت کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہونے دیتا ۔ مرقع نگاری اختصار و ایجاز کی رہینِ منت ہوتی ہے ۔ یہ تفصیل کا فن نہیں ، بلیغ اشاروں اور رمزیہ ابلاغ کا فن ہے ۔ مرقع نگاری سروں پر تاج رکھنے یا گردن قلم کر دینے کا نام نہیں ہے ۔ خاکا نگاری کا بنیادی مقصد روشنی اور سایے کے امتزاج سے شخصیت کی جیتی جاگتی اور بھرپور تصویر پیش کرنا ہے ۔ اچھی مرقع نگاری زمان و مکان کی دوری برداشت نہیں کر سکتی ، وہ شخصیت کا قرب چاہتی ہے ۔ اس لیے ہر ادب میں خاکا نگاری کے بہترین نمونے وہ ہیں ، جنھیں معاصر مصنفین نے جذباتی اور ذہنی رفاقت اور قرب و موانست کے سہارے ابھارا ہے ۔ رشید احمد صدیقی نے "گنجہائے گرانمایہ" اور "ہمنفسانِ رفتہ" میں جن اشخاص کی تصویر کشی کی ہے ، ان سے کسی نہ کسی

زمانے میں ان کا قریبی ربط اور تعلّق رہا ہے۔ لہٰذا ان کی معلومات سماعی نہیں، اور اسی لیے وہ قیاس آرائی پر تکیہ نہیں کرتے، بلکہ اپنے مشاہدات و تاثرات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے خاکوں میں صداقت پسندی اور حقیقت نگاری کا عنصر اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ وہ جاہ و منصب یا اثر و اقتدار کو شخصیت سے قرب حاصل کرنے کی ضروری شرط تصوّر نہیں کرتے، بلکہ انسانی فضائل، خوش اخلاقی اور اعلیٰ اقدارِ حیات سے وابستگی کو دوستی اور ہمنشینی کی وجہ تحریک سمجھتے ہیں۔ "ذاکر صاحب" میں لکھتے ہیں:

> میں دوست کے تعائم و فضائل پر مرتا ہوں، نہ کہ اس کے اقتدار و اختیار پر، اس لیے کہ اثر و اقتدار حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں، جن کو سخت مذموم طریقوں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یا جن کے حصول میں محض اتفاق کو دخل ہو سکتا ہے، لیکن فضائلِ نفس وہ نعمت ہے، جو صرف خدا کے برگزیدہ بندوں کو ملتی ہے۔

بعض خاکہ نگار اپنی اہمیت منوانے یا قاری کے دل پر اپنی عظمت کا سکّہ بٹھانے کو اہم سیاسی اور ادبی شخصیتوں سے اپنے دوستانہ تعلّقات اور بےتکلّف صحبتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا مقصد دراصل کسی خاص شخصیت کی مرقع نگاری نہیں، بلکہ اپنی تصویر پیش کرنا ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے جہاں ہندستان کی عظیم شخصیتوں کے مرقعے پیش کیے ہیں، وہاں اپنی انا کی تسکین کا سامان نہیں فراہم کیا ہے، بلکہ زیرِ بحث شخصیت کے خدوخال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر انھوں نے کہیں اپنا ذکر ضروری بھی سمجھا ہے، تو محض اس شخصیت کی سیرت کے مخصوص گوشوں کو نمایاں کرنے کے لیے۔

رشید احمد صدیقی کے مرقعوں میں بعض جگہ شخصیت کا مطالعہ معروضی نہیں رہا اور ان کا لہجہ تاثراتی اور جذباتی ہو گیا ہے۔ اپنے اکثر خاکوں میں جہاں وہ انسان دوستی، حسنِ سیرت، دلسوزی اور جذبۂ اخلاق کا ذکر کرتے ہیں، وہیں عقیدتمندی، شخصی پسند و ناپسند اور ہیرو پرستی ان کی تصویروں کو یکسر تاثراتی بنا دیتی ہے۔

انھوں نے اپنے مرقعوں میں سیرت کے انہی پسندیدہ پہلوؤں اور خصوصیات پر زور دیا ہے اور ان میں وہ انہی اخلاقی قدروں کے متلاشی ہیں، جنھیں وہ خود عزیز رکھتے ہیں۔ انہی شبلی کا دیر کی کامیاب خاکا نگاری کا راز یہی ہے کہ اس نے انہی شخصیتوں کی مرقع کشی کی ہے، جن میں اسے اپنی سیرت اور اپنے پسندیدہ انسانی اوصاف کا پرتو نظر آیا۔
"شیش محل" میں شوکت تھانوی نے اپنے بعض ہمعصروں اور دوست احباب کے جو خاکے پیش کیے ہیں، وہ دلچسپ اور پرلطف ضرور ہیں، لیکن ان میں سیرت کے مختلف رخوں کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کا فقدان نظر آتا ہے۔ ظرافت کی بہتات اور قہقہے لگانے کی عادت نے انھیں سنجیدہ غور و خوض سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیا ہے۔ اس لیے "شیش محل" کے عائے شخصیت کی حقیقی تصویریں نہیں، کارٹون ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی خوبی یہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے اپنی مرقع نگاری میں ظرافت کے ذریعے سے ایک پرلطف، شگفتہ اور انبساط پرور کیفیت ضرور پیدا کر دی ہے، لیکن "خندہ ہائے بیجا" سے احتراز کیا ہے، جس سے ان کے مرقعے سیرت کے سنجیدہ مطالعے اور افادیت سے بہرہ مند نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شخصی تاثرات، سیرت کے ذاتی مطالعے اور منصفانہ و حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر نے ان مرقعوں کو اردو نثر کے نگار خانے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔
رشید احمد صدیقی کے طرز تحریر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی عبارتیں معنی و مفہوم کے اعتبار سے مختلف سمتوں میں حرکت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں سے شخصیت کے وہ گوشے بھی نظر کے سامنے آجاتے ہیں، جو بعض اوقات سیرت کے کمزور پہلوؤں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ رشید احمد صدیقی اپنے فیصلوں میں کتنے اٹل اور اپنی بات کے اظہار میں کتنے بیباک ہیں۔
وہ سیاق و سباق کی تبدیلی سے ترسیل و اظہار کے لطیف پیرایے پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی لفظوں کے اچھے نباض اور رمز شناس ہیں۔ ان کے یہاں خیال آرائی بڑی حد تک لفظوں کے حسن اور فقروں کی جادوگری کی رہین منت ہے۔ بیساختہ، دلنشین اور خوبصورت انداز بیان نے ان کی مزاح نگاری میں جان ڈال دی ہے۔

ان کا طرزِ تحریر اپنی انفرادیت، شگفتگی، بذلہ سنجی اور نکتہ آفرینی کی وجہ سے دلوں میں گھر کرتا ہے۔ لطیف و شیریں فارسی ترکیبوں اور اساتذہ کے اشعار کے منتخب الفاظ اور اور اظہار کے پیکروں نے رشید احمد صدیقی کی نثر کو ایک نئی حلاوت، دلکشی اور دلآویزی عطا کی ہے۔ ان کے یہاں خطابت کا رنگ کہیں کہیں ذرا گہرا بھی ہو گیا ہے۔ بعض وقت وہ اپنے اصل موضوع سے بے اعتنائی بھی برتتے ہیں۔

مزاحیہ مضامین میں اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ظریفانہ تحریروں میں مزاح کا انحصار ایک خاص حد تک الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی برمحل نشست پر بھی ہوتا ہے۔ اگر مزاح نگار برجستہ اور موزوں الفاظ کا انتخاب نہ کر سکے، بلیغ فقروں اور لطیف اشاروں سے کام نہ لے، تو ممکن ہے کہ بسا اوقات وہ مضحکہ خیز واقعات اور مواقع کو بھی ظریفانہ رنگ دینے سے قاصر رہے۔ رشید احمد صدیقی کی ظرافت کا انحصار واقعات کی ترتیب اور ان کے محلِ وقوع کے ساتھ ساتھ مصنّف کے تبسّم ریز فقرہ اسلوب کی گدگداہٹ اور مخصوص لفظیات پر بھی ہوتا ہے۔ وہ ضرورتاً مزاحیہ الفاظ ڈھال بھی لیتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہم کو "بیمہ کا ایجنٹ"، "اگر ڈاکٹر نہ ہوتے"، "اگر میں فاؤنٹن پن ہوتا"، "ایڈیٹر"، اور "پاسبان" سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ نئے الفاظ اور ترکیبیں وضع کرنے میں انھوں نے عربی اور بالخصوص فارسی سے بہت مدد لی ہے۔ وہ اپنے دَور کے ایک صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں، جن کی تقلید آسان نہیں۔

سلیمان اطہر جاوید

مکاتیبِ رشید احمد صدّیقی
ایک مطالعہ

مکاتیب کا شمار ادب ہی میں نہیں، ادبِ لطیف میں بھی ہوتا ہے، اور اگر اچھے مکاتیب ہوں، تو ان کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہونا چاہیے۔ اُردو میں جن ادیبوں کے مکاتیب فنونِ لطیفہ کی آبرو میں اضافہ کرتے ہیں، ان میں رشید احمد صدیقی بھی ایک ہیں۔ ایک اچھا مکتوب اچھی غزل کی طرح ہوتا ہے، پُرکیف اور دلپذیر۔ رشید صدیقی نے یہاں وہاں غزل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ سب کم و بیش اچھے مکاتیب کے بارے میں بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً "غزل شاعری نہیں، تہذیب بھی ہے"۔ ... یا۔ "غزل فن ہی نہیں، فسوں بھی ہے" ... یا "غزل صنفِ سخن ہی نہیں، معیارِ سخن بھی ہے"۔ یا "غزل ریزہ کاری میں مینا کاری ہے"۔ یا "غزل کو میں فن نہیں، اُردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں"۔ بہرحال اچھے مکاتیب سے مُراد کاروباری نوعیت کے مکاتیب نہیں، نہ وہ محض رسمی طور پر تحریر کیے جاتے ہیں، بلکہ وہ مکاتیب ہیں، جو اداؤتاً لکھے نہیں جاتے، بلکہ صاحبِ مکتوب کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کو لکھ جائے۔ کاروباری مکاتیب کا دائرہ معیّن اور محدود ہوتا ہے۔ "رسمی مکاتیب برائے مکاتیب" کی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ اس لیے تحریر کیے جاتے ہیں کہ ان کا تحریر کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ کچھ ہمارے تہذیبی تقاضے اور راہ و رسم کی پابندیاں ایسی ہیں کہ انھیں لکھنا ہی پڑتا ہے۔ انسان ایسے مکاتیب میں مجبور اور "محدود" سا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ لیکن

وہ مکاتیب جو آپ ہی آپ لکھے جاتے ہیں، ہر طرح کی قید و بند سے آزاد ہوتے ہیں۔ لکھنے والا انھیں غیر شعوری طور پر لکھ جاتا ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ قلم کی روانی پر اس کی گرفت نہیں رہتی، رہ بھی نہیں سکتی۔ یہاں غیب سے مضامین خیال میں آنے لگتے ہیں اور صریرِ خامہ نوائے سروش بن جاتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اس بات کو اپنے خوبصورت انداز میں یوں پیش کیا ہے:

> خطوط کا معاملہ عشق و محبت کا ہے۔ جس طور پر محبت ہوجاتی ہے، کی نہیں جاتی؛
> اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے، لکھا نہیں جاتا۔ محبت کے دیوتا کے مانند خط کا
> دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔

ایسے مکاتیب میں داخل اور خارج کا آپ ہی آپ اظہار ہو جاتا، اور مکتوب نگار کی شخصیت کسی ظاہرداری اور ملمع کے بغیر منظرِ عام پر آجاتی ہے۔ اس نوع کے مکاتیب آئینے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی لکھنے والا چاہے یا نہ چاہے، ان سے اس کی شخصیت منعکس ہوکے رہتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں تصانیف کو پیشے کا اور خطوط کو شخصیت کا ترجمان قرار دیا ہے۔ ایسے مکاتیب میں قلم سے کام نہیں چل سکتا؛ ایسے مکاتیب تو دل سے لکھے جاتے ہیں۔ ادب میں ایسے ہی مکاتیب کی اہمیت ہوتی ہے اور ایسے مکاتیب ہی فنونِ لطیفہ کے ذیل میں آتے ہیں۔

ادبی تذکرے، ادبی تواریخ، سوانح عمریاں اور خود نوشت سوانح عمریاں۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کے وسیلے سے ہم کسی فرد یا شخصیت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ خود نوشت سوانح عمری کو اس خصوص میں اونچی حیثیت حاصل ہے، جس میں شخصیت زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ تاہم اس میں تصویر کے دونوں رُخوں کا ملنا محال ہے یہاں بیشتر واقعات پردۂ خفا میں رکھے جاسکتے ہیں، مبالغہ آرائی بھی ممکن ہے اور روداد کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا بھی۔ اس ضمن میں تازہ اور عمدہ مثال جوش کی "یادوں کی برات" ہے۔ مکاتیب کا معاملہ ان سے مختلف ہی نہیں، ممتاز بھی ہے۔ خاص طور پر ان مکاتیب

۱۔ رشید احمد صدیقی، مکتوباتِ نیاز پر اظہارِ خیال، نگار، لکھنؤ، (جولائی ۱۹۴۰ء): ۱۹

جن کو میں نے فنونِ لطیفہ کی ذیل میں شامل کیا ہے۔
مصنف اپنے مضامین میں، مقرر اپنی تقاریر میں، اور ایک عام فرد اپنی گفتگو میں جن خیالات کا اظہار کرتا ہے، قاری یا سامع سے وہ کتنا ہی بے تکلف ہو اور اپنائیت کا اظہار کرے، پھر بھی وہ اپنے دل کی بات نہیں کہتا۔ موقع و محل کو ملحوظ رکھنا ہی پڑتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ کتاب نہ جانے کب، کہاں اور کتنے افراد کے زیرِ مطالعہ آتی ہے، جو مختلف مزاج، میلانات اور افکار کے حامل ہوتے ہیں۔ تقاریر میں مقرر کو مخاطبین کی کئی سطحوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ بہر طور وہ نہیں کہہ سکتا، جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ گفتگو میں مخاطب سے نسبتاً بے تکلفی ممکن ہے لیکن یہاں بھی حفظِ مراتب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پاس و لحاظ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مکاتیب کا معاملہ ان سب سے جداگانہ ہے۔ ایک حد تک برعکس بھی کہا جا سکتا ہے یہاں جھجک، تکلف، خاطر داری، پاس و لحاظ اور مروت کے پردے خود بخود اٹھ جاتے ہیں، یا اٹھا دیے جاتے ہیں، بالخصوص ایسے خطوط میں جو بے تکلف احباب کو تحریر کیے جاتے ہیں اور اسی لیے زیادہ برجستگی کے حامل ہوتے ہیں۔ اور کیا کہیے، ان میں انسان اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے، اپنے فکر و خیال کو برافگندہ نقاب کر دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض افراد اپنے نجی مکاتیب کی اشاعت مناسب خیال نہیں کرتے، خواہ وہ کتنی ہی ادبی حیثیت کے حامل ہوں اور ادبی، جواہر پارہ دل کی حیثیت کیوں نہ رکھتے ہوں، کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں! رشید احمد صدیقی کا شمار انہی افراد میں ہوتا ہے، بلکہ ان کا ردِ عمل تو قدرے شدید ہے۔ اپنے اس موقف کی انھوں نے وضاحت بھی کر دی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے موسومہ اپنے مکتوب مورخہ ۱۶ جون ۱۹۶۳ء میں رقمطراز ہیں:

> نجی خطوط کے شائع نہ کرنے کے جواز میں دوستوں سے گفتگو اور بحث کے دوران میں مثال بجنسہ وہی دیتا تھا، جو آپ نے دی ہے، یعنی غسل خانے میں تانک جھانک کس صحیفۂ اخلاق میں روا ہے!

ایک موقع پر اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:[2]

۲ - غالب کی شخصیت اور شاعری: ۲۳

مجھے خطوط نگاری کی تاریخ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ بچپن میں انشا ے
مادھورام، جوانی میں لیڈی چیٹرلی کے عاشق کے خطوط اور بڑھاپے میں مولانا
ابوالکلام آزاد کے مکاتیب نظر سے گزرے۔ ممکن ہو اسی کا رد عمل ہو جس کی وجہ
سے اس پر اصرار ہے کہ میرے خطوط خواہ کسی کے نام ہوں شائع نہ کیے
جائیں۔

یہ تو باتیں تھیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ رشید صدیقی کے مکاتیب اچھے ہوتے ہیں بہت اچھے، بےحد اچھے۔ علمی، ادبی، تہذیبی، یہ اور ایسے ہر مفہوم میں اچھے۔ مکتوب کی پہچان رشید احمد صدیقی نے یہ بتائی ہے کہ اسے پڑھ کر تلف کر دیا جائے۔ رشید احمد صدیقی کی اس منطق کو کون تسلیم کریگا؟ اور اگر کچھ دیر کے لیے کوئی تسلیم کر بھی لے، تو کیا عجب کوئی دلجلا کہہ بیٹھے کہ اچھے انسان کی پہچان یہ ہے کہ گفت و شنید کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے! ممکن ہے رشید احمد صدیقی نے اپنے مکاتیب کو تلف کر دیا ہو، لیکن کسی اور سے یہ کفر ممکن نہیں۔ یہ ادبی قتل کون کریگا! رشید صدیقی کے اس رجحان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے رشید صدیقی ایک جذباتی فنکار ہیں۔ وہ لوگوں سے عموماً لیے دیے رہتے ہیں اور ایک حد قائم رکھتے ہوئے ملتے ہیں۔ لیکن جن سے بےتکلف ہوتے ہیں، اُن پر اُن کی شخصیت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ ان کے لیے اُن کے راز، راز نہیں رہتے، اور پھر اپنے تعلق سے اور اُن کے بارے میں بھی بلا کسی تکلف کے اظہار خیال کرتے ہیں۔ مختلف شخصیات طنز و ظرافت کا نشانہ بنتی ہیں اور جہاں تہاں راز ہائے درون پردہ بےنقاب ہوتے ہیں۔ ایسے خطوط کا بوجوہ اشاعت پانا مناسب نہیں ہوتا۔ وہ خود اپنے اس اصول پر شدت سے کاربند ہیں۔ غالباً انھوں نے اس نوعیت کے خطوط تلف نہیں کیے، بلکہ واپس کر دیے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے موسومہ مکتوب مورخہ ۵ جنوری ۱۹۵۲ء میں ایک ایسے مکتوب کا حوالہ ملتا ہے:۔

اس خط کو آپ ہی رکھ لیں۔ میں ایسے خطوط کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا جس
میں لکھنے والے نے بھی باتیں لکھی ہوں اور اس کا امکان ہو کہ جس کو لکھا گیا ہے

وہ کبھی اس سے اس طور پر فائدہ اٹھائے کہ لکھنے والے کو شرمساری ہو۔

لیکن جہاں تک خطوط کی وقعت، ادب میں اُن کی اہمیت اور اُن کے جزوِ فنونِ لطیفہ ہونے کا تعلق ہے، رشید صدیقی کا معیارِ مذاق بہت بلند ہو، مہذب اور شائستہ۔ وہ اچھے مکاتیب لکھتے ہی نہیں، اچھے مکاتیب کا احترام کرنا بھی جانتے ہیں۔ ان سطور سے مکاتیب کے بارے میں اُن کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے:

> خطوط کو نہ تھا گانا ہونا چاہیے، نہ قلمی قوالی۔ خط لکھنا دراصل اتنا خطیۂ ہد۔ اتنا تصنیف کرنے کا فن نہیں، جتنا گفتگو کرنا کا سلیقہ ہے اور گفتگو کرنا، گفتگو کرنے کا نہیں، خاموش رہنے کا بھی فن ہے۔ اس اعتبار سے یہ بڑا سخت گیر فن ہے۔ خاموش رہنا صفاتِ الٰہیہ میں سے ہو۔ اپنے بے پایاں اور بیکراں اختیارات میں تنہا بیٹھنا خدا ہی کے بس کی بات ہے۔
>
> خطوط کو میں فنونِ لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں۔ لیکن اردو میں اس کی مثال صرف غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ جس دہنر کا جو اظہار و ابلاغ مختلف فنونِ لطیفہ سے علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے، گفتگو کرنے میں ان سب بطریقِ احسن کام لینا پڑتا ہے۔ اچھی گفتگو کرنے میں نقش، رنگ، رقص، آہنگ اور شخصیت کی بیک وقت جلوہ گری ملتی ہے۔ شخص کی عدم موجودگی میں یہی کرشمہ اس کے خطوط میں نظر آئیگا۔ غالب نے جو کہا ہے کہ میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے، یہ اسی رمز کی وضاحت ہو۔ ان امور کے پیشِ نظر غالب کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ تصنیف اور مصنف میں کتنی ہم آہنگی ہے۔

رشید صدیقی کے مکاتیب میں ان میں سے کئی خصوصیات ملتی ہیں۔ "کئی" اس لیے کہ غالب کے مکاتیب، غالب کی شخصیت، اسلوب اور انفرادیت کے مظہر ہیں؛ رشید صدیقی کے مکاتیب میں اُن کی اپنی شخصیت، ان کا اپنا اسلوب اور اُن کی اپنی انفرادیت ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ممیّز کیے جا سکتے ہیں۔

۳۔ غالب کی شخصیت اور شاعری: ۲۴

رشید صدیقی مکاتیب نگاری کے معاملے میں وسیع النظر اور فراخدل ہیں۔ وہ اپنے نام آئے ہوئے کم و بیش ہر مکتوب کا جواب پابندی اور عجلت سے دیتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے ان کے شوق کا مشغلہ ہے؛ اور ان کی بڑائی کی دلیل بھی۔ وہ ان معنوں میں "بڑے نہیں" کہ مکاتیب کا جواب نہ دے کر لوگوں میں یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ آدمی مصروف اور "بڑا" ہے۔ اس سے قطع نظر اپنے قریبی احباب اور شاگردوں کو مکاتیب لکھنے میں وہ خود پہل کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی اپنے معدودے چند عزیز دوستوں اور انتہائی عزیز شاگردوں کے علاوہ اوروں سے ملاقات کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ علیگڈھ میں جو لوگ رشید صدیقی کے مزاج کی اس کیفیت سے واقف ہیں، وہ بھی ان سے کم ہی ملتے ہیں۔ اب گویا طرفین میں ایک "سمجھوتہ" سا ہو گیا ہے، نہ رشید صدیقی اوروں سے ملتے ہیں اور نہ دیگر حضرات رشید صدیقی سے! اس چیز نے رشید صدیقی کے مکتوب نگاری کے "مشغلہ" کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ کسی سے کچھ کام ہو، کسی شعر کے بارے میں دریافت کرنا ہو، کسی کتاب کی ضرورت ہو، کسی مصنف یا شاعر کے بارے میں معلومات درکار ہوں، کسی کا مضمون پسند آجائے، کسی کے مضمون میں کسی نکتہ سے اختلاف ہو، کسی اطلاع پر تبصرہ کرنا ہو، علیگڈھ کے کسی واقعہ پر اظہار خیال مقصود ہو، کسی پر ناراضی کا اظہار کرنا ہو، کسی کو مبارکباد دینی ہو ــ غرض یہ یا ایسی کوئی بات ہو؛ رشید صدیقی کسی سے ملتے ملاتے تو ہیں نہیں، پہلے سے کہیں زیادہ اب ــــــ بس ایک رقعہ لکھ دینگے۔ یہی نیم ملاقات ان کے لیے ملاقات ہے، بلکہ ملاقات سے بھی زیادہ! ادھر یونیورسٹی کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد گزشتہ کئی سال سے انھوں نے ملنا جلنا اور کم کر دیا ہے، اپنی ضعیفی، مزاج کی ناسازی، خانگی حالات اور علیگڈھ کے واقعات نے انھیں اور زیادہ تنہائی پسند اور گوشہ نشین بنا دیا ہے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے گرد ایک حصار کھینچ لیا ہے۔ راقم الحروف کے نام خط ۲۹ اپریل ۱۹۷۱ء کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

علالت کی معذوریوں سے علیگڈھ سے باہر نہیں جاتا، بلکہ گھر سے باہر

نکلنے کا اتفاق بہت کم ہوتا ہے۔
اس طرح ان کے خطوط کی تعداد افزوں ہوتی جارہی ہے، جو اُن کی تنہائی پسندی اور گوشہ نشینی کا لازمی نتیجہ ہے۔ یوں وہ اپنی انجمن خیال کو زندگی حرارت اور روشنی دیتے رہتے ہیں۔
رشید صدیقی کے مکاتیب میں ان کی شخصیت اور اسلوب ہی نہیں، ان کا طرز فکر، ادبی سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی موضوعات و مسائل کے بارے میں اُن کا رویہ اور مختلف شخصیات کے متعلق ان کے خیالات کی آئینہ داری بھی ہوتی ہے۔ رشید صدیقی کی شخصیت نہ پیچدار ہے اور نہ تہ در تہ۔ کسی رمز و ایما کے بغیر وہ اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے ہیں۔ ان کے مضامین میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے اور ان کے خطوط میں بھی۔ وہ باتیں جو انھوں نے اپنے مضامین میں نہیں بیان کی ہیں، اپنے مکاتیب میں پیش کر دی ہیں۔ اس طرح ان کے مکاتیب اُن کے ذہن کے ان گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں جو اُن کے مضامین میں روشن نہیں ہو سکے ہیں۔
اگر آپ نے رشید صدیقی سے ملاقات کی ہے، کبھی تبادلۂ خیال کیا ہے، انھیں دیکھا ہی نہیں، سمجھنے کی کوشش کی ہے اور سمجھا ہے، تو آپ انھیں اپنے مکاتیب میں بولتا پائیں گے۔ یہ ان کے مکاتیب کی بہت بڑی خوبی ہے۔ اور پھر اُن کے اسلوب کی ظرفگی شائستگی، شگفتگی، بات کو دھیمے دھیمے کہنے کا انداز۔ خنکی اور کیف میں ڈوبا ہوا لب و لہجہ! لگتا ہے، ریکارڈ ہیں جو آپ سے آپ بجتے جارہے ہیں۔
رشید صدیقی کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں وہ سیاسی آدمی ہیں ہی نہیں بلکہ عام انتخابات میں انھوں نے شاید ہی کبھی اپنے ووٹ کا استعمال کیا ہو۔ انھوں نے اپنے مضامین میں سیاسی مسائل اور سیاستدانوں پر کاری طنز ضرور کیے ہیں۔ لیکن کسی سیاسی مسئلے پر اظہار خیال نہیں کیا۔ البتہ مکاتیب میں کہیں کہیں سیاسی مسائل پر خیالات کا اظہار ملتا ہے، سنجیدگی کے ساتھ، بہت محتاط ہو کر۔ ان کے سیاسی طرز فکر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن انھوں نے غیر معمولی وسیع انداز اختیار کیا ہے۔ قومی ہی نہیں، بین قومی موضوعات پر بھی، ادھر ہندو پاکستان کے مابین طے پانے والے شملہ سمجھوتے پر پروفیسر مسعود حسین خان (وائس چانسلر

جامعۂ ملیہ اسلامیہ) کے نام خط مورخہ ۴ جولائی ۱۹۷۲ء میں لکھتے ہیں:

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حال میں جو مفاہمت ہوئی ہے، کاش اب سے بہت پہلے ہوئی ہوتی۔ کتنی خواریوں، ہلاکتوں، محرومیوں سے نجات ملتی۔ کتنی عقلِ انسانی سے اور کتنا جلد ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور کیسے کیسے دردناک تاوان لینے کے بعد واپس آتی ہے!

خیر، یہ تو ایک انسانی اور اخلاقی نقطۂ نظر تھا۔ مسعود صاحب ہی کے نام ایک اور مکتوب مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۴ء میں روس میں کمیونزم کی انسانی کشمکش کے بارے میں لکھتے ہیں:

روس کی حالیہ اکھاڑ پچھاڑ کے مقابلے میں آپ نے جو مثال (حال ہی کی) انگلستان کی دی، اس سے کتنی باتیں تازہ ہوگئیں، جن کو یادوں کے کباڑ خانے میں پھینک چکا تھا۔ گزشتہ نصف صدی میں کمیونزم (نجاتِ موعودہ!) کے نام سے کیا کیا نہ ہوا، کون نہیں جانتا لیکن بقول فانی "بہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی!" اکثر یہ بات ذہن میں آئی ہے کہ آج ہم آفاق پُر از فتنہ و شر کی منہم کا جو سماں نظر آ رہا ہے، کیا عجب، اگر اس کا بڑا سبب وہ عمل و ردِّ عمل ہو، جو روس کا لایا ہوا ہے۔ اقدار کی یکسر اور یک بیک جو شکست و ریخت روس میں ہوئی ہے اس سے ساری دنیا کے اخلاقی بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ معاشرے میں بدچلنی اور بدامنی کی کیسی قیامت برپا ہے۔ روس ایک طرح کا پریشر بلٹ بن گیا ہے، جس کی وجہ سے سارا فضائی نظام درہم برہم ہوتا رہتا ہے۔ یہ کیسی بدبخت حکومت اور کیسی مظلوم قوم ہے، جہاں دوست یا عزیز پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ قہرِ الٰہی اور کسے کہتے ہیں!

علیگڈھ تو رشید احمد صدیقی کی زندگی ہے، وُان کے لیے سب کچھ۔ اُن کے بیشتر مضامین کا مرکز و محور یہی ہے۔ اسی طرح علیگڈھ کا ادبی نام ہے رشید احمد صدیقی! رشید احمد صدیقی نے ہمیشہ علی گڈھ کا ذکر بڑے چاؤ سے، بڑے اہتمام سے، بڑی اپنائیت سے

کیا ہے۔ علیگڈھ کے بنیادی کردار کو تبدیل کرنے کی بات ہو، یا علیگڈھ کو کسی نہ کسی بہلانے بہکانے کی۔ یہ سب باتیں رشید احمد صدیقی کے لیے سوہانِ روح ہیں۔ اپنے مضامین و مقالات میں انھوں نے علیگڈھ کی تہذیبی، علمی اور ادبی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے، لیکن علیگڈھ کے اس رُخ پر انھوں نے اظہار رائے نہیں کیا ہے، شاید کرنا ہی نہیں چاہتے ہوں کہ وہ طبعاً اپنے دل کے داغوں کی نمائش عام طور پر پسند نہیں کرتے۔ ان جب بھی انھوں نے اپنے ہمخیال اور ہم مذاق افراد کو مکاتیب لکھے ہیں، علی گڈھ کے بارے میں ان کا خامہ خونچکاں بن گیا ہے۔ وہ اپنے جذبات کی شدت پر قابو نہیں رکھ سکے ہیں۔ اور اپنا دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ علیگڈھ میں اپریل ۱۹۶۵ء میں جو ہنگامہ ہوا، اس کے لیے ذمہ دار کون تھے، یہ کیوں ہوا وغیرہ سے بحث نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ان ہنگاموں کے ایک مہینا بعد ۲۴ مئی ۱۹۶۵ء کو علیگڈھ کا یہ عاشق زار مسعود حسین خاں کو لکھتا ہے۔ دیکھیے زخم دل کتنے تازہ ہیں، کتنے ہرے!

'علیگڈھ کے حادثہ کو آج ایک ماہ ہونے کو آیا، لیکن اس کا اثر کچھ اس طرح کا ہے، جیسے وہ حادثہ گزر نہ چکا ہو، بلکہ بعنوان دگر برابر پیش آ رہا ہو۔ معلوم نہیں، اب اپنی زندگی میں اس کا ختم ہونا دیکھ پاؤں گا، یا نہیں۔

اور یوں کئی سال گزر جاتے ہیں ۱۹۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی (مرتمہ) مسودہ قانون پارلیمان میں پیش ہوتا ہے۔

انھیں کے نام ایک اور مکتوب، ۶ جون ۱۹۷۲ء کے تحریر کردہ میں، اس مسودۂ قانون کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے:۔

'حادثہ سخت ہو یا جان عزیز، رعایت لفظی ہم اور آپ سے نہ چھوٹیگی مسعود صاحب! ایک بات کہتا رہا ہوں اور کہتا رہونگا کہ ہم جس متاع کو عزیز رکھتے ہیں، یا ہم کو رکھنا چاہیے، اس کی وکالت، حمایت اور حفاظت سے باز نہیں آسکتے۔ فرد کا یہی مقام ہے۔ یہی مرد مومن کہلاتا ہے۔ یہ لڑائی حق کے لیے کی جا رہی ہے، ہارنے جیتنے کے لیے نہیں۔ اس لیے اس کا انجام یا انعام شہادت یا سعادت

ہے جس کے لیے زندہ ہیں اور زندہ رہنا چاہتے ہیں، اس کے لیے مرنے میں کیا ہرج ؟

اسی طرح کے مکاتیب سے رشید احمد صدّیقی کی علیگڑھ سے وابستگی پر کچھ تیز روشنی پڑتی ہے کہ وہ اس کی گلی میں جانے کے لیے جان و دل کو عزیز نہیں رکھتے ۔

رشید صدیقی کے مکاتیب میں انہی موضوعات پر نہیں، گھریلو معاملات پر بھی اظہارِ خیال ہے۔ نجی معاملات پر "گفتگو" بھی ہوتی ہے، اپنی صحت اور دوسروں کی عافیت کی باتیں بھی۔ غرض وہ سب کچھ جو ایک عام انسان سے ممکن ہے؛ اور فنکار خواہ وہ کتنا ہی عظیم المرتبت اور عالی مقام کیوں نہ ہو، اپنے اندر کے انسان سے تو جدا نہیں ہو سکتا۔ ایسا ممکن بھی نہیں۔ بیگم رشید صدّیقی، حیدر آباد کے نقشی پاندان کی خواہاں ہیں۔ اس کے بارے میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو مسعود صاحب کو رقمطراز ہیں:

"معلوم نہیں، میرا وہ خط آپ کو ملا یا نہیں، جس میں بیگم فاطمہ عالم علی صاحبہ (قاضی عبدالغفار مرحوم کی صاحبزادی) کے بارے میں عرض کیا تھا کہ میری بیوی نے ان کو ایک عدد حیدر آبادی پاندان خریدنے کے لیے پچپن روپے دیے تھے، جب وہ، وائل ماہ گزشتہ میں کشمیر جاتی ہوئی علیگڑھ ٹھہر گئی تھیں۔ تاباں صاحب کے صاحبزادے میاں افتخار حیدر آباد پہنچے ہونگے، ان کی معرفت وہ پاندان (بغیر ناگردان کے) بھیج دیا جائے، یا بیگم مسعود وہ روپے لے کر خود ویسا ہی پاندان خرید کر بھجوا دیں، جیسا موصوفہ نے میرے لیے خرید دیا تھا۔ بیگم فاطمہ کا پتہ نہیں معلوم، ورنہ اُن کو "راست" لکھتا۔

اسی طرح ایک اور خط میں سوّیوں کا تذکرہ ہے۔ یہ خط ان کے بہنوئی جناب محمد سمیع صدیقی (استاد تعددد کالج) کے نام ہے، ۱۶ اگست ۱۹۷۲ء کا لکھا ہوا:

شاہدہ سلمہا یا رتی سلمہا علیگڈھ آنے لگیں، تو ان کے ساتھ دو کلو لکھنو کی سوّیاں

بھیج دینا۔ بنارس کی بہت باریک سوئیاں ہرگز نہ ہوں ۔صرف لکھنؤ
کی، دو کیلو ہوں اور حالات بدستور ہیں۔

نیاز بنارس کی بھیج دیا کرتے تھے ، وہ اب مقبول نہیں ہیں ۔صرف لکھنؤ
کی کام میں لائی جاتی ہیں۔

یہ مع صدیقی صاحب ہی کے موسومہ مکاتیب میں کہیں اصغر علی محمد علی کے عطر کی فرمائش ہے، تو کہیں محمد عمر محمد صدیق کے ہاں کے برقی قوام کی ۔

رشید صدیقی کو گلابوں کا بہت شوق رہا ہے ۔ان کے گھر میں گلاب کا ایک باغ تھا' جس میں دیسی گلاب' ولایتی گلاب' رنگ رنگ کے گلاب، چھوٹے گلاب' بڑے گلاب غرض طرح طرح کے ، قسم قسم کے گلاب ـــــ لیکن یہ شوق بتدریج کم ہوتا گیا ، عمر کے ساتھ ساتھ ۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آ گیا کہ انھوں نے گلابوں کا یہ شوق اپنے بھانجے ڈاکٹر کمال الدین کے حوالے کر دیا ۔مسعود صاحب کے موسومہ مکتوب مورخہ ۹ اگست ۱۹۷۹ء میں لکھتے ہیں :

> ایک زمانہ تھا کہ اچھے گلاب، اچھے قالین اور چینی کے اچھے ظروف جمع کرنے کا شوق تھا۔کراکری چوری ہو گئی ۔گلابوں کا شوق کمال کو منتقل ہو گیا ۔ قالین کے بجائے اب چٹائیاں سمیٹنے لگا ہوں ۔خانہ آرائی کے لیے کیا دیدۂ یعقوب کی سپیدی اور کیا تجلۂ ماہِ کنعاں !

رشید صاحب کی صحت نے کبھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ بالعموم بیمار رہے ، اور بیماری نے اپنے لیے کوئی نہ کوئی حیلہ تلاش کر ہی لیا۔ برسوں سے وہ ایک گردے کے بغیر تو زندگی گزار ہی رہے تھے ؛ اب ادھر چند سال سے دوچار اور عوارض کا مستقل شکار ہو گئے ہیں۔ان میں ضعیف العمری سب سے بڑا عارضہ ہے ۔کیا کریں اور کیا نہ کریں ۔مجبوری بڑی شے ہے ۔بُری شے ہے ۔ وہ سب کچھ سمجھتے جانتے ہیں ۔ انھوں نے اپنی علالت کا تذکرہ مختلف اصحاب کے نام مکاتیب میں کیا ہے ۔ اب جب کہ سوانح ان کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں' یہ دو ایک اہمیت رکھتے ہیں ۔ یہ وغیرہ اسلوب احمد انصاری

(صدر شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی) کے موسومہ مکتوب مورخہ ۲ نومبر ۱۹۷۰ء میں اپنی حالت بیان کرتے ہیں:۔

ادھر کچھ طبیعت اعتدال سے ہٹی ہوئی ہے۔ ایسے میں معالج کی ہدایت کے مطابق ایک آدھ tranquilizer لے کر دم بخود ہو جاتا ہوں۔ چارپائی پر لیٹ رہنے کا یہ بدل نکالا ہے۔ آپ کل شام تشریف لائے، تو میں اسی عالم میں تھا۔

اور ۲ جولائی ۱۹۷۱ء کا یہ خط راقم الحروف کے نام اپنی معذوریوں کا بیان کرتے ہیں:

"میری طبیعت بالکل اچھی نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔۔ .... نہ آنکھ کام دیتی ہے، نہ ذہن، یا دل۔ دل کا پرانا مریض ہوں اور آنکھوں میں موتیا بند۔۔"

آئے دن ان کے عوارض میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آج جو عارضہ نہیں تھا، کل اس سے دو چار ہیں۔ ایک اور مکتوب ہے، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام، ۷ اجنوری ۱۹۷۳ء کا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ خود اپنی صحت کے بارے میں کس قدر بے اطمینانی کا شکار ہیں:۔

آپ کو شاید نہ معلوم ہو کہ جہاں مجھے اور بہت سے آزار لاحق ہیں، ان میں سال بھر سے ہرنیا کا اضافہ ہو گیا ہے، جس سے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے یا کوئی چیز اٹھانے میں بڑی احتیاط کرتا ہوں۔ ہرنیا کا علاج صرف آپریشن ہے، جو مجھ جیسے قلب کے مریض اور معمّر کے لیے ناممکن ہے۔ دن میں کئی بار اس میں سخت درد ہوتا ہے، اور بے سان دگمان۔ اور اندیشہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کب کیا ہو جائے۔

رشید صدیقی، اپنے جاننے والوں، شناساؤں اور دوستوں سے کس قدر تعلق خاطر رکھتے ہیں اس کا اظہار "گنجہائے گرانمایہ"، "ہمنفسانِ رفتہ" اور "ذاکر صاحب" کے مطالعے سے ہوتا ہے

ان مرقعوں میں جو اُردو ادب کی متاعِ گرانمایہ ہیں، رشید صدیقی نے اپنے احساسات اور جذبات کی صحیح تصویر پیش کر دی ہے۔ آپ پڑھ لیجیے، وہ کتنے لطیف اور کتنے گہرے جذبات رکھتے ہیں یہ ان کا صرف مرقع نگاری کا انداز و اسلوب ہی نہیں، ان کا اپنا مزاج بھی ہے۔ یہ ایک فنکار ہی کے نہیں، ایک انسان کے بھی احساسات ہیں۔ رشید صدیقی نے مولانا ابوالکلام آزاد کا مُرقع بھی لکھا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کے خط مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد کے بارے میں دو، تین جملے ہیں، لیکن اس اجمال میں کتنی تفصیل ہے! یہ جوئے کم آب، بحرِ بیکراں سے کم نہیں۔ الفاظ انتخاب، ان کی نشست اور جملوں کا دروبست ہے ہی ایسا:

"مولانا ابوالکلام آزاد کی رحلت سے اس وقت یونیورسٹی میں سبھی نہایت افسردہ خاطر ہو رہے ہیں۔ کتنا بڑا آدمی ہم سے رخصت ہو گیا۔ ایسے ہمہ جہت، فاضل اور یگانۂ روزگار کو اب ہم کہاں پائیں گے!"

بعض اصحاب ایسے بھی ہیں، جن کا انھوں نے مرقع نہیں لکھا، لیکن ان کے بارے میں مرقع نگاری کر گئے ہیں کہ متعلقہ شخصیت اپنے حقیقی خدوخال میں محفوظ ہو گئی ہے۔ ایک ایسی ہی شخصیت مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر عمرالدین کی ہے۔ ان کی وفات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مکتوب ہے ۱۴ اگست ۶۴ء کا تحریر کردہ۔ ... مسعود صاحب کے نام ہے:-

"عمرالدین صاحب کی وفات کچھ دنوں سے غیر متوقع نہیں رہی تھی۔ کئی مہینے سے میری ہمت ان کو دیکھنے جانے کی نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے کہ وہ طرح طرح سے بار بار یاد کرتے رہے اور "احسان" کا بھی اصرار رہا۔ جس کو زندہ، ہنستا بولتا، محبت کرتا ہوا، دیکھتا چلا آیا، اس کو موت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔"

... ید صدیقی کا ادب کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ وہ فن اور فنکار

کے لیے سب سے پہلے اخلاق و آداب، حیا، شرافت اور تہذیب پر زور دیتے ہیں۔ ان کے اس موقف سے تھوڑا بہت اختلاف کیا گیا ہے، لیکن اس خیال کی صداقت اور خلوص سے کسی کو شاید ہی انکار ہو کہ کوئی شخص اسی وقت اچھا فنکار بن سکتا ہے، جب کہ وہ اچھا انسان بھی ہو۔ یہاں اچھے انسان سے مراد اخلاق و آداب، حیا، شرافت اور تہذیبی اقدار کا حامل انسان ہے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار انھوں نے بعض مکاتیب میں بھی کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو ۱۶ جون ۱۹۶۳ء کو تحریر کرتے ہیں:۔

> شعر ہو، ادب ہو، زندگی ہو، فن ہو، سب لا طائل، اگر حیا کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ بےحیائی و بےغیرتی فن نہیں، معصیت ہو۔ البتہ اس کا علاج نہیں، اگر کوئی یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ معصیت ہی اصل فن ہے، یا معصیت اپنے ظہور کے لیے فن کی تلاش میں رہتی ہے۔

ان سطور کا یہ مطلب ضرور ہو سکتا ہے کہ فنکار کو کسی نظامِ اخلاق کا پابند ہونا چاہیے لیکن رشید صدیقی اس سے قطع نظر فنکار کے لیے کسی نظامِ حکومت کی پابندی کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ یہاں فنکار کی آزادی پر زور دیتے ہیں، جس کے بارے میں کسی ایک نے آواز بلند کی ہے۔ ان کے مضامین میں جہاں تہاں فنکار کی آزادی کی بات ملتی ہے۔ لیکن مکاتیب میں بھی انھوں نے اس تعلق سے اپنے خیالات کو جا بجا لیکن مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے موسومہ مکتوب مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۲ء میں لکھتے ہیں۔

> ...... آرٹسٹ کو خود اظہار کی پوری آزادی ہونا چاہیے۔ بغیر اس کے زندگی میں وہ تنوع اور توانائی نہیں آتی، جس کے طفیل ۔ ہر دم جواں ہے زندگی ... ۔"

لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے آزادی کے حدود بھی متعین کر دیے ہیں۔ ان کا آزادی کا تصور اصول اور ضوابط کا حامل ہے، بے ضابطہ اور بے لگام نہیں۔ ایسی آزادی

کے بارے میں ان کے خیالات سنیے ۔ مذکورہ مکتوب ہی کا اقتباس ہے :

..... بے ضابطہ اور بے لگام آزادی افراد کی ہو یا جماعت کی، قابلِ قبول نہیں اس لیے کہ یہ نظم نہیں بلکہ "مزاج" ہو گی۔ ہر شخص یا آرٹسٹ کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنے Artistic Urge کا اظہار کرے ۔ لیکن یہ تو سماج یا اس کے مستند افراد ہی طے کرینگے کہ اس آرٹسٹ کی طرف کیا اور کتنا التفات کیا جائے .....

رشید صدیقی کے ہاں فن اور لوازمِ فن کی بھی اہمیت ہے، بلکہ بہت زیادہ ۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے موسومہ مکتوب مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۶۸ء میں تحریر کرتے ہیں:

مصنّف یا تحریک سے بیزار ہونے میں مضائقہ نہیں ۔ البتہ فن کے آداب اور تقاضوں سے منحرف ہونا کسی طرح گوارا نہ کرنا چاہیئے ۔

رشید صدیقی نے تنقید کی سمت توجہ فرمودی ہے، لیکن ان کا تنقیدی سرمایہ کمیت کے اعتبار سے زیادہ نہیں ۔ اُن کی تنقید تاثراتی نوعیت کی ہوتی ہے ۔ اس پر ان کا اسلوب! قاری کو ان کی روحِ تنقید پر توجّہ دینے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے؛ وہ ان کے اسلوب کے سحر سے مسحور ہو جاتا ہے ۔ مکاتیب میں انھوں نے مختلف شاعروں اور نثر نگاروں کے بارے میں اپنے آرا ظاہر کیے ہیں ۔ یہاں اسلوب کی رو انسبتاً ہلین ہے، اس لیے تنقید کے خدوخال بھی نسبتاً واضح ہیں ۔ ایسے ہی مکاتیب سے ان کے تنقیدی شعور پر مزید روشنی پڑتی ہے ۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کے تنقیدی موقف کو متعین کرنا ہو، تو اُن کے ایسے مکاتیب کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔ اس خصوص میں، میں ان کے دو مکاتیب کے اقتباس پیش کرتا ہوں۔ اتفاق سے یہ دونوں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے نام ہیں ۔ ۲ نومبر ۱۹۷۰ء کے مکتوب میں اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں :

اسرار اور رموز کو آپ نے کم اہمیت دی ہے ۔ میرے نزدیک اقبال کی شاعری

کے لیے سب سے پہلے اخلاق و آداب، حیا، شرافت اور تہذیب پر زور دیتے ہیں۔ ان کے اس موقف سے تھوڑا بہت اختلاف کیا گیا ہے، لیکن اس خیال کی صداقت اور خلوص سے کسی کو شاید ہی انکار ہو کہ کوئی شخص اسی وقت اچھا فنکار بن سکتا ہے، جب کہ وہ اچھا انسان بھی ہو۔ یہاں اچھے انسان سے مراد اخلاق و آداب، حیا، شرافت اور تہذیبی اقدار کا حامل انسان ہے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار انھوں نے بعض مکاتیب میں بھی کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو ۱۶ جون ۱۹۶۳ء کو تحریر کرتے ہیں:۔

> شعر ہو، ادب ہو، زندگی ہو، فن ہو، سب لاطائل، اگر حیا کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ بےحیائی و بےغیرتی فن نہیں، معصیت ہو۔ البتہ اس کا علاج نہیں، اگر کوئی یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ معصیت ہی اصل فن ہے، یا معصیت اپنے ظہور کے لیے فن کی تلاش میں رہتی ہے۔

ان سطور کا یہ مطلب ضرور ہو سکتا ہے کہ فنکار کو کسی نظامِ اخلاق کا پابند ہونا چاہیے۔ لیکن رشید صدیقی اس سے قطع نظر فنکار کے لیے کسی نظامِ حکومت کی پابندی کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ یہاں فنکار کی آزادی پر زور دیتے ہیں، جس کے بارے میں کئی ایک نے آواز بلند کی ہے۔ ان کے مضامین میں جہاں تہاں فنکار کی آزادی کی بات ملتی ہے۔ لیکن مکاتیب میں بھی انھوں نے اس تعلق سے اپنے خیالات کو جامع لیکن مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے موسومہ مکتوب مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۲ء میں لکھتے ہیں۔

> .... آرٹسٹ کو خود اظہار کی پوری آزادی ہونا چاہیے۔ بغیر اس کے زندگی میں وہ تنوع اور توانائی نہیں آتی، جس کے طفیل ۔ ہر دم جواں ہے زندگی . . . "

لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے آزادی کے حدود بھی متعین کر دیے ہیں۔ ان کا آزادی کا تصور اصول اور ضوابط کا حامل ہے، بے ضابطہ اور بے لگام نہیں۔ ایسی آزادی

کے بارے میں ان کے خیالات سنئے ۔ مذکورہ مکتوب ہی کا اقتباس ہے :

. . . . بے ضابطہ اور بے لگام آزادی افراد کی ہو یا جماعت کی، قابلِ قبول نہیں؛ اس لیے کہ یہ نظم نہیں بلکہ "مزاج" ہو گی۔ ہر شخص یا آرٹسٹ کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنے **Artistic Urge** کا اظہار کرے۔ لیکن یہ تو سماج یا اُس کے مستند افراد ہی طے کرینگے کہ اس آرٹسٹ کی طرف کیا اور کتنا التفات کیا جائے . . . .

رشید صدیقی کے ہاں فن اور لوازم فن کی بڑی اہمیت ہے، بلکہ بہت زیادہ ۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے موسومہ مکتوب مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۶۸ء میں تحریر کرتے ہیں :

مصنّف یا تحریک سے بیزار ہونے میں مضائقہ نہیں ۔ البتہ فن کے آداب اور تقاضوں سے منحرف ہونا کسی طرح گوارا نہ کرنا چاہیئے ۔

رشید صدیقی نے تنقید کی سمت توجہ ضرور دی ہے، لیکن ان کا تنقیدی سرمایہ کمیّت کے اعتبار سے زیادہ نہیں ۔ اُن کی تنقید تاثراتی نوعیت کی ہوتی ہے اس پر ان کا اسلوب! قاری کو ان کی روحِ تنقید پر توجہ دینے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے؛ وہ ان کے اسلوب کے سحر سے مسحور ہو جاتا ہے ۔ مکاتیب میں انھوں نے مختلف شاعروں اور نثر نگاروں کے بارے میں اپنے آراظاہر کیے ہیں ۔ یہاں اسلوب کی رد انسبتاً ہیں ہے، اس لیے تنقید کے خدوخال بھی نسبتاً واضح ہیں ۔ ایسے ہی مکاتیب سے ان کے تنقیدی شعور پر مزید روشنی پڑتی ہے ۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان کے تنقیدی موقف کو متعین کرنا ہو تو اُن کے ایسے مکاتیب کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔ اس خصوص میں، میں ان کے دو مکاتیب کے اقتباس پیش کرتا ہوں ۔ اتفاق سے یہ دونوں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے نام ہیں ۔ ۲ نومبر ۱۹۷۰ء کے مکتوب میں اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں :

اسرار اور رموز کو آپ نے کم اہمیّت دی ہے ۔ میرے نزدیک اقبال کی شاعری

نہیں، تو اقبال کے عرفانِ حقیقت میں یہ کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسرے شعرا سے ہٹ کر اور ان سے ملند ہو کر اقبال نے اپنے ایمان و ایقان کا ان میں اظہار و اعلان کیا ہے۔ اس طور پر ان کی شاعری کا ان دو لائیتوں کو context یا سیاق و سباق کہنا چاہیے۔ ایسے موقع پر یا اس منزل کی شاعری کو glory glamour سے نہیں دیکھتے، شاعر کی شخصیت سے پرکھتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے، جو اس قول کی نفی کرتی ہے، یا اس سے علیٰحدہ ہو جاتی ہے، جو کلامِ پاک میں ملتی ہے کہ شعرا بھٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے وہ آیت ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔

اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ اقبال نے بعض نظمیں وقتی قدر و قیمت کی لکھی ہیں، جس کو جرنلزم کی اصطلاح میں news reviews کہتے ہیں۔ میں نے تو یہاں تک محسوس کیا ہے کہ اقبال نے، جن مسائل پر، جو بات، جس بلاغت اور خوبصورتی سے کہہ دی ہے، غالباً سعدی کے بعد اب تک کسی نے نہیں کہی ہے۔ صوفیوں کی زبان میں یہ جزو میں کل دیکھنا ہے، یا جزو سے کل کا استنباط ہو۔ "ارمغانِ حجاز" کا ایک خاص context میں مطالعہ کرنا چاہیے۔ اقبال عاشقِ رسول تھے، عہدِ رسالت کے عاشقِ رسول کی مانند۔ وہ کبھی دیارِ رحمت میں نہیں پہنچ سکے۔ "ارمغانِ حجاز" میں انھوں نے اُن کی حد تک، اس کی یوں تلافی کی ہے کہ عالمِ خیال میں سفر اختیار کیا ہے اور اپنے ذوق و شوق کا عالم بے اختیاری و بیخودی میں اظہار کیا ہے۔

یہ اقتباس قدرے طویل تھا؛ دوسرا مختصر ہے، لیکن بایں طور اہم کہ وہ کلاسکس کے مقام کو تسلیم کرتے ہوئے، ادب کو زندگی سے کس طرح ہمکنار و ہم آہنگ کرتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل مکتوب ۲۵ نومبر ۱۹۷۰ء کا ہے:

غالب، حالی اور اقبال کو سمجھے بغیر اُردو کے شعراء اور تنقید نگار، خاص طور پر نوجوان طالب علم، اپنے اسلاف کی عظیم خدمات کا صحیح احساس نہیں کر

کر سکتے ۔ آشوب و آزمائش کے موجودہ دور میں اس کی بڑی ضرورت ہے۔

طنز و مزاح رشید احمد صدیقی کا اہم میدان ہے۔ مکاتیب میں یہ جوہر کیوں نہ کھلتے! یہاں یہ جوہر کھلے ضرور ہیں لیکن کم کم۔ ان کے مکاتیب عموماً طنز و مزاح سے دور رہتے ہیں، بلکہ وہ خوش مذاقی کے دائرے میں بھی نہیں آتے، جو غالب کے مکاتیب کا طرۂ امتیاز ہے؛ اور اگر ہے بھی، تو غالب سے اس کا مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ حال آنکہ مزاح نگار ہونے کی وجہ سے اُن کے مکاتیب میں یہ چیز زیادہ پائی جانی چاہیے تھی۔ ان کے مکاتیب کی فضا علمی و ادبی ہوتی ہے، متانت و سنجیدگی کی حامل۔ البتہ یہی سنجیدگی کہیں کہیں شوخ سنجیدگی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بس۔ بڑی بلاغت اور سنجید لطافت کے ساتھ! مزاح کی یہ ہلکی سی لہر ملاحظہ ہو۔ مسعود صاحب کو ۸ جون ۱۹۷۱ء کو لکھتے ہیں:

کیا معلوم تھا کہ آپ کی طبیعت ناساز تھی۔ لیکن اس کی خوشی ہے کہ میرے دعا مانگنے سے پہلے آپ صحتیاب ہو گئے، خدا نے میری دعا کو anticipate کر کے آپ کو صحتیاب کر دیا ہو!

کیا ایسے برگزیدہ یا بر خود غلط بندے نہ ہوتے ہوں گے!

اس خط میں شوخی کی بس ایک زیریں سی لہر ملتی ہے۔ جب کہ ایک اور مکتوب میں یہ لہر واضح ہے، خدا ئے پاک پر بھی "طنز" ہے اور عورت پر بھی۔ ان دو پر طنز ہو اور مکتوب ہو مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام، تو ایسے مکتوب کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ مکتوب ۱۷ دسمبر ۱۹۶۰ء کا ہے:

ایسے معمولی Investment پر اتنا زیادہ Dividend ایسے کاروبار کو کیا کہا جائے۔ مثلاً

اللہ دے اور بندہ لے۔

یہ فقرہ مثل کے اعتبار سے جتنا غلط استعمال کر رہا ہوں، اسی واقع کے اعتبار

سے اتنا ہی صحیح ہے۔ فقرے کے تیور سے معلوم ہوتا ہے، کسی عورت نے تصنیف کیا ہے۔ اس طرح کی ملی جلی طنز و تجدید وہی کر سکتی تھی۔ کیا معلوم ہماری طرح اللہ میاں بھی عورت کی اور باتوں کو enjoy ، ورنہ انگیز کرتے ہوں۔

ناوک نے تیرے صید۔۔۔۔

اور یہ مکتوب ہو تحریر کردہ مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۷۲ء کا پروفیسر محمد حسن کے نام اس میں فرقہ وارانہ تعلقات پر طنز ہے، کتنا کاری، کتنا بھاری:

عید کا چوتھا دن مبارک ہو۔ دیر سویر کا خیال نہ کیجیے گا مسلمانوں کا ہو، یا ہندوؤں کا، جو تیوہار خیر سے گزر جائے، مسلمانوں پر اس کا شکرانہ دوسرے تیوہار تک واجب رہتا ہے۔۔۔۔ (اسی مکتوب میں اس کے علاوہ)۔۔۔۔۔۔ بتایا گیا کہ آپ کئی بار تشریف لائے، لیکن میں مکان پر موجود نہ ملا۔ آئندہ کے لیے دعا ہے، غالب سے معذرت کے ساتھ۔

آئے وہ یوں خدا کرے، پر نہ خدا کرے کہ یوں

معذرت اس لیے کہ میں نے مصرع موزوں پڑھا یا لکھا ہے، لیکن ناموزوں موقع پر!

رشید صدیقی کسی زمانے میں پان بہت کھاتے تھے، اب نہیں۔ اردو شاعری کا ذوق ان کو پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن کسی یونیورسٹی کے رجسٹرار کے بارے میں جو پان اور اردو شاعری سے برابر کا شوق رکھتے تھے، کتنا شوخ طنز کر جاتے ہیں۔ مکتوب ہے ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۱ء کا، پروفیسر محمد حسن ہی کے نام:

۔۔۔۔۔۔ اگر وہاں وہی رجسٹرار ہیں، جو بہت پان کھاتے تھے اور اردو شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے، جن کے تصرف سے صرف باتونی ہو کر رہ گئے تھے۔ جہاں کہیں ایسا آدمی دیکھیے۔ یقین کیجیے کہ نکما، ورنہ ناقابلِ اعتبار ہوگا۔۔۔۔۔۔

انفلوئنزا کی کیفیت کچھ یوں ہوتی ہے کہ ہفتہ عشرہ، جس طرف، جس کو دیکھیے، انفلوئنزا کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ غالب صدی کے دوران بھی ہر کس و ناکس، ہر کہ و مہ، غالب کا پرستار، شیدائی، بلکہ ماہر غالبیات بن چکا تھا۔ یہ سال گزرا کہ بس وہی کیفیت، جو پہلے تھی۔ رشید صدیقی کس خوبی سے بات میں بات پیدا کرتے ہیں۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ، صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی کو ۲۳ جنوری ۱۹۶۹ء کو لکھتے ہیں:

> ..... ان دنوں میں بھی "غالب فلو" میں مبتلا ہوں۔ نظام لیکچرس کا یہی موضوع ہے۔ ریڈیو پر اسی موضوع پر تقریر کرنی ہے اور غالب مشاعرہ کا افتتاح بھی میرے سپرد ہے ......"

مکاتیبِ غالب، اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور شاید ان کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہے۔ رشید صدیقی کے مکاتیب بھی کئی خوبیوں کے حامل ہیں۔ ان میں طنز و مزاح بھی ہے ہلکا پھلکا، لیکن لطافت و بلاغت لیے ہوئے۔ البتہ مکاتیبِ غالب کی طرح ان میں بے تکلفی نہیں ہے۔ بدیہی انداز بھی نہیں، جو مکاتیبِ غالب کی ایک شان ہے۔ ان کے ہاں رکھ رکھاؤ ہے، پاس و لحاظ ہے، لیکن مصنوعی اور بناوٹی نہیں۔ یہ رشید صدیقی کی شخصیت کا ایک رخ ہے، وہ رخ جو ان کے مضامین "گنجہائے گرانمایہ" اور ایسے ہی انشائیوں اور مرقعوں میں نکھرتا اور روشنی پھیلاتا چلا گیا ہے۔ رشید صدیقی کے مکاتیب میں ادبی چاشنی ہوتی ہے، شگفتگی بھی، تر و تازگی اور شادابی بھی ..... ایک بانکپن، طرحداری اور اسلوب کی دلآویزی بھی۔ میں اسلوب کی وضاحت کے لیے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں، یہی کافی ہوگا۔ مسعود صاحب کو ۱۱ اپریل ۱۹۶۴ء کو تحریر کرتے ہیں:

> سالہا سال سے کچھ اس طرح کا حال ہے جیسے کسی نے زندگی کے سارے ہرے بھرے درخت کاٹ کر گرا دیے ہوں اور ان میں آگ لگا دی ہو۔ آپ جانتے ہیں، گیلی لکڑی کتنے دھیرے دھیرے، کتنے دنوں تک سلگتی رہتی ہے، اور اس سے کیسا تاریک اور دم گھٹنے والا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔

اسلوب کی دلآویزی اور دلکشی کے ساتھ یہ اقتباس بھی دیکھیے۔ ایک جواہر پارہ ہو کہ جس کو ہمارے کلاسیکی ادب کے اقتباسات میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب (معتمد عمومی انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش) کے موسومہ مکتوب میں لکھتے ہیں۔ (اس مکتوب پر تاریخ ندارد ہے، لیکن علیگڈھ کے پوسٹ آفس کی مُہر ۲۰ اپریل ۱۹۶۴ء کی ہے)

> جس کے سامنے کوئی اچھا اور بڑا مقصد ہوتا ہے، وہ زندگی اور زمانے کے مفسدات کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جب کہ ہر طرف غیر یقینی اور مایوسی پھیلی ہوئی ہو، کسی اچھے اور بڑے کام میں لگ جانا قابل تعریف بات ہے۔ میں اس کو فتح کا پہلا زینہ سمجھتا ہوں۔

رشید صدیقی کے مکاتیب میں اس نوع کے کئی اقتباسات ملینگے۔ زندگی کا کونا مسئلہ، کونسا رُخ یا کونسا پہلو ہے، جس کو انھوں نے نظر انداز کردیا ہو۔ ان خطوط میں مسکراہٹیں بھی ہیں، اور جہاں تہاں ان کے لہجے میں دلسوزی، آزردگی اور غمگینی بھی آگئی ہے۔ انھوں نے خوشیاں بھی سمیٹی ہیں، اور زندگی اور زمانے کا رونا بھی رویا ہے۔ خیالات کے اظہار میں جرأت سے بھی کام لیا ہے اور کبھی مصلحتوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے مکاتیب کے مطالعے سے ان کے ذہن کی مختلف تہوں کا پتا چلتا ہے۔ ان کے مضامین سے ان کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آئے ہیں، لیکن ان کی مکمل شخصیت سے آگاہی کے لیے ان کے مکاتیب کا ہمہ گیر جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ ان کے خیالات کی تصویر، اُن کے ذہن و فکر تک رسائی حاصل کرنے کا ایک اہم پل، اور اُن کے معتقدات کا آئینہ ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ مکاتیب میں انسان کا قلم نہیں، دل بولتا ہے، تو یہ بات رشید صدیقی کے مکاتیب پر حرف بحرف صادق آتی ہے کہ ان کے مکاتیب میں ان کے دل کی دھڑکنیں سنی جاسکتی ہیں۔

گفتار

مرتبہ گیان چند

نگارشاتِ رشید میں اخلاقیات

۱۔ اخلاق:۔

مستند تعریف وہ ہے، جو دوسرے ہماری کریں، نہ یہ کہ ہم خود اس بارے میں زحمت گوارا فرمایا کریں۔ (آشفتہ بیانی میری: ۱۰۰)

ظاہر ہے خود ستائی اور خود نمائی اس شخص یا جماعت کا شیوہ ہوتا ہے، جسے اس عیب کے سوا کسی ہنر کا سہارا نصیب نہیں ہوتا۔ (آشفتہ بیانی میری: ۱۰۱)

مختار وہ ہے جو اپنی اچھی استعدادوں کو پورے طور پر اور آخر تک بروئے کار لا سکے، خواہ وہ استعداد معمولی ہو، یا غیر معمولی۔ اس کے بعد ہر انجام انعام بن جاتا ہے، خواہ وہ المناک ہی کیوں نہ ہو۔ (مضامین رشید (اپنی یادیں): ۸۲)

کام کرنا وہ نشہ ہے، جس میں نہایت آسانی سے ہر طرح کے مصائب غرق کیے جا سکتے ہیں۔ (مضامین رشید (اپنی یادیں): ۸۶)

بے لوث خدمت بالآخر تخریبی عناصر پر غالب آتی ہے (ہمارے ذاکر صاحب: ۱۰۶)

سچائی بہت سہل اور سادہ ہوتی ہے۔ ایسی نہ ہوتی، تو ہر شخص کو بتایا کیسے جا سکتا اور وہ سمجھ کیونکر پاتا کہ سچائی کتنی ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیے، لیکن اس کی تلاش و تصدیق اتنی ہی مشکل ہے۔ (ہمارے ذاکر صاحب: ۱۸۶)

جسمانی یا فطری نقائص، یا معائب کی مذمت ناروا ہے (طنزیات و مضحکات: ۲۷)

آباواجداد کی فردِ گزاشت پہ اولاد کو موردِ لعن وطعن قرار دینا ناجائز ہے
(ایضاً : ۲۷)

زندگی کو یکسر فراغت، عشرت اور بیچیزی کا گہوارہ بنا دینے اور رکھنے سے شدید ردِ عمل کا سامنا ہوتا ہے (عزیزانِ علیگڈھ (مشمولہ فکر و نظر) جلد ۱۲ شمارہ ۱-۲ ۲-۷۲ ۱۹ء)

انسان نے ابتدا سے آج تک جو ترقی کی ہے، اس میں اس کے وجود کے حیوانی تقاضوں اور اخلاقی و روحانی صلاحیتوں میں مسلسل جدال یا ساز و ستیز ہوتی رہی ہے یہ عمل تا یوم الآخر قائم رہیگا۔ اس میں بحیثیت مجموعی واضح طور پر خیر کو شر یا انسان کو جانور پر غلبہ رہا ہے۔ (عزیزانِ علیگڈھ (فکر و نظر) : ۱۶۴)

ہم جتنی فکر و فرزانگی اور دولت و اقتدار غلط کو صحیح بتانے اور منوانے پر صرف کرتے ہیں، اس کا عشرِ عشیر بھی صحیح کو صحیح بتانے اور منوانے پر صرف نہیں کرتے
(ایضاً: ۱۶۵)

۲۔ اخلاقی اقدار:

جب تک آپ کے دل میں کسی بڑے عقیدے، ارادے، مقصد یا شخصیت کا احترام اور اس سے بے لوث شغف نہ ہوگا، نہ آپ اپنے لیے کسی مصرف کے رہینگے، نہ کسی دوسرے کے لیے۔ (مضامینِ رشید (سرگزشتِ عہد گل) : ۱۹)

امن، آسودگی، عالی ہمتی اور راست بازی کا وہ احساس یا اہمیت باقی نہیں رہی، جن کے بغیر زندگی کا کوئی معیار متعین ہوتا ہے، نہ موقف
(عزیزانِ علیگڈھ، (فکر و نظر): ۱۴۱)

۳۔ دیرینہ اقدار و روایات:

(اسکول میں طلبہ کے پاس آنے والے بزرگ) قدیم تہذیب اور وضعداری کا نمونہ

ہوتے اور اسلاف کے حالات اس شغف سے، اس دلچسپ انداز سے، سناتے اور اخلاق وتہذیب کے حدود میں رہنے کی نصیحت اس پیرایے میں کرتے کہ لڑکوں پر بڑا اچھا اور گہرا اثر پڑتا (آشفتہ بیانی میری: ۹)

(جو ہنود میں عوام وخواص) کرتے کچھ ہوں، بیٹھتے سب کے سب برابر تھے۔ نجابت اور شرافت کا اس زمانے میں کتنا لحاظ رکھا جاتا تھا! (آشفتہ بیانی میری: ۱۲)

کلاسکس کی گرانمایگی سے ذوق وظرف کو جو وزن ووقار اور زندگی کو جو تب وتاب یا خوبی وخوبصورتی ملتی رہتی تھی اس سے ہمارے نوجوان محروم ہو گئے۔ اس بحث کو خلط مبحث تک پہنچا دینے کے لیے میں یہ بھی کہونگا کہ مذہب واخلاق کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ میں مذہب واخلاق کو انکا ور اعمال میں وہی درجہ دیتا ہوں جو کلاسکس کو شعر وادب میں (ایضاً: ۱۸)

آج سے پہلے ہمارے نوجوان خاندان کی اعلیٰ روایات کو ایک قیمتی ترکہ سمجھ کر اس کی پیروی یا اس کا احترام کرتے تھے، اور معمولی سے معمولی خاندان بھی ایسا نہ تھا جو کسی صالح وصحتمند روایت کا کسی نہ کسی حد تک حامل نہ ہو۔ رفتہ رفتہ یہ بات ختم ہو گئی۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ایسی متاع باقی نہ رہ گئی ہو، جس کے تحفظ یا ترقی کے لیے کسی کو اپنی بہتر صلاحیتیں بروے کار لانے کی فکر ہو (ایضاً: ۸۶)

طلبہ کی اکثریت ... آقا منشا ہوں کے آس پاس اساتذہ، اولڈ بوائز اور دوسرے چھوٹے بڑے ملازمین اور متوسلین کے خاندان بھی دور اور نزدیک پھیلے ہوئے ہیں۔ شریف نوجوان طلبہ کی موجودگی کا احساس ان خاندانوں اور ان خاندانوں کی رہن سہن اور عزت وناموس کا لحاظ ان طلبہ کو، غیر شعوری طور پر رہتا.... جب سے یہ ادارہ قائم ہے آج تک کوئی ایسا حادثہ اس کے حدود کے اندر پیش نہیں آیا، جو ہمارے دیرینہ آئین شرافت کا منافی ہو۔ (ایضاً: ۱۱۹-۱۲۰)

ظاہر ہے پرانے وقت کا ہوں۔ راگنی بیوقت کی ہے۔ زمانہ ترقی کر چکا ہے۔ زندگی اور زندگی کے تار وپود نئے اسلوب سے مرتب ہو رہے ہوں۔ ہر چیز کی قدر وقیمت

گھٹ بڑھ رہی ہے، جس چیز کو ہم متاعِ کنعاں سمجھتے تھے، وہ متاع کاسد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ (گنجہائے گرانمایہ (ڈاکٹر انصاری): ۱۸)

(علیگڈھ کے طلبہ سے) آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہم اپنے طرح طرح کے جن کارناموں، خدمات، اور خوبیوں پر فخر کرتے ہیں، وہ ہمارے بزرگوں کی کس مسلسل محن و مشقت، ایثار و قناعت، اور سخاوت و شجاعت کا نتیجہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو قوم اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھلا سکتی ہے، وہ نہ کسی کارنامے کی خود اہل ہوگی نہ کسی اور کی خدمات کی اہمیت اور بڑائی کا احساس کر سکتی ہے۔

(عزیزانِ علیگڈھ (مشمولہ فکر و نظر) ۱۴۴)

عزیزا گزشتہ نصف صدی میں اخلاق کا زوال اور اعمال کے مکافات کب اور کہاں سے آئے، اور کیونکر پھیلے، ان کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ دو عالمگیر جہا بھارتوں کے بعد پرانی قدریں درہم برہم ہوگئیں، لیکن ان کی جگہ لینے کے لیے (نئی) نہ متعین ہو سکیں، نہ قبول ہو پائیں۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا، جب ہماری بیچارگی یا غفلت کا یہ حال ہو کہ زندگی اور زمانے کی بے پناہ رفتار اور راندھی شکست و ریخت نئی قدروں کو بروے کار آنے سے پہلے پرانی بنا دیتی ہو۔

(عزیزانِ علیگڈھ (فکر و نظر): ۱۶۰)

۴۔ پرانی اور نئی نسلیں:

ذوقِ شعر و ادب کی سیرابی اور صحتمندی کے لیے شاگردی، استادی اور اعمال و افکار کے سنوارنے، سدھارنے کے لیے مرشد اور مرید یا گرو چیلے کا جو رشتہ یا ادارہ مشرق میں مدت الایام سے چلا آرہا ہے۔ وہ اپنے گوناگون فوائد کے اعتبار سے بہت اہم اور قابلِ قدر مانا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ آج کل نوجوانوں میں جو عام ذہنی انتشار ملتا ہے، اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں، وہاں ممکن ہے ایک یہ بھی ہو کہ استاد شاگرد یا مرشد اور مرید کا "شخصی" رشتہ جو مدتوں سے مجرب چلا آتا تھا، اس کی طرف سے

سے ہم نے اپنی توجہ ہٹالی ہے۔ (آشفتہ بیانی میری: ۱۰۸)
وہ طالب علم ہی نہیں، برہما کیوں نہ ہوں، انسانیت سے گزرینگے تو انسانوں کے نزدیک قابلِ مواخذہ ٹھہرینگے۔ نوجوانوں پر یہ راز آشکارا ہونا چاہیے کہ نالائقی کا جواز نہ مذہب ہے، نہ وطنیت، نہ سیاست، نہ مزدور، نہ سرمایہ دار، نہ خود نوجوانی۔ (آشفتہ بیانی میری: ۱۰۹)
دوسری بات یہ ہے کہ گزشتہ زمانے میں نوجوانوں کو ریاضت کرنے اور نتیجہ کا اظہار کرنے کی تلقین کی جاتی تھی، اور اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس سے ان میں بیصبری، بے اعتمادی یا غیر ذمہ داری کے جذبات پیدا نہیں ہونے پاتے تھے ..... ظاہر ہے جہاں انقلاب بلانے اور بغاوت کرنے کا اذنِ عام ہو وہاں ریاضت اور انتظار کو کیا دخل۔
انسان کی صالح اور صحتمند زندگی کا اس پر ہے کہ اس کے ہاں اقدار کی اہمیت کیا ہے۔ اور اقدار کے لیے ضروری ہے کہ ان میں استقلال ہو اور وہ ہوا کے ہر جھونکے سے زیرو زبر نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر اقدار نتیجہ ہوتے ہیں، مدتوں کے تجربہ اور ریاضت کا۔ زندگی کی کشتی کو طرح طرح کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اقدار وہی کام کرتے ہیں، جو لنگر اور ناخدا کرتے ہیں۔ آج سے پہلے زندگی میں وہ "مرکز گریز" سرعت اور شدت نہیں تھی، جواب ہے (آشفتہ بیانی میری: ۸۷)
اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لیے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصل مقصد ہے، تو جہاں تک وضع قطع، رہن سہن، مرنے جینے، قدامت اور نفع رسانی کا تعلق ہے، پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارے میں نہیں ہیں۔ نئی زندگی اور نیا زمانہ مجموعہ صد کرامات سہی، لیکن ذاتی طور پر میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل، اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی، انسانوں اور انسانیت کے لیے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعثِ خیر و برکت تھی۔ (گنجہائے گرانمایہ (احسن مارہروی) ۱۷۴۱)

نوجوانوں کا یہ سمجھنا کہ وہ کبھی بوڑھے ہونگے، سمجھ میں آنے کی بات تھی۔ البتہ یہ بات تعجب اور افسوس کی تھی کہ بوڑھے اپنی جوانی بھول چکے تھے۔ اُن کو جوانوں سے چڑھ ہوگئی تھی؛ یہ بوڑھوں کی بھول تھی۔ (مضامینِ رشید (اپنی یاد میں): ۹۱)

نوجوان، سو فی صدی معصوم ہوتے ہیں، نہ ان کو معصوم رکھا جا سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں یونیورسٹی کے طالبعلموں کو یہ بھاشنو دیکھنا چاہتا ہوں، نہ رکھنا چاہتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بایں ہمہ اس کا بھی قائل نہیں کہ ہماری یونیورسٹی کے طلبہ وہی شیوہ اختیار کریں جو آج کل کی پولیٹیکل پارٹیوں کے زیرِ اثر نوجوان لڑکے لڑکیوں نے اختیار کر رکھا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ محکومی میں غلامی کو بدنصیبی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن آزادی میں مطلق مطلق العنانی تو لعنتِ محض ہے۔ (مضامینِ رشید (سلام ہو نجد پر): ۲۶۹)

جب تک انسان اس عالمِ آب گل میں آباد ہے، بحیثیتِ مجموعی زندگی ترقی اور ابتری کی طرف بڑھتی رہیگی۔ یہ محض بوڑھوں کی فطرت ہے، جو اپنے ماضی کو مبارک اور نوجوانوں کے حال اور مستقبل کو مایوس کن بتا کر اپنے دل کو بہلاتے رہتے ہیں۔ (ایضاً: ۲۷۲)

یہ دنیا جس طرح صرف بوڑھوں سے آباد نہیں رکھی جا سکتی، اسی طرح صرف بوڑھوں کے خیالات و عقائد سے بھی زیادہ دنوں تک اس کا کام نہیں چل سکتا۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ نوجوانوں کو سہنا تو پڑے اپنی دنیا میں، لیکن رہنا پڑے بوڑھوں کی دنیا میں۔ (ایضاً: ۲۷۳)

نوجوانوں کا یہ زعم کہ وہ "سوارِ اشہبِ دوراں" ہیں، اور دوسرے یعنی بوڑھے اور کم نوجوان صرف گردِ راہ، ایک ایسا مغالطہ ہے، جس میں امراض کی طرح بچے اور نوجوان ہی زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ زمانہ جس تیز رفتاری سے جوان اور جوان تر ہونے لگا ہے، اس رفتار سے خود نئی نسل ذہنی طور پر جوان نہیں رہ پاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بوڑھے ایک حد تک بہتر پوزیشن میں ہیں، اس نتیجے کہ انھوں نے اپنے سہارے کے لیے بچی کھچی پنچاں قدریں سینے سے لگا رکھی ہیں، اور اقدارِ اعلیٰ کا احساس اور ان کی

پیروی ہی وہ سہارا ہے، جو انسان کا اس وقت خاص طور پر ساتھ دیتا ہے، جب تمام دوسرے سہارے ساتھ چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ (ایضاً۔ ۲۰۶)

، نوجوانوں کی تنظیم سیاسی مقاصد و مصالح کی سطح پر نہیں، اسپورٹس اور اخلاق کی سطح پر کرنا چاہیے، لیکن خودغرضی اور تنگ نظری اس کی مہلت یا اجازت نہیں دیتی۔ (ہمارے ذاکر صاحب: ۱۰۶)

بیشتر طالب علموں نے غیر ذمہ داری کا جو رویہ اختیار کیا ہے، وہ بالکل وہی ہے، جو سوسائٹی میں نامبارک و خطرناک عوامل و عناصر کا ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی تعلیم، تربیت، تہذیب اور روزگار کے مسائل کو لا اینڈ آرڈر (نظم و نسق) کا مسئلہ بنا دیا ہے ... یہ کہنے سے کام نہ چلیگا کہ پرانی باتوں کا اب چلن نہیں رہا، وہ نئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں رہیں۔ لیکن اس سے نہ یہ ثابت ہوتا ہے، نہ کوئی تسلیم کریگا کہ نئے اوضاع و اطوار بہرگونہ پسندیدہ اور قابل قبول ہیں۔ آپ کے پسند یا ناپسند کرنے سے کام نہیں بنتا۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ کس طریق عمل سے زندگی میں بہتری اور بلندی آئی اور کس سے ادبار و انتشار۔

(عزیزان علیگڑھ (فکر و نظر): ۱۴۹)

آپ طلبہ سے ڈر کر آپ کے حد سے بڑھے ہوئے مطالبات کو جو اس طرح پیش کیے جاتے ہوں جیسے یہ تاوان جنگ، بلیک میل یا یرغمال ہو، اس طرح پیش کیے جاتے ہوئے ان میں سب سے نامسعود اور عبرت انگیز یہ ہے کہ امتحان کے مقررہ ضوابط اور معیار کو گرا دیا جائے یا بالکل ختم کر دیا جائے۔ (ایضاً: ۱۶۳)

۵۔ سیکولرزم۔

(اسکول اور شوالے کی فضا کا اثر) طنز و ظرافت باوجود مدت العمر کے ادبی شغلہ ہونے کے آج تک اس کا اتفاق نہ ہوا کہ طنز و ظرافت کا کوئی فقرہ ہندو معتقدات کے بارے میں زبان یا قلم سے نکل جائے ... حتی الوسع میں نے کسی مذہب پر نہ تو کبھی

نکتہ چینی کی، نہ اس کا مذاق اڑایا۔ (آشفتہ بیانی میری، ۲۹)

علیگڈھ سے باہر فرقہ وارانہ جھگڑے اور صوبجاتی عصبیت کے جہاں تہاں اکثر مظاہر ہوتے رہے، لیکن کالج کی فضا اس طرح کی نحوست و نجاست سے ہمیشہ پاک رہی۔۔ ...... علیگڈھ کے تعلیمیافتہ حکومت کے جن چھوٹے بڑے مناصب پر فائز رہے، یا جہاں کہیں جس حال میں رہے، فرقہ وارانہ عفونت سے پاک رہے (ایضاً: ۱۴۲)

میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے پر جس چنگیزی کا سامنا ہوگا، وہ قابل قبول ہے، یا دین کو سیاست سے جوڑنے میں جس چنگیزی سے سابقہ ہو، وہ قابلِ ترجیح ہے۔ (ایضاً: ۱۶۸)

۶۔ مذہب و اخلاق: اسلام

مذہب کی بنیادی اور فروعی باتوں میں امتیاز کرنے میں اکثر چوک ہوئی ہے، جس کی تلافی کی کوشش ہمیشہ جاری رہیگی۔ (آشفتہ بیانی میری: ۴۰)

ہر مذہبی آدمی اخلاقی نہیں ہوتا۔ خود غرض، ناواقف، مذہب کو بالعموم اصطلاحی حدود میں متقید رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے اخلاق کو مذہب سے آزاد اور علیحدہ سمجھتے ہیں۔ مذہب اور اخلاق کو علیحدہ خانوں میں نہیں رکھا جاسکتا، اس لیے کہ حقیقتاً اخلاق مذہب سے برآمد ہوا ہے اور اس کا آوردہ و پروردہ ہے۔ اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے۔ مذہب سے علیحدہ ہوکر اخلاق پر زور دینا ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے، جن کی نیت بالعموم بخیر نہیں ہوتی۔ مذہب اخلاق کا محافظ و محتسب ہے اور اخلاق بغیر مذہب، عورت بغیر شوہر ہے۔

خودغرض طبائع مذہب کی ہمہ گیر و ہمہ وقت گرفت سے بچنے کے لیے اخلاق کے دائرے میں پناہ لیتی ہیں، جس کی سرحد پھاند کر تہذیب کی قلمرو میں آجاتے ہیں۔ وہاں سے سیاست کی وادی میں پہنچتے ہیں۔ سیاست سے قومیت اور تجارت کی منزلیں دور نہیں رہ جاتیں۔ یہیں پہنچنا بالعموم ان کا مقصد ہوتا ہے۔ مذہب کے تقاضوں

سے بچنے یا مذہب کی بلندی سے اتمنے کے لیے جو چیزیں ہیں، ان میں پہلا اخلاق، پھر تہذیب، اس کے بعد سیاست، قومیت اور تجارت ہیں۔ مؤخر الذکر تین کا نامسعود اتحاد آج عالم انسانیت کا سب سے بڑا آشوب ہے۔

(گنجہائے گرانمایہ (جگر مرادآبادی): ۲۴۹)

بذات خود میں ہندستان کے مسلمانوں کو عقائد اور اعمال کے اعتبار سے دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے بہتر مسلمان سمجھتا ہوں۔

(مضامین رشید (سرگزشت عہد گل): ۱۴)

میں ہر مذہب کا احترام کرتا تھا مگر مذہبی آدمی کو بالعموم اچھا انسان نہ پایا۔ مذہبی آدمی اکثر عقائد کی خانہ پری کرکے اعمال کی طرف سے بےفکر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ بات بھی نہیں سمجھنا چاہتے تھے کہ خدا نے اپنی نجات انسانوں کے سپرد نہیں کی ہے، بلکہ انسانوں کی نجات انسانوں کے سپرد کی ہے۔ خدا نے عقائد و عبادت کو خدمت خلق کے راستے سے نازل کیا ہے اور اسی معیار سے وہ ان کو پرکھیگا۔ عقائد اور اعمال کو یہ لوگ علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ دیتے ہیں... زندگی کا کیا مقصد ہے؟ انسان کیوں پیدا کیا گیا؟ ...... شرافت، خوشدلی اور بہادری سے رہنا ان سب کا جواب ہے۔

(مضامین رشید (اپنی یادیں): ۸۲)

مسلمانوں کے ذہنی اور اخلاقی امور وہ ہیں، جو ان کی مستند دینی کتابوں اور معتبر مسلمانوں کی سیرت وسوانح میں ملتے ہیں؛ وہ نہیں، جن کو ہم اپنے مخصوص مفاد و مقاصد کے پیش نظر حسب ضرورت اختراع کرتے رہتے ہیں۔ مسلمان معاشرے میں کچھ ممنوعات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ فنون لطیفہ ہوں، یا سیاسیات، سماجیات اور حیوانات کے تقاضے اور طور طریقے، تاوقتیکہ سخت مجبوری کا سامنا نہ ہو، کوئی ایسا اقدام گوارا نہیں کیا جا سکتا، جو ایسی ترغیبات کا محرک ہو، جن کو ہمارے مذہب و اخلاق نے مسلمہ طور پر قابل اجتناب قرار دیا ہو۔ ممنوع کو

مستحب نہ منطق سے قرار دیا جاسکتا ہے، نہ جمالیات اور اقتصادیات کے نکات بیدل سے۔ (مضامینِ رشید (اسلام ہو تجدید پر): ۲۶۹)

مسلمانوں کا یہ موقف غیر متبدل اور غیر متزلزل رہیگا کہ ان کا دین و آیین اور معاشرہ عیش و طرب کا نہیں، ضبطِ نفس اور رفاہ و ریاضت بالفاظ دیگر فوجی ڈسپلن کا ہے۔ ظاہر ہے، جس ملت نے اس ڈسپلن کے ساتھ نوع انسان کے فوز و فلاح کی اتنی بڑی ذمے داری قبول کی ہو، وہ طرب و تفنن کی زندگی نہ بسر کر سکتی ہے نہ اسے کرنا چاہیے۔ فنونِ لطیفہ اور اس کے عوارض و عواقب کو اگر اسلامی شریعت نے زندگی میں وہ اہمیت یا وقعت نہیں دی ہے، جو آج کی دنیا دے رہی ہے، تو نہ شرمانے کی ضرورت ہے، نہ معذرت خواہ ہونے کی۔ (ایضاً: ۲۷۱)

مسلمانوں کا صحیفۂ مذہب و اخلاق دوسروں کے صحیفۂ مذہب و اخلاق سے زیادہ ہمہ گیر ہی نہیں، سخت گیر بھی ہے . . . . جہاں تک مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے مسلمان ہونے کا تعلق ہے، ہندستان کے مسلمان ممالکِ اسلامیہ کے مسلمانوں سے زیادہ معتبر اور قابلِ تقلید ہیں، نہ کہ اس کا عکس۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ بحیثیتِ مجموعی ہندستان کے مسلمانوں کی سب سے بہتر نمایندگی علیگڈھ کرتا ہے۔
(ایضاً: ۲۷۱)

عبادت کا مفہوم یا مقصد یہ نہیں کہ خدا سے مزدوری، خیرات، انعام، تاوان وصول کرنے یا دوسروں پر فضیلت اور تفوق جتانے یا ان کو سنگسار کرنے کا حق اور اختیار حاصل ہو گیا ہو۔ ہر پندار بد اخلاقی ہے، لیکن عبادت کا پندار لعنت ہے۔
(ہمارے ذاکر صاحب: ۱۴۲)

عبادت زندگی کو قبول کرنے کا اقرار و اقبال اور سعی و عمل ہے۔ عبادت پیشہ اور عبادت گزار کا فرق یہ ہے کہ اول الذکر اپنی عبادت اور احسانات سے ہر وقت، ہر کس و ناکس کو مطلع کرتا رہیگا، جیسے ان کو چیلنج دے رہا ہو۔ عبادت گزار اپنی

خدمات کو نہ کبھی ظاہر کریگا، نہ ظاہر ہونے دیگا بلکہ اس پر شرمندہ رہیگا اور شکر گزار کہ خدا کی دی ہوئی زندگی جیسی نعمت اور سرفرازی کے مقابلے میں اس کی خدمات کتنی ناچیز ہیں۔۔۔۔ خدا کی صفات کو جانتے اور مانتے ہوئے اس کو دھوکہ دینے کی کوشش ایسی حماقت ہے، جس کے آرکاب کی ایک عبادت پیشہ ہی جرأت کرسکتا ہے۔

(ایضاً: ۱۴۳)

مذہب کے دیے ہوئے اعتقاد و احکام میں تفتیش و تفحص کے معنی ہستنا کی اتنی گنجائش رکھتے ہوئے جتنی عموماً رکھی جاتی ہے، بدنیتی کے ہیں یعنی مذہب و اعتقاد میں کرید بالعموم اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب دل میں اور سر سے گریز اور نواہی کا مرتکب ہونے کے لیے چور دروازوں کی تلاش کرنے اور پانے کی خواہش سر اٹھاتی ہے۔

(ایضاً: ۱۴۸)

انسانی زندگی کے تقاضوں کو اقدارِ اعلیٰ کی روشنی میں سمجھنے اور پورا کرنے میں جتنے واضح اور مکمل آداب و ہدایات نماز میں ملتے ہیں، وہ مشکل کہیں اور ملینگے۔ مقررہ نماز پنج وقتہ ہوتی ہے، لیکن اس کی ڈسپلن ہمہ وقتی، ہمہ جہتی اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔ ہماری تہذیبِ نفس اسی ڈسپلن کا عطیہ ہے۔ اگر یہ ڈسپلن پوری نہیں ہوتی، تو نمازی کو سمجھ لینا چاہیے کہ احکامِ شرعیہ کے تقاضے پورے ہوئے، نہ منشاے الٰہی کی تعمیل ہوئی۔

(ایضاً: ۱۷۰)

مذہب کی بڑائی کا ہمیشہ قائل رہا۔ ایسا نہ کروں، تو اپنی کس خوبی پر بھروسہ یا فخر کرسکونگا، لیکن اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ مذہب دراصل اتنا کسی کو بناتا یا بگاڑتا نہیں جتنا اس کو بےنقاب کر دیتا ہے۔ کم سے کم آج کل کے مسلمانوں میں تو یہی دیکھنے میں آرہا ہے، بالخصوص ایسے مسلمانوں میں جو مذہب کے کاروبار، نفع و نقصان کے خطوط پر کرتے ہیں، نفع اپنا، نقصان مذہب کا، یا چاہے جس کا۔ (ایضاً: ۱۷۳)

(تقسیمِ ملک کے بعد ہندستانی مسلمانوں کو مشورہ) ان حالات میں غالباً اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم ہر طرح کی تعمیری اور تخلیقی لیاقت پیدا کرنے میں اس طرح کھو جائیں، نہ اور رسم نوحہ گری

کو ترک کردیں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسلاف کے کارناموں سے اپنی بڑائی جتانا اور ان کے نام پر بھیک مانگنا یا بے لگام ہونا بڑی نادانی اور بے عزتی ہے۔
(فکر و نظر (عزیزان علیگڑھ) : ۱۷۸)

۷۔ سماجی اخلاق:
یہ بات بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اکثر و بیشتر اپنوں کی تعریف کرتے ہیں اور مخالف پر ہیجل اور بیجا آوازے کستے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت پر اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی چیز حاصل کرلی جائے اور وہ لوگ جو اعلیٰ نتائج کے لیے اعلیٰ صفات کام میں لاتے ہیں ان کو زک پہنچائی جائے۔ . . . ۔ ذاکر صاحب کا یہ کہنا مجھے بہت پسند آیا کہ اسپورٹسمین شپ کا تقاضا یہ ہے کہ جس ٹیم کے خلاف تماشائیوں کی طرف سے ناروا باتیں سرزد ہونے لگیں، اس کی مقابل ٹیم کو چاہیے کہ کھیلنے سے انکار کردے اور اس وقت تک کھیلنے پر راضی نہ ہو، جب تک مجمع اس بات پر آمادہ نہ ہو جائے کہ وہ دونوں ٹیموں کے ساتھ یکساں سلوک کریگا۔

(آشفتہ بیانی میری: ۷۹)

میرا کچھ ایسا بھی خیال ہے کہ سرمایہ و مزدور، زمیندار اور کسان، ظالم و مظلوم اور متعلقہ مسائل کی خرابیوں کی اتنی مذمت کی گئی ہے کہ اب ہر کس و ناکس، خواہ وہ مستحق ہو یا نہیں، غیر شعوری طور پر سمجھنے لگا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ وہ مدد کا مستحق ہے . . . چنانچہ اپنی دشواریوں کو محنت اور ایمانداری سے دور کرنے کے بجائے تقریباً ہر شخص یہ ماتم کرتا نظر آتا ہے کہ دوسرے اس کا حق غصب کر رہے ہیں، جیسے کسی خواہش کا پیدا ہو جانا ہی اس کے پورا کیے جانے کے لیے سند جواز ہو، اور جس شخص کی خواہش پوری نہ کی جا سکے، اس کو حق حاصل ہے کہ وہ سوسائٹی پر لعنت بھیجے، اور قانون اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس طرح کی باتوں سے ہمارے ہر چھوٹے بڑے میں ذمّے داری کا احساس کم اور ناحق کوشی کا بڑھتا جا رہا ہے۔ (ایضاً : ۸۸)

بحیثیت مجموعی میں اس درسگاہ کی صحتمند یا غیر صحتمند فضا کی نشانی اس میں تلاش کرتا ہوں کہ یونین کے الیکشن میں امیدوار کس چیز کا سہارا پکڑتے اور کامیاب ہوتے ہیں، اپنی ذہنی اور اخلاقی برتری اور ادارے کی علمی اور اخلاقی منزلت کا یا مذہب و مسلک کے اختلافات اور ذاتی یا بیرونی اغراض و مقاصد کی حمایت کا۔

(ایضاً: ۹۰)

جو قوم اپنی خامیوں کو جس حد تک طنز و ظرافت کا نشانہ بنانے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرنے کا حوصلہ اور ظرف رکھتی ہے، اسی حد تک اس کی بڑائی دوسری قوموں میں مسلّم ہوتی ہے۔

(ایضاً: ۱۱۶)

قل اعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں، لیکن زنانہ پن یا شہدپن کے مقابلے میں قل اعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دے سکتا۔ لباس و جسم کی نمائش یا تزیین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لیے مباح ہے، مسلمان مردوں کا یہ وطیرہ نہ ہونا چاہیے۔

(مولانا احسن مارہروی: گنجہائے گرانمایہ: ۱۷۴)

گفتگو کرنا ایک سفر کے مانند ہے۔ اچھا آدمی ہمسفروں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور ان کے رنج و راحت کو اپنے رنج و راحت پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اچھے آدمیوں کی نہیں، اچھے لکھنے والوں کی بھی پہچان ہے۔ لکھنے اور گفتگو کرنے میں بھی رونا، گڑگڑانا، حکم چلانا یا قابلیت جتانا، نااہلوں کا کام ہے۔

(مضامین رشید (اپنی یادیں): ۹)

ڈانڈی کا منظر بھی کس درجہ عافیت سوز ہوتا ہے۔ اس میں تو صرف عورتوں کو بیٹھنا چاہیے جب وہ بھی تفریحاً نہیں انتقاماً۔ مردوں کو اس سواری میں دیکھ کر اکثر جی میں آیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے درمیان سے ایک ڈنڈا نکال دیا جائے جس کے دونوں سروں کو قلی اٹھالیں اور ان سے کہہ دیا جائے کہ اس زندہ لاش کو نینی تال کی سب سے بلند چوٹی پر لے جا کر اس طور پر پھینکیں کہ یہ جھیل کے عمیق ترین حصّے میں جا کر گرے۔

(مضامین رشید (شگوفے): ۲۵۰)

ڈانڈی اور رکشا پر سفر کرنے والوں کو دیکھ کر مجھے کافی غصّہ آتا ہے۔ غور و فکر کرنے پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ڈانڈی اور رکشا پر صرف ماڈرن عورتوں یا مایوس العلاج مریضوں کو بٹھانا چاہیے۔ ان کے علاوہ کوئی اور بیٹھا ملے، تو اُسے کسی ترکیب سے سفرِ آخرت پر روانہ کر دینا چاہیے۔ (خنداں (سفر): ۴۳)

چوری کرنا ضرور بری بات ہے، لیکن فاقے سے ہلاک ہو جانا اس سے بھی بُرا ہے۔ شکم سیر چوری کریں یا نہ کریں، فاقہ کش کو ایسا ضرور کرنا چاہیے۔ دوسروں کی حق تلفی اتنی سنگین بات نہیں، جتنا اپنے حقوق سے محروم ہونا عبرتناک اور درد انگیز ہے (خنداں (ناصح): ۲۶۹)

ہمارا مزاج کچھ اس طرح کا بن گیا ہے کہ ہم اپنے اچھے افراد، اداروں، اقدار، روایات اور اخلاق و مذہب میں کوئی نہ کوئی خامی فرض کر لینے اور اس کے اچھالنے میں غیر معمولی تسکین و فخر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسوں کے نزدیک کوئی بڑائی بڑائی نہیں ہے، غلط اندیشی یا خوش فہمی ہے۔ (ہمارے ذاکر صاحب: ۱۳۱)

حق العباد کو پورا کرنے میں جو تقصیر ہوئی ہوگی اس کو (اللہ) اپنی طرف سے معاف نہ کریگا، بلکہ معاف کرنے کا تمام تر حق یا اختیار اس کا ہوگا جس کی حق تلفی کی گئی ہوگی۔

ظالم کو سزا خدا دیگا، یا دنیا کا مقررہ قانون اور عدالت۔ ظالم کو معاف صرف مظلوم کر سکتا ہے۔

یہ بات اس لیے عرض کرنی پڑی کہ عبادت پیشہ حضرات عبادت پر زیادہ بھروسا نہ فرمائیں۔ خلق کی خدمت و خیر خواہی سے خالی ہے، تو ایسی عبادت وادیِ غیر ذی ذرع ہے، جہاں نہ پانی ہے نہ پودا، نہ پیڑ و ل (ایضاً: ۱۴۴)

تسخیرِ فطرت انسان کا جتنا قابلِ فخر کارنامہ ہے، اتنا ہی اپنے پر تسخیر پانے میں ناکامی اس کا المیہ ہے۔ امریکہ نے چاند پر پاؤں رکھ دیا، لیکن کالے پر اس کا پاؤں جہاں کا تہاں ہے۔

(ایضاً: ۱۴۷)

کھدر کے اوصاف کے بہت لوگ قائل ہیں۔ میں اس کو اس لحاظ سے خاص طور پر قابلِ احترام سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عظیم روایت اور عظیم شخصیت کا نشان یا سمبل ہے، جس نے ہندوستان کو اس کی اخلاقی روایات، ملکی اور قومی ذمہ داریوں اور عالمی تقاضوں سے

آشنا کرایا۔ مجھے کھدّر کی شیروانی اور پاجامہ زیادہ خوشنما معلوم ہوتا ہے۔

(ایضاً : ۱۶۶)

زندگی کی خوشی اس میں نہیں کہ ہر خواہش پر دم نکلے خوشی اس میں ہے کہ ہم کتنوں کے رنج وراحت میں اور کتنے ہمارے رنج وراحت میں شریک رہے۔ اسی کو عزّت و محبّت کی زندگی کہتے ہیں، جو صرف انسان کو نصیب ہے۔ (ایضاً : ۱۹۰)

جب سے اشتراکی طریق فکر وعمل کا آغاز ہوا، فرد، سماج، ادارے، مذہب، حکومت، شعر و ادب، فنونِ لطیفہ، اقدارِ عالیہ میں ایسا عالمگیر ہیجان، فساد وفتور آیا کہ اب تک کوئی دوسری طاقت اس کو صحت و اعتدال پر لانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

(فکر و نظر (عزیزان علیگڈھ): ۱۶۵)

لباس کو ستھرا، خوبصورت، آرامدہ، قرینِ حیا اور موسم و موقع کے اعتبار سے موزوں ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو جس سے کوئی نازیبا نمایش مقصود ہو۔ سر کو ڈھکے رکھنا مشرقی تہذیب میں ضروری سمجھا گیا ہے..... شیروانی اور اچکن میں کسی شخص کو برہنہ سر سڑکوں پر یا تقریبوں میں دیکھتا ہوں، تو اس کی وقعت کافی حد تک نظروں سے گر جاتی ہے۔

(ایضاً : ۱۷۴)

آدمی کے تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کا پتہ دو موقعوں پر آسانی سے لگ جاتا ہے، ایک بولنے میں، دوسرے کسی کے ساتھ طویل ریلوے سفر میں (ایضاً : ۱۷۷)

گفتگو کے معمولی آداب میں سے یہ ہو کہ اپنی بات سنجیدگی سے کہیے اور دوسرے کی تحمل سے سنیے۔ اپنی بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے عقل، معتبر دلائل اور سلامت طبع سے کام لیجیے۔ طنز و تہتک، شور و شغب اور ہرزہ سرائی جاہلوں کا شیوہ ہے۔ (ایضاً : ۱۷۷)

۸۔ فرد کا اخلاق، اپنے بارے میں:۔

علیگڈھ کی زندگی میں جہاں گزشتہ مصائب کو بھول چکا تھا، وہاں ان ذمہ داریوں کو بھی بڑی حد تک نظر انداز کر گیا، جو بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتی تھیں۔

وہ مجھ پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے رنج وراحت سے جتنا وہ ملول یا مسرور ہوتے ہیں، اتنا ان کے رنج وراحت سے میں نہیں ہوتا ۔ فراغت کی زندگی کی یہ محرومی اکثر میرے لیے بڑی تکلیف دہ ہوجاتی ہے ۔ بزرگوں اور عزیزوں کے رنج و راحت میں شریک ہونا چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔ نفس حیلے تراشتا ہے ، تو اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہوں ۔ (گنجہائے گرانمایہ (سید سلیمان اشرف): ۵۱)

(اصغر گونڈوی نے الہ آباد میں انھیں مزید روکنا چاہا، یہ نہ رکے) "وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، تو اوقات سے نفرت ہوجاتی ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں ۔ میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا، لیکن مرحوم کو جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا، اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں ۔

(گنجہائے گرانمایہ (اصغر حسین اصغر گونڈوی: ۱۱۹)

کسی کی خوبیوں کو جتلانے اور کمزوریوں کو چھپانے کے طریقے کو اصولاً صحیح نہیں سمجھتا ۔ لیکن عملاً اس کو غلط بھی نہیں قرار دیتا، اس لیے کہ دیکھا اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بُرے اور بدنیت اشخاص بڑے اور اچھے لوگوں کی تمام خوبیوں سے منہ موڑ کر ان کی طرف ایک آدھ کمزوری کو اپنی بداعمالی اور بدراہروی کے جواز میں چن لیتے ہیں ۔

(گنجہائے گرانمایہ (بابائے اردو مولوی عبدالحق): ۲۹۶)

کسی کے عیب نکالنے سے بہتر مشغلہ چپ رہنا ہے اور ان دونوں سے بہتر اس کی خوبیوں کو ظاہر کرنا ہے ۔ ۔ ۔ انسان اور انسانیت کے تقاضے فن اور فنکار کے تقاضوں سے وسیع تر اور عظیم تر ہوتے ہیں، اس لیے ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ (ایضاً: ۲۹۷)

اس کا دوسرا پہلو بھی کچھ اچھا نہ تھا، یعنی میں جس کو دوست سمجھتا، یا جس کا مجھ پر احسان ہوتا، یا جس کو میں مجبور و مظلوم سمجھتا تھا، اس کی حمایت میں خواہ وہ بیجا کیوں نہ ہو عقل اور اخلاق دونوں سے گزر جانے میں تامل نہ کرتا ۔ الیکشن وغیرہ میں ووٹ اپنے دوست ہی کو دیتا، خواہ فریق مخالف آسمان ہی سے کیوں نہ اترا ہو ۔

مجھے زندگی میں ایک چیز کی بڑی تمنا رہی؛ میرے اطمینان کے مطابق پوری نہ ہوئی یعنی

یا تو میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں حاجتمند کی اپنے حوصلے یا اطمینان کے مطابق مدد کر سکتا، یا میرا کوئی ایسا دولتمند دوست ہوتا کہ جب کبھی اس قسم کی ضرورت پیش آتی، تو وہ میری خاطر اسے پورا کر دیتا۔ (مضامینِ رشید (اپنی یاد میں) : ۸۵)

خاقینیت میں نے اکثر کی ہیں سازش کبھی نہیں کی۔ (ایضاً : ۸۵)

زیادہ سونا اور زیادہ کھانا میرے نزدیک نحوست اور بدتوفیقی تھا۔ (ایضاً : ۸۶)

مجھے درباداری سے سخت نفرت تھی۔ درباداری کے وہ لوگ محتاج ہوتے ہیں، جو خود اپنی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں اور اس ذہنی عذاب سے بچنے کے لیے دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں .... درباداری پر صرف لعنت بھیجی جا سکتی ہے (ایضاً ۸۷)

جب ابتری عام ہو، اس وقت ایک اچھا اور بڑا شخص تنہا وہ کر سکتا ہے، جو فوج، پولس، الکشن، کانفرنس، یو تھو۔ فیسٹول، طالب علم اور سادھو علیحدہ علیحدہ اور مل کر بھی نہیں انجام دے سکتے۔ اصلاح و امن کے کاموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایک پیغمبر بھیجا ہے، افواج کبھی نہیں بھیجیں۔

(ہمارے ذاکر صاحب : ۱۵۶)

۹۔ شاعر و فنکار، فنونِ لطیفہ۔

شعر و ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کی قدر و قیمت متعین کرنے میں فنکار کی شرافتِ نفس کے عنصر کو جتنی اہمیت دی جائے، بجا ہے۔ حالی انسان کی حیوانی سرشت نہیں، انسانی سرشت (حیا و حمیت) پر زور دیتے ہیں۔ اقدارِ عالیہ اور اقدارِ مطلقہ کا جواز اور مدار انسان دوستی پر ہے جس کے لیے ابتدائے تہذیب سے آج تک اچھے اور بڑے انسان ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں اور قربانی دیتے آئے ہیں۔ جب انسان کا معیار "انسان اور انسانیت" ہے تو اس کے حسنِ عمل یعنی شعر و ادب کو بھی انسان و انسانیت ہی کے معیار سے پرکھنا چاہیے۔ ہم میں شاعر اور ادیب کی آزادیٔ فکر کا غلط اور بڑا خطرناک تصور راہ پا گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے شاعر اور انشا پرداز یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ ہر طرح کی بات

جس طرح چاہیں لکھ سکتے ہیں۔
نامعقول شخص معقول شاعر نہیں ہوسکتا۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں، اس میں فنونِ شریفہ کے آداب کہاں سے آئینگے؟ (گنجہائے گرانمایہ (سجاد حیدر یلدرم): ۲۰۸)
شاعر کے ظرف و ذوق کا صحیح اندازہ لگانے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ عورت اور متعلقہ جذبات کا کس طرح اظہار کرتا ہے۔ وہ عورت کو جسم کی لذّت کا صرف ایک وسیلہ سمجھتا ہے یا اس کو ایک قدرِ اعلیٰ اور ایک تہداری بھی مانتا ہے۔
(گنجہائے گرانمایہ (جگر): ۲۵۷)

۱۰۔ جنس، عورت۔
شہوت، غصّہ، نفرت، خود نمائی کے جذبات بڑے منہ زور ہوتے ہیں، اور کم و بیش سارے انسان میں ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی غلط نہیں ہے کہ حیوان اور انسان میں فرق بھی ہے کہ حیوان ان پر قابو نہیں رکھ سکتا، لیکن انسان ان کو بس ہی میں نہیں رکھتا۔ بلکہ ان کو بہتر مقاصد اور بہتر شکل میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ محسوس تو حیوان ہی کی طرح کرتا ہے لیکن اظہار انسان کی مانند کرتا ہے۔ جو محسوس کرے، اسی کو ظاہر کرنا قرینِ فطرت یقیناً ہے، قرینِ انسانیت نہیں ہے (ایضاً: ۲۵۸)
جنسی میلانات کو بڑی اچھی چیز سمجھتا تھا۔ لیکن جنسی میلانات کو بدوضعی کا بہانہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ان میلانات کی موجودگی مستحسن ہے، ان کا مظاہرہ مذموم ہے۔ ہر انسانی فعل کا محرّک جنسی میلان ہوسکتا ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک جنسی میلان کا ارتکاب نہ کرلیا جائے، اس وقت تک کوئی کام شروع نہ کیا جائے۔
(مضامینِ رشید (اپنی یاد میں): ۸۸)
آسٹریا کے مشہور فلسفی اور دانشور سگمنڈ فرائڈ (۱۸۵۶ء۔ ۱۹۳۹ء) کے نظریۂ حیات یا جنس کو لیجیے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے ہر فعل کی محرّک اس کی جنسی جبلت ہے۔ اس انکشاف نے انسان کے اخلاقی اقدار و کردار اور ان کی لائی ہوئی ہزاروں سال

کی برکت اور برگزیدگی کو جس طرح مسخ و مسمار اور انسان کی ترقی کی رفتار اور سمت کو جن بد اعمالیوں کی طرف موڑ دیا، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ نوجوانوں کی اعلیٰ تعمیری صلاحیتوں کو مسخ کر کے اس نظریے نے فنونِ لطیفہ و عالیہ کو جس طرح ماؤف کیا ہے اور ان کے ماؤف ہو جانے سے نوجوانوں کے صالح فکر و عمل پر جیسا ہمہ گیر و عالمگیر دردناک اثر پڑا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔

(فکر و نظر (عزیزانِ علیگڈھ): ۱۵۰)

جنس کی تخلیقی مصلحت اور اخلاقی ذمّہ داریوں کو نظر انداز کر کے جنس کی جس بے لگام اور غیر فطری ہوسناکی و لذّت کوشی کا مغرب شکار ہوا اور ہے، اس کی ایک قابلِ رحم اور عبرت انگیز مخلوق وہ ہے جسے ہم "ہپّی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (ایضاً: ۱۵۴)

مرد اور عورت جس طرح نسلِ انسانی کے قیام و بقا کے ضامن اور لازم و ملزوم ہیں، اور جنسی روابط میں جو زبردست اور ناقابلِ تسخیر لذّت اور کشمکش رکھی گئی ہے، جس سے کوئی متنفس خالی نہیں ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہماری کس غیر معمولی احتیاط و احترام کا مستحق ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کے ہر مذہب و اخلاق نے ہمیشہ سے ان روابط کو اعتدال پر رکھنے کے لیے سخت شرائط کا پابند رکھا ہے۔ (عزیزانِ علیگڈھ: ۱۵۵)

عورت کی آزادی یا نجات کا یہ تصوّر نہ صحیح ہے، نہ صالح کہ وہ ہر مرد کے لیے ہو، اور ہر مرد اس کے لیے ہر موقع پر اور ہر غرض سے دستیاب ہو، جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آ رہا ہے۔ مرد کے لیے عورت کا منجملۂ اسبابِ تفریح و طرب ہونا، نہ عورت کے شایانِ شان ہے، نہ مرد کے۔ موافق سے موافق اور مبارک سے مبارک حالات میں رہ کر آزادی اور یکساں حقوقِ شہریت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر عورت کے فرائض میں ہے کہ وہ اچھی سے اچھی ماں اور بہتر سے بہتر بیوی کا رول ادا کرے۔ (ایضاً: ۱۵۵)

جنس کا یا سیکس کو سائنس اور ٹکنالوجی کے اس "دورِ قمر" میں جا ہے، جو حیثیت حاصل ہو، زندگی کو سمجھنے اور برتنے میں اس کو وہ درجہ نہیں دینا چاہیے، جیسے زندگی سیکس کے سوا کچھ اور نہ ہو۔ زندگی صرف جنس کے تقاضوں سے کہیں زیادہ اہم اور عظیم ذمّہ داریں

کے احساس اور ان ذمہ داریوں کے دیے ہوئے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا تقاضا کرتی ہے ۔ (ایضاً: ۱۵۸)

گناہوں کو گناہوں سے ڈھکنا یا ایک کو دوسرے سے سندِ جواز دینا آج کل کی دانش اور دانشوروں کا کمال یا ذمہ دارانہ سمجھی جانے لگی ہے ۔جس گناہ کو ابتدا سے اب تک ہر مذہب اور صحیفۂ اخلاق میں گناہ ہی سمجھا گیا ہو، اس کو زندگی کا طرزِ فکر اور طریقہ عمل بنا لینا کتنی مایوس کن اور تشویشناک صورتِ احوال ہے ۔ (ایضاً: ۱۵۹)

۱۱۔ سائنس اور اس کا فنونِ لطیفہ، اخلاق سے تعلق ۔

سائنس کے کرشموں کو انسانیت کی معراج کیسے قرار دیا جائے ۔ آرٹ اور آزادی کی قربان گاہ پر کن سعادتوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے ۔ افراد کی شادی اور غمی کیا ہوگی، ان کی پروا کیوں نہیں کی جاتی ۔جماعت کے ریگزار سے افراد کی اُمید اور اُمنگ کے نخلستان کیوں فنا کیے جا رہے ہیں ۔

(گنجہائے گرانمایہ (ڈاکٹر مختار احمد انصاری): ۱۹)

موجودہ دنیا کی بے یقینی و محرومی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم فن اور فنکار، سائنس اور سائنسکار کو انسان اور انسانیت پر ترجیح دینے لگے ہیں ۔کبھی کبھی تو ایسا گمان ہونے لگتا ہے، جیسے انسانیت کو فن اور سائنس کی غلامی میں دے دیا گیا ہو، حالانکہ ان دونوں کو بہر حال انسانیت کا تابع رہنا چاہیے ۔جہاں خاک نشینی نہ آتی ہو، وہاں سرکش پرواز ی زبردست خطرہ ہے

(گنجہائے گرانمایہ (بابائے اردو مولوی عبدالحق): ۲۹۸)

سائنس، ٹکنالوجی یا دوسرے علوم کے نئے نئے انکشافات کی اہمیت اور منزلت سے کوئی انکار نہیں ہو سکتا ۔ یہ پیمانے ہیں جن سے فکرِ انسانی کی تازگی، پرواز اور پختگی کا اندازہ لگاتے ہیں اور اس پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں ۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ فکرِ انسانی کو اخلاقِ انسانی سے متوازن اور ہم آہنگ رکھنا اس سے بھی زیادہ قابلِ فخر کارنامہ ہے ۔علوم چاہے جتنے اور جیسے ہوں، ان کا اصلی، اعلیٰ اور آخری مقصد انسان کو انسانیت کی راہ پر رکھنا اور

جانور کی طرف پلٹنے سے روکنا ہے۔ (فکر و نظر (عزیزانِ علیگڈھ) : ۱۵۱)

(سائنس) اس کا یہ منصب کبھی نہیں رہا، نہ ہونا چاہیے کہ وہ اخلاق، مذہب اور معاشرہ کے دیے ہوئے اقدارِ اعلیٰ کی قلمرو میں دخل انداز ہو، اور دست درازی کرے۔ دونوں کی مملکت قطعاً جداگانہ ہے۔ موجودہ عالمگیر ہیبت و ہیجان کا سبب یہ ہے کہ ہم نے مذہب و اخلاق کی دی ہوئی شریعت کو حیوانیات اور حیاتیات کے طبعی قوانین کے مقابلے میں ناقابلِ التفات اور ناقابلِ عمل قرار دے دیا ہے، حال آں کہ بھلائی، راستی اور حسن اور ان کی دی ہوئی برکتیں تمام تر فیضان ہیں، مذہب و اخلاق کے بتائے ہوئے اوامر و نواہی کی تعمیل کا۔ انسانیت کے اعلیٰ اقدار پر نفس کے ادنیٰ تقاضوں کے غلبہ پا لینے سے ہمارے اخلاق، شعر و ادب، فنونِ لطیفہ اور خوب و ناخوب کے معیار میں جو ابتری آئی ہے، اس نے زندگی کو طرح طرح کی بداعتدالیوں اور محرومی میں مبتلا کر دیا ہے۔

(ایضاً: ۱۶۵)

مغرب کی سائنسی، میکانیکی اور دوسرے علومِ جدیدہ میں تبحر کا کون قائل نہ ہوگا۔ لیکن مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی ترقی کے میدانوں میں پچھلے چالیس پچاس سال میں وہ ہم سے بہت پیچھے ہی نہیں ہو گیا ہے، بلکہ اپنے نقطۂ نظر سے ہم اس کو واماندۂ راہ نہیں، تو گم کردہ راہ ضرور سمجھتے ہیں۔ (ایضاً: ۱۷۳)

مآخذ

۱۔ آشفتہ بیانی میری: سرسید بک ڈپو، علیگڈھ (طبع اول، فروری ۱۹۵۸ء)

۲۔ مضامین رشید: انجمن ترقی اُردو ہند (۱۹۶۴ء)

۳۔ گنجہائے گرانمایہ: مکتبۂ جامعہ، نئی دلّی (اکتوبر ۱۹۶۲ء)

۴۔ خنداں: مکتبۂ جامعہ، نئی دلّی (مارچ ۱۹۶۵ء)

۵۔ ہمارے ذاکر صاحب: مکتبۂ جامعہ، نئی دلّی (اگست ۱۹۷۳ء)

۶۔ عزیزانِ علیگڈھ: مشمولہ فکر و نظر ۱۹۷۲ء (جلد ۱۲: شمارہ ۱-۲)

لطائفِ رشید

سلیمان اطہر جاوید (ڈاکٹر)

● پروفیسر ابوبکر احمد حلیم کسی زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ رشید صاحب ہمیشہ عید پر ان کے مکان پر ملاقات کو جایا کرتے تھے۔ جب وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے، تو اس کے بعد کسی کو اطلاع دیے بغیر وہ لکھنؤ چلے گئے۔ دو دن بعد بقر عید تھی۔ رشید صاحب حسبِ معمول عید ملنے ان کی کوٹھی پر گئے، تو لائبریری کے ایک کارکن مشتاق حسین صاحب نے بتایا کہ حلیم صاحب تو لکھنؤ گئے ہیں۔ رشید صاحب نے کہا: وہ اپنی خو بدلیں، تو بدلیں؛ لیکن مشتاق صاحب، آپ گواہ رہیے گا کہ ہم نے اپنی وضع نہیں بدلی ہو

ایک خاتون جو رشید صاحب کی بہت مداح تھیں، اپنے شوہر کے ساتھ ان سے ملاقات کو آئیں۔ دورانِ گفتگو میں کہنے لگیں، میں آپ کو اس وقت سے جانتی ہوں، اور جب سے پسند بھی کرتی ہوں، جب ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ رشید صاحب نے فوراً جواب دیا: غضب کیا آپ نے کہ مجھے جانتی تو آپ شادی سے قبل سے ہیں اور ملاقات کو اب اس وقت آئیں، جب آپ کی شادی ہو چکی ہے۔

حکیم عبداللطیف اور رشید صاحب نینی تال میں تھے۔ شام کے وقت سیر کو نکلے، تو کچھ دیر

سستانے کو ایک جگہ ٹھہر گئے۔ ان سے بلندی پر کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی طرف سے دو چار کنکر لڑھک کر نیچے آئے، اور ان میں سے ایک رشید صاحب کے چشمے پر لگا۔ رشید صاحب نے حکیم صاحب کو مخاطب کرکے کہا: حکیم صاحب، آپ نے کچھ کیا ہو تو کیا ہو۔ لیکن سنگسار میں کیا جا رہا ہوں۔

ظہیر احمد صدیقی (پروفیسر)

ملک کے ایک افسانہ نگار کو اپنے افسانے پڑھ کر سنانے کا بیحد شوق تھا؛ اگر افسانہ مکمل نہ ہو تو پلاٹ ہی سنا دیتے تھے۔ ایک دن وہ رشید صاحب کو اپنے ایک افسانے کا پلاٹ سنا رہے تھے۔ ان کا تکیۂ کلام تھا: "دیکھا آپ نے" "دیکھا آپ نے" جسے وہ بار بار دہراتے جا رہے تھے۔ رشید صاحب حسبِ معمول پان کھا رہے تھے اور سر جھکائے کچھ لکھنے میں مشغول تھے؛ اور یہ صاحب اپنا پلاٹ سنا رہے تھے اور پڑھ رہے تھے۔

"ایک سنسان بیابان تھا (دیکھا آپ نے) رات کا سنّاٹا ہُو کا عالم۔ ....

(دیکھا آپ نے) اسی سنّاٹے میں ایک اُلّو اڑا (دیکھا آپ نے)۔

رشید صاحب نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا اور کہنے لگے: "جی ہاں حضرت! دیکھ رہا ہوں"۔

•

علیگڈھ کی نمائش کے مشاعرے کی صدارت گوپی ناتھ امن لکھنوی فرما رہے تھے۔ طلبہ اور ایک شاعر میں جھڑپ ہو گئی جس کی وجہ سے مشاعرے میں یک گونہ بدمزگی اور انتشار پیدا ہو گیا۔ جب دوسری مرتبہ امن صاحب علیگڈھ تشریف لائے، تو گفتگو کے دوران میں رشید صاحب نے ان سے دریافت کیا: "امن صاحب! آپ یہاں کے لڑکوں کے رویّے سے کچھ آزردہ تو نہیں ہوئے؟" امن صاحب نے جواب دیا: "نہیں آزردگی کی کیا بات ہے؟ ابھی حال میں میرٹھ کے مشاعرے میں شریک ہوا تھا؛ وہاں اس سے بھی بڑھ کر بدنظمی دیکھی"۔

بیاختہ رشید صاحب نے ہنس کر کہا: "سچ ہے جہاں اس طرح کا آشوب نمایاں ہو، وہیں امن کی ضرورت ہوتی ہے"۔

ایک دن مسز ممتاز حیدر صاحبہ (پرنسپل گرلز کالج، علیگڑھ) نے رشید صاحب کو خط لکھا کہ گرلز کالج کی میٹنگ کے لیے تاریخ مقرر کردیں۔ رشید صاحب نے جواب میں لکھ دیا کہ "تاریخ تو لڑکی والوں کی طرف سے مقرر کی جاتی ہے؛ آپ مجھ سے تاریخ کے تعین کا اصرار کررہی ہیں"۔

میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور رشید احمد صدیقی صاحب کلاس لے رہے تھے۔ موضوع زیر بحث مومن کی شاعری تھی۔ رشید صاحب نے دریافت کیا،
"حضرت! مومن کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"
میں نے عرض کیا "جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے، مومن نوازوں نے جتنا مومن کو بڑھا دیا ہے، اتنے بڑے شاعر وہ نہیں ہیں"۔
فرمانے لگے "جناب یوں نہیں مانوں گا۔ یہ بتایئے کہ آپ کو اپنے والد صاحب قبلہ (پروفیسر ضیاء احمد بدایونی۔ شارحِ دیوانِ مومن) سے اختلاف ہے یا اتفاق؟ غالباً یہ آپ کی دکھتی رگ ہوگی"۔
میں نے شرارتاً عرض کیا "میں انتہائی ادب سے اختلاف کی جسارت کروں گا"۔
کہنے لگے: "بھئی آج تک تو یہ سنتے آئے تھے، لیکن آج اس کی تصدیق بھی ہوگئی"۔

پسرِ نوح با بداں بنشست
خاندانِ نبوتش گم شد

رشید صاحب کے پاس یونیورسٹی کے کچھ ممبران اسٹاف بحث کرتے ہوئے آئے۔ بحث اس مسئلہ پر تھی کہ ایک عورت کا اگر پہلا شوہر طلاق دے دیتا ہے یا وہ مر جاتا ہے، اور عورت دوسری شادی کرلیتی ہے، تو اس عورت کے پہلے اور دوسرے شوہر کا آپس میں کیا رشتہ ہوگا۔
رشید صاحب نے برجستہ جواب دیا "ہم زلف کہہ لیجیے"۔

حشمت حسین عثمانی ۔

غالباً ۱۹۳۴ء کے جاڑوں کی ایک رات تھی ۔ علیگڈھ میونسپل ہال میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا تھا ۔ جگر مرادآبادی کی آمد آمد تھی، اور مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا ۔ بدنظمی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے ۔ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ جلسہ کی صدارت رشید احمد صدیقی صاحب فرمائیںگے اور حضرت جگر مرادآبادی بھی تشریف لے آئے ہیں ۔ اس کے بعد چند مقامی اور بیرونی شعرا کا نام ان کے مدارج کی ترتیب سے پکارا گیا ۔ مگر مجمع کو قرار نہ تھا، جو جگر صاحب کا کلام سننے کے لیے بیتاب تھا ۔ یہاں تک کہ لوگ فرش پر بیٹھے رہنے کے بجائے کھڑے ہو گئے ۔ جس سے صاحبِ صدر و شعرا نظروں سے اوجھل ہو گئے ۔ قریب تھا کہ مجمع بے قابو ہو جائے ۔ اتنے میں رشید صاحب نے مائکروفون اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: "حضرات! جگر صاحب آ گئے ہیں اور وہ میری تحویل میں ہیں ۔ وہ ضرور آپ کو اپنا کلام سنائیںگے، بشرطیکہ آپ میری بات سنیں ۔ اس پر مجمع خاموشی سے بیٹھ گیا ۔ رشید صاحب نے اپنے خصوصی انداز میں حاضرین کو محبت آمیز لہجہ میں سرزنش کی اور علیگڈھ کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے نظم و ضبط کی اپیل کی ۔ فرمایا "دنیا میں دو ہستیاں سب سے زیادہ قابلِ رحم ہوتی ہیں، ایک بارات کا دولہا اور دوسرا مشاعرہ کا صدر ۔ پہلی حالت عرصہ ہوا، مجھ پر گزر چکی اور خدا نہ کرے دوبارہ گزرے ۔ دوسری حالت سے آج دوچار ہوا ہوں ۔ آپنے مجھ جیسے ثقیل اللسان اور رکیک بیان کو مشاعرے کی صدارت کے لیے نامزد کرکے دانشمندی یا غیر دانشمندی کا ارتکاب کیا ہے، اس سے اب مفر ممکن نہیں ۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے صبر اور اپنے سکون کو معرض امتحان و خطر میں نہیں ڈالیںگے" ۔ اس کے بعد جگر صاحب سے خاص فرمائش کرکے ان کی ایک مشہور غزل سے مشاعرے کا آغاز کرایا ۔ گفتار و اشعار کی اس حسین بوقلمونی کے ساتھ جب معرکۃ الآرا مشاعرہ اختتام پذیر ہوا، تو لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ حاصلِ مشاعرہ صدر کی تقریر تھی یا شعرا کا کلام۔

رشید صاحب سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں صدرِ شعبۂ اردو ہونے سے پیشتر مولانا احسن مارہروی تھے۔ مولانا حضرت داغ کے شاگرد عزیز اور ان کے نورتنوں میں شمار ہوتے تھے جب مولانا کے انتقال کی خبر رشید صاحب کو ملی، تو بے اختیار فرمایا:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

اور طلبا بھی ان کے ساتھ آبدیدہ ہو گئے۔

ان کے ایک شاگرد رشید ہے پور کا مخملی جوتا بنوا کر لائے اور بڑی مسرت و احترام سے بنفسِ نفیس خود اسے پہنانے لگے۔ شاگرد نے احتراماً کہا کہ پاؤں تک بمشکل رسائی ہو رہی ہے، سر پر رکھ دیجیے۔ رشید صاحب نے برجستہ فرمایا: "سر حاضر ہے"۔

عید کی تہنیت کے لیے لوگ رشید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے اور رشید صاحب انھیں مٹھائی، سوئیاں اور پھل پیش کر رہے تھے۔ ایک صاحب کی نگاہ سنگترون پر تھی، مگر وہ اسے اٹھانے میں پس و پیش کر رہے تھے کیونکہ وہ کچھ ترش قسم کے معلوم ہوتے تھے۔ رشید صاحب نے فرمایا: "لانے والے کا احسان ہو گا میرے اوپر، تناول فرمائیے"۔

محمد حسن (پروفیسر)

علیگڑھ میگزین (اردو) کے ایک مدیر خاصے بدخط تھے۔ انھوں نے اداریہ لکھ کر رشید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ رشید صاحب نے جہاں تہاں سے دیکھا، کچھ ترمیم اور اضافے کے بعد انھیں واپس کر دیا اور لکھ بھیجا۔ "اداریہ تو ٹھیک ہے لیکن جناب! یہ آپ پانو سے لکھنے کی عادت کب چھوڑینگے؟"

انھیں مدیر نے علیگڑھ میگزین کے مندرجات کے شاعرانہ عنوانات فہرستِ مضامین میں تجویز کیے تھے، مثلاً منظومات کے حصے کا عنوان تھا: "گل پیرہن" اسی طرح دوسرے عنوانات

بھی خاصے شاعرانہ تھے۔ رشید صاحب نے ان تمام عنوانات کو قلمزد کر دیا اور کہا "اور توسب ٹھیک ہے، لیکن یہ طوائفوں کے سے نام بدل دیجیے۔"

ڈاکٹر عبدالعلیم، شعبۂ عربی وعلومِ اسلامیہ کے صدر تھے۔ علیم صاحب لینن کی سی مختصر ڈاڑھی رکھتے تھے، اور یہ ڈاڑھی اُن کی شخصیت کا جزو ہو گئی تھی۔ علیم صاحب علیگڈھ یونیورسٹی میں مقنن اور یونی ورسٹی کے معاملات میں قانون دان کی حیثیت سے مشہور تھے۔
ایک دن میں نے رشید صاحب کی موجودگی میں علیم صاحب سے پوچھا: "یہ آپ کو قانون سے دلچسپی کیسے اور کب سے پیدا ہوگئی؟"
علیم صاحب بتانے لگے، "میرے والد وکیل تھے، وہ صرف ایسے مقدمات لیتے تھے، جن کے بارے میں انھیں یقین ہو کہ مؤکل حق پر ہے جب میں بچہ تھا . . ."
رشید صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "آپ کبھی بچے بھی تھے؟"
یہ جملہ اس وجہ سے بڑا برمحل تھا کہ علیم صاحب کم سخنی، سنجیدگی اور وقار کا مجسّمہ تھے۔

حیدر آباد کی رضاکار تحریک کے رہنما قاسم رضوی کبھی علیگڈھ کے طالب علم رہے تھے۔ اس زمانے میں رشید صاحب فارسی پڑھانے پر نئے نئے مامور ہوئے تھے۔ پہلے ہی کلاس میں قاسم رضوی سے سابقہ پڑا۔ رشید صاحب نے عرفی یا انوری کا قصیدہ پڑھانا شروع کیا۔ مطلع ہی پڑھا تھا کہ قاسم رضوی نے مطالبہ کیا کہ اس شعر کی تقطیع کر دیجیے۔ رشید صاحب کو بُرا لگا کہ اس شخص کو معلوم ہے کہ عروض وغیرہ سے میں دور بھاگتا ہوں۔ پھر اس نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ میرا پہلا کلاس ہے اور اس طرح کسی کو تنگ کرنا علیگڈھ کے شیوے کے خلاف ہے۔ مگر انھوں نے بے تامّل تقطیع کر دی: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔ قاسم رضوی مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ رشید صاحب نے سوال کیا: "آپ مطمئن ہو گئے؟" قاسم رضوی نے کہا: "جی ہاں"
رشید صاحب نے کہا "ویسے جو تقطیع میں نے کی، وہ غلط تھی" اس پر زبردست قہقہہ

پڑا اور قاسم رضوی ایسے شرمندہ ہوئے کہ دوبارہ کلاس میں کبھی تنگ نہ کیا۔

رشید صاحب سے ایک بار میں نے پوچھا: آپ کے نزدیک بڑے شاعر کی کیا پہچان ہے؟"
فرمایا: "جو شاعر خدا سے جتنا بیباک اور عورت سے جتنا محتاط ہو، وہ اتنا ہی بڑا شاعر ہے"

علیگڑھ میں ایک زمانے میں استاد چھوارا کے نام سے ایک شخص ہوتے تھے۔ موزوں طبع تھے۔ کچھ امرد پرستی کا ذوق تھا، کچھ وضع قلندرانہ تھی، مفلوک الحال رہتے تھے۔ مگر ہر مشاعرے میں ضرور پہنچ جاتے تھے۔ ایک بار کسی مشاعرے سے نکل رہے تھے، رشید صاحب نے پوچھا: "استاد! "آپ نے کلام نہ سنایا"۔
استاد نے ازراہِ انکساری کہا: "بھلا ہم جاہل کیا کلام سناتے"۔ رشید صاحب نے کہا: "نہیں استاد کبھی کبھی جاہل بھی بڑے تیے کی بات کہہ جاتا ہے"۔ استاد نے برجستہ کہا: "آپ نے کیا تتے کی بات کہی ہے۔

میرے ڈراموں کا مجموعہ "پسینہ اور پرچھائیں" چھپ کر آیا، تو میں نے ایک جلد رشید صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے بعض اوراق کے دونوں طرف، نیلا کاغذ ہونے کی وجہ سے، سیاہی پھوٹ آئی تھی۔ رشید صاحب نے ایسے ہی ایک ورق کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور فرمایا: "پسینہ بھی ہے اور پرچھائیں بھی"۔

ایک خاتون کا ناول چھپ کر آیا، نام تھا "راہِ عمل" کہنے لگے: "بیچیے، اب عورتیں بھی راہِ عمل دکھانے لگیں"۔

ایک دفعہ تذکرہ ہو رہا تھا کہ بیویاں اور نوکر کبھی شوہر اور آقا کے معترف نہیں ہوتے۔ فرمایا: "میں تو حضرت محمد کو رسول خدا اسی بنا پر مانتا ہوں کہ ان پر سب سے پہلے ان کی بیوی ایمان

لائی تھیں جب تک داعی پیغمبر نہ ہو، ہوی ایمان نہیں لا سکتی۔"

اقبال علیگڑھ آئے، تو رشید صاحب نے پوچھا "حضرت، اگر ایک دور میں دو مردِ مومن پیدا ہو جائیں تو کیا ہو؟"

ایک صاحبزادے نے شعبۂ اردو میں داخلہ لیا۔ شیروانی کے بٹن ٹوٹے رہتے تھے، پاجامہ میلا اور سلوٹوں سے بھرا ہوا، داڑھی کے بال پریشان، ٹوپی مڑی تڑی۔ بار بار وہ کلاس میں آتے جاتے، رشید صاحب کے سامنے سے گزرتے تھے۔ ایک دن رشید صاحب نے انھیں بلایا اور کہا: "حضرت! سر تسمہ کے لباس پر میرا کاپی رائٹ ہے۔ اسے صرف میں پہن سکتا ہوں۔ آئندہ آپ صاف ستھرے کپڑے پہن کر آیا کریں۔"

ایک مصنف شکار کے افسانے لکھا کرتے تھے۔ کسی شکار سے واپس آئے تھے اور رشید صاحب کو اپنی تازہ مہم کا حال سنا رہے تھے۔ بال خاک آلود اور بکھرے ہوئے، خط بڑھا ہوا، چہرے پر اور لباس سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ ابھی شکار سے لوٹے ہیں۔ رشید صاحب گردن جھکائے نہایت صبر و سکون سے ان کے قصے سن رہے تھے۔ دورانِ گفتگو انھوں نے پوچھا: "رشید صاحب، کیا آپ نے کبھی ہمالیائی اُلّو دیکھا ہے؟"
رشید صاحب نے گردن اٹھائی اور انھیں غور سے دیکھا: "جی نہیں، دیکھ رہا ہوں۔"

عصمت چغتائی ایک دفعہ ان سے ملنے آئیں۔ رشید صاحب کھرپی لیے گلاب کے پودوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ یہ سمجھیں، کوئی مالی ہے۔ ان سے کہا: رشید صاحب سے ملنا ہے، انھیں اطلاع کر دو۔ رشید صاحب اسی طرح کھڑے رہے۔ ان کو خیال ہوا کہ یہ سمجھے نہیں۔ بولیں "شاید ابھی نئے آئے ہو" رشید صاحب نے کہا: "یوں تو اس گھر میں سب سے پرانا میں ہی ہوں۔"

مطبوعاتِ علمی مجلس

۱. تذکرۂ گلشنِ ہند، از حیدر بخش حیدری (مرتّبہ پروفیسر مختار الدین) ۵/-

۲. کلیاتِ میر، (میر کے مکمّل چھ دیوانِ غزلیات) مرتّبہ ظلِّ عباس عباسی ۲۵/-

۳. کلیاتِ مصحفی، (دیوانِ اول) مرتّبہ نثار احمد فاروقی ۸/۷۵

۴. کلیاتِ مصحفی، (دیوانِ دوم) مرتّبہ نثار احمد فاروقی ۷/۷۵

۵. تذکرۂ مقالات الشعرا، از قیام الدین حیرت (مرتّبہ نثار احمد فاروقی) ۵/-

۶. تذکرۂ بہارِ بیخزاں، از احمد حسین سحر لکھنوی (مرتّبہ ڈاکٹر نعیم احمد) ۵/-

۷. ہندستانی انگریزی لغت، مؤلفہ ڈنکن فوربس (بذریعہ فوٹو آفسٹ) مجموعہ ۵/-

۸. عیارِ غالب، مرتّبہ مالک رام (غالب سے متعلق مشاہیر کے ۱۳ مضامین) ۷/-

۹. گلِ رعنا، از غالب، مرتّبہ مالک رام (غالب کا اوّلین انتخاب اردو فارسی) ۷/۵۰

۱۰. اعلان الحق، مولانا ابو الکلام آزاد (معہ مقدمہ از مالک رام) ۲/-

۱۱. سیّد مسعود حسن رضوی، ذات و صفات مرتّبہ مالک رام ۱۰/-

۱۲. ال احمد اکبر آبادی مرتّبہ مالک رام ۷/-

ملنے کا پتا

علمی مجلس

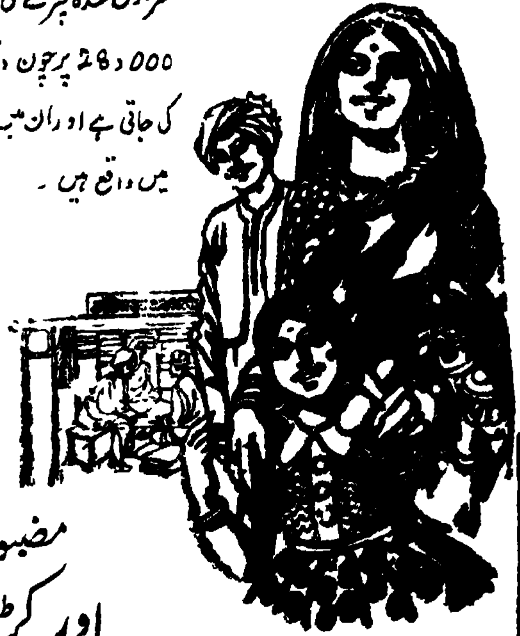
۱۴۲۹، چھتّہ نواب فرّاشخانہ، دلّی ۶

قوم ترقی کی راہ پر

زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے مزید کپڑا

دھوتیوں اور ساڑھیوں کی پیداوار 16 کروڑ مربع میٹر تک پہنچ گئی ہے۔ آج سے ایک سال پہلے ہی یہ مقدار صرف ۱۵ کروڑ مربع میٹر تھی۔

کنٹرول شدہ کپڑے کی 90 فیصد مقدار کو ایرڈیو سیکٹر کی 28,000 پرچون دکانوں کے ذریعہ فروخت کی جاتی ہے اور ان سب سے زیادہ تر دکانیں دیہات میں واقع ہیں۔



مضبوط ارادہ
اور کڑی محنت
ہمارے ساتھی ہیں

davp 75/454

قوم ترقی کی راہ پر

زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے مزید خوراک

اس سال اناج کی پیداوار ۱۱ کروڑ 4 0 لاکھ ٹن تک پہنچ جانے کا امکان ہے جو کہ ایک ریکارڈ پیداوار ہوگی۔

بھارت میں عوام میں ضروری چیزوں کی تقسیم کے سسٹم میں بہت سُدھار ہوا ہے اور اسے اب دُنیا میں بہترین سسٹم مانا جاتا ہے۔



مضبوط ارادہ اور کڑی محنت ہمارے ساتھی ہیں

davp 75/456

غالب کا اپنے اُردو اور فارسی کلام کا اوّلین انتخاب

گُلِ رعنا

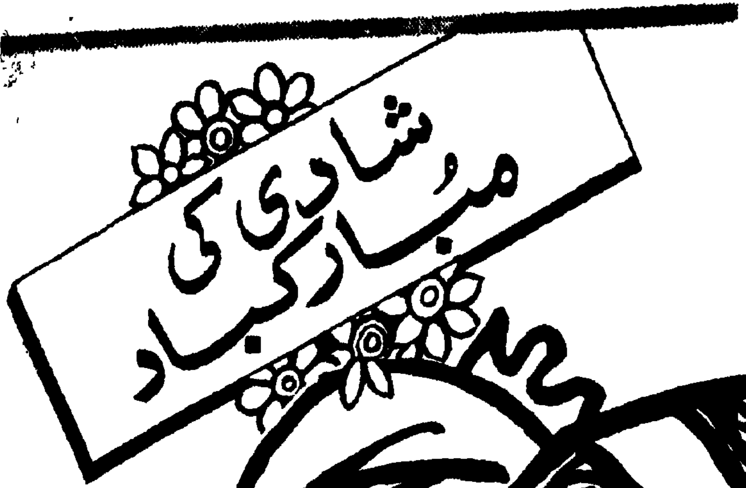
مرتّبہ

مالک رام

* غالب نے یہ انتخاب ۱۸۲۸ء میں مرتّب کیا تھا، لیکن کتاب گم ہو گئی، اور اسی لیے آج تک شائع نہ ہو سکی۔ خوش قسمتی سے مرتّب کو اس کا مکمل خطّی نسخہ دستیاب ہو گیا۔ اسی کو تفصیلی مقدمے اور مفید حواشی کے اضافے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ بہترین کتابت، آفسٹ کی عکسی طباعت، مضبوط جلد۔

قیمت دس روپے

علمی مجلس، ۱۴۲۹۔ چھتّہ نواب صاحب فراشخانہ دلّی



شادی کی مبارکباد

:ER" Quarterly of ILMI MAJLIS DELHI-6. R. No. 19758/67